بہنوں کا اپنا ماہنامہ
شعاع
اگست 2013
www.paksociety.com

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

نظمیں غزلیں

مستقل سلسلے

اگست 2013
جلد 27 شمارہ 12
قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - مقام: 91/B، پی ای سی ایچ ایس سوسائٹی کراچی
Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

رضیہ جمیل

پہلی بات

شعاع کا اگست کا شمارہ سالگرہ نمبر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔
یہ مہینہ تین بڑی خوشیاں لے کر آیا ہے۔
عیدالفطر۔ روزہ داروں کے لیے اللہ تعالیٰ کا انعام۔
جشن آزادی۔ برصغیر کے مسلمانوں کے لیے قدرت کا سب سے بڑا تحفہ آزادی اور ایک علیحدہ ملک کا قیام۔
اور
شعاع کا سالگرہ نمبر۔

اللہ تعالیٰ کے حضور سربسجود ہیں کہ شعاع 28 سال کی مسافت کر کے 29 ویں سال میں قدم رکھ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ شعاع کو روزِ اول سے کامیابی نصیب ہوئی اور وقت کے ساتھ ساتھ یہ آگے ہی بڑھتا رہا اور آج اس کا شمار قارئین کے پسندیدہ ترین پرچوں میں ہوتا ہے۔

شعاع کی کامیابی میں سب سے بڑا حصہ ہماری مصنفین کا ہے۔ بلاشبہ ہماری مصنفین ہمارا سرمایہ اور افتخار ہیں۔ ہم ان کی دل سے قدر کرتے ہیں اور ان کی مزید کامیابیوں اور خوشیوں کے لیے دعاگو ہیں۔

محمود ریاض صاحب جنہوں نے شعاع کا اجرا کیا، اور وہ مصنفین جو آج ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ ہمارے دلوں میں ان کا مقام ہمیشہ قائم رہے گا۔ اللہ تعالیٰ ان کی خطاؤں سے درگزر کرے اور انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازے۔

ہماری قارئین جن سے ہمارا محبتوں کا رشتہ ہے، انہوں نے ہمیشہ ہمیں سراہا، ہماری حوصلہ افزائی کی۔ ہم تہہ دل سے ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے حفظ و امان میں رکھے اور یہ محبتیں قائم و دائم رہیں۔ آمین۔

قارئین کو عیدالفطر اور جشن آزادی مبارک۔

آخری عشرے کی خصوصی عبادتوں میں پاکستان کی بقا، سلامتی اور خوش حالی کے لیے دعا کیجیے گا۔ ہمارا، آپ کا اور ہماری آنے والی نسلوں کا مستقبل پاکستان سے ہی وابستہ ہے۔

اس شمارے میں،

سحر ساجد ہماری مصنفین میں نیا اضافہ ہیں۔ اس ماہ ان کا مکمل ناول "ابھی کچھ وقت باقی ہے" شائع کیا جا رہا ہے۔ انہوں نے مخصوص طبقے کی سوچ اور انداز فکر کو بڑی سادگی اور روانی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ جس کی بنا پر طوالت کے باوجود دلچسپی قائم رہتی ہے۔ قارئین ہمیں اس کے بارے میں اپنی رائے ضرور دیں۔

- راشدہ رفعت، صائمہ اکرم اور سائرہ رضا کے ناولٹ،
- رضیہ مہدی، شیریں ملک، امانت وائیوا اور نظیر فاطمہ کے افسانے،
- رخسانہ نگار عدنان اور نبیلہ عزیز کے ناول،
- پھولوں کے سلسلے۔ کئی موسم گزر گئے۔ قارئین سے سروے،
- ڈان نیوز کے نیوز کاسٹر فرید رئیس اور شائستہ رئیس کا بندھن،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ۔ دستک،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں۔ احادیث کا سلسلہ،
- خط آپ کے، شاعری بچ بولتی ہے، شعاع کے ساتھ ساتھ اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

شعاع کا سالگرہ نمبر آپ کو کیسا لگا؟ آپ کی رائے جاننے کے منتظر ہیں۔

سب ناموں کا مالک سب کے دُکھ کا چارا ہے
ہر بستی پر روشن جو بس نام ستارا ہے

ریگِ رواں کی وحشت میں بھی ایک نشانی ہے
دریا کے سناٹے میں بھی ایک اشارہ ہے

حدِ ازل سے حدِ ابد تک اس تاریکی میں
بام تمہارا روشن تھا یا نام تمہارا ہے

ہر رستے کی منزل ہے وہ ہر منزل کی رہ
اس تاریک خلا میں کیسا عجب ستارا ہے

اے آنکھیں اور آنکھوں کو یہ نیندیں دینے والے
میں نے ہر اک خواب میں چھپ کر تجھے پکارا ہے

کیسے بندے ہیں وہ امجد جو یہ سوچتے ہیں
مولا، سب دنیا کا نہیں ہے، صرف ہمارا ہے

امجد اسلام امجد

نظر کو نور لبوں کو گلال کر دیتا ہے
کہ اُن کا ذکر دلوں کو جمال کر دیتا ہے

اُس ایک نام کے صدقے جو لب پہ آتے ہی
سیاہ رات میں تارے اُچھال دیتا ہے

پھر اس کے بعد کوئی تیرگی نہیں رہتی
بس اک دُرود کا جھونکا اُجال دیتا ہے

میں کیوں نہ اس کی صدا پر نمازِ عشق پڑھوں
اذان شہرِ سخن میں بلال دیتا ہے

تسیم کوثر و زم زم بس ایک چشمِ کرم
خدا بھی تیرے کرم کی مثال دیتا ہے

یہ معجزہ ہے محمدؐ کے نام کا ثروت
جو میری فکر کو لفظوں میں ڈھال دیتا ہے

ثروت ظفر

نیکی اور بھلائی کے راستے بہت ہیں

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا۔
"اور تم جو بھلائی بھی کرو گے' بلاشبہ اللہ اسے جاننے والا ہے۔"
(البقرہ۔215) اور فرمایا
"اور تم جو بھلائی بھی کرتے ہو' اللہ اسے جانتا ہے۔"
(البقرہ۔197) اور فرمایا
"جو شخص ایک ذرّے کے برابر بھی کوئی بھلائی کرے گا' وہ اسے (قیامت والے دن) دیکھ لے گا۔" (الزلزال۔7)
اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "جس نے نیک عمل کیا تو اس کا فائدہ اسی کو ہے۔" (الجاثیہ۔15)
اور اس باب میں بہت سی آیات ہیں۔ جہاں تک احادیث کا تعلق ہے تو وہ بھی بہت ہیں' جن کا شمار ہی نہیں ہم ان میں سے چند ایک ذکر کرتے ہیں۔

افضل عمل

حضرت ابوذر جندب بن جنادہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے کہا۔
"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کون سا عمل سب سے افضل ہے؟"
"آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اللہ پر ایمان رکھنا اور اس کے راستے میں جہاد کرنا۔"
میں نے کہا "کون سا غلام آزاد کرنا افضل ہے؟"
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو اپنے مالک کی نظروں میں سب سے زیادہ عمدہ اور زیادہ قیمتی ہو۔"
میں نے کہا۔ "اگر میں یہ نہ کر سکوں؟"
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کسی کاریگر کی مدد کرو یا بے ہنر کا کام کردو۔"
میں نے کہا۔ "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! یہ بتلائیں' اگر میں یہ بعض عمل کرنے سے بھی عاجز رہوں؟"
"آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم لوگوں کو اپنے شر سے بچائے رکھو' یہ بھی تمہارا اپنے نفس پر صدقہ ہے۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ حدیث سے جہاد اور غلاموں کو آزاد کرنے کی فضیلت' اسی طرح دوسروں کے ساتھ ہمدردی و تعاون کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں دوسروں کو تکلیف پہنچانے سے اجتناب بھی صدقہ و اجر میں احسان سے کم نہیں ہے۔
2۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایمان باللہ' قبولیت اور صحت اعمال کے لیے بنیاد ہے اور عمل ایمان کا پھل ہے۔ ایمان کے بغیر عند اللہ کوئی عمل مقبول نہیں

ہر جوڑ پر صدقہ

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"تم میں سے ہر ایک کے ہر جوڑ پر صبح کو ایک صدقہ (ضروری) ہے۔ پس ہر تسبیح (سبحان اللہ کہنا) صدقہ

ہے' ہر تحمید (الحمد للہ کہنا) صدقہ ہے' ہر تہلیل (لا الہ الا اللہ کہنا) صدقہ ہے اور ہر تکبیر (اللہ اکبر کہنا) صدقہ ہے۔ نیکی کا حکم دینا صدقہ ہے اور برائی سے روکنا صدقہ ہے اور ان سب کاموں سے وہ دو رکعتیں کافی ہو جاتی ہیں جو انسان چاشت کے وقت پڑھے۔" (مسلم)

فوائد و مسائل

1۔ انسان کے جسم میں تین سو ساٹھ جوڑ ہیں۔ ان جوڑوں کی وجہ ہی سے انسان ہر طرح کی حرکت اور ہر قسم کا کام کرنے پر قادر ہے۔ اگر یہ جسم بے جوڑ ہوتا تو انسان کے لیے اٹھنا' بیٹھنا' لیٹنا' حرکت کرنا اور مختلف کاموں کے لیے اعضا کا استعمال ناممکن ہوتا۔ اس لحاظ سے ہر جوڑ' اللہ کی ایک نعمت ہے' جس کا شکر ادا کرنا انسان پر واجب ہے۔
2۔ یہ اللہ تعالیٰ کا دوسرا فضل ہے کہ اس نے ان نعمتوں پر شکر کی ادائی کا نہایت آسان طریقہ بھی بتلا دیا'

جو غریب سے غریب انسان بھی اختیار کر سکتا ہے اور وہ تسبیح و تحمید اور تکبیر و تہلیل کا کہنا اور نیکی کا حکم اور برائی سے روکنا وغیرہ ہے اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو طلوع شمس کے بعد سے زوال شمس تک کے درمیانی وقفے میں کسی وقت دو رکعت پڑھ لے۔ زیادہ پڑھنا چاہے تو آٹھ رکعت تک (دو دو کرکے) پڑھ سکتا ہے۔
3۔ ایک حدیث میں دن کے شروع حصے میں چار رکعتیں پڑھنے کی ترغیب ہے' جن کا فائدہ یہ بتایا گیا ہے کہ بندہ شام تک اللہ کی حفاظت میں رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر پریشانی سے اسے کفایت کر جاتا ہے۔

اچھے اور برُے اعمال

ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"مجھ پر میری امت کے اچھے اور برے عمل پیش کیے گئے۔ چنانچہ میں نے اس کے اچھے اعمال میں راستے سے تکلیف دہ چیز (پتھر' کانٹا وغیرہ) کا ہٹانا بھی پایا اور اس کے برُے اعمال میں وہ تھوک پایا جو مسجد میں تھوکا گیا) ہو اور اس پر مٹی نہ ڈالی گئی ہو۔" (مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ اللہ تعالیٰ نے چھوٹے سے چھوٹے عمل کو بھی' جس میں لوگوں کا فائدہ یا نقصان سے بچاؤ ہو' اعمال خیر میں شمار کیا ہے اور جو اس کے برعکس ہو' چاہے کتنا بھی معمولی ہو' اسے شر میں شمار کیا ہے۔ جس سے یہ ترغیب ملتی ہے کہ انسان کو ہمیشہ بھلے کام کرنے چاہئیں تاکہ اسے اللہ کی رضا مندی حاصل ہو اور برُے کاموں سے اجتناب ضروری ہے تاکہ وہ اللہ کے غضب و عتاب سے محفوظ رہے۔
2۔ مسجد کی صفائی کا اہتمام اور اس کے ادب کے منافی کاموں سے گریز کیا جائے جیسے تھوکنا وغیرہ اور یہ پڑا ہو تو اس کو صاف کر دینے کا حکم ہے۔ حدیث میں جو مٹی ڈالنے کا حکم ہے یہ اس وقت ہے' جب مسجد کچی ہو اور اس وقت مسجدیں کچی ہوتی تھیں۔ آج کل مسجد کے فرش پکے ہوتے ہیں' اس لیے کپڑے یا پانی سے صاف کرنا چاہیے۔

مال دار اور غریب

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ کچھ لوگوں نے کہا۔
"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! مال دار لوگ کہیں (زیادہ) اجر لے گئے۔ وہ نماز پڑھتے ہیں جیسے ہم پڑھتے ہیں' وہ روزے رکھتے ہیں جیسے ہم رکھتے ہیں۔ (ہم سے زائد کام یہ کرتے ہیں کہ) وہ اپنے فاضل مالوں سے صدقہ خیرات کرتے ہیں (یوں ہم سے زیادہ اجر حاصل کر لیتے ہیں)"
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"کیا اللہ نے تمہارے لیے ایسی چیزیں نہیں بنائیں کہ تم ان کا صدقہ کرو؟ بے شک ہر سبحان اللہ کہنا صدقہ ہے' ہر اللہ اکبر کہنا صدقہ ہے ہر الحمد اللہ کہنا

صدقہ ہے' ہر لا الہ الا اللہ کہنا صدقہ ہے' نیکی کا حکم دینا صدقہ ہے' برائی سے روکنا صدقہ ہے اور تم میں سے کسی کا اپنی بیوی سے ازدواجی تعلق قائم کرنا صدقہ ہے۔"

انہوں نے سوال کیا "ہم میں سے ایک شخص اپنی خواہش پوری کرے' کیا اس میں بھی اس کے لیے اجر ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"بھلا بتلاؤ! اگر وہ اپنی شہوت حرام جگہ (بدکاری) سے پوری کرے تو اسے گناہ ہو گا۔ (یقیناً" ہو گا) پس اسی طرح وہ حلال طریقے سے اپنی شہوت پوری کرے گا تو اسے اجر ملے گا۔" (مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ اس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کے اس جذبے کا بیان ہے جو نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے سے بڑھ کر کرنے کا ان کے اندر موجود تھا اور اسی حساب سے نیکی میں تقصیر سے رنج و ملال محسوس ہوتا تھا۔

2۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اسلام میں نیکی کا مفہوم بڑا وسیع ہے اور اس میں ہر وہ عمل آجاتا ہے (بشرطیکہ اس میں اللہ کی نافرمانی نہ ہو) جو اچھی نیت اور اچھے ارادے سے کیا جائے حتیٰ کہ فطری عادات کی تکمیل پر بھی (جو مباح کے دائرے میں ہوں) اجر ملتا ہے' بلکہ اگر مقصود اللہ کی اطاعت اور امتثال امر (احکام کی تعمیل) ہو تو ترک معصیت بھی فعل طاعت کی طرح باعث اجر ہے۔

نیکی حقیر نہیں

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا۔

"نیکی کے کسی بھی کام کو حقیر مت سمجھنا' اگرچہ تو اپنے (مسلمان) بھائی سے خندہ روئی کے ساتھ ملے (یعنی مسکراتے ہوئے ملنا بھی نیکی ہے)۔" (مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ اس سے معلوم ہوا کہ خندہ روئی سے ملنا بھی نیکی ہے کیونکہ ایک تو یہ انسان کے حسن اخلاق کی دلیل ہے۔ دوسرے' اس سے مسلمانوں کے درمیان الفت پیدا ہوتی ہے جو مطلوب و محبوب عمل ہے۔

2۔ مسلمان کی زندگی اگر اسلامی اصولوں پر کاربند ہو تو اس کا ہر عمل نیکی ہے اور اس حدیث میں اس امر کی بھی ترغیب ہے کہ نیکی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہیے۔

واجب صدقہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ہر دن جس میں سورج طلوع ہوتا ہے' لوگوں کے ہر جوڑ کی طرف سے ایک صدقہ (کرنا واجب) ہے۔ (اور صدقہ صرف مال کا خرچ کرنا ہی نہیں بلکہ) تیرا دو آدمیوں کے درمیان انصاف کرنا بھی صدقہ ہے۔ کسی آدمی کو اس کی سواری پر بٹھانے یا اس کا سامان اٹھا کر اس پر رکھوانے میں اس کی مدد کرنا بھی صدقہ ہے۔ اچھی بات کرنا صدقہ ہے۔ ہر اس قدم میں' جس سے چل کر تو نماز کی طرف جائے صدقہ ہے۔ راستے سے تکلیف دہ چیز کا ہٹانا بھی صدقہ ہے۔" (بخاری و مسلم)

اسے امام مسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی روایت کیا ہے' انہوں نے کہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"بنی آدم میں سے ہر انسان کی تخلیق تین سو ساٹھ جوڑوں پر ہوئی ہے' چنانچہ جس نے اللہ اکبر کہا' الحمد للہ کہا لا الہ الا اللہ کہا' سبحان اللہ کہا' استغفر اللہ کہا راستے سے کوئی پتھر ہٹایا' یا کوئی کانٹا یا ہڈی راستے سے دور کردی' یا کسی نیکی کا حکم دیا' یا کسی برائی سے روکا' تین سو ساٹھ کی تعداد میں وہ مذکورہ کام کرے' تو وہ اس دن اس حالت میں شام کرتا ہے کہ اس نے اپنے نفس کو جہنم کی آگ سے دور کرلیا ہوتا ہے۔"

فوائد و مسائل :

1۔ اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ جس کے پاس صدقہ و خیرات کی استطاعت نہ ہو تو وہ مذکورہ افعال کے ذریعے سے صدقہ خیرات کا ثواب حاصل کرسکتا ہے' نیز اپنے جوڑوں کا صدقہ دے سکتا ہے۔

2۔ اللہ تعالیٰ جذبات کی قدر کرتا ہے۔ حسن نیت سے کیا ہوا معمولی عمل بھی بسا اوقات انسان کی نجات کا باعث بن سکتا ہے۔

مسجد جانا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص صبح کو یا شام کو مسجد کی طرف جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں' جب بھی وہ صبح یا شام کو مسجد کی طرف جاتا ہے' مہمانی تیار کرتا ہے۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل

1۔ اس میں مسجد میں جانے اور نماز باجماعت پڑھنے کی ترغیب ہے۔

2۔ بادشاہ اگر کسی کی دعوت کرے تو اسے قبول کرنے کی وہ ہر ممکن کوشش کرے گا کہ کہیں وہ ناراض نہ ہو جائے لیکن اللہ تعالیٰ جو بادشاہوں کا بادشاہ ہے' اس کی مہمانی کو اگر ہم ٹھکرائیں گے تو اس سے بڑی بدبختی کیا ہے اور نماز باجماعت ادا نہ کرنا اس دعوت کو ٹھکرانے کے مترادف ہے۔

تحفہ کی اہمیت

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اے مسلمانوں کی عورتو! کوئی پڑوسن اپنی پڑوسن (کے ہدیے) کو حقیر نہ سمجھے' اگرچہ وہ بکری کا کھر ہی ہو۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ کسی کے ہدیے کو حقیر نہ سمجھا جائے کیونکہ وہ اخلاص سے بھیجا گیا ہو گا تو تھوڑا ہونے کے باوجود' وہ عنداللہ بڑا ہو گا۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی پڑوسن اپنی پڑوسن کے لیے ہدیہ بھیجنے کو حقیر نہ سمجھے' خواہ بکری کی کھر ہی ہو' یعنی اس کے ہدیہ بھیجنے کو بھی معمولی خیال نہ کرے۔ کسی شاعر نے کہا ہے ہدیے کی قیمت کو نہ دیکھیے بلکہ دینے والے کے جذبات اور دل پر نگاہ رکھیے۔

حیا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ایمان کی ستر یا ساٹھ سے کچھ اوپر شاخیں ہیں۔ ان میں سب سے افضل' لا الہ الا اللہ کہنا ہے اور سب سے ادنیٰ' راستے سے تکلیف دہ چیز (پتھر کانٹے وغیرہ) کا ہٹانا ہے۔ اور حیا بھی ایمان کی ایک شاخ ہے۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ ایمان کے' عمل کے حساب سے مختلف مراتب ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایمان اور عمل لازم و ملزوم ہیں۔

2۔ حیا کی فضیلت و اہمیت بھی اس سے واضح ہے کیونکہ حیا انسان کو گناہوں سے روکتی اور نیکیوں پر آمادہ کرتی ہے۔

جان داروں پر رحم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ایک دفعہ آدمی راستے پر چلا جارہا تھا کہ اسے سخت پیاس لگی۔ اس نے ایک کنواں پایا تو اس میں اتر کر اس نے پانی پیا' پھر باہر نکل آیا۔ وہیں ایک کتا تھا جو پیاس کے مارے زبان باہر نکالے (ہانپتے ہوئے) کیچڑ چاٹ رہا تھا۔ اس آدمی نے (دل میں) کہا۔ اس کتے کو بھی اسی

طرح پیاس نے ستایا ہے، جس طرح میں اس کی شدت سے بے حال ہو گیا تھا' چنانچہ وہ (دوبارہ) کنویں میں اترا اور اپنا موزہ پانی سے بھرا اور اسے اپنے منہ سے پکڑے اوپر چڑھ آیا اور کتے کو پانی پلایا۔ اللہ تعالیٰ نے اس (کے اس عمل اور جذبے) کی قدر کی اور اسے معاف فرما دیا۔"

(یہ سن کر) صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا ہمارے لیے چوپایوں (پر ترس کھانے) میں بھی اجر ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "(ہاں) ہر تر جگر والے (جاندار کی دیکھ بھال) میں اجر ہے۔" (بخاری و مسلم)

اور بخاری کی ایک روایت میں ہے۔

"اللہ تعالیٰ نے اس شخص کے عمل کی قدر کی۔ چنانچہ اسے بخش دیا اور جنت میں داخل کر دیا۔"

اور بخاری مسلم کی ایک روایت میں ہے۔

"ایک دفعہ ایک کتا کنویں کے گرد چکر لگا رہا تھا' اسے پیاس مارے دے رہی تھی کہ اچانک اسے بنی اسرائیل کی فاحشہ عورتوں میں سے ایک بدکار عورت نے دیکھا' پس اس نے اپنا موزہ اتارا اور اس کے ذریعے سے اس نے اس کے لیے (کنویں سے) پانی کھینچا اور اسے پلا دیا' تو اس کے اس عمل کی وجہ سے اسے بخش دیا گیا۔

فوائد و مسائل :

1۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کی ہر مخلوق کے ساتھ حتیٰ کہ جانوروں کے ساتھ بھی احسان کرنا چاہیے۔ اس سے اللہ تعالیٰ بہت خوش ہوتا ہے۔

2۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت بڑی وسیع ہے' وہ اگر چاہے تو تھوڑے سے عمل کو بھی قبول فرما کر بندے کی مغفرت فرما دے۔

3۔ قاعدہ یہی ہے کہ کبیرہ گناہوں سے توبہ کی جائے' تاہم بسا اوقات خلوص نیت سے کیا ہوا نیک عمل بھی گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے اور انسان کے کبیرہ گناہ بھی معاف ہو جاتے ہیں۔

جنت میں داخلہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"میں نے ایک آدمی کو جنت میں چلتے پھرتے دیکھا' اس نے اس درخت کو کاٹ دیا تھا جو راستے کے درمیان میں تھا اور مسلمانوں کو تکلیف دیتا تھا۔" (مسلم)

کانٹے دار شاخ

بخاری و مسلم کی ایک روایت میں ہے "ایک دفعہ ایک آدمی راستے پر چل رہا تھا' اس نے راستے پر ایک کانٹے دار شاخ دیکھی' اس نے اسے پیچھے کر دیا۔ اللہ نے اس کے اس عمل کی قدر فرمائی اور اس کو بخش دیا۔"

فوائد و مسائل :

1۔ لوگوں کو تکلیف اور نقصان سے بچانا اللہ کو بہت پسند ہے' حتیٰ کہ راستوں سے تکلیف دہ چیزوں کو ہٹا دینا بھی اللہ کو بڑا محبوب ہے۔ اسی طرح اس کے برعکس راستوں کو تنگ یا بند کر دینا' جس سے لوگوں کو تکلیف ہو' جیسے شادی بیاہ کے موقعوں پر لوگ نہایت دیدہ دلیری سے ایسی مذموم حرکتیں کرتے ہیں یا بعض دکان دار اور اہل مکان تجاوزات کھڑی کر کے لوگوں کو ایذا پہنچاتے ہیں' یہ کام اللہ کی ناراضی اور اس کے غضب کا باعث ہیں۔

2۔ نیکی کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیے' خواہ ظاہری طور پر وہ معمولی ہی کیوں نہ ہو۔

بندھن

ڈان نیوز کے نیوز کاسٹر

فرید رئیس ہمراہ شائستہ رئیس

شاہین رشید

شعاع کے مقبول سلسلے "بندھن" کے لیے اس بار ہم جوڑے شائستہ اقبال (جواب شائستہ فرید ہیں) اور فرید رئیس سے متعارف کروائیں گے۔ دونوں کا تعارف یہ ہے کہ یہ دونوں ڈان نیوز کے ہر دلعزیز نیوز کاسٹرز ہیں۔

شائستہ فرید

"جی شائستہ! کیسی ہیں اور رمضان المبارک کے لیے رول سموسے بن گئے؟"

"جی بالکل ٹھیک ٹھاک۔ اور بن ہی گئے ہیں رول سموسے۔"

"آواز میں تھکاوٹ کیوں ہے؟"

"شادی کے بعد ایسا ہی ہوتا ہے۔" قہقہہ۔۔۔ "نہیں مذاق کر رہی ہوں۔ رمضان کی تیاری میں کام کچھ زیادہ ہی ہو گیا تو تھوڑی تھکاوٹ ہو گئی ہے اور کوئی بات نہیں ہے۔"

"جوائنٹ فیملی ہے کیا۔ اور شادی کی تاریخ کیا ہے؟"

"جی جوائنٹ فیملی ہے اور۔ میں گھر کی بڑی بہو بھی ہوں۔ اور مجھے جوائنٹ فیملی بہت پسند ہے۔ کیونکہ بڑوں کا ساتھ ہو تو انسان بہت سے مسائل سے بچ جاتا ہے اور جناب! شادی کی تاریخ 3 نومبر 2012ء ہے۔ جبکہ نکاح ہمارا 18 اکتوبر 2012ء کو ہوا تھا۔ 5 نومبر 2012ء کو ولیمہ ہوا تھا۔"

"منگنی کتنا عرصہ رہی اور یہ عرصہ کیسا گزرا' کچھ مسئلہ مسائل ہوئے؟"

"تقریباً" پانچ سال ہماری منگنی رہی اور یہ عرصہ اچھا گزرا۔ جہاں تک جھگڑے یا مسائل کی بات ہے تو ایسا تو ہر جگہ ہوتا ہے۔ لیکن اگر ریلیشن مضبوط ہو اور ایک دوسرے سے محبت ہو تو پھر رشتہ قائم رہتا ہے اور کوئی پرابلم نہیں ہوتی۔"

"ان پانچ سالوں میں کوئی ایسا وقت آیا کہ آپ دونوں نے ہی یہ کہا ہو کہ۔۔۔ نہیں یہ شادی نہیں ہو سکتی؟"

"ہاں۔۔۔ کئی بار ایسا موقع آیا کہ ہم دونوں نے سوچا کہ اب یہ شادی نہیں ہو سکتی۔ لیکن پھر ایک دن کے بعد ہی احساس ہو جاتا تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے بغیر رہ ہی نہیں سکتے اور شادی کے بعد بھی جب ہلکی پھلکی یا تھوڑی زیادہ لڑائی ہو تو لگتا ہے کہ بس اب اینڈ ہے۔ مگر پھر وہی بات کہ ہم ایک دوسرے کے بنا رہ ہی نہیں سکتے۔"

"شادی سے پہلے قربانی دینی پڑتی ہے لڑکی کو یا شادی کے بعد؟"

"شادی سے پہلے کوئی قربانی نہیں دینی پڑتی' کیونکہ اس وقت تو آپ اپنی مرضی کی مالک ہوتی ہیں۔ لیکن شادی کے بعد قربانی دینی پڑتی ہے۔ کیونکہ کوئی بھی لڑکی

یہ نہیں چاہتی کہ اس کا گھر ٹوٹے یا رنجشیں پیدا ہوں۔"

"شادی سے پہلے زیادہ اچھی انڈر اسٹینڈنگ تھی یا اب۔ اور کیا فرق پایا شادی کے بعد فرید صاحب میں؟"

"شادی سے پہلے ہی ہماری بہت اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہو چکی تھی۔ لیکن میں آپ کو ایک بات بتاؤں کہ شادی کے بعد شوہر بھی اور نہیں رہتا' وہ شوہر ہو جاتا ہے۔ کیونکہ پھر اس کی ذمہ داریاں بھی تو بڑھ جاتی ہیں اور جب آپ ایک فیملی میں ایڈجسٹ ہوتے ہیں۔ فیملی کے لوگوں کے ساتھ ملتے ہیں۔ ان کے مزاج سے آشنائی حاصل کرتے ہیں تو فیملی کے رویے میں تو چینج آتا ہی ہے۔ شوہر کے رویے میں بھی کافی چینج آتا ہے۔ مثلاً" ناز نخرے تو پہلے کی طرح ہی اٹھاتے ہیں لیکن اب سمجھاتے بہت ہیں کہ تم اس گھر کی بڑی بہو ہو۔ تمہیں سب کا خیال رکھنا ہے۔ تمہاری یہ ذمہ داریاں ہیں' وغیرہ وغیرہ۔"

"نیچر کے کیسے ہیں فرید؟"

"نیچر کے بہت اچھے ہیں۔ بہت لوونگ ہیں۔ محبت کرتے ہیں تو ٹوٹ کر اور غصہ کرتے ہیں تو بھی پھر سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ بس فرید کہتے ہیں کہ تم میرے ساتھ بحث نہیں کیا کرو۔ خاموش رہا کرو جب مجھے غصہ آرہا ہو تو۔ اور شادی سے پہلے بھی یہ غصے کے ایسے ہی تھے۔ ویسے ہم دونوں ہی غصے کے بہت تیز ہیں۔ فرید کو تو چھوٹی چھوٹی بات پر آجاتا ہے اور کبھی بڑی بات پر بھی نہیں آتا اور جب فرید کو غصہ آتا ہے تب مجھے بھی آجاتا ہے۔ ورنہ میں تو نارمل ہی رہتی ہوں۔ ویسے میں اپنے غصے کو کنٹرول کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ کیونکہ شادی سے پہلے تو سب کچھ چل جاتا ہے۔ مگر شادی کے بعد تو عورت کو ہی کنٹرول کرنا پڑتا ہے۔ انہوں نے تو کہہ دیا ہے کہ میں تو ایسا ہی ہوں اور ایسا ہی رہوں گا۔ تمہیں چینج ہونا ہے۔"

"اب گھر کی ذمہ داریاں پڑنے پر سسرال والے تمہیں جاب چھوڑنے کے لیے تو کہتے ہوں گے؟"

"نہیں' نہیں۔ میرے ساس' سسر اور میری نندیں' ماشاء اللہ اس معاملے میں بہت کوآپریٹو ہیں اور جب میں چینل "آج" میں تھی اور فرید "ڈان نیوز" میں چلے گئے تھے تو میرے سسر کہتے تھے کہ شائستہ کو ساتھ لے کر جایا کرو۔ کیونکہ وہ تمہارے ساتھ ہوتی ہے تو ہمیں تسلی ہوتی ہے اور یہ کبھی نہیں کہا کہ جاب چھوڑ دو۔ یہ تو میری مرضی پر ہے۔ سچ میں میرے سسرال والے بہت اچھے ہیں' بہت سپورٹ کرتے ہیں مجھے۔"

"شادی کے بعد فرید کو اپنے ہاتھوں سے کیا پکا کر کھلایا؟"

"شادی سے پہلے زیادہ کھلاتی پلاتی تھی اور اب یہ کہتے بھی ہیں کہ تم نے شادی سے پہلے مجھے بہت کھانے بنا' بنا کر کھلائے ہیں اور اب تم بہت کم بناتی ہو جب چھٹی ہوتی ہے تو میں کوکنگ میں ہی کرتی ہوں۔ اگرچہ میرے پاس میڈ ہے لیکن میں اس کے ساتھ مل کر کچن میں زیادہ ٹائم دیتی ہوں۔ البتہ اتوار کو مکمل کوکنگ میرے ہاتھ میں ہوتی ہے اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ اگر میں فرید کو اپنے ہاتھوں سے دال بھی بنا کر کھلا دوں تو بہت شوق سے کھاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ تمہارے میں ذائقہ بہت ہے۔ انہیں میرے ہاتھ کے "کالے چنے" بہت پسند ہیں۔ بریانی بہت پسند ہے۔ قیمے کے سموسے پسند ہیں' اس لیے رمضان میں خاص اہتمام کیا ہے میں نے ان کے لیے۔"

"کچن میں ہاتھ بٹاتے ہیں؟"

"نہیں' نہیں۔ کبھی بھی نہیں۔ انہیں عادت ہی نہیں ہے۔ ان کی امی کہتی ہیں کہ ان کے پاپا نے بھی کبھی ہاتھ نہیں بٹایا۔ اس لیے فرید کو بھی عادت نہیں ہے۔ ان کی تو چیزیں ادھر ادھر ہو جائیں تو ناراض ہو جاتے ہیں۔"

"اچھا یہ بتاؤ کہ پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی اور سلسلہ آگے کیسے چلا؟"

"فرید سے میری پہلی ملاقات 2004ء میں ہوئی تھی۔ جون کا مہینہ تھا۔ جب "آج ٹی وی" لاونچ ہو رہا تھا۔ ہم لوگوں کی ٹریننگ کلاسز ہو رہی تھیں کہ ناصرہ زیدی کے ساتھ روم میں داخل ہوئے۔ اتنے ہینڈسم' اسمارٹ' پہلی نظر میں ہی مجھے بہت اچھے لگے تھے۔ مگر لڑکیاں سوچ تو سکتی ہیں۔ آگے قدم نہیں بڑھا سکتیں۔ پھر ساتھ کام کرنے لگے تو لگا کہ فرید مجھے پسند کرنے لگے۔ پھر سلسلہ دوستی میں بدلا اور پھر ایک دن انہوں نے مجھے پرپوز کر دیا۔"

"طویل منگنی' پھر شادی' مرد پختہ عزم لیے ہوئے ہو تو کوئی اس کو بدگمان نہیں کر سکتا۔ مگر انسان کو تبدیل ہونے میں دیر بھی نہیں لگتی تو اگر کبھی کوئی دوسری پسند آگئی تو؟ اور فرید شادی کی اجازت مانگیں تو؟"

"میں اجازت ہرگز نہیں دوں گی' بلکہ اس لڑکی کو مار دوں گی اور فرید ان شاء اللہ کبھی ایسا نہیں کریں گے۔"

"لو میرج میں گھر والوں کو راضی کرنا بہت مشکل ہوتا ہے تو مشکلات ہوئیں تو سب کام ٹھیک ہو گیا؟"

"دونوں فیملیز کی طرف سے تھوڑی بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن ہم دونوں نے اپنی اپنی فیملی کو کنوینس کیا اور پھر ماشاء اللہ۔ آہستہ آہستہ سب کچھ ٹھیک ہوتا چلا گیا۔ ہر کام میں مائنڈ بنانے میں ٹائم تو لگتا ہی ہے۔ لیکن شکر ہے کہ سب ٹھیک ہو گیا اور سب نے خوشی خوشی شرکت کی۔ سب نے بہت انجوائے کیا اور اب پیچھے بھی میرے ساس سسر میری تعریف کر رہے ہوتے ہیں۔"

"شادی دھوم دھام سے ہوئی تھی؟ منہ دکھائی میں کیا ملا تھا اور ہنی مون کہاں منایا تھا؟"

"جی شادی دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ کیونکہ ہمارے گھر میں بہنوں میں یہ آخری شادی تھی۔ میرے بعد ایک چھوٹا بھائی ہے۔ ہم چار بہنیں اور دو بھائی ہیں جبکہ فرید کی دو بہنیں اور دو بھائی ہیں۔ منہ دکھائی میں فرید نے گولڈ کی رنگ دی تھی اور ہنی مون

یورپ اور اپنے ملک کے ناردرن ایریاز گئے تھے۔

"رخصتی کے وقت اور نکاح کے وقت کیا احساسات تھے تمہارے اُداس تھیں؟"

"سچ میں وہ وقت بہت کٹھن تھا جب نکاح اور پھر رخصتی ہو رہی تھی۔ نکاح کے لیے جب قاضی صاحب آتے ہیں اور ہم نکاح نامہ پر دستخط کر رہے ہوتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ اب پرائے ہو گئے ہیں۔ بہت ہی عجیب سے احساسات تھے اور رونا بہت آیا تھا اور رخصتی کے وقت تو میں بس بے ہوش ہی ہونے والی تھی اگر فرید مجھے نہ پکڑتے تو۔"

"یوں تو فیلڈ میں ہر وقت ہی میک اپ میں رہتی ہو۔ مگر پھر بھی فرید کا کیا دل چاہتا ہے کہ کہیں باہر جائیں تو تم سادگی میں جاؤ یا خوب تیار ہو کے جاؤ؟"

"فرید کا تو دل چاہتا ہے کہ میں سو کر بھی اٹھوں تو بالکل تیار ہوں۔ فل میک اپ ہو' اچھے کپڑے ہوں' بہت سارا پرفیوم لگا ہوا' کچن میں بھی جاؤں تو تیار ہو کے جاؤں۔ بہت زیادہ رومانٹک ہیں۔ کہتے ہیں کبھی چہرہ اترا ہوا نہ دیکھوں' ہر وقت فریش نظر آؤ۔ کبھی کبھی میں چڑ بھی جاتی ہوں۔ آفس سے آؤں تو کہتے ہیں تھوڑی لپ اسٹک لگا لو تو میں کہتی ہوں کہ کیا ہو گیا ہے آپ کو ابھی تو اتنا میک اپ اتار کر آئی ہوں۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے قدر کیا کرو۔ اچھا یہ بتاؤ کہ شادیاں ہوتی ہیں' کامیاب بھی ہوتی ہیں' ناکام بھی۔ جو شادیاں ناکام ہوتی ہیں اس کی وجہ میاں' بیوی خود ہوتے ہیں یا خاندان؟"

"اصل میں دونوں فیملیز میں جو والدین ہوتے ہیں وہ اہم رول ادا کرتے ہیں۔ اگر وہ اپنے بچوں کو صحیح طرح سے لے کر چلتے ہیں' آنے والی لڑکی کو اپنی بیٹی کی طرح سمجھتے ہیں اور جس طرح اپنے بچوں کی چھوٹی باتوں کو نظر انداز کرتے ہیں۔ آنے والی کی باتوں کو بھی نظر انداز کریں۔ کیونکہ نئی آنے والی کو ایڈجسٹ ہونے میں تھوڑا ٹائم لگتا ہے اور میاں کو بھی چاہیے کہ وہ غصہ نہ کرے اور کسی بات کو انا کا مسئلہ نہ بنا لے۔ لڑکی کو بہت سمجھ داری کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ بہت نازک رشتے ہیں اور ایک منٹ میں ٹوٹ جاتے ہیں۔ سو سب کو ایک دوسرے کا احترام کرنا چاہیے۔"

"لڑکی کو روٹھ کر میکے جانا چاہیے؟ شاپنگ کے لیے آپ دونوں ساتھ جاتے ہیں؟"

"روٹھ کر جانا تو دور کی بات رہی میں تو دو' دو ڈھائی ڈھائی مہینے میکے ہی نہیں جاتی۔ ٹائم ہی نہیں ملتا اور شادی کے بعد ہم دونوں نے کوئی شاپنگ نہیں کی۔ کیونکہ شادی کی جو شاپنگ تھی ابھی وہی چل رہی ہے۔ کوئی ضرورت ہی نہیں پڑی اور جو ضرورت ہوتی ہے وہ ان کی امی پوری کر دیتی ہیں۔"

"تحفے تحائف کا تبادلہ ہوتا ہے؟ ایک دوسرے کو کس طرح بلاتے ہیں؟"

"جی۔۔۔ ذرا کم ہی ہوتا ہے۔ شادی کے فوراً بعد میری برتھ ڈے تھی تو سسرال والوں نے سیلبریٹ کی تھی اور ویلنٹائن ڈے پہ انہوں نے مجھے گفٹ دیا تھا اور فرید تو میرا نام ہی لیتے ہیں' جبکہ میں کبھی نام اور کبھی سنیے کہہ دیتی ہوں۔ ویسے نام بہت کم لیتی ہوں' مجھے شرم آتی ہے۔"

"فرید صاحب کی بری عادت تو یہ ہے کہ غصہ تیز ہے اور اچھی عادت؟"

"اچھی عادت یہ ہے کہ کچھ بھی ہو' کسی کی بھی غلطی ہو' فرید سوری کر لیتے ہیں اور صلح میں پہل بھی وہی کرتے ہیں' جبکہ مجھ میں یہ عادت ہے کہ میں پہل نہیں کرتی اور میں مانتی ہوں کہ یہ بری عادت ہے۔"

"اور پرسنل سوال کہ کمرے میں آتے ہی میاں صاحب نے کیا جملہ بولا تھا؟"

"کمرے میں تو فرید صبح سات بجے آئے تھے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ میں نے منہ دھو کر کپڑے تبدیل کر لیے تھے اور جب صبح آئے تو فیملی کے بارے میں ہی بتاتے رہے کہ ایسے رہنا ہے کسی کو کوئی تکلیف نہیں دینا' کسی کو شکایت کا موقع نہیں دینا۔ فیملی میٹرز ہی ڈسکس ہوا۔"

☆ ☆ ☆

فرید رئیس

"آپ دونوں ایک ہی فیلڈ کے ہیں اور فیلڈ میں ہی ملاقات ہوئی تو شائستہ کی کس بات نے آپ کو متاثر کیا کہ آپ نے شریک سفر بنانے کا فیصلہ کیا؟"

"شکل نے تو متاثر کیا ہی تھا اس کے علاوہ اس کے انداز گفتگو اور اس کے اخلاق نے بہت متاثر کیا تھا اور مجھے یہ سوچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ یہ میری بہترین چوائس ہے اور اسے اپنی زندگی میں شامل کیا جا سکتا ہے۔"

"گڈ۔۔۔ اب جبکہ شادی ہو گئی ہے۔ انڈر اسٹینڈنگ بھی ہو گئی ہے تو سسرال سے تعلقات کیسے ہیں۔ ویسے سسرال دور ہونا چاہیے یا نزدیک؟"

"سسرال نزدیک ہی ہونا چاہیے۔ کیونکہ شہر سے دور ہو یا شہر سے باہر ہو تو پھر آنے جانے میں بہت مشکل ہوتی ہے۔"

"داماد والے ناز نخرے اٹھواتے ہیں کیا؟"

قہقہہ "ہاں کیوں نہیں۔ جس طرح داماد کو پروٹوکول ملتا ہے' مجھے بھی ملتا ہے اور دامادوں والا رعب بھی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ میں کسی کو پریشان کرتا ہوں۔ مجھ میں بناوٹ نہیں ہے۔ میں کھلی کتاب کی طرح ہوں۔ میری جیسی شخصیت ہے وہ سب کو پتا ہے۔"

"کیا آپ شائستہ کو ایک روایتی بیوی کی طرح دیکھنا چاہتے ہیں' جو آپ کے سارے کام اپنے ہاتھوں سے کرے؟"

"اس میں بات روایتی کی نہیں ہے' اپنائیت کی ہے۔ اگر ایک بیوی آپ۔۔۔ کے سارے کام خود کرتی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اسے آپ سے محبت ہے اور آپ کو سمجھتی ہے اور آپ کا خیال رکھتی ہے۔ تو مجھے تو بہت اچھا لگتا ہے جب شائستہ میرا خیال رکھتی ہے۔"

"شائستہ سگھڑ بیوی ہے؟ اور گھر میں کھانا کھانا زیادہ

پسند کرتے ہیں یا گھر سے باہر؟"

"شائستہ بہت سگھڑ ہے اور بہت اچھا کھانا پکاتی ہے اور باہر کھانا بھی اچھا لگتا ہے۔ مگر اب وقت اور حالات ایسے نہیں ہیں۔ باہر کھانا کھاتے ہوئے کافی ٹائم ہو جاتا ہے۔ دیر سے گھر آنے کے بعد پھر کہیں جانے کا موڈ بھی نہیں ہوتا اور پھر سب کے ساتھ کھانا کھانا بہت اچھا لگتا ہے۔"

"شائستہ بتا رہی ہیں کہ غصہ ان کا بھی تیز ہے تو آپ بتائیے کہ غصے میں کیا کیفیت ہوتی ہے شائستہ کی توڑ پھوڑ یا پھر دل کی بھڑاس نکالنا!"

"نہ توڑ پھوڑ نہ بھڑاس' بلکہ خاموش ہو جاتی ہیں۔ نہ کوئی بحث مباحثہ' ہاں کوئی بہت زیادہ بات ہو جائے تو پھر تھوڑی بحث ہو جاتی ہے ورنہ نہیں۔"

"شاپنگ کے لیے تو دونوں ساتھ ہی جاتے ہوں گے تو لوگ پہچان کر پریشان تو کرتے ہوں گے؟"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ ملتے ہیں۔ محبت سے بات کرتے ہیں اور اس میں حرج ہی کیا ہے اور اول تو شاپنگ کے لیے یا کہیں گھومنے پھرنے کے لیے ٹائم ہی کہاں ملتا ہے اور اگر ۲، جائے اور لوگ بات کرنا

چاہتے ہیں تو مجھے بُرا نہیں لگتا۔"

"آپ چاہیں گے کہ شائستہ جاب جاری رکھیں یا آپ چاہیں گے کہ ہاؤس وائف کی طرح گھر پر رہیں؟"

"فی الحال تو گھر والوں کی طرف سے اور میری طرف سے کوئی پابندی نہیں ہے۔ لیکن آنے والے دنوں میں اگر محسوس ہو گا کہ اب جاب نہیں کرنی چاہیے تو میرا خیال ہے کہ وہ خود ہی سمجھ لے گی کہ کرنی چاہیے کہ نہیں۔"

"فضول خرچ کون ہے؟ اور ایک اچھی زندگی گزارنے کے لیے پیسہ کتنا ضروری ہے اور محبت کتنی ضروری ہے؟"

"ہم دونوں ہی فضول خرچ نہیں ہیں اور پیسہ تو ضروری ہے ہی مگر محبت بھی ضروری ہے کیونکہ اگر محبت نہیں تو پھر کچھ بھی نہیں۔"

"شائستہ کی اچھی اور بُری عادت بتائیں؟"

"بُری عادت تو بالکل بھی نہیں بتاؤں گا کیونکہ ہمیشہ پوزیٹو سوچ رکھنی چاہیے اور انسان کے اندر بہت سی برائیاں ہوتی ہیں مگر اللہ بھی اس کو چھپاتا ہے تو پھر انسان کو بھی یہی کام کرنا چاہیے۔ اور اچھی عادت یہ ہے کہ بہت زیادہ خیال رکھتی ہے سب کا۔"

"اور اس انٹرویو کے ذریعے کوئی ایسی بات جو آپ شائستہ سے کہنا چاہتے ہوں؟"

قہقہہ "بھئی اگر کہنا بھی ہو گا تو انٹرویو کے ذریعے سے کیوں کہوں گا میں ویسے بھی تو کہہ سکتا ہوں۔ فیس ٹو فیس کہی جانے والی بات زیادہ پر اثر ہوتی ہے۔ میں قطعاً انٹرویو کا سہارا نہیں لوں گا۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے شائستہ سے ایک آخری سوال کیا کہ آپ کچھ کہنا چاہیں گی کہ لو میرج بہتر ہوتی ہے یا ارینج میرج؟"

"یہ کوئی پیمانہ نہیں ہے کہ کون سی بہتر ہوتی ہے کون سی نہیں۔ دونوں شادیوں میں دونوں کو بہتر بنانے کی کوشش ہونی چاہیے اگر لو میرج ہے تب بھی لڑکی کا اہم کردار ہے اور اگر ارینج ہے تب بھی لڑکی کا اہم رول ہے کیونکہ اسے اپنے آپ کو نئے ماحول میں ڈھالنا ہوتا ہے۔ اگر کوئی یہ سوچے کہ میں لوگوں کو چینج کر لوں تو یہ پھر غلط ہو گا۔ اگر شادی کو کامیاب بنانا ہے تو پھر لڑکی کو قربانی دینی ہو گی۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے اس جوڑے سے اجازت چاہی۔

دستک دستک دستک

شاہین رشید

علی گل پیر

"کیا حال ہیں۔ اور آج کل کیا ہو رہا ہے؟"

"جی اللہ کا شکر ہے۔ آج کل ———— کئی پروجیکٹس پہ کام ہو رہا ہے اور ساتھ ہی انٹرنیٹ شو "وائرل سائیں" پہ بھی کام ہو رہا ہے۔"

"یہ وائرل سائیں کیا ہے؟"

"اس میں پورے پاکستان کے ٹیلنٹڈ لوگوں کے آڈیشن ہوں گے اور پھر تین سنگرز کو منتخب کیا جائے گا اور پھر ان کے گانوں کے ویڈیوز انٹرنیٹ پر ہی ریلیز کیے جائیں گے۔"

"اور فیوچر میں کیا کیا کرنے کا ارادہ ہے؟"

"بہت کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ بہت پلان ہیں میرے ذہن میں۔ میں انٹرنیٹ انڈسٹری قائم کرنا چاہتا ہوں جو ٹی وی انڈسٹری کی طرح ہی ہو گی۔ اس کے تحت کافی پروگرامز کرنا چاہتا ہوں۔ آج کل وائرل شو کی تیاری ہے۔ پھر ان شاء اللہ انٹرنیٹ پر ہی کوکنگ شو اور دیگر شوز کرنے کا بھی ارادہ ہے۔ بس اللہ تعالیٰ کامیاب کرے۔"

"آپ کے اب تک چار گانے ریلیز ہو چکے ہیں۔ سب میں کچھ نہ کچھ پیغام ہوتا ہے۔ لوگوں پر اثر ہوتا ہے؟"

"دیکھیں، لوگ میری چیزوں کو دیکھتے بھی ہیں اور سنتے بھی ہیں۔ کئی لوگوں کو ان میں اپنا عکس نظر بھی آتا ہو گا اور اگر واقعی کسی کو اپنا عکس نظر آتا ہے تو سمجھیے کہ میری بات اس تک پہنچ گئی ہے۔ "وڈیرے کا بیٹا" تو خیر ریکارڈ توڑ مقبول ہوا۔ "نارو ماشو" کو بھی کافی پذیرائی ملی۔ اسی طرح الیکشن کے حوالے سے جو گانا تھا وہ بھی کافی مقبول ہوا تھا۔"

"علی! آپ کے کافی رشتے دار سیاست سے وابستہ ہیں۔ پیر مظہر الحق تو آپ کے تایا ہیں۔ کبھی دل چاہا کہ سیاست میں آؤں اور کوئی بڑا عہدہ حاصل کروں؟"

"مجھے بچپن میں سیاست بہت اچھی لگتی تھی۔ بچپن سے مراد جب میں تھوڑا سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا۔ کیونکہ میں نے اپنی فیملی میں سیاست دیکھی تھی لیکن جب اپنے ہوش میں 2007ء کے الیکشن میں جھوٹ اور دھاندلی دیکھی تو میرا تو سیاست سے ہی دل اُچاٹ ہو گیا۔ اچاٹ کیا بلکہ یہ سمجھیں کہ سیاست

سے ہی نفرت ہو گئی۔ پھر ہمارے ملک میں کرپشن اتنی زیادہ ہے کہ سب دیکھ کر بہت دکھ ہوتا ہے۔ اصل مجرم پکڑے نہیں جاتے۔ کمزوروں پر ہاتھ صاف کیے جاتے ہیں۔"

"ملک کے حالات سے مایوس ہیں؟"

"نہیں' مایوس تو نہیں ہوں۔ کیونکہ امید کا دامن تو کبھی بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ بے شک آج ملک کے حالات اچھے نہیں ہیں لیکن امید ابھی بھی ہے اور کبھی کبھی تو یقین بھی ہوتا ہے کہ ایک دن ہمارے ملک کے حالات بہت اچھے ہو جائیں گے۔" اِن شاءاللہ۔ کبھی مایوس ہو کر دل چاہا کہ پاکستان چھوڑ دوں۔ کیونکہ تم تو اب —— عالمگیر شہرت رکھتے ہو؟"

"نہیں' نہیں۔ پاکستان کو چھوڑنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تو کوئی بات ہی نہیں کہ مشکل وقت میں اپنے ملک کو چھوڑ دیں۔ میں نے کہیں نہیں جانا ہے۔ میرے نزدیک پاکستان سے بہتر کوئی ملک نہیں ہے۔"

"تو جوان ہو' غصہ تو آتا ہو گا؟"

"جی بالکل آتا ہے۔ لیکن کنٹرول کرنے کی کوشش کرتا ہوں اور گھر سے باہر کہیں چلا جاتا ہوں۔ کیونکہ میں نے بہت سے لوگوں کو غصے میں بہت غلط باتیں کرتے ہوئے بھی سنا ہے۔ تو وہی بات کہ وقت گزر جاتا ہے۔ مگر باتیں یاد رہ جاتی ہیں۔ اس لیے بہت ضروری ہے کہ غصے میں اپنے آپ پر قابو رکھا جائے۔"

"شہرت کے بعد دوستوں کا حلقہ وسیع ہوا یا کم؟"

"بہت وسیع ہوا ہے۔ فیس بک کے ذریعے سے بھی۔ ملنے ملانے کے ذریعے سے بھی۔ جو بہت قریب تھے وہ تو ہیں ہی۔"

"عموماً لوگ ملتے ہیں تو کیا کہتے ہیں؟"

"بہت خوش ہوتے ہیں۔ پرائے لوگ تعریف کرتے ہیں اور قریبی لوگ بے ساختہ کہتے ہیں۔ "یار! تو بہت بدل گیا ہے۔" تو شہرت ملنے پر ہم تبدیل ہوں یا نہ ہوں لوگوں کے رویے ضرور تبدیل ہو جاتے ہیں اور پھر الٹا ہم سے ہی کہا جا رہا ہوتا ہے کہ تم بدل ہو گئے ہو۔"

"ملک کی بات ہے ایک بات کا جواب دو۔ کبھی سی این جی کی لائن میں لگے؟ اکثر لوگ کہتے ہیں ہمیں تو پتا ہی نہیں۔ ہمارا تو ڈرائیور جاتا ہے؟"

"میں ایسا نہیں کہوں گا کیونکہ میں خود لائن میں لگتا ہوں اور آپ بھی کی بات کر رہی ہیں۔ میں اکثر لائن میں کھڑا ہوتا ہوں اور بڑی سنجیدگی کے ساتھ اپنی باری کا انتظار کرتا ہوں۔"

"لوگوں کو جج کرنے کا ہنر آتا ہے؟"

"آتا ہے۔ اکثر لوگوں کو جج کرتا ہوں۔ جو اندازے لگاتا ہوں وہ عموماً" درست بھی ہوتے ہیں۔ لیکن کوئی کہے کہ ایک ملاقات میں جج کر لیتا ہوں تو وہ بات غلط ہے۔ کوئی بھی انسان ایک ملاقات میں سمجھ میں نہیں آتا۔"

"آج کل فارغ اوقات میں کیا کرتے ہیں؟"

"فارغ اوقات تو کم ہی ملتے ہیں اور مجھے خود بھی ہر وقت کام کرتے رہنا اور مصروف رہنا بہت اچھا لگتا ہے۔ آج کل فاطمہ جناح اسکول میں ورکشاپ اٹینڈ کرتا ہوں اور بچوں کو اداکاری سکھاتا ہوں۔ سچ پوچھیے تو بچوں کے ساتھ بہت مزا آتا ہے۔ کیونکہ بچے بہت ذہین ہوتے ہیں۔ بہت مزا آتا ہے اس کام میں۔"

"کیا کر گزرنے کی خواہش ہے؟"

"اپنے ملک کو بدل دینے کی خواہش ہے۔ خواہش ہے کہ ملک سے دہشت گردی ختم ہو جائے۔ خواہش ہے کہ ملک خوش حال ہو جائے اور ملک میں کوئی بے روزگار نہ رہے کوئی ان پڑھ نہ رہے۔"

انجلین ملک

"کیسے مزاج ہیں؟"

"جی۔ اللہ کا شکر ہے' آپ سنائیں۔"

"آپ کا ڈرامہ سیریز "کتنی گرہیں باقی ہیں" میں اکثر ڈرامے بہت عمدہ ہوتے ہیں۔"

"شکریہ۔ لیکن اکثر کیوں کہا۔ سارے اچھے نہیں ہوتے کیا؟"

"کیونکہ میں اکثر دیکھتی ہوں۔"

"اوہ۔" قہقہہ۔

"ابتدا آپ نے ماڈلنگ سے کی۔ پھر ماڈلنگ چھوڑ کیوں دی؟"

"ویڈیو ماڈلنگ کی تھی۔ علی عظمت اور علی حیدر کے گانوں پر۔ ویسے تو ایسی کوئی خاص ماڈلنگ نہیں کی۔"

"آپ کو بہترین ڈائریکٹر کا ایوارڈ بھی مل چکا ہے؟"

"جی مل چکا ہے اور یہ "لکس اسٹائل ایوارڈ" تھا جو مجھے 2006ء میں ملا تھا۔"

"آپ خود ڈائریکٹر اور پروڈیوسر ہیں اور آج کل بے شمار ڈرامے بن رہے ہیں۔ کیا کہیں گی اس کے بارے میں؟"

"ہاں جی ڈرامے تو آج کل واقعی بہت بن رہے ہیں اور ایسا نہیں ہے کہ سب بہت کامیاب ہیں اور ایسا بھی نہیں ہے کہ سب بہت ناکام ہیں۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ ہمارا ڈرامہ بہتری کی طرف جا رہا ہے۔ بلکہ کئی ڈرامے تو بہت زبردست قسم کے تھے۔ یہاں میں ایک بات اور بھی کہنا چاہوں گی کہ اب اس فیلڈ میں اگر نیا ٹیلنٹ سامنے آ رہا ہے تو وہ باصلاحیت ہونے کے ساتھ ساتھ پڑھا لکھا بھی ہے۔ خواہ وہ ڈائریکٹر ہوں۔ پروڈیوسر ہوں یا پھر فنکار ہوں۔"

"آپ اب تک کیا کیا کر چکی ہیں؟"

"میں کافی کام کر چکی ہوں۔ کیونکہ کافی سالوں سے اس فیلڈ میں ہوں۔ پروڈکشن' ڈائریکشن اور اداکاری سب میرے شوق ہیں اور یوں تو لسٹ کافی لمبی ہے۔ مگر کچھ کے نام بتا دیتی ہوں۔ "کتنی گرہیں باقی ہیں" تو آپ دیکھتی ہی رہتی ہیں۔ "سسرال کے رنگ انوکھے" بھی کیا ڈراموں میں بھی کام کیا۔ جن میں "دل

دریا ولیئر کا حاصل' ریشماں تو جلی ہے' ستم گر صحرا اور سمندر' تیرے لب کو کوئی زباں ملے' چنگاری' رانی اور کافی اور بھی ہیں۔"

"آپ کافی جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ شہرت پانا آپ کا خواب تھا یا پیسہ کمانا؟"

"نہ شہرت کمانا خواب تھا نہ پیسہ کمانا خواب تھا۔ کام کا جنون تھا اور کام کے جنون نے ہی مجھے یہ مقام بخشا اور جب ہم جنون کے ساتھ کام کریں تو پھر اللہ تعالیٰ اپنی رحمتیں نچھاور کر دیتا ہے۔"

"کچھ اپنے بارے میں بتائیں؟"

"میں 24 جون کو اسلام آباد میں پیدا ہوئی اور ابتدائی تعلیم بھی اسلام آباد سے ہی حاصل کی اور پھر مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے لندن چلی گئی جہاں کی میٹرو پولیٹن یونیورسٹی کمپیوٹر انیمیشن میں ماسٹرز ڈگری حاصل کی اور ہم چار بہن بھائی ہیں۔"

"ویسے بننا کیا چاہتی تھیں۔ کیونکہ ہمارا بچپن تو چند مخصوص پروفیشن کی گردان سنتے ہی گزرتا ہے؟"

"جی بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔ اور ان آوازوں

میں پھر انہی پروفیشن میں کچھ نہ کچھ بننے کو دل بھی چاہتا ہے تو میں بھی ڈاکٹر بننا چاہتی تھی مگر ڈاکٹر بننے کے خواب کب سب کے پورے ہوتے ہیں۔"

"افسوس ہوتا ہے یا اپنے پروفیشن میں خوش ہیں؟"

"بہت خوش ہوں اپنے پروفیشن میں اور اللہ اپنے بندوں کے لیے جو کرتا ہے اچھا ہی کرتا ہے۔ کیونکہ مجھے اس پروفیشن میں اللہ نے مجھے بہت کامیابیاں عطا کی ہیں۔"

"اپنی اچھی عادت بتائیں؟"

"کچھ لوگ اسے بُری عادت بھی کہتے ہیں، مگر میں اسے اپنی اچھی عادت ہی کہوں گی کہ میں، جس کام میں لگ جاؤں، پھر اسے مکمل کرکے ہی رہتی ہوں۔ اسے آپ میری ضد کہہ لیں یا میرا جنون۔"

طاہر کاظمی

"جی کیا حال ہیں؟"

"آپ سنائیں۔"

"اللہ کا شکر ہے۔ روزے کیسے گزر رہے ہیں؟"

"الحمدللہ بہت اچھے۔"

"کچھ یاد ہے پہلا روزہ کتنی عمر میں رکھا تھا؟"

"عمر تو یاد نہیں، لیکن چھوٹی عمر میں ہی رکھا تھا اور مجھے یاد ہے کہ وہ سردیوں کے مہینے تھے اور ٹائم گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا تھا اور چونکہ پہلا روزہ تھا تو گھر والوں نے خوب اہتمام کیا تھا اور تحائف بھی کافی ملے تھے۔ بڑا اچھا وقت تھا جو بڑی جلدی گزر گیا۔"

"اچھا وقت عموماً" جلدی ہی گزر جاتا ہے۔ تہوار منانا کیسا لگتا ہے؟ اہتمام کرتے ہیں؟"

"تہوار منانا اچھا لگتا ہے۔ خاص طور پر مذہبی تہوار تو بہت ہی ذوق و شوق سے مناتا ہوں۔ عیدیں دونوں اچھی لگتی ہیں جہاں تک اہتمام کی بات ہے تو اب ہم بڑے ہوگئے ہیں۔ پہلے ہمارے والدین اپنے بچوں کے لیے اہتمام کیا کرتے تھے اور اب ہم اپنے بچوں کے لیے اہتمام کرتے ہیں۔"

"اسی کو تو دنیا کہتے ہیں۔ بچپن سے کیسے رہے۔ فضول خرچ یا کفایت شعار؟"

"بچپن سے ہی شوقین ہوں خرچ کرنے کا۔ جو

عیدی ملتی تھی وہ بھی خرچ کر دیتا تھا۔ مجھے خرچ کرنے میں مزا آتا ہے۔ کیونکہ بندہ کماتا کس لیے ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ بچت نہیں کرتا۔ مجھے بچت کی بہت عادت ہے۔"

"آج کل آپ کا سوپ "مینو کا سسرال" دیکھ رہے ہیں۔ اس کے علاوہ کیا کیا کر رہے ہیں؟"

"اور بھی دو، چار پروجیکٹس ہیں جن پر کام ہو رہا ہے۔ کچھ تکمیل کے مراحل میں ہیں۔ کچھ شروع ہونے والے ہیں اور کچھ مکمل ہوگئے ہیں۔ بس آن ایر کا انتظار ہے۔"

"کہتے ہیں کہ پہلا عشق، پہلی کمائی اور کوئی بھی کام جو پہلی بار کیا ہو وہ انسان کبھی نہیں بھولتا۔"

قہقہہ۔ "بہت خوب، پہلی کمائی تو پینتیس ہزار تھی جو کہ اپنے پہلے سیریل "ٹیپو سلطان" سے کمائے تھے۔ تو نہ "ٹیپو سلطان" کو بھول سکتا ہوں اور نہ ہی پہلی کمائی کو بھول سکتا ہوں۔"

"کیا کیا تھا پینتیس ہزار کا۔ کیونکہ کچھ سال پہلے تو 35 ہزار بہت بڑی رقم ہوتی تھی؟"

"اپنی والدہ کے ہاتھ میں دے دیے تھے کہ آپ کا جہاں دل چاہے آپ خرچ کریں۔"

"ایک زمانے میں پی ٹی وی کا بڑا چرچا تھا۔ ڈرامے بھی بہت عمدہ ہوا کرتے تھے اور شہرت بھی راتوں رات مل جایا کرتی تھی۔ "ٹیپو سلطان" نے بھی شہرت تو بہت دی ہوگی؟"

"بہت زیادہ شہرت ملی تھی اور میں اچانک ہی ایک عام آدمی سے خاص آدمی بن گیا تھا۔ ہر طرف سے مبارک باد اور تعریف۔ بہت خوب صورت وقت تھا۔ کبھی نہیں بھول سکتا اور ویسے بھی اس سیریل کو نہیں بھول سکتا کہ اس میں، میں نے ایک ایسی شخصیت کا رول کیا تھا جسے سب مانتے اور جانتے ہیں۔ "ٹیپو سلطان" ایک تاریخی شخصیت ہیں ہمارے لیے۔"

"فارغ اوقات میں کیا کرتے ہیں؟"

" زیادہ سے زیادہ وقت اپنی فیملی کے ساتھ گزارتا ہوں، کیونکہ فیملی کے ساتھ وقت گزارنا اچھا لگتا ہے۔"

☆

پھولوں کے سلسلے کئی سال گزر گئے

ادارہ

دل میں پھول کھلا دیتے ہیں
لوگ محبت کرنے والے
خواب خوشی کے بو جاتے ہیں
لوگ محبت کرنے والے
ایک دن خوشبو ہو جاتے ہیں
لوگ محبت کرنے والے

شب و روز کے تسلسل میں وقت آگے بڑھتا جاتا ہے۔ وقت کے اس سمندر میں کچھ لمحے جگمگاتے ہیں' وہ لمحے جب تعبیروں میں ڈھلتے ہیں' جب محبتیں امر ہوتی ہیں اور جب روشن شعاعیں مجسم ہو کر سامنے آتی ہیں۔ شعاع کا اجرا بھی ایسے ہی روشن خوابوں کی تعبیر ہے۔

28 سال پہلے شعاع کا پہلا شمارہ آیا تھا۔ سالوں کی گنتی کریں تو لگتا ہے کہ ایک طویل وقت گزر گیا ہے لیکن سوچنے بیٹھیں تو کل کی بات لگتی ہے۔ آج بھی وہ خوبصورت دن یادوں کے افق پر تابندہ ہیں' جب پوری محنت اور لگن کے ساتھ شعاع کے لیے تحریروں کا انتخاب کیا تھا اس کے سلسلے ترتیب دیے تھے اور وہ دن جب دھڑکتے دل کے ساتھ اس کا پہلا شمارہ ہاتھ میں تھاما تھا اور قارئین نے بڑی محبتوں کے ساتھ پذیرائی کی تھی۔

آج بھی ہمارے دل میں وہی جوش و جذبہ ہے۔ شعاع کو نکھارنے' سنوارنے اور خوب تر بنانے کی وہی لگن ہے اور روز اول کی طرح قارئین کی محبتیں بھی ہمارے ساتھ ہیں۔

حسب روایت سالگرہ نمبر میں قارئین کی شمولیت کے لیے سروے شامل ہے۔ اس بار سالگرہ نمبر عید الفطر کے ساتھ آرہا ہے۔ اس لیے سروے میں دو سوال عید الفطر کے حوالے سے کیے گئے ہیں۔

1 رمضان المبارک میں روز مرہ کے معمولات تبدیل ہو جاتے ہیں عبادت' گھر کے کام اور دیگر ذمہ داریاں۔ رمضان میں یہ سب آپ کیسے نبھاتی ہیں؟ رمضان المبارک کی خصوصی عبادات میں کبھی اپنے قلب میں کوئی تبدیلی محسوس کی؟

2 آپ عید کیسے مناتی ہیں؟

ہماری مصنفین جن کے قلم سے پھول کھلتے ہیں' احساس سنورتا ہے' سوچ و فکر نکھرتی ہے' جو جذبوں کو زبان دیتی ہیں اور اپنے لفظوں سے ذہنوں کو مہکا دیتی ہیں۔ سروے کا تیسرا سوال مصنفین کے حوالے سے ہے۔

3 اس سال آپ نے شعاع میں بہت سی تحریریں پڑھی ہیں۔ اگر ان کی مصنفین سے آپ کی ملاقات ہو تو آپ ان تحریروں کے بارے میں کیا کہیں گی۔ کوئی شکوہ شکایت کوئی فرمائش یا تعریف و ستائش؟

آیئے دیکھتے ہیں ہماری قارئین نے کیا جواب دیے ہیں۔

غزالہ کنول۔ گوجرانوالہ

جی ہاں رمضان میں روز مرہ کے معمولات تبدیل تو ہو جاتے ہیں لیکن ہماری فیملی چھوٹی ہے لہٰذا زیادہ کام تو نہیں ہوتا۔ رمضان کی پہلی تراویح کے فوراً بعد ہی ہم سحری کے لیے کھانا بنا کر رکھ لیتے ہیں۔ سحری کرنے کے بعد فجر کی نماز ادا کر کے قرآن پاک کی تلاوت کرتی ہوں۔ ساتھ ساتھ رمضان میں وظائف بھی چلتے ہیں۔

اس کے بعد تھوڑی دیر سو جاتی ہوں۔ نو بجے اٹھ کر چند معمول کے کام کر کے بارہ بجے ہی کھانا بنا لیتی ہوں پھر ظہر عصر کے وقت بالکل فراغت ہوتی ہے۔ عصر کی نماز کے بعد پھر قرآن پاک کی تلاوت کا ٹائم مل جاتا ہے اور پھر افطاری کی تیاری شروع کر دیتی ہوں۔ ہم گھر کی افطاری زیادہ پسند کرتے ہیں مثلاً "دہی بھلے' آلو کے چپس' پکوڑے' چائنیز رول حتیٰ کہ سموسے بھی گھر پر بنائے جاتے ہیں۔ پھر افطاری کے بعد تراویح اور عشاء کی نماز پڑھ کر جلدی سو جاتے ہیں۔ اس طرح روز مرہ کے کام اور عبادت ساتھ ساتھ چلتی ہے۔

رمضان کا بابرکت مہینہ جیسے ہی ہم پر سایہ فگن ہوتا ہے۔ پہلی تراویح کے ساتھ ہی مجھے اپنے قلب میں ہمیشہ ایک تبدیلی کا احساس ہوتا ہے۔ ادھر رمضان کا چاند نکلا ادھر میری آنکھیں پانیوں سے بھر جاتی ہیں اس احساس سے کہ یہ ہے رحمتوں کا وہ مہینہ جب اللہ تعالیٰ ہر ایک کی توبہ قبول فرماتا ہے اور اس ماہ کسی کی کوئی دعا رد نہیں ہوتی خاص کر روزہ دار کی۔

2005 کے ماہ رمضان میں' میں نے دو مرتبہ قرآن پاک ختم کیا۔ تب مجھے اپنے اندر بہت سی روحانی تبدیلیاں محسوس ہوئیں اور پھر 2006ء میرے لیے گولڈن ایئر تھا اور اللہ تعالیٰ نے میری ہر دعا قبول فرمائی اور مجھے ڈھیروں خوشیاں دیں۔

صاحب عقل ہو ایک مسئلہ تو بتاؤ!
ہم نے رخ یار نہیں دیکھا کیا ہماری عید ہوگی؟

جی جناب! عید تو جب ہوا کرتی تھی جب ہم سب سکھیاں ساتھ ہوا کرتی تھیں۔ ہم سب ایک دوسرے کے گھر عید کا تحفہ لے کر جایا کرتے تھے اور افطاری بھی وہیں کرتے تھے۔ عید کارڈز کے تبادلے ہوا کرتے تھے حتیٰ کہ اسکول و کالج میں ٹیچرز کو بھی عید کارڈز دیا کرتے تھے۔ اب تو سب دوستوں کی شادیاں ہو گئیں تو دو' تین سال سے عید کا اب وہ مزا نہیں رہا۔ ورنہ ہم تو عید سے پہلے ہی عید کی خوشیاں منانا شروع کر دیتے تھے۔ ایم اے کی کلاس میں جو نیئرز اپنے سینئرز کو "عید ملن پارٹی" دیا کرتے تھے تو بھی عید کی خوشیاں

دوبالا ہو جاتی تھیں۔ اب تو عید والے دن بھی عید کا احساس نہیں ہوتا کہ عید والے دن اپنی دوستوں سے ملاقات بھی نہیں ہو پاتی کہ شاید ہم سب کے سسرال والے پسند نہ کریں۔ ہاں البتہ اب سال میں دو تین دفعہ کبھی کبھار سب سہیلیاں مل لیتی ہیں۔

دوسری خوشی عید کارڈز کی ہوتی تھی مگر اب یہ خوبصورت روایت بھی دم توڑتی جارہی ہے۔ اب تو بس ادھر چاند نظر آیا ادھر سب کو ایس ایم ایس کردیئے۔ جو حقیقی خوشیاں ہوا کرتی تھیں اب وہ ناپید ہو چکی ہیں۔

اب عید بالکل سادہ انداز سے مناتی ہوں۔ نئے کپڑے بنا تو لیتی ہوں مگر گھر کے کام کرنے کے بعد پہنوں تو زیادہ اچھا لگتا ہے۔ پھر سارا دن تیار ہو کے بس مہمانوں سے ملنا ملانا ہوتا ہے۔ مہندی اور چوڑیاں پہلے بھی اچھی لگتی تھیں، اب بھی لگتی ہیں مگر پہلے جو کشش ان میں محسوس ہوتی تھی۔ اب تو وہ عیدیں خواب ہوئیں۔ اپنی دوستوں سے کہوں گی۔

چلو عہد محبت کی ذرا تجدید کرتے ہیں
چلو تم چاند بن جاؤ ہم پھر سے عید کرتے ہیں

3۔ "اگر نمرہ احمد ملیں تو ان سے سوال کروں گی کہ آپ کی ہیروئن اتنی مہم جو کیسے ہوتی ہے؟ اس ماحول اور اس معاشرے میں ایک لڑکی کے لیے تو ایسی کوئی گنجائش نہیں کہ وہ اتنی بولڈنیس کا مظاہرہ کرے۔ کیا آپ بھی اتنی بہادر ہیں؟

آسیہ رزاقی سے سوال ہے کہ آپ کے ناول، ناولٹ تو سب زبردست ہوتے ہیں۔ عورت کو جینے کے کئی گر سکھاتے ہیں۔ مگر کیا آپ کے ناول کی ہیروئن ضرورت سے زیادہ مظلوم اور معصوم نہیں ہوتی؟ جبکہ موجودہ زمانے میں زمانے کے ساتھ چلنے اور بچوں کی اچھی تربیت کرنے کے لیے تھوڑی بہت تیزی ہونی چاہیے۔

سائرہ رضا کی تعریف نہ کرنا بھی زیادتی ہوگی۔ انہوں نے ہمیشہ الگ ہی موضوع پر لکھا اور بہت اچھا لکھا۔ اس سال ستمبر 2012ء کے شعاع میں سائرہ جی نے مکمل ناول "دل موم کا دیا" لکھا اور بہت اچھا لکھا "الفت" کا کردار ناقابل فراموش ہے۔ "الفت" کے کردار کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے کن لوگوں کے بارے میں کہا ہے کہ ہم نے ان کے دلوں پر مہر لگادی ہے۔

سلویٰ علی بٹ بھی شعاع میں ایک نیا اضافہ ہیں۔ 2011 میں ان کا ناول "دل کے رستے دشوار بہت تھے" بہت زبردست رہا تو اس سال ان کے افسانے "سبق ظرف" اور سلائی مشین" بہت خوب تھے۔ سلویٰ جی نے ہمیشہ مثبت پیغام دیا۔

نعیمہ ناز "ہم کیوں ملے" بہت خوب لکھا۔ اسلم نے فیصلہ تو درست کیا مگر اسلم سے شکایت ہے کہ اس نے اپنی بچپن کی منگیتر کا احساس کیوں نہیں کیا؟ اور نعیمہ جی! آپ سے سوال ہے کہ پہلے تو رامین شادی کے لیے مان نہیں رہی تھی اور آخر میں اچانک کیسے مان گئی۔ آپ نے کچھ تو بتایا ہوتا کہ کس "وجہ" سے اچانک وہ مان گئی۔ باقی آپ سے کہنا ہے "ویلڈن"

ثانیہ مشعل اشرف۔ ضلع اوکاڑہ

1 رمضان میں روزمرہ کے معمولات واقعی تبدیل ہو جاتے ہیں اور چونکہ میں گھر میں سب سے بڑی ہوں اس لیے ذمہ داریاں بھی ہیں۔ ایسے میں میری کوشش ہوتی ہے کہ امی کے ساتھ مل کر گھر کے سارے کام صبح سویرے ہی نبٹالوں تاکہ عبادت کے لیے زیادہ سے زیادہ وقت مل سکے۔ افطاری پر عام طور پر کبھی خاص اہتمام نہیں کیا سکنجبین۔ فروٹ چاٹ یا کبھی کبھار پکوڑے۔ بس اس سے زیادہ اہتمام مجھے پسند نہیں ہے۔

رمضان کی عبادات میرے دل کو پرسکون کردیتی ہیں۔ بالکل ہلکا پھلکا۔

2 عید خوشیوں کا نام ہے اور عید کا دن خوشی کا دن۔ مگر میرا سارا دن بڑا ہی اداس گزرتا ہے۔ کوئی ملنا نہ ملانا، نہ کہیں آنا نہ جانا، نہ کزنز سے میل ملاپ نہ کوئی مستی نہ شور شرابا۔ بندہ کب تک درودیوار کو دیکھ سکتا ہے یا سو جاؤ یا رو لو۔ بس۔

ہر چھوٹے بڑے نے اپنے گرد انا اور اجنبیت کی اس قدر بلند دیواریں بنا رکھی ہیں کہ یہاں محبت، خلوص اور چاہت کا سانس لینا بھی محال ہے ایسے میں بندہ اداس نہ ہو تو کیا کرے؟؟ حفصہ اور آمنہ کے گھر کسی بچے کو بھیج کر وش کردیتی ہوں اور باقی ساری دوستوں کو عید کے بعد۔ کیونکہ عید کے دن ابا حضور اپنے دوستوں اور خاندان کے بڑے بوڑھوں سے عید ملنے جاتے ہیں اور اپنی شاندار روایت کو برقرار رکھتے ہوئے جب شام کو تشریف لاتے ہیں تو موبائل میں مس بیل کے لیے بھی بیلنس نہیں ہوتا۔

3 تیسرا سوال انتہائی اچھا لگا۔

اگر سائرہ رضا جی سے میری ملاقات ہو تو میں ان سے صرف ایک سوال کروں گی کہ ان کے ناول "دل موم کا دیا" کی الفت ایسی کیوں تھی؟

نایاب جیلانی، تنزیلہ ریاض سے ملی تو ان سے شکوہ کروں گی کہ آپ ہماری پکار نہیں سنتیں؟ اگر کوئی بہت محبت سے پکارے تو لوٹنا تو چاہیے نا؟

فرحت اشتیاق، عمیرہ احمد اور نمرہ احمد سے ملے

لمبے ناولز کی فرمائش کروں گی۔

نازیہ اظہر۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ

1۔ 2012ء سے پہلے تک میرے روز و شب بھی رمضان المبارک کے شروع ہوتے ہی گھر کے کاموں کی ترتیب بدل جانے سحری و افطاری کا اہتمام کرنے تک ہی محدود ہوا کرتے تھے۔ لیکن اللہ پاک نے اپنا خاص لطف و کرم کرتے ہوئے اپنا مہمان بننے کی سعادت نصیب کی۔

وہاں گزرے ہوئے روزے میرے ساتھ اس طرح منسلک ہو گئے ہیں کہ اب اس رمضان میں میں اٹھتے بیٹھتے ہر ہر گھڑی وہ لمحے شدت سے یاد کر رہی ہوں کبھی وہ خانہ کعبہ پر پڑنے والی پہلی نظر جب آپ کا پورا جسم کانپتے ہوئے چشم کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ پوری زندگی کا حاصل لگتی ہے یا پھر روزے کی حالت میں خانہ کعبہ کو چھونا اور حجر اسود کو بوسہ دینا پوری دنیا کی دولت ملنے سے بڑھ کر ہے۔ یقین جانیے وہ کوئی اور ہی دنیا ہے۔ کوئی اور ہی ماحول ہے۔ پر امن مکمل وہاں انسان کی ذات حقیقتاً "ایک بے وقعت ذرے سے بڑھ کر نہیں۔ ہر نسل ہر ملک کے لوگ ایک دوسرے سے بے خبر روزے کی حالت میں سخت گرمی سے بے پروا طواف کرنے میں مگن پیشانیوں پر عرق ندامت اور آنکھوں میں آنسو اور اپنے رب لاشریک کو منانے کی دھن۔

کبھی وہ مسجد نبویؐ کے احاطے میں بچھے افطاری کے دسترخوان جو ہر روزہ دار کے لیے دو کھجوروں "آب زم زم ایک چھوٹے سے بن اور قہوے کے ایک ایک کپ پر مشتمل ہوتے تھے جن کا نعم البدل ہمارے انواع و اقسام کے کھانوں سے بھرے دسترخوان کبھی نہیں ہو سکتے۔ نہ وہ سیری نہ وہ سرشاری۔ خانہ کعبہ کے ساتھ لگنے کا موقع جب بھی ملتا ہے تو اپنی قسمت پر رشک آتا ہے زبان تو شاید دعا ہی مانگتی ہو مگر آپ کا دل ہچکیوں سے رونے پر مجبور کر دیتا ہے۔ کوئی متوجہ نہیں ہوتا۔ ہر کوئی اپنا رابطہ بحال کرنے اور اپنی کہنے سنانے میں لگا ہے۔ اب اللہ پاک سے ہر گھڑی یہ دعا ہے کہ اے میرے پیارے رب وہی گھڑیاں وہی ساعتیں بس ایک دفعہ اور مجھ سمیت سب مسلمانوں کا نصیب بنا دے۔ آمین۔

2۔ عید الحمد اللہ بچوں اور گھر والوں سمیت اسی روایتی گہما گہمی سے گزرتی ہے جو اس کا خاصہ ہے۔

3۔ اس سال شعاع میں بہت سی تحریریں پڑھیں لیکن مجھے تو صرف اور صرف سائرہ رضا نے نہ صرف چونکایا دل دھڑکایا بلکہ کبھی کبھی تو بہت ہی زبردست دھمکایا بھی ہے۔ نہ کوئی رعایت نہ کوئی گنجائش۔ بے شک وہ موضوع کا چناؤ ہو کرداروں کے ساتھ برتاؤ ہو یا کہانی کا بہاؤ ہو وہ ہر آن ایک ایسے سخت گیر مصنف کا سا رویہ رکھتی ہیں جو اچھے کم برے اور برے لوگوں کو علیحدہ علیحدہ خانوں میں فٹ کرتی ہیں۔ انگلش لٹریچر پڑھتے ہوئے ہم نے سیکھا تھا کہ ہر کہانی کا ایک آغاز ایک کلائمکس اور ایک اختتام ہوتا ہے لیکن سائرہ کو پڑھتے ہوئے سوائے کلائمکس کے کچھ اور نہیں لگتا۔ ہر جملہ روک دینے والا ہر لفظ سوچنے پر مجبور کرنے والا۔

مسرت الطاف احمد۔ کراچی

1۔ رمضان المبارک کا مہینہ آتے ہی روز مرہ کی روٹین میں نہ صرف تبدیلی آتی ہے بلکہ ذاتی طور پر بھی میں خود کو بہت چینج محسوس کرتی ہوں۔ رمضان کے پورے مہینے میں میں عام دنوں کے حساب سے جلدی سوتی ہوں کیونکہ ساڑھے تین بجے اٹھ کر امی کے ساتھ سحری بنانا ایک ایک کر کے بہنوں اور ابو کو اٹھانا دسترخوان لگانا سب کے لیے چائے نکالنا سب میری ذمہ داری ہے۔ فجر کی نماز کے بعد قرآن پاک کی ایک گھنٹے تک تلاوت کر کے سو جاتی ہوں۔ ساڑھے گیارہ بجے اٹھ کر اپنے حصے کے کام سرانجام دیتی ہوں پھر فریش ہو کر ظہر کی نماز پڑھ کر قرآن پاک کی دو گھنٹے تک تلاوت کرتی ہوں۔

افطاری میں صائمہ اور ندا مل کر بناتے ہیں اور رباب ہماری ہیلپ کرتی ہے۔ گھر والوں کو میرے ہاتھ کی آلو چاٹ لب شیریں دہی بھلے اور نزا کفل بہت پسند ہے اسی لیے میں افطاری میں یہ چیزیں ضرور بناتی ہوں۔

افطاری کے لیے خود کو بہت اہتمام سے تیار کرتی ہوں سب بہنیں مل کر دسترخوان سجاتے ہیں۔ اذان سے ایک منٹ پہلے سب کے لیے شربت یا لسی گلاس میں نکالنا میری ذمہ داری ہے۔ افطاری کے بعد سب مل کر برتن سمیٹتے ہیں۔ جس کی باری ہو وہ افطار کے برتن دھوتا ہے۔ مغرب کی نماز کے بعد دس پندرہ منٹ تک بھاگ دوڑ کا سلسلہ چلتا ہے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ کر بلہ گلہ کرتے ہیں۔ ابو افطاری بہت کم کرتے ہیں اسی لیے امی ابو کے لیے رات کے

کھانے کا اہتمام کرتی ہیں۔ عشاء کی نماز اور تراویح کے بعد میں دو گھنٹے شعاع کے ساتھ گزارنا پسند کرتی ہوں۔

اپنے قلب میں تبدیلی ــــ یہ سوال کرکے آپ نے میرے دل کو جھنجوڑ کے رکھ دیا' رمضان کا مہینہ وہ واحد مہینہ ہے جو مجھے دینی اعتبار سے اللہ کے بہت قریب کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے مجھے دلی سکون اور راحت کا بھرپور احساس ہوتا ہے۔ عام دنوں میں بھی میرا اللہ سے رشتہ بہت گہرا اور مضبوط ہے۔ میں کبھی بھی اللہ کی آزمائشوں سے مایوس نہیں ہوئی۔ میں نے اگر بہتر کی تمنا کی ہے تو اللہ نے مجھے بہترین دیا اور رمضان کا مہینہ تو رحمتوں اور عبادتوں کا مہینہ ہے جو سال میں صرف ایک بار آتا ہے اور اس کی رحمتوں اور نعمتوں سے بھرپور فائدہ اٹھاتی ہوں۔

2۔ ہماری عید تو چاند رات سے ہی شروع ہو جاتی ہے رات دیر تک جاگتے ہیں۔ کوئی ایک بہن ہر سال چاند رات کو اسکیٹھی بناتی ہے ایک دوسرے کو مہندی لگاتے ہیں۔ ہنسی مذاق میں اسکیٹھی سے بھرپور لطف لیا جاتا ہے رات دیر تک جاگنے کے باوجود فجر کی اذان کے ساتھ ہی ابو کی نرم اور میٹھی آواز کے ساتھ آنکھ کھلتی ہے۔ فجر کی نماز کے بعد میں اور ندا امی کے ساتھ گپ شپ کرتے ہیں جب کہ صائمہ اور رباب خواب خرگوش کے مزے لیتے ہوئے پائی جاتی ہیں۔ امی سویوں اور فیرنی سے سب کا منہ میٹھا کراتی ہیں۔ ابو عید کی نماز پڑھنے جاتے ہیں' اس دوران ہم سب گھر کے کاموں سے فارغ ہو کر جلدی جلدی نہا دھو کر فریش ہو جاتے ہیں۔ ابو سے عید ملنے کے بعد ایک دوسرے سے گلے لگ کر عید ملتے ہیں سب خود کو بہت اہتمام سے تیار کرتے ہیں جیولری' میک اپ' ڈریسنگ سب کی ایک سے بڑھ کر ایک ہوتی ہے۔ تایا' چچا اور سب کزن عید ملنے ہمارے گھر آتے ہیں۔ باقی کا سارا دن آنے جانے اور ٹی وی دیکھنے میں نکل جاتا ہے جب کہ دوسرے دن ہم سب دادا ابو کے گھر جاتے ہیں۔ سارا خاندان وہاں جمع ہوتا ہے تیسرے دن نانی کے گھر سب گیٹ ٹو گیدر کرتے ہیں۔

3۔ اگر میری ملاقات فائزہ افتخار سے ہو تو میں ان سے یہ شکوہ کروں گی کہ آپ نے مائرہ کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ "اک نئی سنڈریلا" کی ہر قسط میرے لیے بہت ایکسائیٹڈ تھی لیکن آخری قسط پڑھ کر دل بہت دیر تک بوجھل رہا۔

میری یہ شدید خواہش ہے کہ صرف ایک بار میری ملاقات نبیلہ عزیز سے ہو جائے تو ان کی بھرپور تعریف کروں گی اور انہیں یہ کہوں گی کہ میں ان کو بہت پسند کرتی ہوں ان کی ہر تحریر میرے ذہن میں نقش ہے۔ کردار' ان سے ایک شکوہ کروں گی مائی نی میں موموکی ڈیتھ نے مجھے بہت افسردہ کر دیا تھا۔ آپ نے اچھا نہیں کیا۔

اگر کسی دن میری ملاقات صوفیہ بشیر سے ہوئی تو میں ان کے ناول "اداس چاند" کی دل کی گہرائیوں سے تعریف کرنا چاہوں گی۔ ان کا ناول اگست 2012ء میں شائع ہوا تھا لیکن اب تک میرے ذہن سے محو نہیں ہوا۔ اس میں دجانے عثمان اور ماہم نور کا کردار بہت ہی اٹریکٹو تھا۔

میں چاہوں گی کہ میری ملاقات نمرہ احمد سے ہو تاکہ ان سے میں یہ پوچھ سکوں کہ "کیا آپ کے پاس کوئی جادو کی چھڑی ہے جو آپ اتنی ڈفرنٹ اور منفرد تحریریں لکھتی ہیں؟ آپ کی ہر تحریر ہمارے ذہنوں پہ برسوں حاوی رہے گی۔ جنت کے پتے بھی انہی تحریروں میں سے ایک ہے۔"

اور اگر میری ملاقات عنیزہ سید سے ہوئی تو میں ان سے یہ شکوہ کروں گی کہ آپ نے نان بائی کی بیٹی کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ زینا کو واؤ کی صورت میں اس کے حصے کی خوشیاں ملنی چاہیے تھیں۔

بقیہ صفحہ 282 پر

۲
دوسری قسط

نبیلہ عزیز

رقصِ بسمل

مادرا مرتضیٰ' عافیہ بیگم کی اکلوتی بیٹی ہے۔ فارہ کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی ہے۔ عافیہ بیگم اس کا اپنی سہیلیوں سے زیادہ ملنا جلنا پسند نہیں کرتیں۔ اس کے علاوہ بھی اس پر بہت ساری پابندیاں لگاتی ہیں جبکہ مادرا خود اعتماد اور اچھی لڑکی ہے۔ عافیہ بیگم اکثر اس سے ناراض رہتی ہیں۔ البتہ بی گل اس کی حمایتی ہیں۔

فارہ اپنی ثمینہ خالہ کے بیٹے آفاق یزدانی سے منسوب ہے۔ دو سال پہلے یہ نسبت آفاق کی پسند سے ٹھہرائی گئی تھی مگر اب وہ فارہ سے قطعی لاتعلق ہے۔ فارہ کی والدہ منزہ رحیم اپنی بہن ثمینہ یزدانی سے ملنے کراچی جاتی ہیں۔ آفاق انہیں ایرپورٹ لینے نہیں جاتا۔ مجبوراً "ساشا" کو جانا پڑتا ہے۔

منزہ' ثمینہ اور رضا حیدر بہن بھائی ہیں۔ ان کی ایک بہن شارجہ میں رہتی ہیں۔ ان کے بیٹے سے فارہ کی بہن حمنہ بیاہی گئی ہے۔ رضا حیدر کے دو بچے ہیں۔ تیمور حیدر اور عزت حیدر۔ تیمور حیدر بزنس مین ہے اور بے حد شان دار پرسنالٹی کا مالک ہے۔ ولید رحمن اس کا بیسٹ فرینڈ ہے۔ اس سے حیثیت میں کم ہے مگر دونوں کے درمیان ڈسٹینس حائل نہیں ہے۔

عزت اپنی آنکھوں سے یونیورسٹی میں بم دھماکا ہوتے دیکھ کر اپنے حواس کھو دیتی ہے۔ ولید اسے دیکھ کر اس کی جانب لپکتا ہے۔

"عزت۔۔۔" اس نے قریب آتے ہوئے کافی گھبرائے ہوئے اور تشویش بھرے لہجے میں پکارا۔ لیکن عزت کو اس وقت کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کی سماعتوں میں لوگوں کی دردناک اور دل خراش چیخیں گونج رہی تھیں۔ وحشت اور خوف سے وہ خود بھی چلا رہی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پہ رکھے ہوئے تھے اور اس کی حالت کافی ابتر محسوس ہو رہی تھی۔ ولید کو مزید تشویش نے آگھیرا۔

"عزت۔۔۔" اس نے ایک بار پھر پکارا۔ لیکن اس کے ذہن پہ خوف اور سماعتوں پہ چیخوں کا شور حاوی تھا۔

"عزت۔۔۔ آر یو آل رائٹ؟" ولید کے لہجے میں پریشانی اور گھبراہٹ تھی۔ لیکن وہ کچھ سنتی تب نا؟

"عزت۔۔۔! میں آپ سے مخاطب ہوں۔ ادھر میری طرف دیکھیں۔۔۔ جواب دیں مجھے۔" اس کی پریشانی اور فکرمندی لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی۔ مگر وہ تو جیسے ہوش و حواس سے بیگانہ بلک رہی تھی اور ولید کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ آس پاس کا ماحول اور صورت حال ایسی نہیں تھی کہ وہ اسے اس کے حال پہ چھوڑ دیتا۔ کیونکہ وہ اس کے دوست تیمور حیدر کی بہن تھی اور اس ناتے اس کا فرض بنتا تھا کہ وہ اس سنگین صورت حال میں اس کی مدد اور حفاظت کرے۔ کیونکہ اس کا نقصان تیمور حیدر کا نقصان تھا اور وہ کبھی مر کے بھی تیمور حیدر کا نقصان نہیں چاہ سکتا تھا۔

"ولید۔۔۔ لگتا ہے انہوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے بم بلاسٹ ہوتے دیکھا ہے۔ یہ یقیناً ہمیں کچھ بتا سکتی ہیں۔" ولید کے عقب سے اس کے کولیگ حارث زیدی کی آواز ابھری۔ ولید چونک کر پلٹا۔ حارث زیدی عزت کو ہی دیکھ رہا تھا۔ ایک چشم دید گواہ کی آس میں۔

"نہیں۔۔۔! یہ فی الحال ایسی پوزیشن میں نہیں ہیں کہ کوئی اسٹیٹمنٹ ریکارڈ کروا سکیں۔۔۔ اس لیے پلیز تم جاؤ یہاں سے۔" ولید نے حارث زیدی کو سختی سے منع کیا تھا۔

"ارے۔۔۔ کیوں نہیں ہیں پوزیشن میں؟ تمہیں کیا پتا بھلا؟ یہی تو اصل پوزیشن ہوتی ہے۔ سب کچھ صاف اور سچ سچ بتانے کی۔ ادھر دیکھو! ہزاروں لڑکے اور لڑکیاں کیمرے کے سامنے سب کچھ لائیو شیئر کر رہے ہیں۔ حالانکہ ان کی بھی تقریباً ایسی ہی حالت ہے؟" حارث زیدی وہاں سے جانے کو تیار نہیں تھا۔

"تو جاؤ نا! تم بھی ان ہزاروں کے پاس چلے جاؤ۔ یہاں کیوں کھڑے ہو؟" ولید کو اس پہ جی بھر کے غصہ آیا۔

"کیونکہ تم یہاں کھڑے ہو۔۔۔ ان ہزاروں کو چھوڑ کر۔" اس نے ولید کو زچ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ مگر وہ بڑے ضبط سے اپنا غصہ دبا گیا۔ کیونکہ یہ جگہ اور یہ وقت غصہ کرنے کے لیے نہیں تھا۔

"یہ میری ریلیٹو ہیں۔ اس لیے ان کے پاس کھڑا ہوں۔" ولید نے کافی چبا کے کہا۔ حارث زیدی کے تاثرات ایکدم بدل گئے۔

"او! اچھا اچھا۔۔۔ ٹھیک ہے۔۔۔ پھر کھڑے رہو۔۔۔ تمہارا حق بنتا ہے۔" وہ اطمینان سے کہہ کر پلٹ گیا تھا اور ولید مٹھیاں بھینچ کے رہ گیا۔

"ہونہہ۔۔۔ خبیث کو اس وقت بھی خباثت سوجھ رہی ہے۔" ولید غصے سے بڑبڑاتا ہوا عزت کی سمت واپس پلٹا۔ لیکن اب وہ اپنی جگہ پہ کھڑی نہیں تھی۔ بلکہ زمین پہ بیٹھی ہنوز روتے ہوئے چیخ رہی تھی۔ ولید نے خود کو بے بس محسوس کیا۔ آخر کیا کرتا؟ وہ بھی عزت کے سامنے پنجوں کے بل زمین پہ بیٹھ گیا اور اسے دونوں کندھوں سے تھام کے انتہائی سختی سے جھنجھوڑ ڈالا تھا۔

"عزت۔۔۔ ہوش میں آئیں۔۔۔ کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ پاگل ہو گئی ہیں کیا؟" اب کی بار وہ خاصی اونچی اور سخت آواز میں بولا۔ عزت اس کے اس طرح بولنے اور اس طرح جھنجھوڑنے پہ جیسے ہوش میں آئی تھی۔ اس نے بے تحاشا بھیگے ہوئے چہرے اور بھیگی ہوئی آنکھوں سے ایکدم اپنے سامنے دیکھا تھا۔ اس کی نظروں کے عین سامنے ولید کا چہرہ تھا۔ لیکن پچویشن کچھ ایسی تھی کہ وہ ولید کو پہچان نہیں پا رہی تھی۔ اس کی بھیگی متورم آنکھوں میں اس وقت خوف اور دہشت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

"میں ولید ہوں۔۔۔ ولید۔۔۔ ولید رحمان۔۔۔ تیمور کا دوست۔۔۔ آپ نے یقیناً پہلے بھی مجھے دیکھا ہو گا۔۔۔ شاید آپ کے گھر پہ ہی؟" وہ اس کی پہچان سے عاری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اسے اپنی پہچان کا حوالہ دے رہا تھا۔ جس پہ اس کی آنکھوں میں تحیر اتر آیا اور پھر بے ساختہ وہ آنکھیں درد سے چھلک پڑیں۔ وہ ایک سنگین اور ہنگامہ خیز صورت حال میں بری طرح پھنسا تھا۔

"تیمور بھائی!" وہ کہتے ہوئے ایک دم چیخ پڑی۔ اس کا خود پہ کوئی اختیار نہیں تھا اس وقت۔۔۔ کیونکہ جو کچھ وہ دیکھ چکی تھی۔ اس کے بعد ایسی حالت اور ہذیانی کیفیت تو ایک لازمی امر تھا۔

"پلیز عزت! پلیز کنٹرول یور سیلف۔۔۔ بند کریں یہ رونا دھونا۔۔۔ کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ کیا کوئی نقصان ہوا ہے آپ کا؟" ولید نے اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔ جس پہ نڈھال سی عزت دم بخود سی رہ گئی۔

"کیا کہا آپ نے؟ کیا آپ کو نہیں پتا کہ کیا ہوا ہے مجھے؟ کیا یہ نقصان کوئی نقصان ہی نہیں ہے؟ کیا یہ نقصان آپ کو نظر ہی نہیں آرہا؟ کیا اس نقصان کو دیکھ کر روؤں بھی نہ؟"

عزت یونیورسٹی کی پارکنگ میں بپھی قیامت دیکھ کر پھر سے چیخنے لگی۔

"عزت۔۔۔ یہ نقصان صرف آپ کا نہیں ہے۔ یہ تو ہم سب کا نقصان ہے۔۔۔ پوری قوم کا نقصان ہے۔ اس پہ تو ہم سب کو رونا چاہیے۔ لیکن فی الحال یہ جگہ مناسب نہیں ہے۔ بہت افراتفری ہے یہاں۔۔۔ ہنگامی حالت ہے۔۔۔ کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔۔۔ بہت خطرہ ہے یہاں۔۔۔ اس لیے یہاں رکنا مناسب نہیں ہے۔ پلیز! آپ اٹھیں یہاں سے۔۔۔ ایک سائیڈ پہ آجائیں۔" ولید نے اسے وہاں سے اٹھانے کی کوشش کی۔

"لیکن۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ سب۔۔۔؟" عزت زخمی اسٹوڈنٹس کو دیکھ کر سسک اٹھی۔

"یہ ہمارے ملک، ہماری قوم کا المیہ ہے۔ اس کا کوئی مرہم کوئی مسیحا نہیں ہے۔" ولید کا لہجہ تلخ اور زخمی ہو رہا تھا۔ رضاکار مسلسل اپنی جان ہتھیلی پہ رکھے شہریوں کی مدد اور خدمت میں لگے ہوئے تھے۔ پولیس آفیسرز تحقیقات کرنے میں مصروف تھے اور میڈیا والوں نے الگ حشر اٹھا رکھا تھا۔ پرنٹ میڈیا اور الیکٹرونک میڈیا ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوششوں میں تھے اور اس کوشش سے بڑھ کے انہیں کسی بھی جانی و مالی نقصان کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اگر وہ پروا کرتے تو یقیناً سیکڑوں اور زخمیوں کی جان بچ سکتی تھی۔ لیکن اس دھماکے کی نیوز سب سے پہلے نشر کرنے کا فخر حاصل کرنے کے لیے انہوں نے کئی زندگیوں کے زیاں کے احساس کو پس پشت ڈال دیا تھا جو اس ملک قوم کا ایک اور المیہ تھا۔ عزت یہ سب دیکھ کر دوبارہ رو پڑی۔

"عزت پلیز۔۔۔ ادھر میرے ساتھ آئیے۔" ولید اسے بازو سے پکڑ کر سہارا دیتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ یوں ہی اس کو اٹھاتے ہوئے ولید کی نظر اچانک نیچے زمین پہ پڑی تو عزت کا بیگ اسے نیچے گرا ہوا نظر آیا تھا۔ ولید نے بیگ اٹھایا تھا اور اسے بازو سے تھامے یونیورسٹی کی اندرونی سمت بڑھا۔ اس کے ساتھ چلتی عزت بمشکل قدم اٹھا رہی تھی۔ اس کا پورا جسم لرز رہا تھا۔ اتنے سنگین حادثے کے باعث اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ ٹھیک سے چل بھی سکتی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا اور ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ ولید کے ہاتھ میں اس کا بازو دبا ہوا تھا۔ لیکن گرفت کافی ڈھیلی تھی۔ وہ اپنے دھیان میں آگے بڑھ رہا تھا۔ جبکہ وہ اسے روکنا چاہتی تھی۔ مگر روک نہیں پا رہی تھی۔ کیونکہ اس کے حلق سے آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔ یوں ہی چلتے چلتے قدم زمین سے سرک گئے تھے یا شاید زمین سرک گئی تھی۔ جس سے وہ ایکدم لڑکھڑا گئی۔

"ولید۔۔۔" اس نے بڑی مشکل سے اسے پکارا اور تیورا کے زمین بوس ہو گئی۔ ولید کے ہاتھ سے اس کا بازو

چھوٹ گیا ولید پر بوکھلاہٹ طاری ہو گئی۔ وہ اس کی کراہ پہ ایک دم اس کی سمت پلٹا۔

"عزت۔۔ عزت۔۔ آنکھیں کھولیں۔۔ عزت پلیز۔۔ کیا ہوا ہے آپ۔۔ ٹھیک تو ہیں؟" ولید زمین پہ دو زانو بیٹھ کافی بوکھلائے ہوئے انداز میں عزت کا چہرہ تھپکتے ہوئے اسے پکار رہا تھا۔ وہ اس اچانک افتاد کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کا دھیان ایک ایمبولینس کی طرف تھا اور اس کے بازو پہ گرفت ڈھیلی ہونے کی وجہ سے اسے پتا ہی نہ لگا کہ کب وہ زمین پر گر گئی۔ اب اپنی کوتاہی اور غفلت پہ وہ خود کو دل ہی دل میں کوس رہا تھا۔

"پلیز عزت۔۔ میری طرف دیکھیں۔۔ آنکھیں کھولیں۔۔ پلیز عزت۔۔ ہوش میں آئیں۔" ولید نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دبایا۔ پھر بے ساختہ اس کی نبض ٹٹولی تھی۔ نبض چل رہی۔۔ لیکن بہت مدھم رفتار سے۔ ولید کو اس کے بچنے کی امید ہو چلی تھی۔ اس نے عجلت اور پریشانی میں اپنی جیب سے موبائل نکال کر تیمور حیدر کا نمبر ڈائل کیا تھا۔ دوسری طرف رنگ جا رہی تھی۔

"ہیلو۔۔" اگلے تین سیکنڈ میں تیمور حیدر کی آواز ایئر پیس سے ابھری۔

"تیمور! کہاں ہو تم؟" ولید کی آواز کافی بوکھلائی ہوئی تھی۔ تیمور چونک گیا۔

"میں گھر پہ ہوں۔۔ کیوں کیا ہوا؟ تم ٹھیک تو ہو؟" تیمور کو ولید کے پیچھے بہت زیادہ شور اور بہت زیادہ آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

"میں ٹھیک ہوں یار۔۔ تم فوراً عزت کی یونیورسٹی پہنچو۔" ولید کی اگلی بات پہ تیمور کی پریشانی اور بھی سوا ہو گئی۔

"عزت کی یونیورسٹی؟ کیوں ولید! کیا ہوا ہے؟ عزت ٹھیک تو ہے نا؟" تیمور کا پہلا خیال ایکسیڈنٹ کی طرف گیا تھا کہ شاید عزت کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔

"ہاں۔۔ وہ ٹھیک ہیں۔۔ یونیورسٹی کی پارکنگ میں بم بلاسٹ ہوا ہے۔ کافی نقصان ہوا ہے یہاں۔۔ لیکن تم پریشان مت ہونا۔ عزت کی جان بچ گئی ہے۔ وہ محفوظ ہیں۔ لیکن اس اچانک حادثے کے اثر سے بے ہوش ہو گئی ہیں۔ میرے پاس بائیک ہے اور میں انہیں بائیک پہ اسپتال لے کر نہیں جا سکتا۔ اس لیے تمہیں فون کیا ہے۔ تم پلیز! جلدی پہنچو۔ بس پانچ منٹ میں۔" ولید نے جلدی جلدی اسے اطلاع دی تیمور کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔

"او کے۔۔۔ او کے۔۔ میں ابھی پہنچ رہا ہوں ڈونٹ وری۔" تیمور نے کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔

ولید بے ہوش پڑی عزت کو اٹھا کے یونیورسٹی کے ــــــ اندر لے آیا تھا۔

۞ ۞ ۞

تیمور اسلام آباد جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ جب اسے ولید کی کال موصول ہوئی تھی۔ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے بڑی عجلت میں اپنے بیڈ روم سے نکلا۔ اسے یوں تیزی سے سیڑھیاں اترتے دیکھ کر رابعہ بیگم ٹھٹک گئیں۔ کیونکہ پریشانی اس کے چہرے سے ہویدا تھی۔

"تیمور! کیا بات ہے کہاں جا رہے ہو؟" رابعہ بیگم تیزی سے اس کے سامنے آئی تھیں۔

"کچھ نہیں مما! وہ دراصل ولید کی کال آئی تھی۔ وہ شاید کسی پریشانی میں ہے۔ اس نے بلایا ہے۔" تیمور اصل بات دبا گیا۔ کیونکہ اسے پتا تھا کہ وہ پریشانی میں رونا دھونا شروع کر دیں گی۔

"کیوں۔۔ کیا ہوا ہے اسے؟ خیر تو ہے؟" انہوں نے اپنا دل تھام لیا۔

"نہیں! یہ تو نہیں بتایا اس نے۔۔ آپ بس دعا کریں۔۔ میں کچھ دیر تک آ جاؤں گا۔" وہ انہیں تسلی دیتا ہوا لمبا لمبے ڈگ بھرتا ہوا کاریڈور عبور کر گیا تھا اور پھر ڈرائیو وے سے روڈ تک گاڑی لانے میں اسے محض پندرہ

بیس سیکنڈز لگے تھے۔ مین روڈ پہ آتے ہی اس نے گاڑی پوری رفتار سے بھگانا شروع کی۔ روڈ پہ آ کر اسے پتا چلا تھا کہ پورا شہر ایک ہلچل میں تھا۔ ہر طرف ایک افراتفری سی دکھائی دے رہی تھی۔ سب کو اپنے اپنے جوان جہان بچوں کی فکر تھی۔ جو اپنے گھروں سے علم کی روشنی حاصل کرنے کے لیے نکلے تھے۔ لیکن موت اور درد کے اندھیروں میں ڈوب گئے تھے۔ یونیورسٹی روڈ پہ آتے ہی کئی ماؤں کی چیخ و پکار سنائی دینے لگی تھی۔ جو اس تباہ کن دھماکے کی خبر ملتے ہی اپنے گھروں سے بھاگی آئی تھیں اور اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کی المناک موت پہ تڑپ رہی تھیں اور بین کر رہی تھیں۔ تیمور کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ گاڑی ایک طرف کھڑی کرتے تیزی سے نیچے اترا اور ولید کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس کا نمبر ڈائل کیا۔

"ولید۔۔ کہاں ہو تم؟"

"یونیورسٹی کے اندر آ جاؤ۔۔ ہم اندر ہیں۔" ولید نے مختصر سا بتا کر فون بند کر دیا۔

تیمور تیز تیز قدم اٹھاتا لوگوں کے ہجوم کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا بڑی مشکل سے یونیورسٹی کے اندرونی حصے تک پہنچا تھا۔ یونیورسٹی کے گیٹ کے اندر طویل ڈرائیو وے تھا۔ جس کے دائیں بائیں سرو کے درخت اور پتھریلے بینچ نصب تھے۔ تیمور تھوڑا اور آگے آیا تو ولید اسے پہلے بینچ کے قریب ہی کھڑا دکھائی دیا۔

"عزت؟" تیمور نے ولید کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ولید ایک قریبی بینچ کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے عزت کو اس بینچ پہ لٹا رکھا تھا۔ کیونکہ اس بینچ پہ اس کے ساتھ لگے درختوں کی چھاؤں تھی۔ اس لیے دھوپ سے بچانے کی خاطر ولید نے اسے یہاں لٹا دیا تھا۔ تیمور عزت کو دیکھ کر تیزی سے قریب آیا۔

"عزت۔۔ آنکھیں کھولو عزت۔" تیمور نے اس کے گال تھپکے۔

"میں نے بھی بہت کوشش کر کے دیکھی ہے۔ لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم انہیں جلد سے جلد اسپتال لے جاؤ۔ ان کے لیے بروقت ٹریٹمنٹ کا ملنا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ ان کا نروس بریک ڈاؤن بھی ہو سکتا ہے۔" ولید نے ایک سرسری سی نظر بے ہوش پڑی عزت پہ ڈالتے ہوئے تیمور کو مشورہ دیا تھا۔

"ٹھیک ہے! تم یہیں ٹھہرو۔ میں گاڑی اندر لے آتا ہوں۔" تیمور کہتے ہوئے سیدھا ہوا۔

"گاڑی اندر لانے میں تمہیں دو دن لگ جائیں گے۔ باہر دیکھا نہیں تم نے؟ کیا حالات ہیں؟ کتنا کراؤڈ ہے؟" ولید نے تیمور کی طرف دیکھا۔

"تو پھر؟" تیمور نے احمقوں کی طرح پوچھا۔

"تو پھر یہ کہ انہیں اٹھا کر گاڑی تک لے جاؤ۔۔ گاڑی ان تک نہیں آ سکتی۔" ولید نے اس کی عقل پہ ماتم کیا تھا۔

"میں اٹھا کر لے جاؤں؟" تیمور کو عجیب سا لگا۔ لیکن جواباً ولید نے اسے جن نظروں سے دیکھا تھا اس پہ تیمور کو عقل آ ہی گئی۔

"او کے۔۔ یہ لو چابی۔۔ گاڑی کا لاک کھولو جا کر۔۔ میں اسے لے کر آتا ہوں۔" اس نے عزت کو اٹھایا اور یونیورسٹی سے نکل آیا۔ ولید اس کے آگے آگے چلتا لوگوں کے ہجوم کو سامنے سے ہٹاتا جا رہا تھا۔ روڈ پہ آتے ہی وہ لپک کے گاڑی تک پہنچا تھا اور گاڑی کے آگے کا دروازہ کھول کے پیچھے کا دروازہ بھی کھول دیا۔ تیمور نے آگے بڑھ کے بڑی احتیاط سے اسے پچھلی سیٹ پہ لٹایا اور خود ڈرائیونگ سیٹ کی سمت بڑھا تھا۔

"تیمور! ٹھہرو۔" ولید نے کچھ یاد آنے پہ اسے آواز دی۔

"یہ ان کا بیگ ہے۔" اس نے عزت کا بیگ تیمور کی سمت بڑھایا۔ اس کے پاس دو بیگ تھے۔ ایک اپنا جو اس نے اپنے گلے میں ترچھا کر کے ڈال رکھا تھا اور ایک عزت کا جو اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔

"کیوں؟ کیا تم ساتھ نہیں چل رہے؟" تیمور ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے رک گیا۔

"نہیں۔" ولید کا جواب مختصر تھا۔

"کیوں؟" تیمور نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"مجھے یہاں کام ہے۔"

"کیسا کام؟"

"بعد میں بتاؤں گا۔ فی الحال تم جاؤ۔" ولید ٹال گیا تھا۔ تیمور نے ولید کو الجھی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ پھر گاڑی میں بیٹھ گیا۔

"شام کو ملتے ہیں۔" تیمور نے گاڑی اسٹارٹ کرنے سے پہلے ملاقات کا وقت مقرر کیا۔

"وعدہ نہیں کرتا۔" ولید نے نفی میں سر ہلایا۔

"اور ہاں۔ سنو!" اس نے پیچھے سے ولید کو آواز دی۔

"کہو؟" وہ پھر قریب آگیا تھا۔

"عزت کی گاڑی دیکھی تمہیں؟" تیمور کو ایک دم عزت کی گاڑی کا خیال آیا۔

"آئی ایم سوری! مجھے ان کی گاڑی کا نہیں پتا۔ بلکہ مجھے تو یہ بھی نہیں پتا کہ ان کی گاڑی ہے کون سی۔" ولید نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

"بلیک کرولا اے ایکس ایل ٹرپل تھری۔" تیمور نے اسے گاڑی کا نمبر وغیرہ بتایا۔

"اوکے۔ میں دیکھتا ہوں۔ لیکن اگر یہ گاڑی پارکنگ میں پارک تھی تو پھر بہت مشکل ہے کہ گاڑی کا نام و نشان بھی بچا ہو۔ کیونکہ پارکنگ میں جتنی بھی گاڑیاں کھڑی تھیں سب کو نقصان پہنچا ہے۔ کئی گاڑیاں تو آگ کی نذر ہو گئی ہیں۔ اس لیے گاڑی کا خیال دل سے نکال دو۔ ان کی جان بچ گئی ہے۔ بس یہی کافی ہے۔ گھر جاؤ اور شکرانہ ادا کرو۔ پندرہ بیس لاکھ کا نقصان کوئی نقصان نہیں ہے تمہارے لیے۔ وہ تو تم ایک دن میں پورا کر لو گے۔" ولید کی چوٹ پہ تیمور نے اسے گھور کے دیکھا۔

"حلال کی کمائی ہے۔ حرام کی نہیں ہے کہ دل سے خیال ہی نکال دوں۔"

"ہاں! جانتا ہوں۔ سب جانتا ہوں۔ خیر! بحث میں مت الجھو۔ مزید نقصان کا اندیشہ ہے۔ فوراً اسپتال پہنچو۔" ولید نے ذرا سا مسکراتے ہوئے کہا اور اس کی گاڑی کو ہاتھ سے بجاتے ہوئے آگے بڑھنے کا سگنل دیا تھا۔

تیمور خفگی سے گھورتا ہوا سر جھٹک کر گاڑی نکال لے گیا۔ جبکہ ولید اس کی گاڑی آنکھوں سے اوجھل ہو جانے کے بعد خود بھی صحافیوں کے ہجوم میں شامل ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

تیمور عزت کو لے کر اسپتال پہنچا ہی تھا کہ اس کے موبائل فون پہ کالز موصول ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ سب سے پہلی کال رضا حیدر کی تھی۔

"تیمور۔ عزت کی یونیورسٹی میں دھماکا ہوا ہے۔ اس کا پتا کرو، وہ کہاں ہے؟ اس کا موبائل بھی آف ہے۔"

رضا حیدر چھوٹتے ہی شروع ہو گئے۔ ان کی پرسکون آواز اور تحمل آمیز لہجہ اس وقت لرز رہے تھے۔ تیمور بنا دیکھے بھی جان سکتا تھا کہ اس وقت ان پہ کیا بیت رہی ہو گی؟ اور ان کی کیسی حالت ہو رہی ہو گی۔

"ریلیکس بابا! ریلیکس۔ ڈونٹ وری۔ عزت بالکل ٹھیک ہے۔ میرے ساتھ ہی ہے۔ میں اسے یونیورسٹی سے لے آیا ہوں۔ بس اتنے سنگین حادثے کی وجہ سے اس کے دل پہ اثر ہوا ہے اور اس کا بی پی لو ہو گیا ہے۔ اس

لیے میں اسے لے کر اسپتال آگیا ہوں۔ ڈاکٹرز بتا رہے تھے کہ کچھ دیر تک وہ ہوش میں آجائے گی۔" تیمور نے باپ کو تسلی دی۔

"سچ بتا رہے ہو تیمور! میرے ساتھ غلط بیانی تو نہیں کر رہے؟" انہوں نے کافی پریشان اور مشکوک سے لہجے میں پوچھا۔ کیونکہ تیمور۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی رابعہ بیگم کو ٹالنے کی خاطر غلط بیانی کر کے گیا تھا۔

"ارے نہیں بابا! وہ بس مما کی پریشانی کی وجہ سے انہیں ٹھیک سے نہیں بتایا تھا۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ عزت کو ذرا سی بھی خراش تک نہیں آئی ہے۔ شی از آل رائٹ۔" تیمور کو پتا تھا کہ وہ اب اس کی بات کا یقین نہیں کریں گے۔ لیکن پھر بھی اس نے انہیں مطمئن کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔

"ہمیں اسپتال نام کا بتاؤ۔ ہم خود آرہے ہیں۔" ان سے صبر نہیں ہو رہا تھا۔ مجبوراً تیمور کو اسپتال کا نام بتانا ہی پڑا۔

"جی ڈاکٹر صاحب! اب کیسی کنڈیشن ہے اس کی؟" تیمور فون بند ہوتے ہی پرائیویٹ روم سے باہر نکلتے ڈاکٹر اور نرس کی سمت متوجہ ہوا۔

"ڈونٹ وری سر! شی از بیٹر ناؤ۔" ڈاکٹر نے مسکرا کر اسے تسلی دی۔

"تھینک گاڈ! اینڈ تھینک یو سو مچ ڈاکٹر۔" اس نے خوش ہوتے ہوئے اللہ کا شکر ادا کیا اور اندر کمرے میں آگیا۔ عزت کا بی پی خطرناک حد تک لو ہو گیا تھا۔ اس لیے ڈاکٹرز نے فوری طور پہ اس کے لیے ڈرپ اور انجکشن تجویز کیے تھے۔ اسے ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ تیمور اس کے بیڈ کے قریب آکھڑا ہوا۔ اس نے عزت کے چہرے کو بغور دیکھا۔ اس کے چہرے پہ بہت زیادہ رونے کے آثار واضح محسوس ہو رہے تھے۔ تیمور نے تاسف سے سر ہلاتے ہوئے نرمی سے اس کا سر تھپکا اور پلٹ کر صوفے پہ جا بیٹھا۔

اس کا ذہن اس وقت ولید کی طرف ہی تھا۔ اس کی سوچوں کے دھارے اس کی سمت ہی بہہ رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ولید وہاں کیا کر رہا تھا؟ وہ وہاں کیوں تھا؟ اسے بم بلاسٹ کی خبر کیسے ہوئی؟ وہ وہاں کیسے پہنچا؟ اور وہ ان لوگوں کے وہاں سے آجانے کے باوجود بھی وہیں کیوں تھا؟ اس نے نظر کیوں چرائی؟ اس نے ٹال کیوں دیا؟ کیا وجہ تھی آخر؟ تیمور کی سوچیں اس کے دماغ سے جنگ لڑ رہی تھیں اور ہار جیت کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی تھی۔ داؤ پیچ بڑھتے جا رہے تھے اور شاید یہ جنگ مزید جاری رہتی اگر ایک اور کال نہ آجاتی۔ یہ کال ساشا کی تھی جو تھوڑی دیر پہلے ان کے گھر سے عزت کا پتا کر کے اسے کوستی ہوئی رخصت ہوئی تھی۔

"ہیلو۔۔!" تیمور نے کال ریسیو کی۔

"تیمور بھائی! عزت کہاں ہے؟ کیسی ہے وہ؟ اسے کچھ ہوا تو نہیں؟ وہ ٹھیک تو ہے نا؟" ساشا بھی چھوٹتے ہی شروع ہو گئی تھی۔ اس نے یہ خبر ابھی رپورٹ پہ سنی تھی اور وہ عزت کے لیے پریشان ہو گئی تھی۔

"اسے تمہاری بددعا لگی ہے۔ تمہیں ہی اس پہ غصہ آرہا تھا نا کہ وہ گھر سے جلدی کیوں چلی گئی ہے؟" تیمور نے جان بوجھ کر ساشا کو چھیڑنے کے لیے کہا اور اسے تھوڑی دیر پہلے کا غصہ یاد دلایا۔

"تیمور بھائی! آپ مجھے ایسا سمجھ رہے ہیں؟ میں اسے بددعا دے سکتی ہوں بھلا؟ وہ تو بس معمولی سا غصہ تھا۔ وہیں کا وہیں ختم ہو گیا۔ لیکن میں ایسا تو کبھی بھی نہیں چاہ سکتی کہ عزت کو کوئی نقصان پہنچے؟" ساشا فوراً جذباتی ہو گئی۔ تیمور بے ساختہ مسکرا دیا۔

"گڈ۔ مجھے بھی تم سے یہی امید تھی کہ تم کبھی بھی عزت کے لیے بددعا نہیں کر سکتیں۔ بلکہ دعا ہی کرتی ہو۔ جو آج اللہ نے قبول کی ہے۔ یوں سمجھو کہ آج وہ موت کے منہ سے بچ کے آئی ہے۔"

"اچھا! کہاں ہے وہ؟ اب کیسی ہے؟" ساشا نے دوبارہ استفسار کیا۔

"اسپتال میں ہے۔ اسے ڈرپ لگی ہوئی ہے۔ لیکن پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ ٹھیک ہے اب۔ کچھ دیر تک ڈسچارج ہو جائے گی تو ہم گھر آجائیں گے۔" تیمور سب کو تسلیاں دے رہا تھا۔

"ہم اسپتال آجائیں؟"

"نہیں! اس کی ضرورت نہیں ہے۔ تم منزہ آنٹی کو لے کر گھر پہنچو۔ شہر کے حالات ویسے ہی بہت خراب ہیں۔" اس نے نرمی سے کہتے ہوئے ساشا کو جلدی گھر پہنچنے کی تاکید کی۔

"او کے بھائی! اللہ حافظ۔" ساشا نے سعادت مندی سے کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔ ابھی اس کی کال بند ہوئی ہی تھی کہ آفاق کی کال آگئی۔

"ہیلو۔۔۔؟" تیمور نے کال ریسیو کی۔

"یار۔۔۔ میں ابھی آفس پہنچا' یونیورسٹی میں بم بلاسٹ کی نیوز ملی۔ تم بتاؤ! تمہیں کوئی اطلاع ملی یا نہیں؟ ساشا اور عزت تو یقیناً" یونیورسٹی گئی ہوں گی۔" آفاق خاصا متفکر ہو رہا تھا۔ تیمور ان سب کی اتنی محبت' اتنی اپنائیت اور اتنی فکرمندی پہ دل ہی دل میں مسکرا دیا۔

"ہاں۔۔۔ مجھے بھی اطلاع ملی تھی اور میں خود یونیورسٹی گیا تھا۔ جب بم بلاسٹ ہوا تو عزت وہیں پہ تھی۔ اسی صدمے اور دہشت کی وجہ سے وہ بے ہوش ہو گئی ہے اور اس وقت اسپتال میں ہے۔"

"اسے کوئی نقصان تو نہیں پہنچا؟ کوئی چوٹ تو نہیں آئی؟" آفاق نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

"نہیں' نہیں۔۔۔ بالکل ٹھیک ہے وہ۔ البتہ پارکنگ میں بلاسٹ ہونے کی وجہ سے اس کی گاڑی کا نقصان ضرور ہوا ہے۔ لیکن شکر ہے کہ اور کوئی نقصان نہیں ہوا۔ اس کی جان بچ گئی ہے۔ بس یہی اللہ کا احسان ہے۔" اس نے اللہ کا شکر ادا کیا۔

"تھینک گاڈ۔۔۔ ورنہ مجھے تو سنتے ہی بہت زیادہ پریشانی ہو گئی تھی۔ لیکن یار! ساشا کا نہیں بتایا تم نے؟ وہ کہاں ہے؟" آفاق کو دوبارہ ساشا کا خیال آیا۔

"ساشا تمہارا چھوڑا ہوا کام پورا کرنے گئی ہے۔" تیمور کے جواب پہ آفاق ٹھٹکا۔

"کیا مطلب؟ میرا چھوڑا ہوا کام؟" آفاق کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

"منزہ آنٹی کو ایئرپورٹ سے ریسیو کرنے کا کام۔" اس کے اس جواب پہ آفاق چند ثانیے کے لیے خاموش ہو گیا۔

"بے شک تمہارا اور ساشا کا منزہ آنٹی کے ساتھ برابر کا رشتہ ہے۔ تم فارہ سے منسوب ہو اور وہ حماد سے منسوب ہے۔ لیکن پھر بھی تم مرد ہو اور وہ لڑکی ہے۔ جو کام تمہارے کرنے کا تھا۔ وہ کام وہ کرنے گئی ہے۔ کیا یہ اچھی بات ہے؟" تیمور اپنے ذہن میں کلبلاتا ہوا نقطہ سامنے لے ہی آیا تھا۔

"مجھے پہلے نہیں پتا تھا کہ منزہ آنٹی آ رہی ہیں۔ میں جب گھر سے نکل رہا تھا' تب مما نے بتایا کہ وہ آ رہی ہیں۔ لیکن تب تک میں اپنی میٹنگ کا ٹائم کنفرم کر چکا تھا۔ بہت ضروری میٹنگ تھی۔ اس لیے میں کینسل بھی نہیں کر سکتا تھا۔" آفاق اپنے کہے پہ قائم تھا۔

"تمہاری میٹنگ سے زیادہ ضروری تھا ساشا کا یونیورسٹی جانا۔ لیکن منزہ آنٹی کی خاطر اس نے ایک دن یونیورسٹی جانا بھی کینسل کر دیا۔ کیونکہ اسے اس رشتے کا بہت زیادہ پاس ہے۔ جو تمہارے' ساشا کے اور آنٹی کے درمیان ہے۔ اسے قدر ہے۔ لیکن تمہیں نہیں ہے۔ ہونہہ۔۔۔ یہ کوئی طریقہ نہیں ہے آفاق! تم اگر فارہ سے بھاگ رہے ہو تو سمپل سی بات ہے کہ تم کسی روز انگیجمنٹ توڑ ڈالو۔ اسے بتا دو کہ تمہاری پسند بدل چکی ہے اور تم اپنی محبت سے پھر چکے ہو۔ اس طرح بغیر کچھ کہے' بغیر کچھ بتائے فارہ سے ریلیٹڈ رشتوں سے بھاگنے کی

کیا ضرورت ہے بھلا؟ اپنے ساتھ ساتھ اپنے ماں' باپ کو بھی ستا رہے ہو۔ کیا فائدہ تمہاری ایسی میٹنگز اور بزنس کا' جن کے باوجود۔۔۔ تمہارے ماں' باپ سکون میں نہیں ہیں کیا حاصل ہے تمہیں؟ یہ سب کس کے لیے کر رہے ہو؟ نہ بیوی ہے' نہ بچے ہیں' نہ ماں' باپ کا احساس ہے۔ تو پھر یہ سب کس لیے؟ یا پھر یہ بتاؤ کہ کوئی اور روگ پال لیا ہے تم نے؟" تیمور نے کبھی کسی کے بھی معاملے میں دخل نہیں دیا تھا اور نہ ہی وہ اس چیز کو مناسب سمجھتا تھا۔ لیکن وہ پچھلے کچھ عرصے سے تین' چار مرتبہ ثمینہ آنٹی کو آفاق کی طرف سے پریشان دیکھ چکا تھا۔ اس لیے آج اتفاقاً" آفاق سے بات ہوئی تو وہ خود کو روک نہیں سکا۔ دوسری طرف آفاق کو نہ جانے کیا ہوا تھا کہ اس نے کچھ بھی کہے بغیر فون بند کر دیا۔

تیمور حیدر اس کی اس حرکت پہ ابھی پوری طرح سے حیران بھی نہیں ہوا تھا کہ رضا حیدر اور رابعہ بیگم کمرے میں داخل ہوئے۔ تیمور انہیں دیکھ کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ تیزی سے عزت کی طرف بڑھے تھے۔ البتہ تیمور کا ذہن اس وقت حاضر نہیں تھا۔ وہ خاصا الجھا ہوا سا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس نے فون بند کرنے کے بعد ایک گہری سانس کھینچی اور اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے کرسی کی پشت سے ٹکا دیا۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ وہ بھلا کب اپنے ماں' باپ کو ستانا چاہتا تھا؟ وہ تو ایسا کرنے کا کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ لیکن پھر بھی نہ چاہتے ہوئے بھی وہ ان کی دل آزاری کا سبب بن رہا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ مسلسل ٹینشن کا شکار تھا۔ یہی ٹینشن اس کے ماں' باپ کے سر پہ بھی سوار تھی۔ اس چیز سے وہ خوش نہیں تھا اور نہ ہی وہ انہیں خوش کر سکتا تھا۔ کیونکہ ان کی خوشی فارہ رحیم تھی۔ جبکہ وہ فارہ رحیم کے نام سے بھی دور بھاگنے لگا تھا۔ کترانے لگا تھا۔ فارہ کا نام سنتے ہی اجنبی سا ہو جاتا تھا۔ یوں جیسے وہ فارہ کو جانتا تک نہ ہو۔ اس کی یہی اجنبیت اس کے ماں' باپ کے لیے تشویش اور دل آزاری کا سبب بنی ہوئی تھی۔ کیونکہ انہیں وہ وقت بھی یاد تھا کہ جب آفاق کی تمام خوشیوں کا محور صرف اور صرف فارہ کا نام ہوتا تھا۔ وہ جب جب فارہ کا نام لیتے تھے تو اس کے چہرے پہ خوشی کی لہر دوڑ جاتی تھی۔ لیکن اب وہ اس کا نام لیتے تھے تو وہ منہ موڑ لیتا تھا۔ اسی لیے تو آج کل ان کی دل آزاری اور آفاق کا غلط نامہ دن بہ دن بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ جس سے آفاق کی ٹینشن بھی بڑھ رہی تھی۔ کیونکہ پہلے یہ مسئلہ' یہ دل آزاری ان کے گھر کی چار دیواری تک ہی محدود تھی۔ لیکن آج اسے تیمور کی باتوں سے اندازہ ہوا تھا کہ اب تشہیر ہونے لگی ہے۔ اگر تیمور کو اس چیز کا احساس یا علم ہو سکتا تھا تو پھر کسی کو بھی ہو سکتا تھا۔ کوئی بھی اسے روک ٹوک سکتا تھا۔ سرزنش کر سکتا تھا۔ جو اسے ہرگز بھی گوارا نہیں تھا۔

اس وقت وہ یہی سوچ رہا تھا کہ وہ ایسا کیا کرے کہ فارہ سے دور بھی رہے اور کسی کی دل آزاری یا کسی کو کوئی دکھ بھی نہ ہو۔ یوں واویلا اور تشہیر بھی نہ ہو اور سب کچھ خاموشی سے ختم بھی ہو جائے۔

کیسا وقت تھا' کیسی اذیت تھی کہ وہ خود ہی سب کچھ ختم کر دینے کے درپے ہو رہا تھا۔ آفاق نے ایک پل کے لیے سوچا اور پھر ایک دم بے چینی اور اضطراب سے اپنی کرسی چھوڑ کر اک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

بے کلی اور اضطراب جیسے اس کے پاؤں کے تلوؤں سے لپٹ گئے تھے۔ وہ اپنے آفس ہی میں بے چین اور بے کل سا ٹہل رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس مسئلے کا کیا حل نکالے؟ اور اگر کوئی حل نکل آیا تو کیا واقعی وہ فارہ کو چھوڑ دے گا؟ کیا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس سے رشتہ ختم کر کے منہ موڑ لے گا؟ کیا اتنا حوصلہ۔۔۔ اتنا صبر۔۔۔ اور اتنی ہمت ہے اس میں؟

وہ اپنے دل کو اپنی ذات کے کٹہرے میں کھڑا کیے اس سے سوال پوچھ رہا تھا اور دل نہ جانے کیوں گردن جھکائے

ہولے ہولے نفی میں سرہلا رہا تھا۔
نہیں ،نہیں ،نہیں۔

✡ ✡ ✡

فارہ نے اسے جس بس اسٹاپ سے پک کیا تھا' واپسی پہ اسے اسی بس اسٹاپ پہ ڈراپ کردیا۔ سورج آج بھی سوا نیزے پہ کھڑا جیسے ماورا مرتضیٰ کی واپسی کا انتظار کررہا تھا۔ کسی گلی کی نکڑ پہ کھڑے نظرباز مسٹنڈے کی طرح۔ جس کی نظروں کی تیزی ماورا مرتضیٰ کو اے سی گاڑی کی ٹھنڈک سے باہر نکلتے ہی اپنے جسم پہ محسوس ہوئی تھی۔ سورج کی تیز دھوپ لوگوں کے کپڑے بھی جیسے چھید رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے یہ نوکیلی دھوپ سیدھی جسم میں گھس رہی ہو۔

''کل پھر تمہیں پک کرلوں؟'' فارہ نے دروازہ بند کرتی ماورا سے پوچھا۔

''نہیں تھینک یو یار! میں خود ہی آجاؤں گی۔'' ماورا نے انکار کردیا۔

''ارے یار! اب بس اسٹاپ سے پک کرنے میں کیا حرج ہے؟ آنٹی کو کون سا پتا چلے گا؟ خوامخواہ بسوں کے دھکے کھانے کا کیا فائدہ ہے؟'' فارہ نے اصرار کرتے ہوئے اسے قائل کرنا چاہا۔

''نہیں یار! جب کوئی مسئلہ ہو تب تو ٹھیک ہے۔ لیکن اکثر نہیں۔ تمہارا راستہ اور ہے — میرا راستہ اور ہے۔ میری وجہ سے اپنا راستہ طویل مت کرو۔ تمہیں مسئلہ ہوگا۔'' ماورا نے نفی میں سرہلاتے ہوئے جواب دیا تھا۔

''یار۔ مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ میرے پاس گاڑی ہے۔ میں آسانی سے آسکتی ہوں۔'' فارہ نے پھر اصرار کیا۔

''خیر! چھوڑو اس قصے کو۔ یہ بحث طویل ہے۔ اسے پھر کسی وقت پہ اٹھا رکھو۔ یہاں ٹھہرنا محال ہورہا ہے۔ میں جارہی ہوں اب۔''

''اللہ حافظ۔'' ماورا نے جلدی سے کہتے ہوئے سرجھکا اور اسے ہاتھ ہلا کر پلٹ گئی۔ لیکن اگلے ہی لمحے اس کے قدم ٹھٹک گئے۔ عافیہ بیگم بھی بس اسٹاپ پہ ویگن سے اتری تھیں۔ ماورا کو چمکتی دمکتی کار سے اترتے دیکھ کر ان کے قدم بھی ٹھٹک گئے تھے۔ وہ ماورا کو اور ماورا ان کو دیکھ چکی تھی۔ نظروں کا تصادم ہوا تو ماورا نے نظریں جھکالیں۔

''السلام علیکم۔'' اس نے انہیں سلام کیا۔ لیکن وہ اس کے سلام کا جواب دیے بغیر خاموشی سے رخ موڑ کر گھر کے راستے کی سمت قدم بڑھا چکی تھیں اور یہ ان کی طرف سے غصے اور لاتعلقی کا اظہار تھا۔ وہ اس کے آگے آگے چل رہی تھیں اور ماورا سرجھکائے ان کے پیچھے پیچھے آرہی تھی۔ سورج کی تیز اور گرم نظروں کا احساس بھی پس پشت چلا گیا تھا۔ کیونکہ اس وقت اس پہ ماں کی غصیلی اور لاتعلق نظروں کا احساس زیادہ حاوی تھا اور وہ ننھی کے بچے کی طرح سیدھی — اپنی ماں کے پیچھے جارہی تھی۔ یوں جیسے ایک قدم بھی رکی تو ماں سے بچھڑ جائے گی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے راستہ بھٹک جائے گی۔ جبکہ وہ نہ تو راستہ بھٹکنا چاہتی تھی اور نہ ہی ماں سے بچھڑنا چاہتی تھی۔ اس لیے بالکل ان کی سیدھ میں چلتی ہوئی گھر کے سامنے آرکی۔ انہوں نے کافی آہستگی سے دروازہ بجایا۔

''آرہی ہوں بیٹا! آرہی ہوں۔'' بی گل بھی جیسے انتظار میں بیٹھی تھیں۔ ان کی آواز کے بعد چپل گھسیٹ کر چلنے کی آواز برآمدے سے سنائی دیتی ہوئی دروازے تک آئی اور پھر فوراً دروازہ کھل گیا۔

''السلام علیکم!'' عافیہ بیگم ہی سامنے کھڑی تھیں۔ اس لیے پہلے سلام بھی انہوں نے ہی کیا تھا اور پھر اندر داخل ہوگئیں۔

''وعلیکم السلام بیٹا!'' بی گل سلام کا جواب دیتے ہوئے دروازہ بند کرنے ہی والی تھیں کہ ان کے پیچھے ماورا کو دیکھ کر ٹھٹک گئیں۔

''السلام علیکم!'' ماورا نے کافی دھیمی آواز میں سلام کیا اور اندر داخل ہوگئی۔

''وعلیکم السلام!'' آج دونوں ساتھ ہی آگئی ہو۔'' وہ حیران ہوتی ہوئی دروازہ بند کرکے ان دونوں کے پیچھے ہی آگئیں۔ عافیہ بیگم اپنا بیگ اور چادر رکھنے کے لیے کمرے میں چلی گئیں۔ ماورا وہیں برآمدے میں تخت پہ بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد عافیہ بیگم کمرے سے نکل کر کچن میں گئیں اور خاموشی سے بغیر کچھ کہے کھانا گرم کرنے لگیں ان کو خاموشی سے کھانا گرم کرتے دیکھ کر ماورا نے سینڈل اتارے اور چپل پہن کر واش روم کی سمت آگئی۔ منہ ہاتھ دھو کر واپس آئی تو کھانا لگ چکا تھا۔ عافیہ بیگم کو خاموشی سے کھانا کھاتے دیکھ کر وہ بھی چپ چاپ بیٹھ گئی۔ انہوں نے اس کا انتظار بھی نہیں کیا اور کھانا شروع کرلیا تھا۔ جس پہ بی گل کھٹک گئیں کہ ضرور کچھ ہوا ہے۔ ورنہ ان دونوں ماں بیٹی کے ہوتے ہوئے اتنی خاموشی؟ ایک ناممکن اور ناقابل یقین سی بات تھی۔

''کیا ہوا ہے؟'' کھانا ختم کرنے کے بعد ماورا نے برتن سمیٹ کر کچن میں رکھے اور اپنے کمرے میں جارہی تھی۔ جب بی گل کی آواز پہ اس کے قدم ٹھہر گئے۔

''کچھ نہیں۔'' وہ آہستگی سے کہہ کر دوبارہ کمرے کی طرف قدم بڑھا چکی تھی۔

''ماورا!'' اب کی بار بی گل نے ذرا سختی سے پکارا۔ ماورا کو ایک بار پھر رکنا پڑا۔

''بی گل! کھانا… کچھ نہیں ہوا۔'' ماورا ڈھیلے ڈھالے اور جھنجلائے ہوئے انداز میں بولی۔

''میرے سامنے آکر بیٹھو۔'' انہوں نے تخت کی طرف اشارہ کیا تھا۔ مجبوراً ماورا بے دلی سے قدم اٹھاتی ہوئی پلٹ کر تخت پہ آبیٹھی۔ تخت کے مقابل ہی بی گل کرسی پہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کی نظریں ماورا کے چہرے پہ جمی ہوئی تھیں۔

''ہوں… کہو… کیا ہوا ہے؟'' انہوں نے ماورا کو بولنے پہ اکسایا۔

''بسوں کی ہڑتال ہوگئی تھی آج۔'' وہ بے حد آہستگی سے گویا ہوئی۔

''پھر…؟'' انہوں نے اگلی بات سننا چاہی۔

''پھر یہ کہ صبح جب میں گھر سے گئی تھی تو مجھے نہیں پتا تھا کہ آج بسوں کی ہڑتال ہے۔ میں کافی دیر بس اسٹاپ پہ کھڑی بس کا انتظار کرتی رہی۔ لیکن بس کا تو دور دور تک نام و نشان ہی نہیں تھا۔ تب وہیں ایک بوٹ پالش کرنے والے نے بتایا کہ کل اسی روڈ پہ ڈرائیور' کنڈیکٹر اور کالج کے کچھ لڑکوں کا آپس میں جھگڑا ہوگیا تھا۔ اس لیے آج تمام ڈرائیوروں نے مل کر بسوں کی ہڑتال کردی ہے اور آج کوئی بس نہیں آئے گی۔ آپ کو پتا ہے۔ آج کل ایگزامز قریب ہیں۔ یونیورسٹی کا ایک دن بھی مس نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن پھر بھی میں پریشان اور مایوس ہوکر واپس گھر آرہی تھی کہ میری کلاس فیلو فارہ وہاں پہنچ گئی اور میں چاہتے ہوئے بھی اس کی آفر ٹھکرا نہیں سکی اور اس سے لفٹ لے لی۔ اب واپسی پہ دوبارہ وہی مسئلہ تھا۔ اس لیے مجھے واپسی پہ بھی اسی کے ساتھ آنا پڑا۔ وہ مجھے بس اسٹاپ تک ڈراپ کرگئی ہے۔ اور امی…'' ماورا آخری جملہ ادھورا چھوڑ کر چپ ہوگئی اور بی گل اتنی عقل تو ضرور رکھتی تھیں کہ اس کی پوری بات سمجھ گئی تھیں۔

''تو اس میں اتنا غصہ کرنے اور اتنا برا لگنے والی کیا بات ہے بھلا؟'' بی گل نے خفگی سے کہتے ہوئے کمرے کی طرف دیکھا۔ کیونکہ عافیہ بیگم کھانا کھاتے ہی اٹھ کر کمرے میں چلی گئی تھیں۔

''اس میں برا لگنے والی بات یہ ہے کہ اس کو میری یا میری کسی بات کی کوئی پروا نہیں ہے۔'' عافیہ بیگم غصے سے

کہتے ہوئے باہر نکل آئیں۔

"ارے! ایسے ہنگاموں اور ایسے حالات میں تو بندہ کچھ بھی کر لیتا ہے۔ وہ تو پھر بھی اپنی دوست' اپنی کلاس فیلو کے ساتھ گئی اور آئی ہے؟" بی گل نے بھی انہیں غصے سے دیکھا۔

"نہ جاتی۔۔۔ گھر واپس آجاتی۔ کوئی قیامت نہیں آنے والی تھی۔ اگر ایک دن میں ہو جاتا تو۔۔۔؟" ان کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہو رہا تھا اور غصے میں وہ یہ بھی بھول گئی تھیں کہ وہ خود ایک استاد ہیں۔ جو تعلیم کی اہمیت سے بخوبی آگاہ ہیں۔

"کیا لڑکی کے بجائے کسی لڑکے کے ساتھ آئی ہے' جو اتنا غصہ آرہا ہے تمہیں؟"

"مجھے بھی پتا ہے کہ لڑکی کے ساتھ ہی آئی ہے اور اس لڑکی کو دیکھا بھی ہے۔ آج نہیں' پہلے بھی دیکھ چکی ہوں تب بھی میں نے اُسے منع کیا تھا۔ لیکن یہ پھر بھی باز نہیں آئی۔ میری ضد میں ایسا کرتی ہے۔ کوئی ہڑتال نہیں تھی آج۔ ہوتی تو مجھے بھی پتا چلتا۔" عافیہ بیگم خاصی بدگمان ہو رہی تھیں۔ حالانکہ انہیں پتا بھی تھا کہ ماورا جھوٹ نہیں بولتی۔ کبھی کچھ بھی ہو جاتا۔ وہ غلط بیانی سے کام نہیں لیتی تھی۔ لیکن پھر بھی غصے میں وہ اسے ہی غلط قرار دے رہی تھیں۔

"تمہیں کس نے کہا کہ آج ہڑتال نہیں تھی؟" بی گل کے سخت لہجے پہ عافیہ بیگم ٹھٹک گئیں۔

"جاؤ پوچھو۔۔۔ یہ اپنے ساتھ والی امبرین سے۔ اس نے آج سرگودھا جانا تھا اپنے میکے۔ لیکن بس نہیں ملی اسے۔ اپنے میاں اور بچوں کے ساتھ بے چاری اتنی دھوپ میں خوار ہو کر واپس گھر آگئی ہے۔" بی گل کے کہنے پہ عافیہ بیگم کو احساس ہو گیا کہ وہ خود ہی غلطی پر ہیں۔ لیکن وہ اپنی غلطی تسلیم کرنے کے لیے اتنی جلدی تیار بھی نہیں تھیں۔ جبکہ بی گل انہیں تاسف بھری نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

"وہ گھر آسکتی ہے تو یہ بھی گھر آسکتی تھی۔ اس لڑکی کے ساتھ جانا ضروری تھا کیا؟" عافیہ بیگم کو اصل مسئلہ اس لڑکی ہی سے تھا۔ وہ جانتی تھیں کہ وہ لڑکی خاصی امیر کبیر لڑکی ہے۔ اس لیے نہیں چاہتی تھیں کہ ماورا کی اور اس لڑکی کی دوستی پروان چڑھے جبکہ ماورا اس سے دوستی ختم کرنے کو تیار نہیں تھی۔ ان دونوں کا ساتھ کالج سے چلا آرہا تھا۔ اتنے سال ہو گئے تھے۔ اب وہ کیسے اتنی آسانی سے ایک دوسرے کو چھوڑ دیتیں؟ وہ جو چاہتی تھیں' ماورا کے لیے ایک ناممکن سی بات تھی۔

"وہ لڑکی بری نہیں ہے عافیہ!" بی گل ہمیشہ کی طرح ماورا کی ہی طرف دار تھیں۔

"پہلے پہل کوئی بھی برا نہیں ہوتا اور جب ہوتا ہے۔ تب ہمیں خبر نہیں ہوتی۔" عافیہ بیگم کے لہجے میں تلخی در آئی۔

"تو خبر رکھنی چاہیے نا۔ خبر نہ رکھنا ہماری اپنی غلطی' اپنی بے وقوفی ہوتی ہے۔ اس میں کسی دوسرے کو کیا الزام دینا؟" بی گل ان سے بھی زیادہ تلخ ہوئیں۔

"بی گل۔۔۔!" عافیہ بیگم انہیں دیکھ کے رہ گئیں۔

"ہم بے وقوف ہیں تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہماری آنے والی نسل بھی بے وقوف ہی ہو گی؟ اللہ بدصورت انسان کو خوب صورت' برے انسان کو نیک اور بے وقوف انسان کو سمجھ دار' عقل مند اور ذہین اولاد دیتا ہے۔ تاکہ وہ اپنے ماں' باپ کی رہ جانے والی کمزوریوں اور خامیوں کو دور کر سکے اور۔۔۔ تمہارے لیے ایک ایسی ہی اولاد ہے۔۔۔ لیکن تم کبھی بھی اس چیز کو سمجھ نہیں سکتیں۔ تم کل بھی بے وقوف تھیں' آج بھی بے وقوف ہو۔ تمہاری ان بے وقوفیوں کا افسوس مجھے ہمیشہ رہے گا۔"

بی گل کی سرزنش پہ عافیہ بیگم چپ کی چپ رہ گئیں۔ ان کا دل بھر آیا۔۔۔ بلکہ دھاڑیں مار مار کر رونے کو چاہ رہا تھا۔ ان کی اس اندرونی کیفیت کو دل سے محسوس کرتی ماورا کو اس وقت سخت بے بسی اور ندامت سی ہوئی تھی۔ کیونکہ وہ اکثر اس کی وجہ سے یوں ہی اذیت کا شکار ہو جاتی تھیں اور ماورا کوشش کے باوجود بھی خود کو ایسی حرکتوں سے باز نہیں رکھ پاتی تھی' جو عافیہ بیگم کو گراں گزرتی تھیں۔

"آئی ایم سوری امی! کوشش کروں گی کہ آئندہ ایسا نہ ہو۔۔۔ آئندہ اگر کبھی ہڑتال ہوئی بھی تو واپس گھر آجاؤں گی۔ کسی کے ساتھ جاؤں گی نہیں۔" ماورا آہستگی سے کہہ کر اٹھی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ عافیہ بیگم نے چونک کر اس کے پیچھے دیکھا۔ بی گل انہیں دیکھ کر تاسف سے سر ہلاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"میں تمہاری یا اس کی دشمن نہیں ہوں۔ میں جب بھی چاہوں گی' تم دونوں کا بھلا ہی چاہوں گی۔ کیونکہ میرا بھی تم دونوں کے علاوہ اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ میں تم دونوں کو خوش دیکھنا چاہتی ہوں اور تم دونوں اس وقت ہی خوش رہ سکتی ہو' جب ایک دوسرے کو صبر اور تحمل کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کرو گی۔ ماورا غلط نہیں ہے۔ تم خود سوچو' وہ جوان ہے۔ اس کی امنگیں' اس کی سوچیں' اس کے ارادے جوان ہیں۔ وہ جس طرح جینا چاہتی ہے' اسے جینے دو۔ جو کرنا چاہتی ہے' اسے کرنے دو۔ مجھے یقین ہے اس پہ۔۔۔ بھروسا ہے کہ وہ کبھی کچھ غلط نہیں کرے گی۔ وہ آج کل کے بچوں کی طرح بگڑی ہوئی نہیں ہے۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ تمہاری بیٹی عزت دار' باحیا' نیک اور غیرت مند ہے۔ غیر اور نامحرم مردوں کے چکر میں آنے والی بالکل نہیں ہے۔ ورنہ آج کل کے کمپیوٹر اور موبائل کے دور میں بھی اتنی سعادت مند اور شریف النفس اولاد کسی کی ہے بھلا؟ وہ اگر سیدھی چل رہی ہے تو اسے چلنے دو۔ اس کے گرد پابندیاں اور حدیں نہ باندھو۔ وہ اپنی ہم عمر لڑکیوں کے پاس بیٹھے گی نہیں' کسی سہیلی کے ساتھ باتیں نہیں کرے گی' ہنسے بولے گی نہیں تو پاگل ہو جائے گی۔ انسان کا اکیلا پن اور تنہائی اسے نفسیاتی مریض بنا دیتے ہیں۔۔۔ آخر تم کیوں اسے ایسا بنا دینا چاہتی ہو عافیہ۔۔۔ زندگی اس طرح نہیں گزرتی کہ انسان بھری دنیا میں اکیلا ہو کر بیٹھ جائے۔۔۔ تم نے اکیلے ایک کونے میں لگ کر زندگی گزار لی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اب تم اس سے بھی یہی کام کرواؤ۔ اس کے لیے تو ابھی پوری زندگی پڑی ہے اس کے سامنے' پوری دنیا ہے۔ اس نے ابھی دیکھا ہی کیا؟ گھر سے یونیورسٹی اور یونیورسٹی سے گھر۔۔۔ بس یہ ہے اس کی زندگی۔۔۔ صرف اتنی سی۔۔۔ کیا تم یہی چاہتی ہو کہ وہ یہیں پہ جیے اور یہیں پہ مر جائے؟ اگر یہی کرنا تھا اور اسے اس طرح باندھ کے رکھنا تھا تو پھر اس کے اندر اتنی عقل و شعور جگانے کی اور اتنا پڑھانے لکھانے کا تردد کرنے کی کیا ضرورت تھی بھلا؟ اپنے دماغ کو ٹھنڈا کرو اور فرصت سے بیٹھ کے سوچو کہ کون کہاں غلط ہے؟ تم غلط ہو' میں غلط ہوں' یا تمہاری بیٹی غلط ہے؟ سوچو اور پھر سمجھنے کی کوشش کرو۔ اللہ تمہیں ہمت اور ہدایت دے' آمین۔" وہ نرمی اور شفقت سے عافیہ بیگم کا سر تھپک کر باتھ روم کی سمت چلی گئیں اور عافیہ بیگم اپنی بے بسی پہ رو پڑیں۔

☼ ☼ ☼

ایک گرم اور قیامت خیز دن اپنے اختتام کو پہنچ رہا تھا اور رات پورے ماحول پہ اپنی سرمئی اوڑھنی پھیلا رہی تھی۔ تاکہ اس گرم اور قیامت خیز دن کا چہرہ سب کی نظروں سے چھپ جائے اور سب کو اطمینان ہو جائے کہ دن تمام ہو چکا ہے۔ لیکن اس دن نے تو زمانے میں کیا کیا حشر اٹھائے تھے۔ یہ تو کوئی ان ماؤں سے پوچھتا' جن کے گھروں میں صف ماتم بچھی ہوئی تھی۔ جن کے گھروں کے چراغ بجھ چکے تھے۔ جن کے ہنستے کھیلتے گھر اجڑ گئے تھے۔

اور انہی گھروں میں ایک گھر رضا اور رابعہ بیگم کا بھی تھا۔ جسے اللہ نے بال بال بچا لیا تھا اور ان کی بیٹی کو ذرا سی بھی آنچ نہیں آئی تھی۔ جس پہ وہ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتے ہوئے انہوں نے صبح سے اب تک کئی بار

صدقہ دیا تھا۔ بلکہ انہوں نے تو اس بم بلاسٹ میں ہلاک اور زخمی ہونے والے اسٹوڈنٹس کے لیے دس لاکھ کا عطیہ بھی دیا تھا اور تیمور کو ان کا یہ اقدام بہت پسند آیا تھا۔ وہ بہت خوش ہوا تھا۔ پانچ لاکھ روپے اس نے اپنے ذاتی اکاؤنٹ سے بھی عطیہ کیے تھے۔ کیونکہ اس طرح کرنے سے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے اسٹوڈنٹس کے والدین کی تھوڑی بہت امداد ہو سکتی تھی۔ حالانکہ ان کا جو نقصان ہو چکا تھا۔ وہ تو اب زندگی میں کبھی بھی پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک ناقابل تلافی نقصان۔ جس کا دکھ اور افسوس آج بچے بچے کے دل میں تھا۔ بلکہ آج تو ماحول میں بھی عجیب نوحہ کناں سی افسردگی پھیلی ہوئی تھی۔ روزانہ والی تازگی اور ٹھنڈک مفقود تھی۔

شام کے سائے پھیلے تو رضا حیدر ڈرائنگ روم کے ٹھنڈے اور پرسکون ماحول سے نکل کر باہر لان میں آ گئے۔ جہاں بید کی نفیس اور آرام دہ کرسیوں میں سے ایک کرسی پہ تیمور حیدر پہلے سے ہی براجمان تھا۔ ان کو وہاں آتے دیکھ کر وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"کیا بات ہے برخوردار! اکیلے کیوں بیٹھے ہو؟" رضا حیدر اس کے مقابل والی کرسی پہ بیٹھ گئے۔

"بس۔ محسوس کر رہا تھا کہ تنہائی اور اکیلا پن کیسا ہوتا ہے؟ کیا فیلنگز ہوتی ہیں انسان کی؟" تیمور نے کافی پرسکون اور سنجیدہ سے انداز میں جواب دیا۔

"پھر کیسا لگا؟ کیا محسوس کیا؟" انہوں نے دلچسپی سے پوچھا۔

"میں بتاؤں گا تو آپ کو ہنسی آئے گی۔" تیمور کو پہلے سے اندازہ تھا۔

"او کے۔ کوشش کروں گا کہ ہنسی نہ آئے۔ تم بتاؤ! کیا محسوس کیا تم نے؟" رضا حیدر آج کے ناخوش گوار ماحول کے باوجود تیمور کی بات پہ بے ساختہ مسکرا اٹھے۔

"میں نے تو یہ محسوس کیا ہے کہ میری کوئی فیلنگز ہی نہیں ہیں۔ میرے پاس ایسا کچھ نہیں ہے۔ جس کو میں تنہائی میں بیٹھ کر سوچوں تو مجھے تنہائی بھی اچھی لگے۔ میرے ذہن میں کام کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔ میری ہر سوچ گھوم پھر کر کام کی طرف ہی جاتی ہے اور اس وقت بھی میرے ذہن میں یہی سوچ ہے کہ آج میری اسلام آباد والی میٹنگ کینسل ہوئی ہے تو دوبارہ وہی میٹنگ کب اور کہاں ہوگی۔" تیمور نے کافی اکتائے ہوئے سے انداز میں اپنی کیفیت کا اظہار کیا۔ رضا حیدر بے اختیار قہقہہ لگا کر ہنسے۔ حالانکہ انہوں نے تیمور سے نہ ہنسنے کا وعدہ کیا تھا۔

"یعنی۔ تمہیں اب تنہائیوں میں سوچنے کے لیے کچھ چاہیے؟ آخر کار ہمارے صاحبزادے کو ضرورت پیش آ ہی گئی۔" رضا حیدر نے ہنستے ہوئے معنی خیزی سے بیٹے کو دیکھا تیمور تھوڑا سا خجل ہو گیا۔

"نہیں! اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ فی الحال ایسی کسی بھی چیز کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ جس کا آپ اشارہ دے رہے ہیں۔ میں تو محض آپ کو اپنی فیلنگز بتا رہا تھا کہ میں جب بھی اکیلا بیٹھتا ہوں۔ کبھی کچھ سوچنے کی کوشش کرتا ہوں تو میرے ذہن میں کام کے علاوہ اور کچھ نہیں آتا۔ میری تمام سوچیں کام کے متعلق ہی ہوتی ہیں۔" تیمور جیسے اپنے آپ پہ حیران ہو رہا تھا۔

"یہ ایک محنتی اور کامیاب انسان کے ذہن کی علامت ہے۔ لیکن بیٹا! میرا مشورہ ہے کہ اپنی سوچوں میں تھوڑی تبدیلی لاؤ۔ رنگ بھرو۔ اگر یوں ہی خشک سی سوچوں میں پڑے رہے تو دماغ کے ساتھ ساتھ تمہاری شخصیت بھی خشک ہو جائے گی۔" انہوں نے بیٹے کو کافی دوستانہ مشورہ دیا۔

"تبدیلی لانے اور رنگ بھرنے سے کیا مراد ہے آپ کی؟" تیمور نے ان کے مشورے کا اصل مفہوم جاننا چاہا۔

"یہی کوئی لڑکی' کوئی پسند' کوئی عشق و عاشقی وغیرہ' کوئی تحفے تحائف' کوئی ملنا ملانا' کوئی عہد و پیمان وغیرہ اور پھر ہم سے مطالبہ کہ لڑکی کے گھر پروپوزل لے کر جائیں اور شادی کی ڈیٹ ذرا جلدی فکس کریں۔ ایسی رنگین سوچوں میں پڑو گے تو دماغ فریش اور چاق و چوبند رہے گا۔ پھر تم سوچوں سے پیچھا چھڑاؤ گے اور سوچیں تمہارا پیچھا نہیں

چھوڑیں گی۔ ذہن و دل آباد ہو جائیں گے تمہارے۔" رضا حیدر نے بیٹے کو کافی تفصیلی اور تسلی بخش جواب دیا۔ جس پہ تیمور ہنس پڑا۔

"اگر ایسی بات ہے تو پھر میں باز آیا ایسی رنگین سوچوں سے۔" اس نے پہلے ہی ہتھیار ڈال دیے۔

"ارے! وہ کیوں؟" رضا حیدر کو حیرت ہوئی تھی۔

"کیونکہ جن کاموں کی لسٹ آپ گنوا رہے ہیں۔ وہ میں ہرگز نہیں کر سکتا۔ نہ تو عشق و عاشقی میں پڑ سکتا ہوں۔ نہ تحفے تحائف خرید سکتا ہوں اور نہ ہی عہد و پیمان کر سکتا ہوں۔ یہ کام میرے بس سے باہر ہیں۔ ہاں! البتہ لڑکی کو پسند ضرور کر سکتا ہوں۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

"تو پھر بیٹا جی! آپ سمجھ لو کہ آپ شادی نہیں کر سکتے۔ بلکہ یہ سمجھ لو کہ آپ کی شادی ہو ہی نہیں سکتی۔" انہوں نے مایوسی سے ہاتھ جھاڑے۔

"وہ کیوں؟" اب کی بار تیمور کو حیرت ہوئی۔

"کیونکہ آج کل صرف پسند کر لینے سے کوئی بھی لڑکی شادی نہیں کرتی۔ پسند کے ساتھ ساتھ عشق و عاشقی' تحفے تحائف اور عہد و پیمان کا ہونا بہت ضروری سمجھا جاتا ہے۔ تاکہ لڑکی کو یقین آ جائے کہ اس کا ہونے والا شوہر شادی کے بعد بھی اس کے ناز نخرے اٹھا سکتا ہے۔ اس میں ایسی کوالٹیز ہیں کہ اس سے شادی کی جا سکے۔" انہوں نے اسے آگاہ کیا۔

"تو پھر آپ بے فکر ہو جائیں۔ میں ایسی لڑکی پسند کروں گا۔ جسے عشق و عاشقی' تحفے تحائف اور عہد و پیمان سے کوئی غرض نہیں ہو گی۔ جس کے لیے یہی کافی ہو گا کہ تیمور حیدر اسے پسند کرتا ہے۔" تیمور نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"چلو بیٹا جی۔ جب ایسا ہو گا تو دیکھیں گے۔" رضا حیدر نے ناامیدی سے سر ہلایا۔ اتنے میں تیمور کے سیل پہ اس کی پی اے سحرش زمان کی کال آ گئی اور وہ مسکرا دیا۔

"دیکھیں گے تو آپ تب۔ جب مجھے ان کاموں سے فرصت ملے گی۔" وہ سیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہنستا ہوا اٹھ گیا اور رضا حیدر رابعہ بیگم کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ جو ان کے لیے چائے لے کر آ رہی تھیں۔ وہ اکثر رضا حیدر کے لیے خود چائے بنا کر لاتی تھیں۔ کیونکہ رضا حیدر کو ان کے ہاتھ کی چائے بہت پسند تھی۔

☼ ☼ ☼

صبح سے شام ہوگئی تھی۔ لیکن آفاق یزدانی کی آمد کے کہیں دور' دور تک بھی آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

"لگتا ہے آفاق کے لیے آج کا دن کچھ زیادہ ہی مصروف دن تھا۔" منزہ رحیم کہے بغیر رہ نہیں سکیں اور ثمینہ یزدانی کا رنگ بدل گیا۔ وہ بہن کو جواباً بھلا کیا کہتیں۔ پورا دن تو بس یہی کہنے میں گزر گیا تھا کہ وہ مصروف ہے۔ اس کی میٹنگ ہے۔ لیکن اب تو شام بھی رات میں تبدیل ہو رہی تھی۔ اب کیا کہتیں؟ بھلا ایسی کون سی میٹنگ اور ایسی کون سی مصروفیت تھی جو صبح سے لے کر رات تک چل رہی تھی؟

منزہ رحیم کا سوال بھی بجا تھا۔ وہ ان کے گھر آئی ہوئی تھیں اور آفاق یزدانی گھر سے ہی غائب تھا۔

"بس وہ آج کل اشتیاق آفس نہیں جا رہے۔ اس لیے کام کا زیادہ بردن اسی پہ ہے۔ اس لیے اکثر لیٹ ہو جاتا ہے۔" ثمینہ رضوی نے ایک بار پھر منزہ کے ساتھ ساتھ خود کو بھی تسلی دی اور منزہ بہن کا چہرہ دیکھ کے رہ گئیں اور پھر ایک گہری سانس کھینچتے ہوئے ان کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"میں تمہاری بہن ہوں ثمینہ! اور تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں۔ بہت اچھی طرح جانتی ہوں تمہیں۔ اس لیے مجھے پتا ہے کہ تم پریشان ہو اور اپنی پریشانی مجھ سے چھپا رہی ہو۔ کیونکہ اس پریشانی کا تعلق یقیناً" آفاق سے ہے اور تم مجھے بتاتے ہوئے گھبرا رہی ہو۔ لیکن پلیز! تمہیں مجھ سے کچھ چھپانے کی یا گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے صاف صاف بتاؤ کہ اصل مسئلہ کیا ہے؟ آخر ایسی کیا بات ہے کہ تم نے مجھے یہاں بلایا بھی ہے اور بتا بھی نہیں رہیں؟" منزہ رحیم نے ان کا ہاتھ دباتے ہوئے ان کی ہمت بندھائی اور انہیں کچھ کہنے پہ اکسایا۔ جس پہ ثمینہ رضوی کا دل بھر آیا تھا۔

"منزہ... میرا آفاق ایسا نہیں تھا۔ پتا نہیں کیا ہو گیا ہے اسے... وہ... وہ... ہم سب سے دور ہو گیا ہے۔ دور ہو گیا ہے ہم سب سے۔" ثمینہ کہتے ہوئے رو پڑیں اور پھر اتنی شدت سے روئیں کہ منزہ پریشان ہو گئیں۔

"ثمینہ... یہ کیا طریقہ ہے بھئی؟ سنبھالو اپنے آپ کو... کیا ہو گیا ہے... آخر کچھ پتا بھی تو چلے؟" انہوں نے بہن کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

"منزہ... میرا اینق مر گیا ہے۔ لیکن میں اس کا غم سینے میں دبائے صرف اور صرف آفاق کی خاطر جی رہی ہوں۔ لیکن اب جو غم آفاق دے رہا ہے۔ اس کو دبا کے میں جی نہیں پاؤں گی۔ میرے اعصاب جواب دے چکے ہیں... اور وہ جانتا ہی نہیں کہ اس کی ماں اندر سے کھوکھلی ہو چکی ہے۔ اس طرح رہے گا تو مر جائے گی۔" ثمینہ بے تحاشا رو رہی تھیں۔ منزہ خاموشی سے ان کے مزید کچھ کہنے کی منتظر تھیں۔

"فارہ کا نام لے لے کر جیتا تھا۔ اب... اب اس کا نام بھی نہیں لینے دیتا۔ وہ... وہ... فارہ سے انگیجمنٹ کے چار ماہ بعد تک بالکل ٹھیک ٹھاک اور خوش باش تھا۔ لیکن چار ماہ بعد پتا نہیں کیوں وہ بدلنا شروع ہو گیا۔ اس کے سارے طور طریقے ہی بدل گئے۔ اس کی خوبیاں' خامیوں میں تبدیل ہو گئیں۔ میں اس چیز کو وقتی تبدیلی سمجھتی رہی' لیکن اب... اب... احساس ہوا ہے کہ وقتی تبدیلی دائمی تبدیلی کا روپ دھار چکی ہے۔ اس آفاق کا تو شائبہ تک نہیں رہا' جو فارہ کا دیوانہ اور محبت کا دعوے دار تھا۔ جو کہتا تھا کہ میری شادی بھی انگیجمنٹ کے روز ہی نپٹا دو۔ جسے فارہ کو گھر لانے کی جلدی تھی اور ہم نے بڑی مشکل سے اسے فارہ کی اسٹڈیز کمپلیٹ ہونے تک روکا تھا اور اب... اب... جب فارہ کی اسٹڈیز تقریباً" کمپلیٹ ہو چکی ہے۔ صرف مہینے دو مہینے کی بات ہے تو وہ شادی کے لیے تیار ہی نہیں ہے۔ جب بھی بات کرو ٹال دیتا ہے۔ وہ رضامند ہی نہیں ہے۔ پتا نہیں کیا چاہتا ہے اور ایسا

کیوں کر رہا ہے؟ میں یہ سب سوچ سوچ کر مر جاؤں گی۔ فارہ میری بیٹی ہے۔ میرے گھر کی بہو بھی وہی بنے گی۔ ورنہ میری زندگی کی امید نہ رکھے کوئی بھی۔" وہ یہ سب کہتے ہوئے ہچکیوں سے رو رہی تھیں اور منزہ ششدر سی جہاں کی تہاں بیٹھی رہ گئیں۔ انہیں فارہ کی باتوں سے ہی آفاق کی لاپروائی کا اندازہ ہو چکا تھا۔ لیکن وہ اس حد تک جا چکا ہے۔ اس کی امید نہیں تھی انہیں۔ ثمینہ کے انکشاف نے انہیں گنگ کر ڈالا۔

"بہت دنوں سے میرے دل پہ بوجھ تھا اس بات کا۔ میں سہار نہیں پا رہی تھی۔ مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ اس لیے جب کوئی بھی راستہ نہیں ملا تو تمہیں بلا لیا۔ حالانکہ میں جانتی تھی کہ تم اس بات سے ہرٹ ہو سکتی ہو۔ لیکن منزہ! میں چھپا کے نہیں رکھ سکتی تھی۔ اگر ایسا کرتی تو تب بھی تمہیں لا زما" ہرٹ ہونا تھا۔ اس لیے میں نے بتا دینا ہی بہتر سمجھا اور میری اس سوچ کو غلط مت سمجھنا۔ میرے لیے فارہ سے زیادہ اور کوئی اہم نہیں ہے۔" ثمینہ روتے ہوئے کہہ رہی تھیں' جبکہ منزہ کے ذہن میں فارہ اور ثمینہ کی ملی جلی آوازیں اور الفاظ گردش کر رہے تھے۔ وہ کچھ کہنے کے قابل ہی نہیں رہی تھیں۔

"منزہ... کچھ کہو گی نہیں کیا؟" انہیں منزہ کی خاموشی سے بے چینی ہونے لگی۔

"کیا کچھ کہنے کے لیے باقی ہے ابھی؟" منزہ کا لہجہ بے تاثر اور سپاٹ ہو گیا۔

"اس میں ہماری تو کوئی غلطی نہیں ہے نا؟ ہم تو خود پریشان ہیں... تمہیں اس لیے بتایا ہے کہ تم ہی کچھ سوچ کر اس مسئلے کا کوئی حل نکالیں۔" ثمینہ کا لہجہ دھیما پڑ گیا۔ وہ نڈھال ہو چکی تھیں۔

"کیا وہ کسی اور کو پسند کرنے لگا ہے؟" منزہ نے بہن کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں... میں... اس بارے میں فی الحال کچھ نہیں کہہ سکتی... یہ... یہ تو وہی بتا سکتا ہے کہ کیا وجہ ہے؟ لیکن میرا دل نہیں مانتا کہ وہ فارہ کے علاوہ کسی اور کو پسند کر سکتا ہے۔" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولیں۔ ان کے لہجے میں جیسے یقین تھا۔

"تو پھر وہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟" منزہ کے لہجے میں تلخی در آئی۔

"مجھے پتا ہوتا کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے تو پھر غم کس بات کا تھا؟" ثمینہ کے انداز میں بے بسی اور شکستگی تھی۔ منزہ چند ثانیے کے لیے پھر چپ ہو گئیں۔

اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتیں' ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے پہ کسی کے قدموں کی چاپ ابھری۔ ان دونوں نے چونک کر دیکھا۔

"السلام علیکم!" وہ کافی سنجیدہ اور ٹھہرے ہوئے انداز میں سلام کرتا اندر داخل ہوا۔

"السلام علیکم منزہ آنٹی! کیسی ہیں آپ؟" وہ ان کے مقابل والے صوفے پہ بیٹھتے ہوئے بطور خاص صرف ان سے مخاطب ہوا۔

"وعلیکم السلام! ٹھیک ہوں۔ اللہ کا کرم ہے۔" وہ کافی نپے تلے سے انداز میں جواب دے کر صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ وہ ان کی بیٹی کا دل برباد کرنے پہ تلا ہوا تھا اور وہ اس سے خوش خوش مل لیتیں؟ یہ کیسے ہو سکتا تھا بھلا؟

"منزہ... کہاں جا رہی ہو تم؟" ثمینہ چونک گئیں۔

"تھکی ہوئی ہوں۔ نیند آ رہی ہے۔" وہ کہہ کر ڈرائنگ روم سے باہر نکل گئیں اور آفاق دیکھتا رہ گیا۔ اسے منزہ سے ایسے رویے کی ہرگز بھی توقع نہیں تھی۔ آفاق نے بے ساختہ سوالیہ نظروں سے ماں کی طرف دیکھا۔

جس پہ وہ بھی لاتعلق سے انداز میں اٹھ کر چلی گئیں اور وہ اکیلا بیٹھا رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

رات کے دو بجے کا وقت تھا۔ جب اس نے اپنے گھر کا دروازہ بجایا تھا اور رات کے دو بجے بھی اس کے گھر کا دروازہ دوسری دستک پہ یوں کھلا۔ جیسے دن کے دو بجے کا وقت ہو۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اس کی ماں اس کے انتظار میں ابھی تک جاگ رہی ہے۔

"السلام علیکم۔ آپ ابھی تک جاگ رہی ہیں؟" اس نے اندر داخل ہوتے ہی تشویش سے کہا۔

"ہاں بس۔ آج گرمی زیادہ ہے نا۔ اس لیے نیند نہیں آرہی۔ ہر طرف حبس ہی حبس ہے۔" وہ آہستگی سے کہتے ہوئے دروازہ بند کرکے اس کے پیچھے ہی آگئیں۔

"کیوں، بجلی تو ہے؟"

"ہاں! ابھی ابھی آئی ہے پندرہ منٹ پہلے۔" وہ اپنے دوسرے دونوں بچوں کی نیند کے خیال سے کافی آہستہ بول رہی تھیں۔

"وحید اور ککو کیسے ہیں۔ سوگئے دونوں؟" وہ اپنا بیگ کمرے میں رکھ کے دوبارہ باہر نکل آیا اور برآمدے میں رکھی کرسی پہ بیٹھ کے بوٹ کے تسمے کھولنے لگا۔

"ہاں۔ دونوں بارہ بجے تک تمہارا انتظار کر رہے تھے۔ لیکن بارہ بجے بجلی آئی تو میں نے کہا کہ سو جاؤ۔ صبح پھر نماز کے لیے بھی اٹھنا ہوتا ہے۔ لیکن وہ بے چارے سوگئے تو ایک بجے پھر بجلی چلی گئی اور اب دو بجے کے قریب آئی ہے۔" زبیدہ بیگم افسوس کر رہی تھیں۔

"کیا بات ہے؟ آج تھکی تھکی سی لگ رہی ہیں۔" ولید نے ان کی تھکاوٹ فوراً بھانپ لی۔

"تم اتنے لیٹ کیوں آئے ہو؟ صبح سے پریشان ہو رہی ہوں۔"

"کیوں؟ پریشان کیوں ہو رہی تھیں؟" وہ بوٹ وغیرہ اتار کے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"پورے شہر میں بم دھماکے کی خبریں گردش کرتی پھر رہی ہیں۔ طرح طرح کی باتیں سن رہی تھی اور طرح طرح کے وہم اور اندیشے ستا رہے تھے۔ ایسے میں پریشان نہ ہوتی تو اور کیا کرتی؟" ان کے دل و دماغ پہ چھائی پریشانی آخر ان کی زبان پہ آہی گئی تھی۔

"اف امی! میں نے یہ جاب کرنے سے پہلے ہی آپ کو بتا دیا تھا کہ آپ کو میرے لیے پریشان نہیں ہونا۔ صرف دعا کرنی ہے۔ اور آپ کی دعا مجھے کبھی کچھ نہیں ہونے دے گی۔ آپ کو اپنی دعا پہ بھروسا رکھنا چاہیے۔ اللہ کبھی رد نہیں کرے گا۔"

ولید نے زبیدہ بیگم کے دونوں ہاتھ تھام کر مضبوط لہجے میں کہتے ہوئے انہیں تسلی دی تھی۔

"اللہ تمہیں ہر مصیبت اور آفت سے محفوظ رکھے اور پناہ دے۔ آمین" انہوں نے صدق دل سے دعا کی تھی۔

"بس! مجھے آپ کی انہی دعاؤں کی ضرورت ہے۔" اس نے ان کے ہاتھ عقیدت سے چوم کر آنکھوں سے لگالیے۔

"کھانا کھاؤ گے؟"

"ہوں۔ کھانا تو کھانا ہے۔ لیکن آپ رہنے دیں، ابھی شاور لینا ہے۔ شاور لے کر خود ہی کھانا گرم کرلوں گا۔" اس نے انہیں روک دیا۔

"کوئی بات نہیں۔ مجھے کون سا نیند آرہی ہے۔ تم شاور لے لو۔ میں کھانا گرم کرتی ہوں۔" وہ کہہ کے کچن کی طرف پلٹ گئیں اور ولید اپنے کمرے میں آگیا۔ اندر آتے ہی اپنی شرٹ کے بٹن کھولنے لگا۔ اس نے تیزی سے بٹن کھول کر شرٹ اتاری اور اپنے بستر پہ اچھال دی تھی۔

لیکن شرٹ اچھالنے کے بعد وہ ٹھٹک سا گیا۔ اس کی حس شامہ نے کچھ محسوس کیا تھا۔

ایک خوب صورت اور مسحور کن مہک۔ ایک ایسی مہک جس سے وہ واقف بھی نہیں تھا۔ لیکن وہ پھر بھی اس سے لپٹی ہوئی تھی۔ اسے اپنے حصار میں لیے ہوئے تھی اور وہ صبح سے اک افراتفری کے عالم میں اپنے کام میں مصروف اس خوشبو سے اور اس مہک سے انجان پھر رہا تھا۔

لیکن اب جب اس نے اس خوشبو کو خود سے الگ کیا تھا تو اس نے ولید کو اپنا آپ محسوس کروایا تھا۔ اپنے ہونے کا احساس دلایا تھا۔ جس پہ وہ چونک گیا اور ذرا سا جھکتے ہوئے وہ شرٹ دوبارہ اٹھالی۔ اس خوشبو کو دوبارہ محسوس کیا۔ ولید یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ کون سا پرفیوم ہے۔ لیکن وہ یہ ضرور جان گیا تھا کہ اس پرفیوم کی خوشبو حواسوں کو مسحور کردینے کی حد تک دلفریب ہے۔

گویا عزت حیدر اپنے ملبوس کی خوشبو اس کے ملبوس میں چھوڑ گئی تھی۔ ولید کو یاد آیا، جب وہ عزت کو اٹھا کر یونیورسٹی کے اندر لے گیا تھا۔ تب وہ اس کے اتنے قریب تھی کہ اس کے سادہ سے، عام سے ملبوس کو بھی مہکا گئی تھی۔

"ولید۔ کیا کرنے بیٹھ گئے ہو؟ کھانا گرم کردیا ہے میں نے۔" زبیدہ بیگم کی آواز پہ ولید ایک دم چونک کے اپنے حواسوں میں واپس آیا اور پھر ہاتھ میں پکڑی شرٹ کو دیکھ کر فوراً" نفی میں سر جھٹکا۔ عزت کا خیال آتے ہی خود کو سرزنش کی کہ وہ یہ کیا سوچنے لگا ہے؟

"ولید۔" انہوں نے دوبارہ آواز دی۔

"آرہا ہوں امی!" وہ اپنے سارے خیالات کی نفی کرتا، انہیں پرے دھکیلتا ہوا شرٹ کو کھونٹی سے لٹکا کر باہر نکل آیا اور فوراً" شاور لینے کے لیے گھس گیا۔ لیکن اس کی سوچیں، اس کے خیالات شاور لینے کے دوران، کھانا کھانے کے دوران اور اپنا بستر بچھانے کے دوران بھی اس کے ساتھ ہی رہے تھے۔

بلکہ وہ گھر کی چھت پہ بستر بچھائے جب سونے کے لیے لیٹا تو یہ خیالات تاروں سے سجے وسیع آسمان پہ بھی پھیل گئے۔ جن سے ایک چہرہ تخلیق ہو رہا تھا۔۔۔

ولید اس چہرے سے نظریں چرا کر کروٹ بدل کے لیٹ گیا۔ دن بھر کا تھکا ہوا تھا۔ اس لیے زیادہ دیر سوچوں سے آنکھ مچولی نہ کھیل سکا اور کچھ دیر بعد ہی گہری نیند سو گیا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

رضیہ مہدی

تابی نے مجھے فون پر ہی بتا دیا تھا کہ "امی! اس دفعہ عیدی میں میری دونوں نندوں کی چوڑیاں بھی ضرور رکھیے گا۔ یہ نہیں کہ پچھلی دفعہ کی طرح آپ صرف جوڑے رکھ کر لے آئیں۔"

تابندہ کی اس بات پر میری بہو ہانیہ کا منہ بن گیا۔

"حد ہوتی ہے۔ صرف جوڑے۔ ای لیے تابی سسرال جا کر بھی شاید بڑی نہیں ہو پائی۔"

میں کیا کہتی مجھے خود بھی اپنی بیٹی کی بات اچھی نہیں لگی تھی۔ مگر میں سوچ رہی تھی نجانے کتنا مجبور ہو کر اس نے کہا ہو گا۔ کیا پتا کیا کیا سننا پڑا ہو گا اسے۔ مجھے اپنے داماد پر یقین تھا کہ اس نے کم از کم کچھ نہیں کہا ہو گا۔ مگر اس کی اماں اور بہنیں... یقیناً" تابی نے کچھ نہ کچھ ضرور سنا ہو گا۔

ویسے سچی بات تو یہ ہے کہ عیدی، جوڑے، چوڑیاں اور لوازمات بڑھاتے چلے جاؤ، بڑھتے جائیں گے مگر کیا بہت ساری چیزوں سے بہت ساری خوشیاں حاصل کی جا سکتی ہیں۔ ارے! کہا جاتا تھا مان کا پانی بھلا تو بھی جو خوشی خوشی کچھ دے دے ہنسی خوشی لے لینا چاہیے اس میں مین میخ نکالنا کون سی اچھی بات ہے اور پھر یہ تو خوشی کے سودے ہیں۔ کوئی ادھار چکانا تو ہے نہیں۔ میں کافی دیر ایسی ہی سوچوں کے گرداب میں الجھی رہی۔

میں خود کو بہت خوش قسمت سمجھتی ہوں۔ نئی زمانہ جب ہر گھر میں یہ رونا ہے کہ بیٹے ماں، باپ کی قدر بھولے جا رہے ہیں اور بہوئیں ایسی ہیں ویسی ہیں۔ مگر میرا گھر واقعی جنت ہے کہ میرے دونوں بیٹے ہی نہیں بہوئیں بھی بہت اچھی ہیں۔ اتنی اچھی کہ ہم سب کھلی فضا میں سانس لیتے ہیں۔ میں ان سے کچھ نہیں چھپاتی اور وہ بھی سب اچھا برا میرے منہ پر بول دینے کی آزادی رکھتی ہیں، حد ادب ملحوظ رکھتے ہوئے۔ اور جو خدا لگتی کہوں تو یہ حد انہوں نے کبھی نہیں توڑی، بالکل اچھی بیٹیوں کے انداز میں۔ جو میں کبھی کسی بات پر منع کر دیتی ہوں تو مان بھی جاتی ہیں اور وہ کبھی کسی بات پر اصرار کرتی ہیں تو میں مان جاتی ہوں۔ یقین نہیں آ رہا ہے نا؟ یہ بالکل سچ ہے۔ واقعی ایسا ہی آئیڈیل ماحول ہے ہمارے گھر کا۔

میاں ہمارے کئی سال سے اپنے کمرے بلکہ بستر کے ہو کر رہ گئے ہیں۔ وہ ابھی ساٹھ سال کے بھی نہیں ہوئے تھے۔ ریٹائرمنٹ دور تھی۔ جب نوید میرے بڑے بیٹے نے اپنی تعلیم مکمل کر کے نئی نئی جاب شروع کی تھی اور اس کے ابا جو پہلے مارے باندھے لا چار دن چھٹی کے بعد دفتر چلے ہی جاتے تھے، وہ اس سے بھی جان چھڑا بیٹھے۔

"بس بھئی! اب ہم سے نہیں ہوتی یہ نوکری۔" انہوں نے اعلان کر دیا۔

"ارے ہمت کیجئے آپ۔ یوں بلاوجہ لگی لگائی روزی پر لات مارنا۔ جبکہ ذمہ داریاں گلے لگنے کو تیار کھڑی ہیں کہاں کی دانشمندی ہے؟" میں نے سمجھانا چاہا۔

"آپ سے ہزار دفعہ کہا ہے، میرے معاملات میں مت بولا کریں۔ آپ خود کبھی کسی دفتر کی شکل بھی دیکھنے گئی ہوں تو پتا چلے کہ دفتر کتنے کس چڑیا کو ہیں۔

ساری زندگی خون دیا ہے میں نے اپنا۔ تب جا کر اس خاندان کو تر نوالے کھلائے ہیں۔ ساری زندگی عیش کرتی رہی ہیں آپ۔"

اور ان کی "آپ" "آپ" والی تقریر دیر تک جاری رہی۔ میں ہمیشہ کی طرح کان دبا کر اپنے کام کرتی رہی۔ راشدہ کی شادی ہم کر چکے تھے۔ تابندہ ابھی پڑھ رہی تھی اور ابھی تو عبید کا بھی ایک سمسٹر رہتا تھا ایسے میں ان کے اعلان اور پھر لمبی تقریر نے مجھے بدحواس سا کر دیا۔

"اب ہو گا کیا؟"

خیر! یہ تو میں اپنی شادی کے فوراً" بعد سے دیکھ رہی تھی کہ جنید میرے میاں ان لوگوں میں سے نہیں تھے جو اپنی جاب کو بھی عبادت کی طرح کرتے ہیں۔ وہ تو بس مارے باندھے ہی دفتر جاتے تھے ہر دوسرے دن بچوں کی طرح بہانہ بازی کرتے رہتے۔ کبھی فرماتے۔ "طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی ہے مجھے اپنی۔"

کبھی اعلان ہوتا۔ "سونے دو بھئی! رات بھر جاگا ہوں۔ آپ تو خراٹے لیتی رہیں۔ اب مجھ پر کیا گزری آپ کو کیا پتا۔"

کبھی کہتے لگتا ہے "آج بخار آئے گا مجھے۔"

کبھی سب کچھ ٹھیک ہوتا تو کہتے "بھئی! موڈ نہیں آج دفتر جانے کا۔"

بچے ذرا بڑے ہوئے تو وہ اپنے ابا کی فطرت سمجھنے لگے۔ ایک دفعہ تو عجیب ہی بات ہوئی۔ اسے لطیفہ نہ کہوں تو کیا کہوں۔ اگرچہ کہتے ہوئے اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ اس دن انہوں نے دفتر فون کیا کہ "آج نہیں آؤں گا۔ سر میں بہت درد ہے۔"

تھوڑی دیر بعد ہمارے ایک قریبی عزیز کے انتقال کی خبر آ گئی۔ نوید نے کہا۔

"ابا! دفتر فون کر کے بتا دیں کہ آپ کے کزن کا انتقال ہو گیا ہے۔"

"کیوں؟ کیا پاگل ہوں میں۔۔۔؟ اور خبردار! اگر دفتر سے کوئی فون آ جائے اور کسی نے انتقال کا۔۔۔"

عبید قریب ہی بیٹھا پڑھ رہا تھا۔ ہنس کر بولا۔ "بھیا! اس انتقال کی چھٹی ابا چار دن بعد لیں گے۔"

اس پر عبید کے ساتھ نوید بھی ہنسنے لگا۔

"ابا آپ بھی بس۔"

مجھے اچھا نہیں لگتا تھا ان کا اس طرح کرنا۔ مگر ان کی عادت پختہ تھی اور انہیں میرے اچھا یا برا لگنے کی بھلا کون سی پروا تھی۔

کبھی کبھی نوید اور میں آپس میں ایک دوسرے سے پوچھتے تھے۔

"پرائیویٹ کمپنی میں ملازم ہیں یہ۔۔۔ روز روز کی چھٹی وہ لوگ برداشت کیسے کر رہے ہیں؟"

پھر نوید کہتا۔

"شاید ابا کام بہت اچھا کرتے ہوں۔ کوئی تو بات ہو گی نا۔"

ہاں! تو میں بتا رہی تھی کہ جب انہوں نے گھر بیٹھ جانے کا اعلان کیا تو میں پریشان ہو گئی۔ مگر میرے بچوں نوید اور عبید کو اللہ زندگی دے۔ انہوں نے مجھے بہت ڈھارس دی کہ "کوئی بات نہیں امی ہم ہیں تو آپ کو کیا فکر ہے۔"

"مگر بیٹا! ابھی تو تمہاری پہلی تنخواہ بھی نہیں ملی۔۔۔ اور عبید کی تو پڑھائی بھی باقی ہے ابھی۔"

"سب ہو جائے گا امی! آپ پریشان نہ ہوں۔ اللہ مالک ہے۔"

وہ دن اور آج کا دن۔ نوید ہی نہیں عبید بھی اگر میرے چہرے پر ذرا سا بھی ملال کا رنگ دیکھتا ہے یا دونوں مجھے مضمحل پاتے ہیں تو فوراً" پریشان ہو جاتے ہیں۔

"کیا ہوا امی؟ کوئی مسئلہ ہے؟ کیا بات ہے؟ کسی نے کچھ کہا؟" وغیرہ وغیرہ۔

"کچھ نہیں میرے لعل! میرے چاند! کچھ نہیں۔" ان کی تشفی کرانا میرے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔

میرے مالک نے مجھے بہویں بھی اچھی فطرت کی دی ہیں اور شاید میرے بیٹوں نے بھی انہیں اچھی طرح سمجھا دیا ہے کہ امی کو ٹینشن نہ ہونے دینا۔ سو دونوں میرا بڑا خیال رکھتی ہیں۔

ہانیہ میری بڑی بہو ہے اور نوین چھوٹی دونوں میری آنکھوں کی پتلیاں ہیں۔ میں نے بہت غور و خوض کے بعد یہ سمجھ لیا ہے کہ میرے بیٹوں اور میری بہوؤں نے جو حکمرانی کا تاج میرے سر پر رکھا ہے اور ہر سیاہ سفید کا مجھے مالک بنا رکھا ہے تو مجھے نہایت بردباری سے اور انتہائی سمجھداری سے اپنے گھر کی اہلی کو لے کر چلنا ہے۔ یعنی میری بھی کچھ ذمہ داری ہے کہ میں خود کو اس کا اہل ثابت کرتی رہوں اور وہ کیسے ہو؟

بھئی! حکومت چاہے ملک کی ہو یا گھر کی' وہ انصاف کے بغیر نہیں چل سکتی۔ اے وہ کیا نام لیتے ہیں بچے برطانیہ کے حکمران کا؟ اے دیکھو! یاد آ گیا مجھے۔۔۔ چرچل۔۔۔ تو دوسری جنگ عظیم میں کسی نے اس سے پوچھا کہ "کیا برطانیہ اس جنگ کو ہار جائے گا اور ختم ہو جائے گا" تو وہ بولا کہ "کیا ہماری عدالتیں انصاف کر رہی ہیں؟" پوچھنے والا حیران رہ گیا۔ پوچھا کیا جواب کیا ملا؟ بہرحال' جواب تو دینا تھا' کہا۔ "ہاں! عدالتیں انصاف کر رہی ہیں۔"

چرچل نے کہا۔ "تو بس پھر کیوں ہو گا ختم ہمارا ملک' جہاں انصاف ہو گا' وہ حکمراں کمزور ہو گا نہ ملک۔"

سچ پوچھو تو یہ سب انہوں نے اسلامی تعلیمات سے ہی سیکھا ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ "حکومتیں کفر کے ساتھ چل سکتی ہیں' ظلم کے ساتھ نہیں۔" تو دیکھ لو! جہاں جہاں ظلم ہے' وہاں کیسی ڈگمگا رہی ہیں حکومتیں۔۔۔ اور جہاں جہاں انصاف ہے' وہاں کفر بھی ہے' تو ترقی کی راہ پر گامزن ہیں وہ لوگ۔

ارے! بات کہاں سے کہاں نکلتی چلی گئی۔۔۔ تو میں آپ کو بتا رہی تھی کہ میں نے یہ گر۔ گرہ میں باندھ لیا اور میں بھی کہیں بھی انصاف سے ہٹ کر کوئی بات نہیں کرتی میں۔

ہاں! تو بات شروع ہوئی تھی تابی کے فون سے۔ اس نے کہا یعنی فرمائش کی کہ اس مرتبہ چوڑیاں بھی ضروری رکھی جائیں اور مجھے معلوم تھا' ہانیہ کو یہ بات اچھی نہیں لگی۔ کیونکہ وہ مجھ سے پہلے ہی بات کر چکی تھی کہ۔

"امی! پچھلے سال تابی کی پہلی عید تھی سسرال میں تو ہم نے اس کی ساس نندوں کے جوڑے بھی رکھے تھے مگر اس مرتبہ تو ضروری نہیں ہے نا یہ سب کچھ؟"

اور میں نے ہنس کر کہا تھا۔ "جو تم مناسب سمجھو۔"

اسے مختار بنانا میری مجبوری نہیں تھی۔ مجھے معلوم ہے' وہ کھلے دل کی ہے اور رسم' ریت' رواج نبھانے جانتی ہے۔ نندوں کے معاملے میں کبھی کوئی مسئلہ اس نے آج تک نہیں کھڑا کیا چاہے راشدہ کی سسرال کچھ بھجوانا ہو یا کوئی اور خرچا کرنا ہو۔ تابی کی شادی بھی میں اس نے کیا نہیں کیا اور اب شادی کے بعد بھی مسلسل اس کا خیال رکھتی ہے۔

تابی دو دن بعد لدی پھندی بہت خوش خوش اپنے میاں کے ساتھ آئی۔ "خیریت؟ کہاں سے آ رہی ہو؟"

"وہ امی جی! میں بازار گئی تھی۔ یہ دیکھیے! میں نے یہ دو سوٹ لیے ہیں اپنے لیے۔" اس نے دو قیمتی اور خوبصورت سی پیکنگ والے سوٹ میری طرف بڑھائے۔ میں دل میں سوچنے لگی۔

"قیمتیں آسمان سے باتیں کیوں نہ کریں! اے یہ موئی پیکنگ ہی جب اتنی دل آویز ہو تو۔"

اس نے نفاست سے پیکنگ کھول کر سوٹ دکھائے۔

"زبردست" نوین نے تعریف کی۔

"بھابھی کہاں چلی گئیں؟" تابی نے ہانیہ کا پوچھا۔

"وہ ذرا چائے وغیرہ کے لیے گئی ہیں۔" نوین نے مجھے آہستہ سے بتایا۔

"دیکھا امی! بھابھی کبھی خوش نہیں ہوتیں میری چیزوں سے۔" تابی کا یہ بچکانہ تبصرہ مجھے بہت برا لگا اور میں گھبرا کر نوین کی طرف دیکھنے لگی۔ شکر ہے! وہ

دوسری طرف متوجہ تھی۔

"بے کار کی باتیں مت کیا کرو۔" میں نے بیٹی کو جھڑکا۔

"آپ تو خیر کبھی کچھ سنیں گی ہی نہیں ان کے خلاف۔ پتا نہیں کیا گھول کر پلا دیا ہے آپ کو۔"

"تم اپنی شاپنگ دکھاؤ۔" میں نے بات پلٹنا چاہی۔ داماد سامنے بیٹھا تھا۔ اب اور کیا کہتی۔

"یہ سسر صاحب کے لیے لیا ہے۔ یہ ساس کا سوٹ ہے اور یہ ہے میری پیاری امی کا سوٹ۔" اس نے ایک ملائم سا ہلکا نیلا سوٹ جس پر اسی رنگ سے نازک سی بیل کڑھی ہوئی تھی' میرے سامنے کیا۔

"ارے اس کی کیا ضرورت تھی؟" مجھے اپنے داماد عدیل سے حجاب سا آنے لگا۔ "خوامخواہ میرے لیے لانے کی کیا ضرورت تھی بیٹا؟"

"ضرورت تھی امی! آخر ان لوگوں کے لیے اتنی ساری چیزیں لے رہی تھی' تو ایک سوٹ......"

میرا جی چاہا اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دوں۔ کوئی حد ہوتی ہے بے وقوفی کی۔ مجھے اپنی بہوؤں کے سامنے اس کے بھرے پر ندامت سی ہو رہی تھی۔ بڑے وقوف لگتے تھے مجھے زندگی بھر وہ لوگ' جب وہ بہوؤں کو سامنے بٹھا کر بیٹی کی سسرال کی ہجو اڑاتے ہیں۔ یہ خیال کیے بغیر کہ اگر یہی ان کی بہو بھی کرے تو؟

مجھے یاد ہے میں بہت چھوٹی تھی' جب اپنی ننھیال جاتی تھی اپنی اماں کے ساتھ۔ ہماری نانی اماں مرحوم سیدھی سادی خاتون تھیں۔ وہ مسلسل میری اماں سے پوچھتی رہتی تھیں۔

"اب تمہاری نند اور ساس کا کیا حال ہے۔ وہی آرام طلبی' نوکرانی جوتی ہوئی ہے' بے دام کی غلام۔ وہ بہوئیں اچھی ہوتی ہیں' جو جاتے ساتھ ہی ساس سے کہتی ہیں۔

"منکا دمت کو لہا' آنگن میں رکھو چولہا۔"

میں دیکھتی تھی کہ میری ممانی ادھر سے ادھر آ جا رہی ہوتیں۔ وہ بے چاری کم گو سی کام میں لگی رہنے والی خاتون تھیں۔ مگر میں سوچتی تھی کہ کچھ تو یہ بھی خیال کرتی ہی ہوں گی۔

"امی ٹھیک کہہ رہی ہیں تابی! حق ہے ان لوگوں کا۔ تم ان کے لیے ہی لیتیں۔ امی کے لیے ہم لوگ......"

میں ہانیہ کی بات پر چونک سی گئی۔

"یہ کیا بات ہوئی میری ماں کا کوئی حق نہیں؟ اور میں نے کوئی کسی کو منع کیا ہے' تو پھر کوئی کیوں مجھے منع کرے؟" تابی کا لہجہ تیز تھا۔

میں نے گھبرا کر داماد کی طرف دیکھا وہ ٹی وی پر ہونے والی کسی ٹاک شو میں گم تھا اور یہاں ہونے والی بحث سے انجان تھا یا انجان بن رہا تھا۔ غیر داماد وہ بھی تعلق بہت پرانا نہیں اور یہ میری بے وقوف بیٹی۔

"بیٹی! ہانیہ کی بات درست ہے۔ تم اپنی شاپنگ لے کر وہیں جاتیں تو ٹھیک تھا اور اس تکلف کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔"

"ارے! شہر کے ایک کونے پر آپ کا گھر ہے۔ میں نے عدیل کے تھکے ہونے کے باوجود اتنی لمبی ڈرائیو کرائی۔ اپنا اتنا پیٹرول پھونکا اور آپ کہہ رہی ہیں کہ آپ کے گھر آئی ہی کیوں......"

وہ تو اور جانے کیا کیا کہتی۔ میں نے اس کا ہاتھ دبایا اور آہستہ سے بولی۔

"تم واقعی بے وقوف ہو۔ عدیل کیا سوچیں گے؟"

"عدیل ایسے نہیں ہیں۔ انہوں نے بہت خوشی سے سب شاپنگ کروائی ہے۔ چاہیں تو پوچھ لیں۔ ہے نا عدیل؟" وہ میاں کو آواز بھی دے بیٹھی۔

اب عدیل متوجہ ہوا۔ "جی جی امی! یہ ہم نے آپ کے لیے لیا ہے۔"

"اس کا مطلب تھا وہ سب سن رہا تھا۔" میں نے دل ہی دل میں سوچا۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ نوید کے ساتھ باتوں میں مصروف تھا۔ میں نے تابی کو سمجھانا شروع کیا۔

"میری بات آرام سے سنو اور زور سے بالکل نہ بولنا۔ اس مرتبہ ہمارا ارادہ تمہاری نندوں کے سوٹ کا نہیں ہے اور اب تم کہہ رہی ہو کہ جوڑوں کے ساتھ لوازمات بھی۔ یہ کیسی شرط ہے؟"

"کیوں امی! بیٹیوں کا حق ہوتا ہے میکے پر۔ یہ شرط کی کیا کہی آپ نے؟ میں اپنی بات آپ سے بھی نہ کہوں کیا؟"

"کیا ان لوگوں نے تم سے کچھ کہا ہے؟"

"وہ کیوں کہیں گی؟" وہ ذرا سا تیز بولی۔

"تو پھر؟" میں نے اس کو تنبیہہ "ٹوکا۔

"امی جی! لڑکیوں کی عزت بڑھتی ہے' جب میکے سے ڈھیروں سوغاتیں آتی ہیں۔ اور آپ راشدہ باجی کو بھی تو اتنا کچھ بھجواتی تھیں۔ اب میری باری ہے تو......"

"بیٹا! تب کی بات اور تھی۔ نہ اتنی مہنگائی تھی اور پھر تمہارے ابا کی کمائی بھی تھی اب تو میں خود بیٹوں پر ہوں۔ تمہارے ابا کی دوائیں' بلیاں' بل وغیرہ وہ تو شکر کرو! تمہارے بھائی اور بھابیاں بھی بہت اچھی ہیں۔ مگر مجھے زیادہ بار ڈالنا اچھا نہیں لگتا۔" میں نے ایک گہری سانس لی۔

"ہانیہ کو بھی تمہاری بات اچھی نہیں لگی۔"

"کیوں؟ وہ خود تو اپنے میکے سے بھر بھر کر سامان منگواتی ہیں۔"

"بری بات ہے۔ تم خوامخواہ کی بات مت کرو۔ اول تو وہ منگواتی نہیں ہے۔ وہ لوگ خود لاتے ہیں اس کے منع کرنے کے باوجود۔ دوم یہ کہ اس کے پاپا بہت اچھا بزنس کر رہے ہیں۔ جس میں اس کے چھ بھائیوں نے بھی جان لگا رکھی ہے۔ سوم یہ کہ وہ اکیلی بیٹی ہے۔ یہاں تمہارے ابا ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ دونوں بھائی نوکری پیشہ ہیں اور تمہارے ساتھ ساتھ راشدہ کا بھی خیال کرنا پڑتا ہے انہی لوگوں کو۔"

"تو مت بھیجیں کچھ بھی۔ اب خوش؟" وہ جھلا کر اٹھی۔

"عدیل۔ عدیل اٹھیے! دیر ہو رہی ہے۔" اور پھر سب روکتے رہے' دونوں بھائی' بھابیاں۔ مگر وہ اپنے سامان کو سمیٹ کر سیدھی گیٹ کی طرف بڑھی۔

اس کو رخصت کر کے پلٹے تو سب میری طرف آئے۔

"کیا ہوا تھا امی! کیوں خفا ہو گئی تابی؟"

تب ہی گیٹ پر گاڑی کا ہارن بجا۔ عبید دوڑا اور ایک شاپر لے کر آیا۔

"تابی غلطی سے آپ کا سوٹ بھی لے گئی تھی۔"

ہانیہ نے میری طرف دیکھا۔ اس کی نظریں جیسے جتا رہی تھیں۔

"امی! میں ٹھیک کہہ رہی تھی نا۔ تابی بڑی نہیں ہوئی۔" میں دیکھ رہی تھی کہ ہانیہ کا موڈ تابندہ کے اس بدتمیزی سے اٹھ کر جانے سے خراب ہو گیا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ خود میں بھی اس کی بدتمیزی کے بعد سے مسلسل یہی سوچ رہی تھی کہ اس کا یہ رویہ اس کے سسرال والوں پر کتنا گراں گزرتا ہو گا۔

میں نے آپ سے عرض کیا تھا کہ میں انصاف پسند ہوں۔ بیٹی کی ہر اچھی بری بات کی تائید اور بہو پر تنقید یہ میرا وطیرہ کبھی نہیں رہا۔ مجھے اپنے گھر کو جنت ہی رکھنا تھا۔ اس لیے میں نے دو چار دن بعد ہانیہ سے خود پوچھا۔

"تو چپ چپ کیوں ہو بیٹا؟ ادھر آؤ! میرے پاس۔"

میں نے گلے لگا لیا۔ پیار کیا۔

"تم میری اتنی اچھی بیٹی ہو۔ مجھے معلوم ہے یہ ملال کی گرد تمہارے گرد آئی کیسے۔ تم تابندہ کی وجہ سے پریشان ہو نا؟"

اس نے گردن ہلائی "امی! اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس میں ذرا بھی تبدیلی نہیں آئی۔ مگر امی! آپ تو خود کہتی ہیں کہ سسرال کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو سسرال ہوتی ہے۔"

"ہاں میری جان! تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔"

"امی! میں نے اور نوین نے آپ سے گھرداری ہی نہیں سیکھی ہے' جینے کا طریقہ سلیقہ بھی آپ ہی سے سیکھا ہے۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ وہ تو آپ کی بیٹی ہے پھر ایسی مختلف المزاج کیوں؟"

"بس بیٹا!" میں کیا کہتی سو وہ درست کہہ رہی تھی۔ کیونکہ ان دونوں کو میں نے جب بھی کچھ سمجھایا

انہوں نے کیا۔ میں نے کہا نہ کہ میری دونوں بہوئیں سمجھ دار ہیں۔ جیسے ہی شادی طے ہوئی تھی۔ دونوں لڑکے لڑکی کا رابطہ بہنوں وغیرہ نے کرادیا تھا کہ یہی اب دستور زمانہ ہے۔ میسج میسج کا کھیل بہت ضروری ہے میں نے ہانیہ کو بھی اور نوین کو بھی صرف ایک مرتبہ سمجھایا تھا کہ۔

"بیٹی! لڑکے فطرتاً "مہم جو" ہوتے ہیں۔ انہیں زیادہ لطف ہمیشہ ناقابل تسخیر کو تسخیر کرکے آتا ہے۔ بس تو وہ کبھی کہیں کرتے نہیں۔ پہلے فون پر بات کرو۔ میسج کرو۔ پھر باتوں کو طویل اور طویل کرتی جاؤ۔ پھر کہیں باہر اور پھر پھر۔ چاہے میرے بیٹے ہی کیوں نہ ہوں۔ حدیں 'احتیاط کی فصیلیں سب عورت کھڑی کرتی ہے تاکہ وہ ناقابل تسخیر بن جائے، آسانی سے مل جانے والی ہستی یا چیز کشش کھو دیتی ہے۔"

بات سخت تھی۔ مگر دونوں بچیوں نے میری سنی۔ آج عزت کے ساتھ محبت بھی پارہی ہیں۔

نوین ذرا سی موٹی ہونے لگی۔ میں نے سمجھایا کہ "اپنا خیال عورت کو خود رکھنا ہوتا ہے۔ میاں کے دل میں رہنے کے لیے۔ وہ لاپروا رہے گا۔ خیال نہیں کرے گا۔ پھر ایک دن ادھر ادھر متوجہ ہو جائے گا۔ سو خود پر توجہ دو۔"

اور اس نے میری بات مان لی۔ آج عبید گھر اور بیوی پر بھرپور توجہ دیتا ہے۔

تابی کو میرا سمجھانا کوئی کام نہیں آرہا تھا۔ وہ بس اپنی بات پر اکڑی ہوئی تھی تو اس کو کوئی سزا بھی ملنی چاہیے۔ اس کے فون آئے میں نے منع کردیا کہ کہہ دیا کرو میں سو رہی ہوں۔

☼ ☼ ☼

ہانیہ اور نوین عیدی کی سب شاپنگ کر آئیں۔ میں نے سمجھا دیا تھا۔ منڈوں کے جوڑے نہیں، صرف چوڑیاں لانا۔ مگر ان کے گھر لے جانے کی جلدی مت کرو۔

جوں جوں دیر ہو رہی تھی۔ تابی کی پریشانی بڑھ رہی تھی۔ میں خاموش تھی۔ آخر عید سے دو دن پہلے وہ دوڑی آئی۔

"امی! آپ مجھ سے بات کیوں نہیں کر رہیں؟ واقعی ناراض ہیں؟ اب کچھ نہیں بھیجیں گی؟" وہ رو ہانسی تھی۔

"ہاں! جب تک تم ہانیہ سے معذرت نہیں کروگی اپنے اس بدصورت رویے کی' جو میری طبیعت و تربیت دونوں کے مخالف تھا۔" میں نے ہانیہ کو بلایا۔ وہ چاپ چاپ آکر کھڑی ہوگئی۔

"ہانیہ بیٹا! تابی تم سے معافی مانگنا چاہتی ہے۔"

"ارے نہیں امی! اس کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"نہیں بھابھی! مجھے افسوس ہے کہ میں اس دن بلاوجہ غصہ میں آگئی۔"

"کوئی بات نہیں۔" ہانیہ نے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔

"میں اور امی تو اس لیے پریشان تھے کہ تم اپنی جذباتیت سے کہیں سسرال میں کوئی مشکل نہ کھڑی کرلو۔"

وہ سر جھکائے سنتی رہی۔

"یہ لوگ آج یا کل عیدی لے کر جائیں گی تمہارے گھر۔ خوشی اور خوش دلی سے وصول کرنا۔ یہ کوئی غنڈہ ٹیکس نہیں ہے۔ محبت' مان' سمان کی باتیں ہیں۔ تم خوش نصیب ہو کہ بھابھیاں خوشی خوشی دیتی ہیں تم بھی خوشی خوشی لو۔ جس کا بدلہ دینا چاہیے وہ یہ کہ جس خلوص سے وہ بڑی بھابھی بن کر جائیں اسی خلوص سے کہیں وہاں مگن دیکھیں تمہاری تعریفیں سنیں تو مجھے آکر بتائیں۔ میرا جی بھی ٹھہرا رہے۔ خوش رہو جاؤ۔"

اپنی پیاری بیٹی میں کس کا دل اٹکا نہیں رہتا مگر دوسرے گھر سے لائی ہوئی بچیوں سے تہذیب اور طریقے کی توقع تب ہی رکھی جانی چاہیے۔ جب اپنی بچیاں اس سمجھ بوجھ سے سسرال میں رہیں اور میکے کی قدر کریں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

شیریں ملکہ

"ارے پگلی! تم تو ایسے رو رہی ہو جیسے میں کراچی نہیں۔ بلکہ ملک چھوڑ کے کہیں جا رہا ہوں۔ ان شاء اللہ ہر مہینے چکر لگایا کروں گا۔ چلو! اب رونا بند کرو۔"

حیدر نے بڑے پیار سے اپنی چھوٹی اور سب سے لاڈلی بہن مریم کو ساتھ لگاتے ہوئے تسلی دی تھی۔ لیکن اس کے آنسو تھے کہ رکنے کا نام ہی نہ لے رہے تھے۔ وہ بھی یوں اتنے عرصے کے لیے ایک دوسرے سے دور نہ ہوئے تھے۔ اسی لیے روزگار کے سلسلے میں حیدر کا گھر سے دور جانا مریم کو رلا گیا۔

"اچھا مریم! تم مجھے یہ بتاؤ میں وہاں سے تمہارے لیے کیا لاؤں؟"

حیدر نے اس کا دھیان بٹانے کے خیال سے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے پوچھا تو وہ نفی میں سر ہلا کر رہ گئی۔ ان کی باتیں سنتی سعدیہ کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"مریم! ابھی وقت ہے حیدر کو اپنی فرمائش بتا دو۔ یہ نہ ہو کہ بعد میں تمہیں پچھتانا پڑے۔"

سعدیہ آپی کے شریر انداز پر روتی ہوئی مریم جھینپ سی گئی اور حیدر حیرانی سے دونوں بہنوں کو دیکھنے لگا۔

"آپی! آپ ہی اس چیز کا نام بتا دیں۔ جس کے ذکر پر مریم یوں روتے ہوئے مسکرا دی۔" حیدر سعدیہ سے پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

"ارے حیدر! ہماری مریم کو بھی کسی خاص چیز کا شوق نہیں۔ عام لڑکیوں کی طرح اسے بھی چوڑیوں کا شوق ہے۔" سعدیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں اپنی بہنا کے لیے ڈھیروں چوڑیاں لاؤں گا۔"

حیدر نے مریم کے سر پر پیار سے چپت لگاتے ہوئے کہا۔

"لیکن حیدر! اسے ڈھیروں چوڑیاں نہیں چاہئیں بلکہ اسے تو صرف دو چوڑیاں چاہئیں۔۔۔ اور وہ سونے کی۔ اب بتاؤ! اس کی یہ فرمائش پوری کرو گے؟"

ایک پل کے لیے حیدر کے مسکراتے لب سکڑ گئے تھے۔ لیکن دوسرے ہی پل وہ نارمل ہو گیا تھا۔

"اگر اللہ نے چاہا تو میں یہ فرمائش بھی ضرور پوری کروں گا۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"ارے بیٹا! یہ تو مذاق کر رہی ہے اور تم تو سنجیدہ ہو گئے۔ یہ خواہشیں تو مرتے دم تک انسان کے ساتھ چمٹی رہتی ہیں۔ بس! ہر حال میں سوہنے رب کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ عزت سے ٹائم پاس ہو جائے۔ ننگا نہ ہو، پیٹ خالی نہ ہو۔ اس سے زیادہ اور کیا چاہیے۔ تم وہاں جا کر محنت سے کام کرنا، اپنے باپ کا سہارا بن کر اس کا بوجھ بانٹنا۔ تیری یہ دونوں بہنیں عزت سے رخصت ہو جائیں تو ہم بھی سکھ کی نیند سو سکیں گے۔ اللہ تجھے ساتھ خیریت کے رکھے۔ پردیس میں ہر آفت سے محفوظ رکھے۔"

مذاق مذاق میں شروع کی گئی بات کو دادی کہاں سے کہاں لے گئیں اور حیدر ان کو تسلی دیتا سب سے مل کر ان کو آس اور امیدیں دلاتا رخصت ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

اس چھوٹے سے قصبے میں بنے اس کچے کے مکین بڑے ہی سادہ مزاج اور محبتوں سے گندھے ہوئے تھے۔ محمد علی خود ایک کسان تھا۔ اپنی ہی زمین پہ محنت کر کے اتنا کما لیتا کہ اس کی بیوی بچوں کا گزارہ ہو جاتا۔ سب سے بڑی سعدیہ، منجھلا حیدر اور اس سے چھوٹی مریم اپنی دادی اور اماں ابا کے ساتھ بڑے مزے میں زندگی گزار رہے تھے۔ بڑے ہی فرماں بردار اور سلجھے ہوئے بہن بھائی تھے۔ تینوں نے ہی اپنے قصبے میں موجود ہائی اسکول سے میٹرک کیا تھا۔ بہنیں تو دونوں ہی مزید تعلیم کی خواہش کے باوجود گھر بیٹھ

گئیں۔ کیونکہ محمد علی کی آمدنی مزید تعلیم کے اخراجات برداشت نہیں کرسکتی تھی اور حیدر کو محمد علی نے شہر اپنے ماموں کے پاس بھیج دیا۔ وہ گاڑیوں کا مکینک تھا۔ شہر میں اس کی اپنی ورکشاپ تھی اور اس کا بڑا نام تھا۔ حیدر کو بھی ابا نے یہی کام سیکھنے کے لیے ماموں کے پاس بھیجا تھا۔ تاکہ ہاتھ میں ہنر ہو اور وہ اپنی آئندہ کی زندگی کو سہل بناسکے۔

حیدر نے بڑی لگن اور محنت سے کام سیکھا تھا۔ وہ ہر ہفتے اپنے گھر کا بھی چکر لگالیتا تھا۔ چار سال مسلسل اس نے اپنے ماموں کے ساتھ کام کیا تھا اور پھر وہیں پہ ایک جاننے والے نے اسے کراچی میں ایک بڑی ورکشاپ میں کام کرنے کی پیش کش کی تھی۔ اسے اتنی دور جانے میں کچھ تامل ہوا۔ لیکن ماموں نے اسے سمجھایا کہ بڑے شہروں میں کام کے مواقع زیادہ ہوتے ہیں۔ بہ نسبت چھوٹے شہروں کے۔ اسے یہ موقع ضائع نہیں کرنا چاہیے اور وہاں چلے جانا چاہیے۔

حیدر خود بھی اپنے گھر والوں کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا۔ اسی لیے اس نے ماموں کی بات مان لی اور کراچی چلا گیا اور پھر آنے والے وقت میں اس کا یہ فیصلہ صحیح ثابت ہوا۔ ماموں کی ورکشاپ کی نسبت اسے یہاں زیادہ فائدہ ہوا۔ لیکن محنت بھی اسی حساب سے زیادہ کرنی پڑتی تھی۔ جس سے وہ کبھی جی نہیں چراتا تھا۔ اسے خوشی تھی تو اس بات کی کہ اب اس کے گھر کے حالات بہتر ہوجائیں گے۔

☆ ☆ ☆

آج محمد علی کے اس چھوٹے سے گھر کے باورچی خانے سے کھانے کی بڑی اچھی خوشبوئیں آرہی تھیں۔ دونوں بہنیں سعدیہ اور مریم صبح سے حیدر کی پسند کے کھانے بنانے میں مشغول تھیں۔ سب کے چہروں پر بڑی خوب صورت مسکراہٹ تھی اور کیوں نہ ہوتی آج پورے تین ماہ بعد حیدر گھر واپس لوٹ رہا تھا۔ جب شام کے وقت سامان سے لدا پھندا وہ گھر میں داخل ہوا تو گھر کے مکینوں کی تو عید ہی ہوگئی۔ گھر کا اکلوتا سپوت جو ٹھہرا۔ سب کی اس میں جان تھی۔

"نی کڑیو! جلدی سے کھانا لے آؤ۔ میرا پتر بھوکا ہوگا۔"

حیدر جیسے ہی منہ ہاتھ دھو کر بیٹھا۔ دادی نے اونچی آواز میں سعدیہ اور مریم کو کھانے کا کہا۔

وہ تو پہلے سے ہی مستعد کھڑی تھیں۔ بڑے خوشگوار ماحول میں کھانا کھایا گیا۔ کھانے کے بعد مریم نے حیدر کی پسند کا دار چینی والا قہوہ بنایا۔ اس کے بعد ابا نے دونوں کو اپنے کمرے میں جانے کو کہا۔ حالانکہ وہ چاہ رہا تھا کہ وہ جلدی سے سامان کھولیں اور دیکھیں کہ حیدر ان کے لیے کیا لایا ہے۔ لیکن ابا کا کہنا ماننے کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ اسی لیے دل مسوس کر رہ جانا پڑا۔

ان کے جانے کے بعد ان چاروں افراد کے درمیان اس گھر کا سب سے سنجیدہ مسئلہ تھا اور وہ مسئلہ تھا سعدیہ اور مریم کی شادی کا۔ دونوں کی نسبت بچپن سے طے تھی۔ سعدیہ کی بات اپنے ماموں کے بیٹے سے طے تھی۔ جو کہ آرمی میں تھا اور مریم کو رخصت ہوکر اپنے مرحوم چچا کے گھر جانا تھا۔ سکندر مریم کا منگیتر محمد علی کی طرح کھیتی باڑی ہی کرتا تھا۔

"حیدر پتر! اس دفعہ فصل بھی چنگی ہوئی ہے۔ تو بھی ساتھ چار پیسے لایا ہوگا۔ تیری اماں بھی نہ جانے کب سے ان بچیوں کے لیے چیزیں اکٹھی کر رہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم سعدیہ اور مریم کی اکٹھے ہی شادی کردیں۔" محمد علی نے حقہ پیتے ہوئے اپنے گبھرو بیٹے کو بڑے پیار سے دیکھتے ہوئے بات شروع کی تھی۔

"لیکن ابا! میرا خیال تھا کہ ابھی کچھ عرصہ گزر جاتے تو زیادہ بہتر طریقے سے شادی کرسکتے تھے۔" حیدر اپنی بہنوں سے بہت پیار کرتا تھا۔ اسی لیے چاہتا تھا کہ بہنوں کی شادی میں کوئی کسر نہ چھوڑے۔ لیکن سال بڑے کچھ اور ہی طے کرکے بیٹھے تھے۔

"ارے پتر! ہم نے کون سا غیروں میں شادی کرنی ہے۔ جو وہ ہم کو جانتے نہ ہوں۔ ہم جیسے ہی ہیں۔ سوال روٹی چل رہی ہے۔ فرض فریضے ادا ہوجائیں۔ بس وہ بھی ہماری طرح یہی چاہتے ہیں۔ تو سوچ سوچ کے اپنے ذہن پہ بوجھ نہ ڈال۔" سکینہ نے بیٹے کو فکر مند دیکھا تو کہے بنا نہ رہ سکی۔

"ہم نے کون سا بہت تیاری کرنی ہے۔ گاؤں کی ریت رواج کے مطابق سعدیہ اور مریم کو پلنگ پیڑھی (فرنیچر) تو تیرا ابا ہی دے گا۔ کپڑے اور برتن میں نے کئی اکٹھے کر رکھے ہیں۔ کچھ اب نئے زمانے کے لے لیں گے۔ دونوں بہنوں کے لیے ایک ایک جوڑی بندے اور انگوٹھی بھی بنوا رکھی ہے۔ مسئلہ کھانے کا ہی ہے۔ دونوں بہنوں کی شادی ہوگی۔ پوری برادری کو روٹی کھلانا ہوگی۔ اس پر خرچا کافی ہوجائے گا۔" سکینہ یہاں آکے کچھ اٹک سی گئی۔

"تو بھی لوک! تو کیوں فکر مند ہوتی ہے؟ تو بس شادی کی تیاری شروع کر۔ ایسے نیک کاموں میں رب سوہنے کی طرف سے خاص برکت ہوتی ہے۔ کچھ نہ کچھ بندوبست ہوجائے گا۔" محمد علی اپنے حقے کو نئے سرے سے تازہ کرتے ہوئے بولا۔

"محمد علی! کچھ ہمیں بھی تو بتا کہ کیا سوچ رکھا ہے۔ یہ کام تیرا اکیلے کا نہیں۔ سارے مل جل کر مشورے سے کام کریں گے تو ہی کچھ بنے گا۔" دادی جو چپ چاپ انہیں سنے جا رہی تھیں بولے بنا نہ رہ سکیں۔

"اماں! وہ جو قبرستان والی زمین ہے نا، چوہدری رحیم داد کب سے اس کا خریدار بنا ہوا ہے۔ اب وہ زمین بیچ دوں گا۔ کچھ رقم ادھر سے آجائے گی۔ کوئی تین چار ڈنگر (جانور) فروخت کردوں گا۔ گھر میں بھی پیسے رکھے ہیں۔ ان شاء اللہ سب خیریت سے ہوجائے گا۔ بس اب آپ لوگ حیدر کے مشورے سے کوئی تاریخ پکی کرکے سارا اور تیاری شروع کریں۔"

اور پھر ان تینوں نے حیدر کو خاموشی سے اٹھتے دیکھا۔ وہ سامان کے پاس گیا اور پھر بیگ میں سے کچھ نکال کر لے آیا۔ سب سے پہلے اس نے اپنے بٹوے سے تین مہینے کی ساری آمدنی نکال کر اپنی ماں کے ہاتھ پر رکھ دی۔

"اماں اگر شادی کا پتا ہوتا تو دوستوں سے مزید انتظام کرکے لے آتا۔ لیکن ابھی تو بس یہی ہیں۔ آپ رکھ لیں۔ کام آئیں گے۔"

اور اماں نے دل ہی دل میں اپنے خوبرو بیٹے کی نظر اتارتے ہوئے اسے نہ جانے کتنی دعائیں دے ڈالیں۔

"پتر! رب تیری روزی میں برکت ڈالے۔ دل چھوٹا نہ کر۔ جب جب تجھے توفیق ہوگی تو اپنی بہنوں کو تحفے تحائف دیتے رہنا۔ تو اپنی بہنوں کا مان ہے۔ ایک تیرے دم سے ہی تو تیری بہنوں کا میکہ آباد ہے۔ پر تو یہ بتا! یہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟" انہوں نے اس کے ہاتھ میں موجود مخملیں ڈبے کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"اماں! یہ میں مریم کے لیے چوڑیاں لایا تھا۔ جاتے ہوئے اس نے فرمائش کی تھی۔ لیکن اب سوچ رہا ہوں کہ آپی کے لیے بھی لانی چاہیے تھیں۔" اس نے چوڑیاں دادی اور اماں کو دکھاتے ہوئے کہا۔

"حیدر! یہ تو سونے کی ہیں۔ تجھے اتنے پیسے کہاں سے ملے، جو تو نے اتنی خوب صورت سونے کی چوڑیاں بنوائیں؟" سکینہ کے لہجے میں عجیب سے خدشے لہرائے۔

"ارے اماں! آپ تو پریشان ہوگئیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ وہاں کراچی میں ورکشاپ پہ ایک سنار آتا تھا۔ اس سے اچھی دعا سلام ہوگئی۔ ایک دن اس کے ساتھ اس کی دکان پہ گیا۔ مریم کی بات ذہن میں تھی۔ اسی لیے معلومات کے لیے ان چوڑیوں کی قیمت پوچھ لی۔ لیکن اس نے اصرار کیا کہ اگر مجھے یہ چاہئیں تو میں لے لوں۔ میں نے اسے بتایا کہ فی الحال میرے پاس اتنی رقم نہیں، لیکن اس نے مجھے رقم ادا کرنے کا بڑا آسان ساحل بتایا کہ میں یہ لے لوں اور ہر مہینے تھوڑی

تھوڑی کر کے اسے قیمت ادا کر دوں۔ یوں سمجھ لیں۔ جیسے قسطوں پہ چیز لیتے ہیں۔ بالکل ویسا ہی معاملہ ہے۔" اس نے اماں کی تسلی کے لیے تفصیل بتائی تھی۔

"بیٹا! تو نے پردیس میں ادھار کیوں لیا؟ اس نے تو مذاق میں بات کہہ دی اور تو نے سچ ہی مان لیا۔ اب اگر اسے پتا چلے کہ تو اس کی فرمائش کے لیے اتنی مشکل میں پڑ گیا تو بھلا وہ خوش ہوگی؟ نہ میرا پتر! کبھی بھی یوں فضول چیزوں کے لیے اپنی جان مشکل میں نہیں ڈالتے۔ اب یہ پہن کر مریم کو کیا ملے گا۔ لیکن تو نے تو خود کو قرض تلے دبا لیا۔"

سکینہ کو اس کی بات بالکل اچھی نہ لگی۔

"ارے میری پیاری اماں! اب بس بھی کریں۔ یہ اس کے نصیب میں تھیں۔ میں لے آیا۔ اب آپ بتائیں! آپی کے لیے اس کے بدلے میں کیا کروں؟ کیونکہ اب تو شادی ہو رہی ہے تو دونوں کو ہی تحفہ ملنا چاہیے۔" اس نے چھوٹے بچوں کی طرح پوچھا۔ دادی اس کے انداز اور بہنوں کے لیے پیار پہ مسکرا دیں۔

"دے حیدر! تو پریشان نہ ہو۔ میرے پاس تیرے مسئلے کا حل ہے۔ میں نے تیری دلہن کے لیے اپنا بڑا سوہنا کھڑی چین (بریسلٹ) رکھا ہوا ہے۔ اب اگر تو کہے تو سعدیہ کو ان چوڑیوں کے بدلے میں وہ دے دیتے ہیں۔"

حیدر ان کی بات پر سکون سے مسکرا دیا۔ یوں اس گھر میں شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ گھر میں ڈھولکی کی تھاپ پر تالیاں بجنے لگیں۔ مریم کو جب اماں نے چوڑیاں دکھائیں تو خوشی سے اس کی آنکھیں جھلملانے لگیں۔ نہ جانے کیسے یہ خواہش اس کے دل میں پنپنے لگی تھی۔ وہ چھوٹی سی تھی۔ جب اماں کے ساتھ چوہدری رحیم داد کے گھر میلاد پر گئی تھی۔ اس کی بیٹی کو مریم نے سونے کی چوڑیاں پہنے دیکھا تھا۔ سونے کی وہ چوڑیاں اس کے دل میں یوں گھر کر گئیں کہ ہر روز خیالوں ہی خیالوں میں خود کو وہ چوڑیاں پہنے ہوئے دیکھتی۔ بڑے ہونے کے ساتھ خواہش میں بھی شدت آتی گئی اور اس کے بارے میں اس نے صرف اپنی بہن سعدیہ کو بتایا ہوا تھا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ وہ ایک غریب کسان کی بیٹی ہے۔ ان کے گھر پیٹ بھر کھانے کا احساس سونا پہننے کے احساس سے کہیں زیادہ قیمتی اور سکون کا باعث تھا۔ ضروری نہیں کہ ہر خواہش ہی تعبیر کا روپ دھار سکے۔ لیکن یہ صرف مریم کے دماغ کی تاویلیں تھیں۔ دل تو اپنی چاہ کے لیے ہمکتا ہے۔ اسے کیا خبر یہ چاہ اس کی دسترس سے باہر ہے۔ لیکن مریم نہیں جانتی تھی کہ ایک دن اس خواہش عیاں ہونے پر اس کا لاڈلا بھائی یوں جتن کر کے اس کو خوش کر دے گا۔ بڑی بے خودی کے عالم میں اس نے ہاتھ چوڑیوں کی طرف بڑھائے اور قریب تھا کہ وہ پہن بھی لیتی۔ جب دادی کی گھرکی نے اسے رکنے پر مجبور کر دیا۔

"نی مریم! تجھے یہ نہیں معلوم کہ کنواری لڑکیاں سونے کی چوڑیاں نہیں پہنتیں! ہمارے ہاں شادی کے بعد ہی لڑکی یہ استعمال کر سکتی ہے۔ تو یوں اتاولی نہ ہو اور یہ چوڑیاں مجھے دے۔ میں اپنے پاس سنبھال کر رکھ لوں۔"

کہنے کے ساتھ ہی انہوں نے چھیننے کے انداز میں وہ چوڑیاں اس سے لی تھیں۔ ان بڑی بوڑھیوں کی اپنی ہی تاویلیں ہوتی ہیں۔ ان کو کسی بات پر قائل کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہوتا ہے۔ دادی کی فطرت کو سمجھتے ہوئے مریم صبر کے گھونٹ پی کر رہ گئی لیکن دل میں پھوٹتے خوشی کے سوتے اسے کسی اور ہی دنیا کی سیر کرا رہے تھے۔

زندگی میں آنے والے اس نئے موڑ اور گھر میں شادی کی مصروفیت کے باوجود اس کی ذہنی رو بھٹک بھٹک جاتی اور بے خیالی میں اپنی کلائی کو دیکھتے ہوئے مسکرا دیتی۔ ان ہی احساسات میں گھر سے رخصتی کا دن آ پہنچا۔ سعدیہ کو چونکہ رخصت ہو کے شہر میں حامد کے گھر جانا تھا۔ اسی لیے اس کی رخصتی پہلے کی گئی تھی۔ روتے بلکتے سب کی دعاؤں میں وہ رخصت ہوئی اس کے بعد سکھیاں مریم کو تیار کرنے لگیں۔ اسے رخصت ہو کر دوسرے گاؤں میں چچا کے گھر جانا تھا اور پھر مریم نے سہیلیوں کی چھیڑ چھاڑ اور قہقہوں کے درمیان اپنی چاچی کی آواز سنی۔

"نی نزو! مریم کو گہنے نہ پہنانا۔ جاتے جاتے شام کا وقت ہو جائے گا۔ آج کل لوگوں کا کوئی اعتبار نہیں۔ ایسے موقعوں کی تاک میں گھات لگائے بیٹھے ہوئے ہیں۔ دونوں گاؤں کے درمیان جو کچا رستہ ہے۔ وہاں آج کل نہ جانے کدھر سے کوئی موذی ڈیرہ ڈال کے بیٹھے ہیں۔ جو اندھیرے میں لوگوں کو لوٹ لیتے ہیں۔ تم ایسا کرنا گہنے مجھے دے دینا۔ میں کسی کپڑے کی پوٹلی وغیرہ میں چھپا لوں گی۔ اپنی طرف سے تدبیر کر لیں گے۔ باقی اللہ مالک ہے۔ کل ولیمہ ہے۔ وہاں پہ پہن لے گی۔"

اپنے سیانے ہونے کا ثبوت دے کر وہ تو چلی گئیں۔ لیکن مریم کے دل میں ایک پھانس سی چبھ کر رہ گئی۔ دل عجیب سے واہموں میں گھر گیا۔ اس نے بڑی اداس نظروں سے اپنی چوڑیوں کی مخملیں ڈبے کو دیکھا۔

☆ ☆ ☆

اگلی صبح مریم کی آنکھ عجیب سی آوازوں سے کھلی۔ جیسے کوئی بین کر رہا ہو۔ کہیں سے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے وحشت زدہ ہو کر اپنے ارد گرد دیکھا۔ سکندر کمرے میں نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ صورت حال جاننے کے لیے کمرے سے باہر آتی۔ دھڑ سے کمرے کا دروازہ کھلا اور سکندر کی بہن نور بڑی عجلت میں اندر داخل ہوئی۔

"شکر ہے مریم! تو اٹھ گئی۔ جلدی سے تیار ہو جا۔ نانا جی فوت ہو گئے ہیں۔ ہمیں ادھر جانا ہے۔ میں تیرے لیے ہی رکی ہوئی تھی اور ہاں! سادہ سے کپڑے پہننا۔" منت کرتے ہوئے اس کے آنسو مسلسل گالوں کو بھگوئے جا رہے تھے۔

مریم ابھی پوری طرح حواسوں میں بھی نہیں آئی تھی۔ چاچی کے ابا کی وفات کا سن کر اس کا دل دہل گیا۔ وہ آگے بڑھی اور نور کو گلے لگا لیا۔

"ایسے ایک دم نانا جی کو کیا ہوا؟ کیا بہت زیادہ بیمار تھے؟" اس نے نور کے آنسو صاف کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"ہاں! بیمار تھے۔ اسی لیے تمہاری اور لالا سکندر کی شادی میں بھی شریک نہ ہو سکے۔ کہتے تھے کہ سکندر کے ولیمے میں ضرور شامل ہوں گا۔ لیکن اب کون سا ولیمہ اور کہاں کا ولیمہ۔"

وہ ایک دفعہ پھر رونے لگی۔ مریم نہ جانے کتنی دیر اس کو تسلی دیتی رہی۔ وہ جانتی تھی کہ سکندر سب کا لاڈلا ہے۔ اس کی شادی کا سب کو ارمان تھا اور ہوتا بھی کیوں نہ، سات بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ چار بہنیں اس سے بڑی اور تین اس سے چھوٹی تھیں۔

سکندر اچھا بھی بہت تھا۔ اپنے باپ کے مرنے کے بعد اس نے اس گھر کے کسی مکین کو ان کی کمی محسوس نہ ہونے دی تھی۔ وہ ایک دم اپنی عمر سے نہ جانے کتنا بڑا ہو گیا تھا۔ زمینوں پر خوب محنت کرتا اور اللہ کے کرم سے آج وہ اس قابل تھا کہ اس نے اپنی حیثیت کے مطابق چھ بہنوں کی شادیاں کی تھیں۔ آج وہ اپنے گھروں میں آباد تھیں۔ صرف یہ نور ہی باقی رہ گئی تھی۔ وہ تو اس کی شادی کے بعد ہی اپنی شادی کرنا چاہتا تھا۔ لیکن ماں اور بہنوں کے اصرار پر مجبور ہو گیا اور شادی پر رضامند ہو گیا۔

مریم سے اس کی نسبت مریم کی پیدائش پہ ہی دادی نے طے کر دی تھی۔ اس وقت وہ دس سال کا تھا۔ اسی حوالے سے سکندر کی ماں، بہنوں کو مریم بہت پیاری تھی۔ انہوں نے ان دونوں کی شادی کے لیے نہ جانے کیا کیا پروگرام بنائے تھے۔ لیکن نانا جی کی وفات کی وجہ سے سب ارمان دھرے کے دھرے رہ گئے اور یوں مریم نئی نویلی دلہن اپنا دلہناپا بھلائے سب گھر والوں کے غم میں شریک ہو گئی۔ وہ سکندر کی بیوی تھی۔ اس کی

نسبت سے اس پہ بہت ساری ذمہ داریاں تھیں۔ جو اسے نبھانی تھیں۔ اس گھر کے مکینوں کو اس سے بہت سی امیدیں تھیں۔ جن پہ اسے پورا اترنا تھا۔

☼ ☼ ☼

پہلے دن سے ہی اس نے گھر کے کاموں میں حصہ لینا شروع کردیا۔ چاچی نے اپنی لاڈلی بہو کے لیے اتنا ضرور کیا کہ اسے باڑے کے قریب بھی جانے نہ دیتی تھیں۔ صرف گھر کے کام کاج تک محدود کردیا۔ مویشیوں کی دیکھ بھال سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ یہ کام خود کرتی تھیں۔ باہر زمینوں کے کام کی ذمہ داری سکندر کی تھی۔ لیکن مریم پھر بھی اپنے گھر میں اتنے کاموں کی عادی نہ ہونے کی وجہ سے تھکنے سی لگی۔ کیونکہ یہاں مہمان داری بہت زیادہ تھی۔ آئے دن سکندر کی کوئی نہ کوئی بہن' بچوں سمیت میکے رہنے آجاتی اور ان کی مہمان نوازی میں مریم ہلکان ہوجاتی۔

اس روز تو اس کی جان پہ بن آتی' جب مہینے میں ایک آدھ دفعہ تمام بہنیں پروگرام بنا کر یہاں رہنے آجاتیں۔ گھر میں تل دھرنے کو جگہ نہ رہتی۔ مریم تندور پر روٹیاں لگانے کھڑی ہوتی تو صبح سے شام ہوجاتی۔ کھانا اتنے بڑے دیگچے میں اتنی مقدار میں پکتا کہ مریم کی کمر دکھنے لگتی۔ اگر ان کے لیے بستر لگانے لگتی تو اتنے بڑے صحن میں ہر طرف چارپائیاں ہی' نظر آتیں۔ یہ نہ تھا کہ وہ لوگ اس کی مدد نہ کرتیں۔ لیکن وہ صرف اوپر اوپر کے کاموں ہی میں اس کی مدد کرتیں۔ سبزی بنادی' چائے بنادی' برتن دھودیے۔

دھان پان سی اکیلی مریم کے لیے پھر بھی کام زیادہ تھے۔ لیکن وہ اپنے رویے سے ان پر کچھ بھی ظاہر نہ ہونے دیتی۔ ان کی آمد پر اس کے ماتھے پر شکن تک نہ آتی۔ کیونکہ اس بات کا ادراک اسے اچھی طرح تھا کہ یہ گھران کا میکہ ہے۔ ان کا مان ہے اور وہ اس مان کو ہمیشہ بنائے رکھنا چاہتی تھی۔ اسی لیے ساری نندیں اس کے گن گاتی تھیں۔ لیکن مریم اندر ہی اندر ٹوٹنے لگی تھی۔ شاید اس کی وجہ سکندر کا رویہ تھا۔ اس کی اتنی ریاضت اور محنت پر بھی سکندر کی طرف سے اس نے کبھی ایسا ایک لفظ بھی نہ سنا تھا کہ جس سے اسے احساس ہو کہ وہ اس کے کسی طرز عمل پر خوش ہوا۔ یا اس نے کبھی کسی بھی قسم کے جذبے کا اظہار کیا ہو۔

مریم جیسی نرم و نازک احساسات رکھنے والی لڑکی اس کی ایک نظر التفات کو ترستی رہتی۔ لیکن وہ مصروف ہی اتنا رہتا کہ مریم کی ساری باتیں دل میں ہی رہ جاتیں۔ لیکن وہ اتنا ضرور جانتی تھی کہ سکندر اس کا شوہر ہرگز نہیں اور نہ ہی اسے ناپسند کرتا ہے۔ شاید وقت سے پہلے ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دب کر وہ اتنا سنجیدہ اور سخت دل ہوگیا تھا کہ نرم اور لطیف جذبات اس کے دل پر اثر ہی نہیں کرتے تھے۔

وہ اکثر ایک بات سوچتی تھی۔ ''کیا پیار جیسا خوب صورت اور انمول جذبہ بھی فراغت اور آسائشوں کا محتاج ہے؟'' کبھی کبھار اس طرح کی سوچیں جب اس کے ذہن میں آتیں تو اسے احساس ہی نہ ہوتا اور رات آنکھوں میں کٹ جاتی۔ یہ سوچیں' تھکن اور رتجگے اس کی ذات کو مسمار کرنے کے لیے کافی تھے۔ وہ اپنی ذات سے لاپروا ہوتی گئی۔ سجنے سنورنے کا نہ ٹائم تھا اور نہ ہی دل میں کوئی خواہش۔ ایک لگا بندھا معمول تھا اور وقت گزرتا جارہا تھا۔

☼ ☼ ☼

دن' ہفتوں اور مہینوں میں بدلتے گئے۔ اس کی شادی کو ایک سال بیت گیا۔ جب گھر میں نور کی شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے۔ گھر میں رونقیں لگ گئیں۔ ساری نندیں شادی سے ایک ہفتہ پہلے ہی میکے میں ڈیرہ جما چکی تھیں۔ گھر کی آخری شادی تھی اور نور تھی بھی سب کی لاڈلی۔ اسی لیے خوب خریداری ہو رہی تھی۔

سکندر نے پیسے کی طرف سے کوئی کمی نہ ہونے دی۔ آج بھی گھر کی ساری عورتیں جوڑے ٹانک رہی تھیں۔ گرمیوں کی بڑی خوب صورت سی شام تھی۔ گھر گھر کر آتے بادل اور صحن میں موجود پیپل کے درخت سے اٹھکھیلیاں کرتی ہوائیں۔ جیسے ذہن و دل کی کثافتیں دور کررہی تھیں۔

مزے کی بات یہ تھی کہ آج سکندر بھی جلدی ہی گھر آگیا تھا۔ وہ سب کے لیے آم لایا تھا۔ جنہیں مریم بڑے سے ٹب میں برف ڈالے ٹھنڈا کررہی تھی اور بچوں کو بہلانے کے لیے وہ ساتھ ساتھ آم کاٹ کے انہیں دے رہی تھی۔ سکندر بڑی فرصت سے پاس پڑی چارپائی پہ لیٹا سب کی باتیں سن کر مسکرا رہا تھا اور اس کی یہ مسکراہٹ مریم کو ان گرمیوں میں چھائے بادلوں کی طرح خوش کر گئی۔ آج وہ بہت عرصے بعد یوں خوش ہو رہی تھی۔ اسے سب کچھ اچھا لگ رہا تھا۔ جب چاچی اپنے کمرے سے زیوروں کے ڈبے اٹھائے باہر آئیں۔

''مریم پتر! یہ لے۔ میں بڑے زیور بھی نکال کے لے آئی ہوں۔ نوری کی شادی پہ خوب تیار ہونا اور بری جہیز کے سارے زیور پہننا۔ تجھ میں تو نجانے کہاں سے بڈھی روح آگئی ہے کہ اتنی سی عمر میں تو نے سجنا سنورنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ یہ کام دھندے تو مرتے دم تک ساتھ نہیں چھوڑتے۔ لیکن ان کے ساتھ اپنا خیال بھی ضرور رکھنا چاہیے۔ اب تو تیری بہن جیسی نند کی شادی ہے تو خوب دل لگا کے تیار ہونا۔''

وہ چاچی کی باتیں سنتی بچوں کے ساتھ کھیلتے لاپروا سے سکندر کو دیکھ کر بے دلی سے مسکرادی۔ جبکہ نور اور دیگر نندیں زیور دیکھنے لگیں۔ مریم کٹے آموں کی ایک ٹرے سکندر اور بچوں کو دے کر اور دوسری اپنی نندوں کے پاس رکھ کر خود بھی ان پاس چٹائی پر بیٹھ گئی۔ جب نور نے اس کی چوڑیوں والا ڈبا کھولا تھا اور ان چوڑیوں کو دیکھتے ہی مریم کو بہت کچھ یاد آیا تھا۔ اس کے لب خود بخود مسکرانے لگے۔

''مریم! ایک بات کہوں' مانے گی؟'' اس سے پہلے کہ مریم وہ چوڑیاں نور سے لے کر پہنتی' نور کی بات پر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

''پہلے کبھی تمہاری بات ٹالی ہے جو اب ٹالوں گی؟'' مریم نے سادہ سے لہجے میں کہتے ہوئے اسے دیکھا۔

"مریم! تو میری اکلوتی بھابھی ہے۔ تو نے مجھے شادی پہ کوئی نہ کوئی تحفہ تو دینا ہے تو پھر یہ چوڑیاں ہی دے دے نا۔" وہ بڑی لجاجت اور لاڈ سے سرگوشی کرتے ہوئے بولی۔ چاچی اور دوسری بہنیں کپڑوں کی گنتی میں مصروف تھیں۔ ان کا دھیان مریم اور نور کی طرف ہرگز نہ تھا۔ لیکن وہ دونوں سکندر کی چارپائی کے قریب بیٹھی تھیں اور وہ ان کی طرف متوجہ بھی تھا۔

"مجھے پتا تھا۔ تو میری اچھی بھابھی ہے۔ مان جائے گی۔" نور نے اس کی خاموشی سے خود ہی مطلب اخذ کرلیا اور چوڑیاں ہاتھوں میں پہن کر اندر چلی گئی تاکہ آئینے میں خود کو دیکھ سکے۔

بے بسی سے مریم کی آنکھوں میں ایک دم آنسو آگئے۔ اس نے بے اختیار ہی سکندر کی طرف دیکھا۔ لیکن اسی وقت گلی والے دروازے پر کسی نے دستک دی اور وہ سرسری سی نظر اس پر ڈال کر پاؤں میں سلیپر اڑستا باہر کی طرف چل دیا تھا۔ جبکہ مریم اپنے آنسو چھپاتی اندر چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

نور کی شادی کے ہنگامے ابھی سرد بھی نہ ہونے پائے تھے کہ رمضان کی آمد نے سب میں توانائیاں سی بھر دیں۔ مریم بھی اس بابرکت مہینے میں ساری باتیں ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرنے لگی۔ حالانکہ نور جب بھی میکے آتی۔ تو مریم اس کی کلائیوں میں اپنی چوڑیاں بڑی حسرت سے تکا کرتی تھی۔

حیدر بھائی کتنے شوق اور مشکلوں سے اس کے لیے یہ چوڑیاں لائے تھے۔ لیکن وہ ان کو جی بھر کو دیکھ بھی نہ سکی تھی۔ پہننا تو بہت دور کی بات ہے۔ حالانکہ جب چاچی کو پتا چلا تو انہوں نے اسے کتنا ڈانٹا کہ اس نے چوڑیاں نور کو کیوں دی ہیں۔

"تمہارے پاس کون سے سونے کے خزانے ہیں جو تو نے مٹھی بھر اٹھا کر نند کو دے دیا؟" لیکن نہ تو نور دینے پر راضی تھی اور نہ ہی یہ لینے پر مصر تھی۔ جب سراہنے والی توجہ اور پیار کرنے والی ہستی ہی بے نیازی

اور لاپروائی کا لبادہ اوڑھے بیٹھی تھی تو اسے کس کے لیے بنجنا سنورنا تھا۔ وہ سر جھٹک کر کاموں میں مصروف ہوجاتی اور جلد ہی فارغ ہو کر عبادت کا خصوصی اہتمام کرتی۔

سکندر کے روز مرہ معمول میں بھی فرق آگیا تھا۔ منہ اندھیرے جاتا اور دھوپ نکلنے سے پہلے گھر آجاتا۔ باقاعدگی سے روزے رکھتا۔ نماز اور تلاوت کی بھی پابندی کرتا تھا۔ چاچی نے بھی گھر سے نکلنا چھوڑ دیا۔ کاموں سے فارغ ہو کر دونوں ساس بہو پیپل کی چھاؤں میں چٹائی بچھا کر بیٹھ جاتیں۔ تلاوت کرتیں، درود شریف پڑھتیں۔

مزے کی بات یہ تھی کہ اب کاموں کا بوجھ بھی کم تھا۔ کیونکہ اس کی نندیں بھی اپنی اپنی سسرال میں مصروف تھیں۔ ادھر کا چکر کم ہی لگتا۔ رمضان کی وجہ سے مہمان داری تو نہ ہونے کے برابر تھی۔ چاچی نے مریم کی آسانی کے لیے فیصلہ کیا تھا کہ بیٹیوں کو باری باری افطاری پر بلانے کی بجائے ستائیسویں روزے، اکٹھا مدعو کریں گی۔

مریم کے گھر والوں اور سعدیہ کو بھی سسرال سمیت دعوت دی گئی تھی۔ اسی طرح یہ لوگ بھی باری باری سب کے گھر مدعو ہوئے تھے۔

☼ ☼ ☼

آخر کار سب میں رحمتیں اور برکتیں بانٹتا رمضان رخصت ہوا اور اس چھوٹے سے گاؤں میں چاند رات کی رونقوں نے ڈیرہ جمایا۔ آج سکندر صبح سے ہی کسی کام کے سلسلے میں شہر گیا ہوا تھا۔ چاچی صحن میں چارپائی پر مچھر دانی لگائے سوئی ہوئی تھیں۔ مریم نے سوچا کہ سکندر کے انتظار کے ساتھ ساتھ اپنے کام بھی کرتی جائے۔ اس نے سب سے پہلے سکندر کے عید والے کپڑے استری کرکے رکھے۔ اس کے بعد باورچی خانے میں آگئی۔

سکندر کو میٹھے میں دودھ والی سویاں اور کھیر بہت

پسند تھی۔ اس نے سوچا کہ ابھی سے بنا کر فریج میں رکھ دے۔ تاکہ صبح کام میں آسانی ہوجائے۔ چاچی نے کمیٹیاں ڈال کر نور کی شادی سے پہلے فریج لے کر دیا تھا۔ تاکہ مہمانوں کی خاطر تواضع کے لیے باہر سے برف نہ منگوانی پڑے۔ مریم بڑے شوق سے اسے استعمال کرتی تھی۔ ابھی اس نے کھیر کے لیے چولہے پہ چاول رکھے ہی تھے۔ جب اسے گلی والا دروازہ کھلنے کی آواز آئی تھی۔ اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا تو سکندر ہی تھا۔ وہ اب دروازہ بند کررہا تھا۔ اس کے آنے پر ہمیشہ کی طرح مریم کے لبوں پر بڑی خوب صورت مسکراہٹ بکھر گئی۔

سکندر بھی باورچی خانے میں روشنی دیکھ کر سیدھا ادھر ہی چلا آیا اور سلام کرکے پیڑھی کھینچ کر اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ مریم جلدی سے اس کے لیے ٹھنڈا شربت لے آئی۔

"مریم! سارے کاموں کو چھوڑو اور ادھر میرے پاس بیٹھو۔ دیکھو! میں تمہارے لیے کیا لایا ہوں۔" اس نے ہاتھ پکڑ کے اسے اپنے سامنے بٹھایا۔

مریم بھی اس کے قریب رکھے شاپروں کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے اس کے پاس بیٹھ گئی۔ سکندر نے ایک مخملیں ڈبا نکالا اور کھول کر اس کے سامنے کردیا۔ ڈبے کے اندر موجود جگر جگر کرتی چار طلائی چوڑیاں مریم کی آنکھوں کو خیرہ کر گئیں۔ وہ حیرانی سے سکندر کو دیکھنے لگی۔ وہ بھی چہرے پر سادہ سی مسکراہٹ سجائے اسی کو دیکھ رہا تھا۔ مریم کی حیرانی کو نظر انداز کرکے اس نے اپنے ہاتھوں سے چوڑیاں اس کی کلائی میں پہنا دیں۔

"اب ان کو کبھی نہ اتارنا۔ اگر کوئی مانگے تو صاف انکار کردینا۔ وہ انکار خود کو تکلیف اور اذیت دینے سے بہتر ہے۔"

نجانے کیوں اب بھی مریم کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ وہ تو سمجھی تھی کہ اس دن سکندر نے دیکھا ہی نہیں۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ اس نے دیکھا بھی تھا اور محسوس بھی کیا تھا۔

"بے شک نور ہم سب کے لیے چھوٹی ہے۔ لیکن تم تو نور سے بھی چھوٹی ہو۔ میرے حوالے سے ذمہ داریاں ادا کرتے ہوئے تمہیں اتنا بڑا بننے کی ضرورت نہیں کہ تم اپنی خواہشوں اور ارمانوں کو مار کر خود کو اذیت دو۔ اگر میں چاہتا تو اسی وقت نور کو منع کردیتا۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر خاموش ہوگیا۔ یہ چوڑیاں میری طرف سے عیدی سمجھ لو۔"

مریم کا ہاتھ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ یہ سوچ رہی تھی کہ سکندر اس کی طرف سے اتنا بھی لاپروا نہیں۔ جتنا وہ سمجھتی ہے۔

"کیا بات ہے مریم! تمہیں اچھا نہیں لگا؟" اس کی گھنیری پلکوں کی نمی کو محسوس کرکے اس نے پوچھا۔

"سکندر! یہ تو بہت مہنگی ہوتی ہیں۔ آپ نے اتنے پیسے کہاں سے لیے؟" سکندر مسکرادیا۔

"گاؤں کے باہر ہماری زمین تھی نا۔ اس کے دام بھی اتنے اچھے نہ تھے اور فصل بھی اچھی نہیں ہوتی تھی۔ لیکن ملک صاحب کا بیٹا جو باہر سے پڑھ کر آیا ہے۔ وہ گاؤں سے باہر فیکٹری لگا رہا ہے۔ اسے بہت سی زمین کی ضرورت تھی۔ ہماری زمین بھی اسی حد میں آتی ہے۔ جہاں وہ فیکٹری لگانے کا سوچ رہے ہیں۔ بس ہماری قسمت جاگ گئی۔ اس زمین کے بڑے اچھے دام لگے ہیں۔ بہنوں کا حصہ علیحدہ کرنے کے بعد جو رقم بچی میں نے سوچا تمہارے لیے یہ چوڑیاں لے لوں۔ اسی لیے آج شہر گیا ہوا تھا تاکہ تمہیں عید پر یہ تحفہ دے سکوں۔"

آج خلاف معمول وہ بول رہا تھا اور مریم سانس بھی لیے بغیر اسے سنے جارہی تھی اور پھر سکندر نے پاس پڑے شاپر سے کچھ اور نکالا۔ وہ گہرے سبز رنگ کا ریڈی میڈ سوٹ تھا۔ جس پہ سلور مقیش سے انتہائی نفیس کام کیا گیا تھا۔ وہ سکندر نے اس کی گود میں رکھا۔

"صبح یہی کپڑے پہننا۔ تم پہ یہ رنگ بہت اچھا لگتا ہے۔"

اور پھر یہی نہیں اس نے مریم کی دوسری کلائی پکڑی۔ "اور اس میں ہری کانچ کی نجانے کتنی چوڑیاں

اپنے ہاتھوں سے پہنادیں ــــ "وہ چوڑیاں میں تمہاری خوشی کے لیے لایا ہوں۔ لیکن یہ کانچ کی چوڑیاں میں اپنی خوشی کے لیے لایا ہوں۔ ان کی آواز مجھے ہروقت تمہارے ہونے کا احساس دلاتی ہے۔ چاہے تم میری نظر کے سامنے ہو یا نہ ہو۔ آئندہ ایک بات یاد رکھنا کہ تمہارا رونا مجھے تکلیف دیتا ہے۔ تمہاری آنسو بھری ان آنکھوں نے مجھے ایک پل بھی چین سے نہیں رہنے دیا۔ خوش رہا کرو۔"

آنسوؤں کو پیچھے دھکیلتی مریم نے بمشکل پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ کشادہ پیشانی پہ بکھرے سیاہ بال' آنکھوں میں معصوم سا تاثر لیے' وہ بڑے سادہ سے لہجے میں بولتا ہوا مریم کا من مہکا گیا۔

"ویسے مریم! میں نے ایک بات محسوس کی ہے۔ تم سوچتی بہت ہو۔ اب یہ کام بعد میں کرلینا۔ جلدی سے پھیلاوا سمیٹو اور سو جاؤ۔ صبح عید ہے۔ جلدی اٹھنا ہوگا۔ میں بھی تھکا ہوا ہوں۔ سونے جارہا ہوں۔"

وہ اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگاتا باورچی خانے سے باہر نکل گیا۔ لیکن مریم وہیں بیٹھی رہی۔ کیا کسی کی چاندرات اتنی خوب صورت ہوگی۔ جتنی آج مریم کو محسوس ہو رہی ہے۔ کیا کوئی لباس اتنا خوب صورت ہوگا' جو چاہت کے رنگوں سے رنگا ہو۔ کیا کوئی کلائی اتنی خوب صورت دکھتی ہوگی۔ جس میں سجی چوڑیوں پہ لگا رنگ بے شک ختم ہوجائے۔ لیکن اپنایت اور پیار کا احساس ختم نہ ہو۔ وہ اپنی آستین پیچھے کیے ٹکٹکی باندھے کانچ کی ہری چوڑیوں کو دیکھ رہی تھی۔

"یہ میں اپنی خوشی کے لیے لایا ہوں۔ یہ مجھے تمہارے ہونے کا احساس دلاتی ہیں۔"

یہ فقرہ اس کے من کے ایوانوں میں گونجا۔ جبکہ دوسری کلائی پہ آستین میں چھپی طلائی چوڑیاں اپنی کم مائیگی پہ انگشت بدنداں تھیں۔ انہیں کیا خبر کہ دنیا کی قیمتی سے قیمتی متاع اور کوئی بھی مادی خواہش چاہے جانے کے احساس سے زیادہ انمول نہیں ہوتی۔ یہی احساس آج مریم کے من میں سرایت کرکے اسے ہواؤں میں اڑا رہا تھا۔

"تمہارا رونا مجھے تکلیف دیتا ہے۔"

کیا دنیا میں کوئی فقرہ اس فقرے کی خوب صورتی، گہرائی کا مقابلہ کرسکتا ہے؟ مریم وہیں دروازے کی دہلیز پہ چوکھٹ سے سر ٹکائے اس کا لفظ لفظ دہرا رہی تھی۔ اس کے لبوں کی جنبش دھیان میں سموئے لفظوں کی ہر بات کو من میں اترتا اور ذہن میں نقش ہوتے محسوس کررہی تھی۔ جو اس کو سرتاپا بدلنے کے لیے کافی تھیں۔ نجانے کتنا وقت بیتا تھا۔ جب اس نے دور سے کہیں اذانوں کی آواز سنی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھی۔

"اف! میں کتنی دیر سے یہاں بیٹھی ہوں۔" بکھری چیزیں سنبھال کر نماز کی تیاری کرنے لگی۔ اپنے رب کا شکر بھی تو ادا کرنا تھا کہ اسی ذات نے ہی تو اس کی جھولی بھر بھر خوشیوں اور نعمتوں سے نوازا تھا۔ وہ خوب صورت چاندرات کے اختتام پر شروع ہونے والے بابرکت اور خوشیوں بھرے عید کے دن کا آغاز اچھے طریقے سے کرنا چاہتی تھی۔ اسے سکندر سے کوئی گلہ نہ تھا۔

اسے آج کی رات اوراک ہوا تھا کہ سکندر ان لوگوں میں سے ہے' جو اپنے جذبات کو سیپ میں موتی کی طرح سینچ سینچ کے رکھتے ہیں اور اظہار کی ضرورت انہیں تب ہی محسوس ہوتی ہے۔ جب انہیں لگے کہ ان سے منسلک بندہ بدگمان ہونے لگا ہے۔ وہ بدگمانی دور کرتے ہیں اور دوبارہ سے جذبات سیپ میں مقید کرلیتے ہیں۔ وہ لفاظی کے ہنر سے انجان ہوتے ہیں۔ لیکن پیار سے انجان ہرگز نہیں ہوتے اور نہ ہی اپنی پیاری ہستی سے۔

یہی سوچتے ہوئے وہ مسکرا رہی تھی۔ ابھی اسے بہت سے کام کرنے تھے اور اب وہ جانتی تھی کہ اسے کبھی تھکن نہیں ہوگی۔ کیونکہ محبت جیسی قیمتی متاع کا احساس ہر احساس پر حاوی ہوتا ہے اور یہ احساس اسے اس عید پہ کسی سوغات کی طرح عنایت ہوا تھا۔ جو اس کی آئندہ کی زندگی کو سہل کرنے کے لیے کافی تھا۔

صائمہ اکرم چوہدری

دیمک زدہ محبت

سکینہ، جمیلہ مائی اور اللہ دتا کمہار کی اکلوتی بیٹی ہے، جو شادی کے سترہ سال بعد پیدا ہوئی اور چودہ برس کی عمر میں کبڑے پن کی بیماری میں مبتلا ہو گئی۔ پانچ سال لگاتار علاج کے بعد بیت المال والوں نے اسے سرکاری اسپتال میں پرائیویٹ کرا دلوا دیا۔ جہاں ڈاکٹر خاور اس کا مفت علاج کر رہے ہیں۔ عام سی شکل و صورت والی سکینہ، ڈاکٹر خاور کو پسند کرنے لگتی ہے۔ سکینہ کی آواز بہت خوب صورت ہے، تاہم ڈاکٹر خاور اسے صرف اپنی مریضہ سمجھتے ہیں۔

ماہم منصور حسین ترین سائیکالوجسٹ ہے اور اپنا ذاتی کلینک چلاتی ہے۔ رامس علی اس کا مریض ہے۔ ماہم بلا کی حسن پرست ہے۔ اس کی دوست عائشہ قدرے کم صورت ہے۔ عائشہ کا بھائی موحد رحیم، ماہم کو پسند کرتا ہے مگر سوات آپریشن میں اس کی دونوں ٹانگیں ضائع ہو جانے کے سبب ماہم اس سے کھنچ جاتی ہے۔ ماہم کی بڑی بہن ثمن، عائشہ کے کزن انفر کی بیوی ہے اور ڈومننٹ ہے۔

رامس علی اپنے نفسیاتی عارضے کی وجہ سے خودکشی کی کوشش کرتا ہے لیکن بچ جاتا ہے۔ اس حادثے کے بعد رامس اور ماہم ایک دوسرے کے قریب آ جاتے ہیں۔

سکینہ کی خوب صورت آواز کی وجہ سے ڈاکٹر خاور اسے ایک نعت کمپٹیشن میں حصہ لینے کے لیے کہتے ہیں۔ ڈاکٹر خاور کی ساتھی ڈاکٹر زویا کو ان کا سکینہ پر مہربان ہونا ناگوار گزرتا ہے۔ سکینہ اور ڈاکٹر خاور کو ان کی ناپسندیدگی کا علم ہے۔ جمیلہ مائی وقتاً فوقتاً سکینہ کو سمجھاتی رہتی ہیں۔

اب آگے پڑھیے
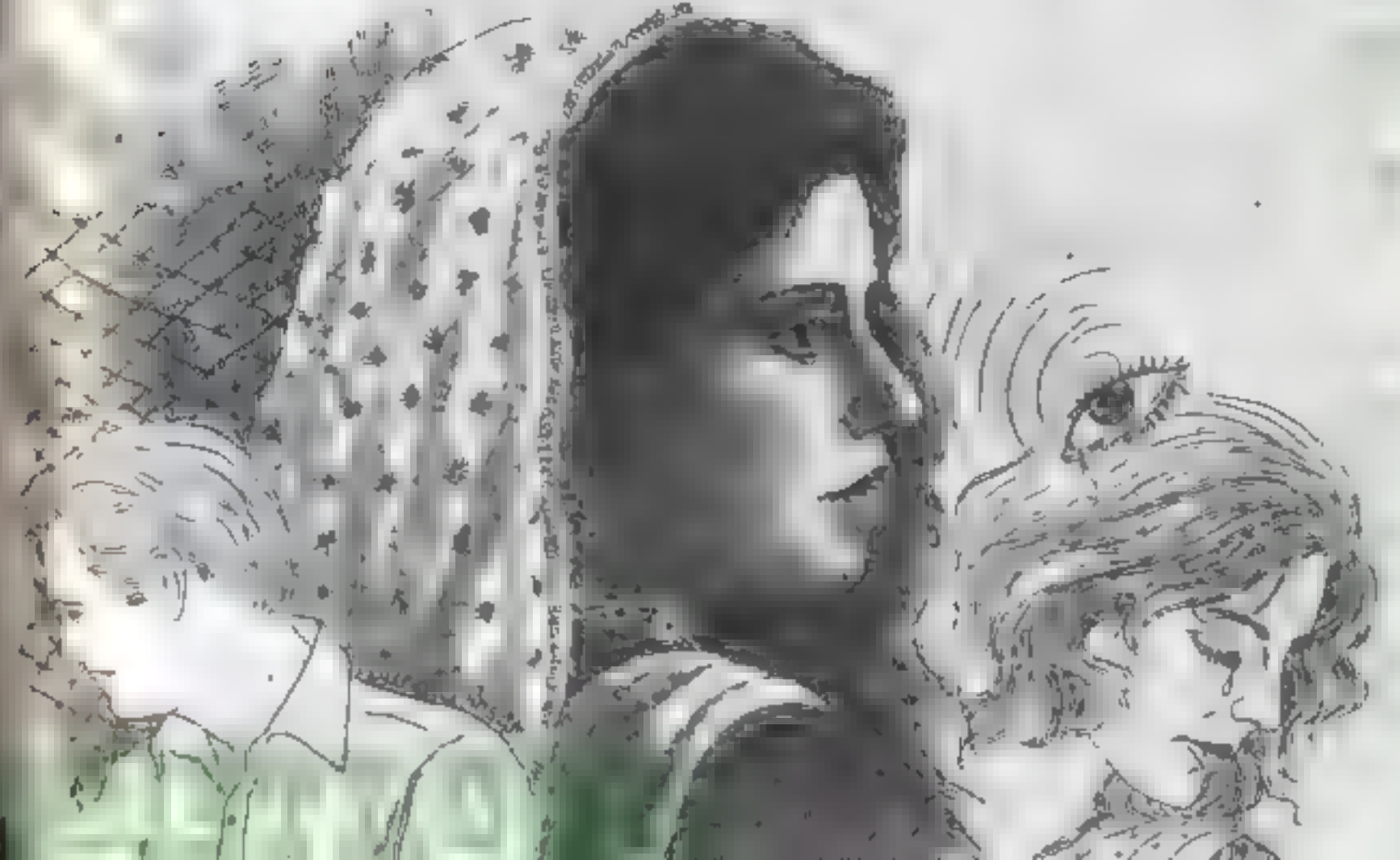
شائلہ زبیر ایک مشہور مصنفہ ہے۔ اس کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ وہ اپنے فرضی کردار سکندر شاہ سے محبت میں مبتلا ہو گئی ہے۔ اسی سلسلے میں اس کی ملاقات ماہم سے ہوتی ہے۔

نعت کمپیٹیشن میں سکینہ کی ملاقات موحد اور عائشہ سے ہوتی ہے۔ عائشہ کی پینٹنگز سے متاثر ہو کر علی اس میں دلچسپی لینے لگتا ہے۔ مگر ماہم کو یہ بات اچھی نہیں لگتی۔ شائلہ زبیر ایک مشہور مصنفہ ہے۔ وہ اپنے فرضی کردار سکندر شاہ سے محبت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اسی سلسلے میں اس کی ملاقات ماہم سے ہوتی ہے۔ شائلہ اپنی ماں کا واحد سہارا ہے۔ اس کا اکلوتا بھائی دوسرے ملک میں اپنی فیملی کے ساتھ رہتا ہے اور انہیں تقریباً "بھول ہی گیا ہے۔ معمولی ایکسیڈنٹ کے واقعے میں اس کی ملاقات موحد سے ہوتی ہے۔ وہ سکندر شاہ سے بے حد مماثلت رکھتا ہے۔ شائلہ اور موحد کی دوستی ہو جاتی ہے۔ مارننگ شو کی میزبانی کرنے سے منع کرنے پر ثمن انفر سے خلع کا دعوا دائر کر دیتی ہے۔ ایک اسپتال میں عائشہ علی کو ایک لڑکی کے ساتھ گائنی وارڈ میں دیکھ کر ریشتہ ہو جاتی ہے۔ ماہم رامس کی ٹانگوں پر برص کے نشان دیکھ کر پیچھے ہٹ جاتی ہے۔

چھٹی قسط

"ماہم! تم اسلام آباد واپس آ گئیں اور تم نے مجھے بتانا تک مناسب نہیں سمجھا۔" رامس کی رنج اور بے یقینی میں ڈوبی کال ماہم نے اٹینڈ تو کر لی تھی لیکن یہ وہی جانتی تھی کہ کس قدر ناگوار گزری۔

"میں نے تمہیں ٹیکسٹ تو کیا تھا کہ ثمن آپی کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے، اس لیے میں ایمرجنسی میں واپس جا رہی ہوں۔" ماہم کے لہجے میں رکھائی کا عنصر غالب تھا اور یہی چیز رامس کے لیے پریشانی کا باعث بن رہی تھی۔

"ماہم! تم نے خود مجھے شام کی چائے پر انوائیٹ کیا تھا۔ تم کم از کم مجھے انفارم تو کر دیتیں۔ میں دو گھنٹے تمہارا انتظار کرتا رہا۔" رامس کے لہجے میں ہلکی سی جھنجلاہٹ نے اسے مزید کوفت میں مبتلا کیا۔

"ہزار دفعہ بتا چکی ہوں کہ آپی کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ اب کیا میں پورے ہوٹل میں اعلان کر کے نکلتی۔" ماہم کے تلخ انداز پر وہ کچھ لمحوں کے لیے بالکل گنگ ہو گیا۔

"مجھے ایک کال کر لیتیں تو میں بھی تم لوگوں کے ساتھ نکل آتا۔" اس نے کچھ سنبھل کر کہا تو وہ خاموش رہی۔ "اب کیسی طبیعت ہے ان کی؟"

"بہتر ہیں۔" ماہم نے مختصراً جواب دیا۔ وہ دل میں اس لمحے کو کوس رہی تھی جب اس نے دسویں بار آنے والی رامس کی کال اٹینڈ کرنے کا فیصلہ کیا۔

"تم خفا ہو مجھ سے؟"

"نہیں۔" اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

"اچھا۔" وہ کچھ چپ ہوا۔ "کیا میں ثمن آپی کی عیادت کے لیے آ جاؤں۔۔۔؟" اس نے ملنے کا ایک بہانہ تلاش کر ہی لیا۔

"ہرگز نہیں۔" ماہم نے تیزی سے بات قطع کی "اصل میں وہ ذہنی طور پر کچھ ٹینس ہیں، اس لیے کسی سے بھی نہیں مل رہیں۔"

"اوہ۔۔۔" رامس نے ایک لمبی سانس فضا میں خارج کی۔ "ان کا مسئلہ حل نہیں ہوا کیا؟" اس نے سنبھل کر پوچھا۔

"نہیں، انہوں نے خلع کے لیے عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا ہے۔" ماہم کی اطلاع پر اسے اچنبھا ہوا۔

"یہ تو اچھا نہیں کیا انہوں نے، مل بیٹھ کر مسئلے کا کوئی حل نکال لیتیں۔"

"مسئلوں کے حل وہاں نکلتے ہیں، جہاں لوگ انہیں سلجھانا چاہتے ہیں۔ جب کہ انفر بھائی حد درجہ دقیانوسی سوچ کے حامل روایتی مرد ہیں۔" ماہم کا لہجہ زہر میں ڈوبا ہوا تھا۔

"ہوں۔۔۔ تم ٹھیک کہتی ہو۔" وہ زبردستی متفق ہوا اور کچھ توقف کے بعد بولا۔ "تم نے اس دن مجھ سے کیا خاص بات کرنی تھی؟"

"کس دن؟" وہ جان بوجھ کر انجان بنی۔

"اس دن بھوربن میں، جب تم نے مجھے شام کو چائے پر انوائیٹ کیا تھا۔" رامس نے اسے یاد دلانے کی کوشش کی۔

"کیا میں نے ایسا کچھ کہا تھا؟" اس کی بے نیازی پر رامس کے، سانوں پر ڈھیروں اوس گر گئی۔

"ہاں ناں۔۔۔ تم نے اس دن کہا تھا کہ کوئی خاص بات کرنی ہے۔" رامس نے خود ہی ڈھیٹ بن کر یاد دلانے کی کوشش کی جب کہ دوسری جانب ماہم پر سخت بے زار ہوئی۔

"مجھے تو ایسا کچھ یاد نہیں۔" وہ صاف مکر گئی۔ اس کے سپاٹ انداز پر رامس کو صدمہ ہوا۔ وہ مارے حیرت اور رنج کے کافی دیر تک کچھ بول ہی نہ پایا۔

☆ ☆ ☆

وہ دریائے کنہار کے ٹھنڈے یخ پانی میں دونوں پاؤں ڈالے بڑی افسردہ سی بیٹھی تھی۔ نم آلود ہوا کے جھونکے اس کے بالوں کے ساتھ اٹھکھیلیاں کر رہے تھے۔ خوبصورت سرسبز پہاڑ، دلکش وادیاں، سحر انگیز نظارے کوئی بھی چیز عائشہ کے دل کو خوشی کا احساس نہیں بخش رہی تھی۔ وہ بڑے سے پتھر پر بے زاری سے بیٹھی سامنے کچھ بچوں کو جنگلی پھول اکٹھے کرتے دیکھ رہی تھی۔ اسے ماما اور بابا کے ساتھ ناران، کاغان آئے ہوئے پورے تین دن ہو چکے تھے۔

"عاشو! ابھی میرے سیل پر ماہم کی کال آئی تھی، وہ پوچھ رہی تھی کہ تمہارا نمبر کیوں بند ہے؟" ماما نے اچانک اس کی پشت سے آ کر کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک اٹھی۔

"ویسے ہی ماما!" وہ تتلیوں کے ایک غول پر نظریں جمائے سپاٹ انداز سے بولی۔

"عائشہ! تم ٹھیک تو ہو بیٹا! میں پچھلے کچھ دن سے نوٹ کر رہی ہوں کہ تم کچھ الجھی الجھی سی ہو۔" ماما نے شال اپنے گرد لپیٹتے ہوئے غور سے اس کا مرجھایا ہوا چہرہ دیکھا۔

"ایسے ہی، تھک گئی ہوں ماما!" اس نے زبردستی مسکراتے ہوئے انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "اسی لیے تو جب آپ کا اور بابا کا ناران کا پروگرام بنا تو میں بھی زبردستی ساتھ چلی آئی۔" اس نے ہاتھ میں پکڑا چھوٹا سا پتھر پانی کی طرف اچھالا۔

"وہ تو تم نے اچھا کیا، لیکن نہ جانے کیوں میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ تم کچھ ڈسٹرب ہو۔" ماما کھوجتی نظروں سے اس کا جائزہ لے رہی تھیں۔

"ماما! چھٹی حس اس وقت کام کرتی ہے جب آپ کی باقی پانچ حسیں بھی بالکل ٹھیک ہوں۔" وہ دانستہ خوشگوار لہجے میں بولی۔ اسے ماما کی پوسٹ مارٹم کرتی نظروں سے الجھن ہو رہی تھی۔

"میری پانچوں، چھٹی کیا سب ہی حسیں تم بہن بھائیوں نے خراب کر دی ہیں۔ ایک تھوڑا سا بستر ہوتا ہے تو دوسرے کے منہ کے زاویے بگڑ جاتے ہیں۔" ماما چڑ کر بولیں تو عائشہ ہنس پڑی۔

"ڈونٹ وری ماما! میں بالکل ٹھیک ہوں، پچھلے دنوں ایگزیبیشن، بلڈ ڈونیشن پھر بیت المال والوں کے فنکشنز وغیرہ نے تھکا دیا۔ اس لیے آپ کو ایسا لگ رہا ہے۔"

"ہاں تو اسی لیے تو میں تمہیں منع کرتی ہوں کہ ایسے اوٹ پٹانگ کام کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔" ماما کو بھی کھل کر بولنے کا موقع مل گیا۔ "آج کل موحد نے بھی اپنی فیکٹری کو حواسوں پر سوار کر رکھا ہے لیکن شکر ہے کہ وہ مصروف ہوا ورنہ اس کی وجہ سے مجھے سخت پریشانی تھی۔" ان کا دھیان تھوڑا سا بٹا تو عائشہ نے سکون کا سانس لیا۔

"عائشہ! ذرا پتا تو کراؤ کہ یہ موصد آخر بات کس سے کرتا ہے۔" انہیں اچانک یاد آیا۔
"ماما! جس سے بھی بات کرتا ہو' آپ تو شکر ادا کریں کہ آپ کے بیٹے کے چہرے پر بھی مسکراہٹ آئی۔" عائشہ نے لاپروائی سے کہا تو وہ مسکرا دیں۔
"کہتی تو تم بالکل ٹھیک ہو۔" وہ فوراً" متفق ہوئیں۔
دور کسی جھرنے کے بہنے کی آواز ماحول کی خوبصورتی میں اضافہ کررہی تھی۔
"پاپا کہاں ہیں۔ ان کو یہاں بھی اپنے دوست مل گئے؟" عائشہ نے یونہی کہا۔
"ان کو کہاں دوست نہیں ملتے۔" ماما نے بے زاری سے جواب دیا۔ "کہنے کو میرے ساتھ وقت گزارنے آئے تھے اور صبح سے کمال صاحب کے ساتھ شطرنج کی بازی بچھائے بیٹھے ہیں۔" انہوں نے روایتی بیویوں کی طرح اپنے شوہر سے ٹائم نہ دینے کا شکوہ کیا۔
"آپ بھی شطرنج کھیلنا سیکھ لیں نا۔" عائشہ نے ان کو چھیڑا۔
"دفع کرو۔" ان کے ماتھے کا بل گہرا ہوا۔ "یہاں زندگی ہی شطرنج کا کھیل بنی ہوئی ہے۔ ہر روز ایک نئی ملت اور نئی چال۔ تم بیٹھو یہاں' میں ذرا ریسٹ ہاؤس کا چکر لگا کر آتی ہوں۔"
وہ ایک دم ہی کھڑی ہوئیں تو عائشہ نے سکون کا سانس لیا۔ وہ آج کل خود سخت مردم بے زار ہو رہی تھی۔
"اپنا سیل فون آن کرلینا۔ ماہم کال کرے گی تمہیں۔" ماما نے تھوڑا سا آگے جاکر پلٹ کر کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
انسانی زندگی میں محبت کا کتنا مضبوط کردار ہے۔ جو سارے موسم بدل دیتی ہے۔ ایک ہی موسم ہوتا ہے دل کا موسم۔ محبت جائے تو جان لیوا افسردگی دل میں ڈیرا ڈال لیتی ہے۔ ایسے میں باہر کا کوئی بھی خوبصورت نظارہ انسان کو خوش نہیں کرسکتا۔
اس نے اچانک بیٹھے بیٹھے اپنا سیل فون آن کیا۔ ٹیکسٹ میسیجز کی بھرمار نے اس کا استقبال کیا۔ بے دلی سے اسکرین پر نظر دوڑا رہی تھی۔ اس دشمن جان کے بھی ڈھیروں پیغامات تھے۔ پچھلے ایک ہفتے سے اس کا فون بند تھا۔
"تم اپنا فون آن کیوں نہیں کررہی ہو۔ تمہاری خاموشی میرے لیے کتنی اذیت ناک ہے' تم اس چیز کا تصور بھی نہیں کرسکتیں۔" بالکل سپاٹ انداز سے اس نے علی کا ایک میسیج پڑھا۔ "اور جس اذیت سے میں گزر رہی ہوں' تم تصور کرلو تو پاگل ہو جاؤ۔" اس نے بہت تلخی سے سوچا اور اس کا اگلا ٹیکسٹ پڑھنے لگی۔
"تم نے کبھی کسی جنگل میں خوشنما پھولوں کی نیچر کے اندر چھپی دلدل کو دیکھا ہے۔ اس کے اندر دھنس جانے کا تصور کتنا خوفناک ہوتا ہے۔ تمہاری خاموشی اور ناراضی اس دلدل سے بھی زیادہ ہولناک ہے میرے لیے۔" اس کے دل کی دھڑکن بے ترتیب ہوئی اور آنکھیں پانیوں سے لبریز ہو گئیں۔
دریائے کنہار کے پانی میں اس کے پاؤں منجمد ہو چکے تھے لیکن وہ ان تمام چیزوں سے بے نیاز تھی۔ شاید مسلسل اس کا نمبر ٹرائی کررہا تھا' تب ہی اس کے موبائل کی خوبصورت اسکرین پر اس کا نمبر جگمگا رہا تھا۔
وہ اس کی آواز سننا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے تیسری دفعہ آنے والی کال پر اس نے اس کی آواز بند کردی۔ سو وہ اب بے آواز رو رہی تھی۔
"میرے دل کی طرف آنے والے تمہارے سارے سگنل مجھے یہی پیغام دے رہے ہیں کہ تم مجھ سے ناراض ہو۔ خفگی حق ہے اور تمہیں منانا میری زندگی کی سب سے بڑی مجبوری' کیوں کہ مجھے زندہ رہنے کے لیے اس ہوا کی ضرورت ہے جو تمہاری جانب سے آتی ہے۔" اس کا ایک اور ٹیکسٹ

عائشہ کے لیے اسکرین پر نمودار ہوا۔
"لیکن مجھے آپ کی ضرورت نہیں۔ اس لیے مجھے کوئی کال یا ٹیکسٹ نہ کریں۔" اس نے دل پر جبر کرکے لائن لکھی اور بھیج دی۔ دوسری جانب اس ٹیکسٹ کے بعد بالکل خاموشی چھا گئی۔ اب یہ خاموشی عائشہ کے دل پر کسی بلڈوزر کی طرح چلنے لگی۔ اس نے کافی دیر تک تو برداشت کیا پھر ہچکیاں لے کر رونے لگی۔ ناران کے پہاڑ بھی اس لڑکی کے رنج میں افسردہ افسردہ سے نظر آنے لگے تھے۔

☼ ☼ ☼

وہ اماوس کی ایک اور سیاہ رات تھی۔ فضا میں حبس کا عنصر نمایاں تھا۔ ہوا کی غیر موجودگی کی وجہ سے پورے ماحول پر عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ شہتوت اور پیپل کے درختوں کے پتے اپنی اپنی جگہ ساکت تھے۔ سکینہ لان کی سیڑھیوں کے پاس برآمدے میں وہیل چیئر پر بالکل خاموش بیٹھی تھی۔ آج پورے ایک مہینے کے بیڈ ریسٹ کے بعد اس نے سسٹر ماریہ سے درخواست کی تو وہ اسے باہر لے آئی۔ اماں گہری نیند میں تھیں اس لیے ان کو اٹھانا مناسب نہیں سمجھا۔
"سسٹر ماریہ! یہ ڈاکٹر خاور آج کل راؤنڈ پر کیوں نہیں آتے؟" سکینہ نے اپنا لہجہ حتی الامکان سادہ رکھتے ہوئے وہ سوال کر ہی لیا جو وہ اماں سے نہیں کرسکتی تھی۔
"پتا نہیں' آج کل کچھ الجھے الجھے سے ہیں۔" سسٹر ماریہ کی بات پر وہ چونکی۔
"اور ڈاکٹر زویا۔۔۔؟"
"ڈاکٹر زویا بھی منہ پھلائے پھرتی ہیں۔ سارے راؤنڈز آج کل جونیئر ڈاکٹرز ہی کررہے ہیں۔" سسٹر ماریہ نے جواب دیا۔
"کیا ڈاکٹر خاور۔ ڈاکٹر زویا سے محبت کرتے

ہیں۔" سکینہ نے دل پر جبر کر کے پوچھا۔

"پتا نہیں سکینہ! لیکن ڈاکٹر زویا تو ان کے پیچھے پاگل ہیں۔ سارا وارڈ جانتا ہے کہ وہ ڈاکٹر خاور کے لیے ہی پاکستان میں آئی ہے۔" سسٹر ماریہ نے ناک سے مکھی اڑاتے ہوئے بے زاری سے کہا۔ "مجھے تو سخت زہر لگتی ہیں۔ نک چڑھی سی۔"

"ہیں تو خوبصورت، اجلی کرن کی طرح۔" سکینہ اداس ہوئی۔

"آگ لگے ایسے حسن کو، جو صرف دوسروں کا دل جلانا ہی جانتا ہو۔" سسٹر ماریہ نے جل کر کہا۔ اسے جانے کیوں ڈاکٹر زویا سے سخت خار تھی۔

"خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آہی جاتی ہے۔" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی۔

"یہ نزاکت نہیں، غرور ہے جس کا سر ہمیشہ نیچا ہی ہوتا ہے۔" سسٹر ماریہ نے فوراً" تصحیح کی تو ایک پھیکی سی مسکراہٹ سکینہ کے لبوں پر ٹھہر گئی۔

"ابھی تو ہم جیسے بدصورت لوگوں کے سر جھکے ہوئے ہیں۔ خوبصورت لوگ بھی بلند میناروں کی طرح ہوتے ہیں، ہمیشہ ان کو گردن اٹھا کر ہی دیکھنا پڑتا ہے۔" سکینہ کی رنج میں ڈوبی آواز پر سسٹر چونک گئی۔

"سکینہ تمہیں کیا ہوا؟"

"مجھے کیا ہونا ہے۔" اس کی آنکھوں میں ہزاروں شکوے مچلے۔

"سکینہ! کہیں تمہیں محبت کا روگ تو نہیں لگ گیا۔" سسٹر ماریہ نے خوف زدہ نظروں سے اپنے سامنے بیٹھی اس لڑکی کو دیکھا۔

"محبت بھی تو کسی دیوی کی طرح ہے وہ اپنے چرنوں میں ہر خاص و عام کو کہاں بیٹھنے دیتی ہے۔ ہم جیسے لوگ جن پر کوئی دوسری نظر ڈالنا بھی پسند نہیں کرتا۔ وہ تو اس محبت کی تلاش میں ان مندروں کے باہر گھنٹیاں بجاتے ہی رہ جاتے ہیں لیکن ان کی آواز نہ کسی کے کانوں تک پہنچتی ہے نہ کسی دل کے دروازے ان کے لیے کھلتے ہیں۔" سکینہ کے فلسفیانہ انداز پر سسٹر ماریہ لاجواب ہوئی۔

"واہ سکینہ! تجھے بھی اپنی اماں اور ابے کی طرح بڑی بڑی باتیں کرنا آگئی ہیں۔" سسٹر ماریہ نے اپنے دوپٹے کو جھلتے ہوئے گرمی کے احساس کو کم کیا۔

"میری اماں اور ابا تو کسی اور ہی سیارے کے لوگ ہیں۔ صبر اور شکر ان کی زندگی کا حصہ ہے۔ ان کی درویشانہ زندگی میں کسی بھی چیز کی گنجائش نہیں نکلتی۔ لوگ کہتے ہیں کہ اولاد اپنے والدین پر جاتی ہے۔ میں نے تو کوئی چیز بھی اپنے اماں ابا سے نہیں لی۔" سکینہ کو آج سچ بولنے کا دورہ پڑا ہوا تھا۔

"بھئی یہ تو اللہ کی حکمتیں ہیں، وہ ہی بہتر جانتا ہے، تم اپنے ذہن پر اتنا زور نہ ڈالا کرو۔" سسٹر ماریہ نے سستی سے جمائی لی۔ پورے وارڈ میں اس وقت خاموشی کا راج تھا۔

"میں نے سنا ہے تمہیں اس مقابلے والے لڑکے نے پھول بھیجے ہیں۔" سسٹر ماریہ کو اچانک یاد آیا تو سکینہ چونک اٹھی۔

"آپ کو کس نے بتایا؟"

"مجھے کس نے بتانا تھا۔" وہ ہنسی۔ "جس دن وہ کوریئر والا آیا تھا۔ برابر والے کمرے میں تھی۔"

"لیکن آپ کو کیسے پتا چلا کہ یہ پھول اسی لڑکے نے بھیجے ہیں؟" سکینہ تعجب کا شکار ہوئی۔

"مقابلے والے روز میں تمہارے ساتھ ہی تو تھی۔ اس کی بہن نے کئی دفعہ اس کا نام لیا تھا۔ پھر نام اتنا پیارا اور منفرد تھا اس لیے یاد رہ گیا۔"

"لیکن میں حیران ہوں کہ اسے کیسے پتا چلا، میں یہاں ایڈمٹ ہوں۔" سکینہ خود کلامی کے انداز میں بولی۔

"بھئی۔ وہ ڈاکٹر خاور کے پرائیویٹ والے کلینک میں آتا ہے نا علاج کے لیے۔ وہ ہفتے پہلے یہاں ہاسپٹل آیا ہوا تھا، مجھ سے ملاقات ہوئی تو اس نے تمہارا پوچھ لیا، میں نے کہا کہ یہیں کمرا نمبر آٹھ میں ہے۔" سسٹر ماریہ نے فخریہ اپنا کارنامہ بتایا تو سکینہ نے اطمینان بھرا سانس لیا۔

"اب یہ بات غلطی سے بھی میری اماں کے سامنے نہ کرنا وہ طبیعت میٹ کر دیں گی۔" سکینہ نے اسے ڈرایا تو وہ ایک دفعہ پھر ہنس دی۔

"تمہیں پتا ہے کہ وہ لڑکا مصنوعی ٹانگیں لگوانے امریکہ جا رہا ہے۔" سسٹر ماریہ کی اطلاع پر وہ حیران ہوئی۔

"یار! سچی؟"

"ہاں نا بہت پیسے والے لوگ ہیں، اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا اور دو بہنوں کا ایک ہی بھائی ہے۔ باپ اس کا آرمی میں بہت بڑے عہدے پر ہے۔" سکینہ حیران ہوئی۔

"اماں کہتی ہیں کہ پیسہ کچھ نہیں ہوتا، لیکن میں کہتی ہوں کہ پیسہ ایک چابی ہے جس سے کئی دروازے کھل سکتے ہیں۔ ایسے دروازے جن کے باہر ہم جیسے لوگ غریب حسرت بھری نگاہیں لیے کھڑے ہوتے ہیں۔" اس کے لہجے میں تلخی در آئی۔

"تم اس لڑکے سے کہو وہ تمہیں بھی علاج کے لیے باہر لے جائے۔ اتنا تو ان کے پاس پیسہ ہے۔"

"وہ مجھے کیوں لے جانے لگا؟"

"مجھے لگتا ہے کہ وہ تمہیں پسند کرنے لگا ہے ورنہ اسے کیا ضرورت پڑی ہے کہ تمہیں پھول بھیجتا۔"

"ایک بات یاد رکھنا سسٹر! درد کا رشتہ عجیب ہے۔ میں اگر اس دن وہیل چیئر پر نہ بیٹھی ہوتی تو وہ مجھ پر ایک نظر ڈالنا بھی پسند نہ کرتا۔ یہ مشترکہ دکھ کا رشتہ بھی کبھی کبھی انسان کو ایک ڈور سے باندھ دیتا ہے۔" وہ شہتوت کے پتوں کو اب آہستہ آہستہ ہلتے ہوئے دیکھنے لگی۔

"ہوا چل پڑی ہے۔" سسٹر ماریہ نے سٹپٹا کر بات بدلی۔ "بہت حبس والا موسم ہے۔"

"میری اماں کہتی ہیں کہ جب ہوا ٹھہر جائے اور ہر طرف حبس اور بے چینی ہو تو ایسے موسم میں کوئی اپنا کسی سے خفا ہوتا ہے۔ اس کا دل دکھتا ہے تو موسم بھی احتجاجاً" سانس روک کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جس سے فضا میں گھٹن کا احساس بڑھ جاتا ہے۔" سکینہ کی بات پر سسٹر ماریہ سخت حیران ہوئی۔

"سکینہ! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کیسی عجیب باتیں کرنے لگی ہو؟"

"مجھے محبت ہو گئی ہے سسٹر ماریہ!" سکینہ نے ایک لمبا سانس لے کر انکشاف کیا تو سسٹر ماریہ کا سانس گلے میں ہی اٹک گیا۔ وہ ششدر نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی، جس کا چہرہ رات کی سیاہی میں اور زیادہ سانولا لگ رہا تھا لیکن اس پر محبت کی سرخی جھلک رہی تھی۔

"لیکن کس سے محبت ہوئی ہے؟" سسٹر ماریہ کا سانس اٹکا۔

"سورج سے۔ جس کی طرف جانے والی ہر چیز جل جاتی ہے۔" سکینہ جیسے نیند میں بولی اور سسٹر ماریہ کو یقین ہو گیا کہ رات کو ان درختوں کے نیچے بیٹھنے سے لڑکی پر سایہ ہو گیا ہے۔

☼ ☼ ☼

"اف! کتنا پیارا لگ رہا ہے ناہمارا گھر۔" ثنا ئلہ کے لہجے میں خوشی اور بے یقینی کے سارے رنگ محسوس کر کے نابیہ مسکرا دی۔

"میرا گھر میری جنت۔" ثنائلہ کے لہجے کی کھنک پر نابیہ نے معنی خیز نظروں سے دیکھا اور موڑھا سنبھال کر بیٹھ گئی۔

"محترمہ! یہ آپ کی عارضی جنت ہے۔ اصل گھر تو آپ کا وہ ہو گا جہاں آپ کے پیا جی آپ کو بینڈ باجوں کے ساتھ لے کر جائیں گے۔"

"یار! پیا گھر جب جانا ہو گا تب جانا ہو گا مجھے اپنا آج تو انجوائے کرنے دو۔" ثنائلہ نے خوشگوار انداز سے کہتے ہوئے کھڑکی سے پردہ ہٹایا تو سامنے گیلری میں بہت سے گملے ایک ترتیب سے رکھے ہوئے بڑا خوبصورت تاثر دے رہے تھے۔

"کب آرہے ہیں تمہارے ماموں اور ممانی؟" نابیہ نے تجسس بھرے انداز سے پوچھا۔

"اگلے مہینے کی دس تاریخ کو۔" ثنائلہ کا چہرہ خوشی کے احساس سے چمکا۔ بہت عرصے کے بعد وہ کھل کر مسکرا رہی تھی۔

کوئی بیٹا بھی ہے ان کا ہینڈسم سا کہ نہیں؟" نابیہ کے شرارت بھرے انداز پر وہ چونک گئی۔ "بھئی ہو بھی تو میری طرف کوئی گنجائش نہیں نکلتی۔" اس نے بھی شوخی سے جواب دیا۔

"ہمیشہ اپنے بارے میں ہی سوچنا۔" نابیہ نے جل کر اس کا ہنستا چہرہ دیکھا۔

"کیا مطلب؟" ثنائلہ کو ابھی ابھی اس کی بات سمجھ میں آئی۔

"بھئی! کب تک تمہارے بے وفا بھائی کا سوگ مناؤں' جو مجھے خواب دکھا کر خود اپنے سے اتنی بڑی عمر کی لڑکی سے شادی رچا کر بیٹھ گیا ہے۔" نابیہ کا انداز خوشگوار لیکن لہجہ درد میں ڈوبا ہوا تھا۔ ثنائلہ کے چہرے پر ایک تاریک سایہ دوڑا۔

"وہ تمہارے قابل ہی کہاں تھا۔ خود غرض لوگوں کی زندگی کی ترجیحات میں محبت کا نمبر سب سے آخری ہوتا ہے۔" ثنائلہ نے افسردگی سے کہا۔

"ہوں۔۔۔" وہ زبردستی مسکرائی۔ "مجھے نہ جانے کیوں لگتا تھا کہ میں اسے اپنی محبت سے بدل دوں گی۔" نابیہ کا لہجہ تھکن گزیدہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی لہرائی۔

"محبت تو بہت حساس جذبہ ہے۔ یہ اسی دل پر اثر کرتا ہے جو اس کے راگ سمجھتا ہو۔ جب کہ تیمیر کی زندگی میں ایسی چیزوں کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ جس کو جنم دینے والی ماں اور بے غرض محبت کرنے والی بہن کا احساس نہیں' وہ کسی اور شخص کے نازک جذبوں کی کہاں حفاظت کرتا۔" ثنائلہ اٹھ کر بالکل اس کے پاس آبیٹھی۔

"تم بہت اچھی لڑکی ہو اور بعض لوگ اتنے بدقسمت ہوتے ہیں کہ وہ ان چیزوں کے پیچھے بھاگتے ہیں جو ان کے حق میں بہتر نہیں ہوتیں۔۔۔" ثنائلہ نے اس کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے محبت سے کہا۔

"بس اچھے لوگوں کی بھی ایک خامی ہوتی ہے کہ انہیں بہت سادہ اور آسان باتیں اپنے دل کو سمجھانا نہیں آتیں۔" نابیہ نے ہاتھ کی پشت سے اپنی نم آنکھوں کو صاف کیا۔

"خبردار! رونا نہیں' میں جان نکال لوں گی۔" ثنائلہ نے انگلی اٹھا کر اسے وارننگ دی تو وہ روتے روتے مسکرادی۔

"یار! تم میری طاقت ہو۔ مجھے حوصلہ دیتی ہو اور خود اندر سے چڑیا کی طرح تمہارا دل ہے۔" ثنائلہ نے اسے چھیڑا تو وہ ایک دم خفت کا شکار ہوئی۔

"اچھا چھوڑو' یہ بتاؤ کہ سکندر شاہ سے کب ملواؤ گی مجھے؟" اس نے فوراً" موضوع بدلا اور سکندر شاہ کے نام کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر اترنے والی دھنک نے اسے حیران کردیا۔

"بہت جلد' میں نے اسے بتایا تھا تمہارے بارے میں۔۔۔" ثنائلہ کی اطلاع پر وہ پرجوش ہوئی۔

"ہاں لیکن وہ کچھ عرصے کے لیے امریکہ جارہا ہے۔ وہاں سے آجائے تب ملوانے لے کر جاؤں گی۔" ثنائلہ کی بات پر وہ تھوڑا سا مایوس ہوئی۔

"دھیان سے' ایسا نہ ہو کہ کوئی امریکن میم بھی ساتھ ہی لے آئے۔" نابیہ نے ہنستے ہوئے اسے چھیڑا۔

"خیر اب ایسے بھی کوئی حالات نہیں۔۔۔" وہ حد درجہ پُراعتماد انداز سے بولی تو نابیہ نے رشک بھری نگاہوں سے اس کا چہرہ دیکھا' جو دن بہ دن نکھرتا ہی جارہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"تمہارا دماغ ٹھیک ہے ماہم؟"

عائشہ ناران سے واپسی پر ماہم کی طرف گئی تو وہاں ملنے والی وہ اطلاع پر اس کا دماغ بھک کرکے اڑ گیا جب کہ وہ سامنے صوفے سے ٹیک لگائے لاپروائی سے اپنے ناخن فائل کرنے میں مگن تھی۔

"اس میں دماغ کی خرابی کی کیا بات ہے' میں نے تمہیں صرف اتنا بتایا ہے کہ میں نے رامس کا پرپوزل ریجیکٹ کردیا ہے۔" اس کا اطمینان قابل دید تھا۔

"لیکن اتنی چھوٹی سی بات پر کسی بھی انسان کو مسترد کر دینا کہاں کی انسانیت ہے یار!" عائشہ کو ابھی تک یقین نہیں آرہا تھا کہ ماہم نے محض برص کے داغوں کی بنا پر رامس کو بری طرح مسترد کردیا ہے۔

"تمہیں کیوں تپ چڑھ رہی ہے۔" ماہم نے ابرو چڑھا کر اس کا سرخ چہرہ دیکھا۔ "کچھ دن پہلے تک تو تم اس سے بری طرح چڑتی تھیں اب ایک دم ہی اس سے ہمدردی کا بخار چڑھ گیا ہے۔" ماہم کا تمام تر دھیان اب بھی اپنے ناخنوں کی تراش خراش کی طرف تھا۔

"میں اس سے اگر کسی وجہ سے چڑتی تھی تو اس کے پیچھے ایک مضبوط جواز تھا۔" عائشہ تھوڑا سا ڈھیلی ہوئی۔

"کون سا بھلا؟" ماہم نے طنزیہ انداز سے اس کا مضطرب انداز دیکھا جو بڑے سادہ لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"مجھے ایسا لگتا تھا جیسے تم میرے بھائی کو مسترد کر کے اب اس کی جگہ اس شخص کو دے چکی ہو۔ یہ ایک فطری سی بات تھی جس کے معاملے میں' میں بے بس تھی۔" اس کے تلخ انداز پر ماہم ایک لمحے کو ساکت ہوئی اور اگلے ہی لمحے اس نے بے ساختہ اپنی نظریں چرائیں۔ وہ اب خود کو سنبھالتے ہوئے دانستہ ہلکے پھلکے انداز سے بولی۔

"میں تو سمجھی تھی کہ شاید تمہیں اس کی پرسنالٹی ہی پسند نہیں۔"

"میں اللہ کی بنائی ہوئی چیزوں میں نقص نہیں نکالتی ورنہ ان چیزوں پر کمنٹس کرتی ہوں جن کو بنانے میں انسان کا اپنا کوئی کردار نہیں ہوتا۔ میں نے کوئی خود ساختہ خوبصورتی کے معیار نہیں بنا رکھے۔ مجھے اللہ کی بنائی ساری مخلوق سے پیار ہے۔ اس میں میرا کوئی کمال نہیں' میں [illegible] فطرتاً" ایسی ہوں۔۔۔" عائشہ کی سادہ سی بات' ماہم کو کسی خنجر کی طرح چبھی۔ وہ عجیب سی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

"اگر تم فطرتاً" سادہ ہو تو لگا بندہ بھی فطرتاً" حسن پرست ہو سکتا ہے۔ میں تمہیں بہت پہلے سے بتا چکی ہوں کہ میرے اندر یہ خامی ہے کہ میں ہر چیز میں پرفیکشن چاہتی ہوں اور اپنی اس خامی پر قابو پانے کے معاملے میں۔۔۔ میں بے بس ہوں۔" وہ تھوڑا سا تلخ ہوئی۔

"شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔۔۔" وہ تھوڑا سا افسردہ ہوئی اس کے دل میں رامس کے لیے تاسف بھرتا ہی جارہا تھا۔ "کیا تم نے رامس کو بتادیا کہ کس وجہ سے تم نے اس کا پرپوزل مسترد کیا ہے۔۔۔؟"

"نہیں۔۔۔" ماہم کے جواب پر عائشہ کو کچھ سکون ہوا۔ "میں نے اسے کہا ہے کہ ماما چاہ رہی ہیں کہ کسی آرمی بیک گراؤنڈ کے بندے کے ساتھ میری شادی ہو۔"

"اس کو لگا تو نہیں کہ اصل وجہ کچھ اور ہے؟"

"پتا نہیں۔" ماہم نے اپنے ہاتھوں کو کاٹن سے صاف کرتے ہوئے لاپروائی سے کہا۔ "میری اس سے فون پر بات ہوئی تھی۔ بھوربن سے آنے کے بعد میں نے اس سے کوئی ملاقات نہیں کی۔ مجھے اس پر غصہ ہی بہت تھا۔"

"تمہیں کس بات کا غصہ تھا؟" عائشہ نے بمشکل خود کو مشتعل ہونے سے روکا۔

"اس نے اتنی بڑی بیماری مجھ سے چھپا کر رکھی۔ وہ تو مجھے اچانک پتا چل گیا ورنہ شادی کے بعد پتا چلتا تو کتنا برا ہوتا۔" وہ نزاکت سے ناک چڑھا کر بولی۔

"یہ کوئی بڑی بیماری تو نہیں ماہم! میں نے بہت سے لوگوں کو اس کے ساتھ نارمل زندگی گزارتے دیکھا ہے۔" عائشہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اپنی نادان دوست کو کیسے سمجھائے۔

"میرا دل تو پہلے ہی نہیں مان رہا تھا اور اس بات کے بعد تو ہرگز نہیں۔۔۔" اس نے ہاتھ جھاڑے۔

"اصل میں بات ہی یہ ہے ماہم! کہ تمہارا دل ہی اس پر نہیں اٹکا اور تمہیں کسی بہانے کی تلاش تھی اور وہ تمہیں مل گیا۔" اس کے جل کر بولنے پر وہ ہنستی ہی چلی گئی۔ عائشہ نے تاسف بھرے انداز سے اسے دیکھا۔

"تم جو بھی سمجھو' لیکن میری زندگی میں اب رامس کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی' ہر شخص کو اپنے لیے بہتر سوچنے کا حق ہے اور کوئی اس کا یہ حق چھین نہیں سکتا۔" ماہم کی بات پر غیظ و غضب کی لہر عائشہ کے چہرے پر چھلکی۔ اسے لگا کہ وہ اپنا ضبط کھو دے گی۔ اس لیے وہ کمرے سے نکل آئی۔ وہ تیزی سے اپنے گھر کا گیٹ عبور کر رہی تھی جب اس کے سیل پر ایک نمبر سے کال آئی۔ جو نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے اٹینڈ کرلی۔

"میں رامس علی بات کر رہا ہوں اور آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔" دوسری جانب سے بغیر سلام دعا کے یہ فرمائش سن کر عائشہ ہکا بکا رہ گئی۔

"جی۔" وہ صرف اتنا ہی بول سکی۔

"پلیز!" اس کے التجائیہ انداز پر عائشہ بالکل چپ رہ گئی۔

"آج شام سات بجے میں آپ کا انتظار کروں گا۔" اپنی بات مکمل کر کے اس نے فوراً" ہی فون بند کر دیا۔

"اف! کس مصیبت میں پھنس گئی ہوں۔۔۔" اندر آتے ہوئے وہ بری طرح جھنجلا گئی۔

"انعر صاحب آئے ہوئے ہیں۔" ملازمہ کی اطلاع پر وہ فوراً" اپنے بیڈ روم کی طرف لپکی۔ وہ اس وقت انعر بھائی کی داستان غم سننے کے قطعا" موڈ میں نہیں تھی۔ اسے معلوم تھا کہ انہوں نے ثمن آپی کو سمجھانے کی درخواست کرنی ہے' جو کم از کم اس کے لیے ناممکن کام تھا۔

☼ ☼ ☼

"وہ آپ کی بہترین دوست ہے۔" رامس کا لہجہ آزردہ تھا۔

"وہ صرف اپنی بہترین دوست ہے۔" عائشہ نے سوچا کہہ نہ سکی کچھ بھی تھا ماہم اس کی دوست تھی۔

"میں نے ہمیشہ آپ کو ان کے ساتھ دیکھا ہے۔ آپ ان کو سمجھاتی کیوں نہیں ہیں؟" رامس نے جھنجلا کر کہا۔

"کیا سمجھاؤں اس سیانی بی بی کو۔" عائشہ چاہتے ہوئے بھی یہ سوال نہیں کرپائی۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ ماہم کو اچانک ہوا کیا' اس نے خود مجھے وہاں بلوایا تھا۔" رامس کی آنکھیں رت جگوں کی غمازی کر رہی تھیں۔ شیو بڑھی ہوئی اور وہ سخت پریشان اور آزردہ حال لگ رہا تھا۔ اس کی ذہنی حالت کا اندازہ اس کی بے ربط گفتگو سے لگایا جاسکتا تھا۔

"اس نے مجھے اچانک ہی نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ میری کال اٹینڈ نہیں کرتی' کسی ٹیکسٹ کا جواب نہیں دیتی۔" وہ اپنی پیشانی مسلتے ہوئے بمشکل بولا۔

"اچھا خاصا ہینڈسم اور ڈیشنگ بندہ ہے۔ اللہ جانے اس احمق کو وہ داغ کیوں نظر آگئے۔" عائشہ نے سوچتے ہوئے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"میں تو سوچ سوچ کر دماغ پھٹنے لگا تھا پھر اچانک مجھے خیال آیا کہ میں آپ سے بات کروں۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے آپ سے اصل بات شیئر کی ہو۔" وہ کھوجتی نظروں سے عائشہ کا سپاٹ چہرہ پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"جب میری ماما اس کے گھر گئی تھیں تو اس کی ممی نے بہت اچھا رسپانس دیا تھا۔ اس کی آپی بھی مجھ سے بہت امپریس ہوئی تھیں۔" اس کی معصومیت پر عائشہ نے ایک دفعہ پھر ماہم کو دل میں ڈپٹا۔

"اس کا تعلق جس کلاس سے ہے' میرا نہیں خیال کہ وہاں والدین کی رائے کو اتنی اہمیت دی جاتی ہوگی اور ماہم جیسی لڑکی تو بالکل بھی نہیں دے سکتی۔" قائل ہوا۔

"آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟" عائشہ نے دوٹوک انداز میں پوچھا۔

"آپ اسے سمجھائیں کہ وہ میرے ساتھ ایسا نہ کرے۔" اس نے بچوں کی طرح معصومیت سے کہا۔

"میرے بس میں اگر یہ ہوتا تو میں سب سے پہلے اسے اس وقت سمجھاتی جب اس نے موحد کو چھوڑا تھا۔" عائشہ کا چہرہ تاریک ہوا۔

"کیا مطلب۔۔۔؟" وہ عجلت میں بولا۔ "موحد آپ کا بھائی ہے ناں' جو مجھے اس دن فنکشن میں ملا تھا۔" عائشہ کے منہ سے غیر ارادی نکلی بات رامس کے دل میں تیر کی طرح پیوست ہوئی تھی۔

"ماہم کا اس سے کیا تعلق تھا؟" وہ کھوجتی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"وہی جو ماہم کا آپ سے تھا۔۔۔" عائشہ نے سچ بولنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ عائشہ کی بات پر اسے جیسے سکتہ ہوگیا تھا۔

"پھر وہ سوات آپریشن میں معذور ہو گیا اور ماہم کی تیز رفتار زندگی میں ایسے لوگوں کی گنجائش نہیں نکلتی۔" اس کے لہجے میں کڑواہٹ سی گھل گئی۔

"لیکن میری تو دونوں ٹانگیں سلامت ہیں؟" یہ سوال پوچھتا ہوا وہ کافی بے وقوف لگا۔

"آپ کی ٹانگیں سلامت ہیں لیکن ان پہ۔۔۔" وہ سخت تذبذب کا شکار ہوئی۔

"بس رہنے دیں میں سمجھ گیا۔" اس نے تیزی سے عائشہ کی بات کاٹی۔ اس کے لہجے میں بے یقینی' دکھ اور صدمے کے سارے رنگ تھے۔ اس کی یادداشت کے منظرنامے پر اس سے آخری ملاقات کا سین بڑی قوت سے ابھرا۔

"میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ وہ اتنی معمولی سی بات کو جواز بنا کر ایک جیتے جاگتے انسان کو رد کر سکتی ہے؟" بہت دیر بعد وہ سرگوشی کے انداز میں بولا تو عائشہ نے سکون کا سانس لیا۔ ورنہ وہ تو اس کی حالت دیکھ کر خوف زدہ ہو رہی تھی۔

"جب وہ ایک معمولی سے سوراخ کی وجہ سے اتنا خوبصورت لباس مسترد کر سکتی ہے تو آپ تو ایک بالکل زندہ حقیقت ہیں۔" عائشہ نے اسے اس دن والا واقعہ یاد دلایا تو وہ کچھ جھینپا سا پڑ گیا۔ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھامے وہ کئی لمحوں تک ایک ہی پوزیشن میں رہا۔ عائشہ [illegible] کو ترس آیا۔

"لیکن ایک سوٹ اور زندہ جیتے جاگتے انسان میں کوئی فرق ہونا چاہیے ناں؟" اس نے سر اٹھا کر سرخ آنکھوں سے عائشہ کو دیکھا تو خوف کی ایک لہر اس کے پورے وجود میں دوڑ گئی۔ وہ جان گئی تھی کہ وہ ضبط کے کڑے مراحل سے گزر رہا ہے۔

"آپ میرے لیے موحد کی طرح ہیں اور میری خواہش ہوگی کہ میں آپ کو بھی اسی طرح زندگی میں کامیاب اور خوش و خرم دیکھوں' جیسے میں اب اپنے بھائی کو دیکھتی ہوں۔" اس کے پُر خلوص انداز پر وہ چونکا۔ اس کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

"زندگی میں بعض دفعہ ہم یونہی چلتے چلتے غلط موڑ مڑ جاتے ہیں' تھوڑا سا چلنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ یہ راستہ ہماری منزل کو نہیں جاتا۔ اس لمحے وہاں بیٹھ کر خود کو کوسنے سے بہتر ہے کہ بندہ یہ سوچ کر پلٹ جائے کہ کوئی نہ کوئی راستہ تو ہمارا ہوگا نا۔" اس کی آنکھوں میں بڑا نرم سا تاثر تھا۔ وہ بے یقینی سے اسے دیکھتا گیا۔

"وہ ایسی کیوں ہے۔۔۔؟" ساری بات سن کر وہ یہ بولا۔

"وہ جیسی ہے' ویسی ہی رہے گی۔ اپنی زندگی کو آسان بنانے کے لیے چیزوں کو اسی طرح قبول کرنا شروع کر دیں' جیسی وہ حقیقت میں ہوتی ہیں۔ نہ کہ انہیں ویسا بنانے کی کوشش میں اپنی زندگی کو ہلکان کرلیں جیسا کہ ہم چاہتے ہیں۔" عائشہ نے پانی کا گلاس اس کی جانب بڑھایا اور اس نے چپ چاپ پکڑ کر لبوں سے لگا لیا۔ وہ ایک ہی سانس میں پورا گلاس خالی کر گیا۔

"کیا آپ بھی ماہم کی طرح ہیں؟" اس نے گلاس میز پر رکھتے ہوئے بہت عجیب سا سوال کیا۔

"کیا میں آپ کو ویسی لگتی ہوں؟" ماہم نے اس کی خالی آنکھوں میں جھانکا۔

"نہیں" وہ ایک لمحے کے توقف کے بغیر بولا۔

"ماہم کہتی تھی کہ عائشہ بہت عجیب لڑکی ہے۔ انسانیت کا پرچار کرتی ہے۔ آج کل کے دور میں ایسی کتابی باتیں بھلا کون کرتا ہے۔" وہ خود فراموشی کے عالم میں

اس کی بات دہرا رہا تھا۔
"لیکن میں اب سوچتا ہوں کہ عجیب آپ نہیں' وہ خود تھی۔ بھلا کوئی اتنی معمولی سی بات پر چیزوں کی طرح انسانوں کو بھی ریجیکٹ کرتا ہے؟" اس کا صدمہ کم ہونے میں ہی نہیں آرہا تھا۔ عائشہ کو اس پر رحم آیا۔
"ہر شخص کے زندگی گزارنے کے لیے اپنے اصول اور ضابطے ہوتے ہیں' ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔" عائشہ نے بڑی صفائی سے اپنا دامن بچایا۔ وہ تو ابھی بھی اس لمحے کو کوس رہی تھی جب وہ بے اختیاری میں اس کے سامنے موحد کا راز افشا کر گئی۔
"تھینک یو سو مچ!" وہ اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔ "آپ نے مجھے بہت بڑی الجھن سے نکالا۔" وہ اب اپنے والٹ سے پیسے نکالتے ہوئے مزید بولا۔ "میں نہ جانے کب تک یہ سوچ سوچ کر پاگل ہوتا رہتا کہ آخر اس نے مجھے کیوں چھوڑا۔ وہ مجھے بے شک رد کردیتی لیکن اصل وجہ بتادیتی تو میں آپ کو کبھی زحمت نہ دیتا۔" اس نے چند نوٹ ٹیبل پر رکھے۔
"آپ ٹھیک ہیں ناں' میں آپ کو ڈراپ کردوں؟" عائشہ خود بھی گھبرا کر کھڑی ہوئی۔
"آپ ٹینس نہ ہوں' میں بالکل ٹھیک ہوں۔" وہ اسے تسلی دیتے ہوئے زبردستی مسکرایا۔
"پھر میں اس بات کی امید رکھوں کہ میری اگلی ملاقات آپ سے کسی اسپتال یا سائیکاٹرسٹ کے کلینک میں نہیں ہوگی۔۔۔؟" عائشہ کی بات پر وہ ہلکا سا چونکا اور مسکرادیا۔
"ان شاء اللہ۔۔۔" اس کے لہجے میں کچھ تھا جو عائشہ نے مطمئن ہو کر سر ہلا دیا۔
"میں آپ کو آپ کے گھر ڈراپ کردوں؟" وہ اب بالکل متوازن لہجے میں اس سے پوچھ رہا تھا۔
"نو تھینکس! میرے پاس گاڑی ہے۔" عائشہ اب اس کی ہمراہی میں ریسٹورنٹ سے باہر نکل رہی تھی۔
"میرے پاس ایک پینٹنگ ہے' میں اگر وہ آپ کو دینا چاہوں تو کہاں ملیں گے آپ۔۔۔" عائشہ نے اپنی گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے اسے دیکھا جو باہر کی فضا میں اب کھل کر سانس لے رہا تھا۔ اسے اندازہ ہوا کہ وہ دوبارہ اس سے ملنے کا کیوں کہہ رہی ہے۔
"یقین کریں' میں کچھ ایسا ویسا نہیں کروں گا' آپ مطمئن رہیں۔" اس نے بڑی سرعت سے عائشہ کی سوچ کو پڑھا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "آپ ماشاء اللہ بہت ذہین ہیں۔"
"ذہین لوگ ہی ہمیشہ احساس کی بھٹی میں جلتے ہیں۔ عقل نہ ہو تو بہت سے مسئلوں کا تو ادراک ہی نہیں ہوتا۔" اس کے خوشگوار انداز پر عائشہ ایک دفعہ پھر ہنس دی۔
"کل فاطمہ پارک میں شام پانچ بجے۔ ڈن۔۔۔" عائشہ نے فوراً ہی پروگرام ترتیب دیا۔
"اوکے۔۔۔ ڈن!" وہ اب کھل کر مسکرا رہا تھا۔ اسے اپنے سامنے کھڑی مہربان سی لڑکی کے سارے اندیشے سمجھ میں آرہے تھے اور وہ اسے مزید پریشان کرنا نہیں چاہ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼
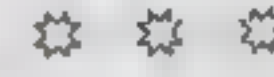
"نی سکینہ! عصر کا ویلا ہوگیا کہ نہیں؟" اماں نے بالکل بے حس و حرکت لیٹی سکینہ کو مخاطب کرنے کے لیے یونہی پوچھا۔ اسے اس طرح بالکل ساکت لیٹے دیکھ کر جمیلہ مائی کے دل کو کچھ ہول سا اٹھ رہا تھا۔ وہ کئی گھنٹوں سے ایک ہی پوزیشن میں لیٹی ہوئی چھت کو تک رہی تھی۔
"پتا نہیں اماں۔۔۔" اس کے وجود میں بالکل بھی جنبش نہیں ہوئی۔
"میری دھی ایسے کیوں لیٹی ہے؟" اماں بے تابی سے اس کا چہرہ چھو کر دیکھنے لگی۔
"پھر کس طرح لیٹوں اماں؟" سکینہ کا لہجہ کسی گہرے دکھ میں ڈوبا ہوا تھا اور چہرے پر ویرانی سی دیرانی تھی۔
"چل میری دھی! اٹھ کر بیٹھ' ایسے لیٹی ہے' میرے دل کو ہول اٹھ رہے ہیں۔" اماں نے اسے سہارا دے کر بٹھایا۔ وہ چپ چاپ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔
"کوئی درد یا تکلیف تو نہیں ہورہی میری چندا کو۔۔۔" جمیلہ مائی کو ابھی ابھی ایک خیال آیا۔
"اماں! مجھے یہ چندا' وندانہ کہا کر۔ بھلا اتنا کالا کلوٹا بھی چاند ہوتا ہے بھلا۔۔۔" اس کے چڑ کر بولنے پر اماں مسکرادی۔ اس کے وجود میں گہرا اطمینان اتر آیا۔
"اب ایسے مشکوک انداز میں کیوں دیکھ دیکھ کر ہنس رہی ہے۔" سکینہ کی جھنجلاہٹ میں کوفت بھی شامل ہوئی۔
"بس میری دھی! ایسے ہی لڑتی رہا کر مجھ سے لیکن یوں چپ کرکے نہ لیٹا کر' میرے دل میں ہول اٹھتے ہیں۔" اماں کی سادہ سی بات پر سکینہ کو ایک دم ہی غصہ آیا۔
"تو بھی اماں بہت ہی عجیب ہے۔ لڑتی ہوں تب بھی تجھے غصہ آتا ہے اور چپ کرکے لیٹ جاؤں تو تب بھی سکون نہیں۔۔۔" وہ برا سا منہ بنا کر دوبارہ لیٹ گئی۔ بازو کی پشت سے اس نے آنکھوں کو ڈھانپ لیا۔
ڈاکٹر خاور کی غیر موجودگی نے اس کا سارا سکون غارت کر رکھا تھا۔ دل و دماغ عجیب سی بغاوت پر اترے ہوئے تھے۔ ہر چیز کاٹ کھانے کو دوڑ رہی تھی۔
اس کی مسلسل خاموشی سے تنگ آکر جمیلہ مائی [illegible] رکھ کر کمرے سے نکل گئیں۔ ان کا [illegible] نرسوں کے ساتھ گپ شپ [illegible]
"سکینہ۔۔۔" ہلکا سا کھٹکھٹانے کے بعد دروازہ کھلا اور ڈاکٹر خاور نے دھیرے سے اس کا نام لیا تو سکینہ کو [illegible] اس کی سماعتیں اسے دھوکا دے رہی ہوں۔
"سکینہ' کیا آپ سو رہی ہیں؟" وہ بالکل اس کے [illegible] اس نے [illegible] کر آنکھیں کھولیں۔ [illegible] سامنے جھکے ہوئے ڈاکٹر [illegible] رہی تھی۔ جو آج کافی دن کے بعد اس کے [illegible] تھے۔
"[illegible] ہے آپ کی۔۔۔" انہوں نے سنجیدگی سے اس کی فائل اٹھائی اور غور سے دیکھنے لگے۔
"میں تو ٹھیک ہوں' لیکن آپ کہاں چلے گئے تھے۔۔۔" سکینہ کے منہ سے بے ساختہ پھسلا تو ایک پھیکی سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر نمودار ہوئی۔
"اپنا تو یہ ہی حال ہے' جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے۔" انہوں نے صاف ٹالا۔ وہ اب سکینہ سے اس کی ادویات کے بارے میں دریافت کررہے تھے۔
"ڈاکٹر صاحب! آپ پریشان ہیں ناں۔۔۔؟" سکینہ کی بات نے ڈاکٹر کو کچھ لمحوں کے لیے تعجب میں مبتلا کیا۔
"آپ سے کس نے کہا؟"
"ہر بات کہنے والی تھوڑی ہوتی ہے" وہ رنجیدہ سے انداز سے مسکرائی۔ "جن لوگوں سے ہمارا رشتہ دل کا ہو۔ ان کی پریشانی ہمارا دل بتاتا ہے۔ ان کے سب دکھ سکھ وحی کی طرح ہمارے دلوں پر اترتے ہیں۔"
"واہ سکینہ! آپ تو فلاسفر ہوگئی ہیں۔" وہ کرسی گھسیٹ کر اس کے پاس بیٹھ گئے۔ "اماں کہاں ہیں؟" انہوں نے دائیں بائیں دیکھا تو وہ مسکرادی۔
"اماں اس وقت راؤنڈ پر نکلی ہیں' آج کل انہوں نے آپ کی ڈیوٹی سنبھال لی ہے۔" سکینہ کہنیوں کے بل اٹھتے ہوئے بولی۔ اس کی شرارت پر وہ مسکرائے۔
"بس کچھ زندگی کے معاملات میں بری طرح الجھا ہوا تھا۔" انہوں نے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔
"ڈاکٹر صاحب! کبھی محبت کی ہے آپ نے؟" سکینہ کے سوال سے زیادہ وہ اس کی جرأت پر چونکے۔
"کیوں۔۔۔؟" ان کی آنکھوں میں استعجاب کی لہر دوڑی۔
"جب شہر محبت کی ہوا لگتی ہے تو انسان ایسے ہی شروع میں کچھ دن پریشان رہتا ہے۔ اس کے بعد جب دل کو نئے موسم راس آنے لگتے ہیں تو پھر زندگی میں قدرے سکون ہوجاتا ہے۔" سکینہ کی بات نے انہیں

جی بھر کر حیران کیا۔
"اچھا تو آپ کا خیال ہے کہ مجھے شہر محبت کی ہوا لگ گئی ہے؟" انہوں نے دلچسپی سے اپنے سامنے بیٹھی عام سی لڑکی کو دیکھا۔ جو اکثر ہی انہیں چونکا جاتی تھی۔
"ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔" انہوں نے لاپروائی سے کہا۔
"یہ آپ مجھے بتا رہے ہیں یا خود کو۔" سکینہ کے ذومعنی انداز پر وہ گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔
"سکینہ! آپ نے اتنی بڑی بڑی باتیں کرنا کہاں سے سیکھ لیں۔" انہوں نے فوراً موضوع بدلا۔
"آپ کی غیر موجودگی میں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔" اس کا لہجہ افسردگی میں ڈوبا ہوا تھا۔ "انسانی چہرے مجھے دلچسپ لگے۔ اس لیے انہیں پڑھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔"
"انسانی چہرے پڑھنا آسان کام نہیں' وہ ہی تو اصل میں دھوکا دیتے ہیں۔" انہوں نے واپسی کے لیے قدم بڑھائے۔
"ڈاکٹر صاحب ایک منٹ۔۔۔" اس نے ان کو جانے سے روکا۔ "آپ کے لیے میں نے ایک کتاب منگوائی تھی۔" سکینہ نے عجلت میں کہا۔
"میرے لیے؟" وہ بڑی خوشگوار حیرت کے ساتھ رکے۔ "وہ کیوں؟"
"آپ بھی تو میرے لیے گفٹس لاتے ہیں' میں نے تو آپ سے کبھی نہیں پوچھا۔" اس کے شکوے پر وہ مسکراتے ہوئے مستنصر حسین تارڑ کی کتاب کا سرورق دیکھنے لگے۔
"پیار کا پہلا شہر۔۔۔" کتاب کا نام پڑھتے ہی انہیں جھٹکا لگا۔
"آپ نے اس ناول کا انتخاب کیوں کیا؟" ڈاکٹر خاور کی آنکھوں میں الجھن تیرنے لگی۔
"مجھے اس ناول کی ہیروئن "پاسکل" میں اپنی جھلک نظر آتی ہے۔" وہ کچھ نہ کہتے ہوئے بھی بہت کچھ کہہ گئی۔

"لیکن پاسکل کی قسمت میں تو نارسائی لکھی گئی تھی۔" انہوں نے انتہائی سنجیدہ انداز میں یاد دلایا۔ وہ یہ ناول پڑھ چکے تھے۔
"مجھے معلوم ہے ہم جیسے لوگوں کی قسمت میں اللہ نارسائی کا دکھ ان مٹ روشنائی سے لکھ دیتا ہے۔ کوئی دوا' کوئی دعا' کوئی تدبیر بھی اسے نہیں بدل سکتی۔۔۔" سکینہ کے لہجے میں قنوطیت در آئی۔ وہ بہت عجیب انداز سے مسکرا رہی تھی۔ ڈاکٹر خاور کو اس کی مسکراہٹ سے پہلی دفعہ خوف محسوس ہوا۔ اس لیے وہ بڑی تیزی سے کمرے سے نکل گئے۔

☼ ☼ ☼

ثنائلہ سخت حیرت' بے یقینی اور تعجب سے سفید ٹائلوں اور آتشی بوگن ویلیا کی بیلوں سے ڈھکا آرٹسٹک انداز میں بنا بنگلہ دیکھ رہی تھی۔ اس وسیع و عریض بنگلے کے سیاہ گیٹ پر لگی تختی پر لکھا نام اور عہدہ پڑھ کر اسے دھچکا لگا۔ وہ اندر داخل ہونے سے پہلے ہی سخت مرعوب ہو چکی تھی۔ گیٹ پر اس کی آمد کی اطلاع تھی اس لیے اسے فوراً" ہی اندر پہنچا دیا گیا۔ وسیع پورٹیکو میں ایک لائن میں تین گاڑیاں کھڑی تھیں۔ دائیں جانب لش گرین لان میں ایک موروں کا جوڑا اٹھکھیلیاں کر رہا تھا۔ انہیں دیکھ کر وہ مبہوت ہوئی۔
"زبردست۔۔۔!" اس نے دل ہی دل میں انہیں سراہا۔ اچانک اس کی نگاہ لان میں بوگن ویلیا کی بیل کے پاس بیٹھے موحد پر پڑی جو دلچسپی سے اسے اندر آتے دیکھ رہا تھا۔
"آئیں ناں ثنائلہ! آپ رک کیوں گئیں؟" موحد نے بڑی خوش دلی سے استقبال کیا۔ پچھلے تین دن سے اس کو فلو اور ہلکا بخار تھا۔ اس نے ثنائلہ سے ذکر کیا تو اس نے عیادت کے لیے آنے کی اجازت چاہی' جسے وہ ٹال نہیں سکا۔ دونوں میں بہت اچھی انڈراسٹینڈنگ پیدا ہو چکی تھی۔ وہ جھجکتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گئی۔

"یہ پھولوں کا گلدستہ شاید آپ میرے لیے لائی تھیں۔" موحد کے شرارت بھرے انداز پر وہ سٹپٹا گئی۔
"آئی ایم سوری۔۔۔" اس نے ماتھے پر نمودار ہونے والی ننھی بوندوں کو ٹشو سے صاف کرتے ہوئے گلدستہ اس کی جانب بڑھایا جو وہ اپنی گود میں رکھ کر بیٹھی ہوئی تھی۔
"اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟" اس کو عیادت کی رسم نبھانے کا بھی خیال آیا۔
"اب تو بالکل ٹھیک ہو گیا ہوں۔" اس کی معنی خیز نگاہیں ثنائلہ کے ہاتھ پیر پھلا رہی تھیں۔
"آپ اپنی کہانیوں میں رومانٹک ڈائیلاگ لکھتی ہیں؟" موحد کے سنجیدہ سے سوال نے اسے مزید بوکھلا دیا۔
"کیا مطلب۔۔۔؟"
"مطلب یہ کہ ابھی تو میں نے کچھ کہا ہی نہیں اور محترمہ بالکل اسٹرابری کی طرح سرخ ہو گئی ہیں تو جب وہ خود لکھتی ہوں گی تو تب کیا حالت ہوتی ہو گی۔۔۔" موحد کو اپنے سامنے بیٹھی یہ سادہ سی لڑکی نہ جانے کیوں اچھی لگنے لگی تھی۔
"لفظ لکھنا اور بات جب کہ ان کو برتنا ایک الگ مرحلہ ہوتا ہے۔" وہ فوراً" بولی۔
"کون سی چیز زیادہ آسان ہے۔ لکھنا یا ان کا تجربہ کرنا؟" اس نے دلچسپی سے پوچھا۔
"تھیوری سے زیادہ پریکٹیکل مشکل ہوتا ہے۔۔۔" ثنائلہ کے بے ساختہ جملے پر وہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔ جب کہ ثنائلہ خفت زدہ انداز سے موروں کے جوڑے کو دیکھنے لگی۔
"یہ میرے بابا کو چولستان میں رہنے والے ایک دوست نے تحفتاً" دیے تھے۔" موحد نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھتے ہوئے اطلاع دی۔
"پچھلے دو سال سے یہ ہمارے گھر کا حصہ ہیں' لیکن مجھے آج ان کی خوش قسمتی کا یقین آگیا ہے۔" موحد کے ذومعنی انداز پر اس نے چونک کر دیکھا۔

"آپ جب سے یہاں بیٹھی ہیں تب سے ان ہی پر نظر کرم کر کے بیٹھی ہیں اس لیے مجھے لگا کہ مجھ سے زیادہ تو یہ لکی ہیں۔" موحد کی بات پر وہ بے ساختہ جھینپ سی گئی۔ اس کے گال تپ گئے اور وہ پلکیں جھپک جھپک کر سامنے بیٹھے شخص کو دیکھنے لگی۔ جس کا بدلا ہوا روپ اس کے ہاتھ پیر پھلا رہا تھا۔
"ثنائلہ! ایک بات کہوں؟" اس کے لہجے کی حدت سے ثنائلہ کا دل پگھلا۔
"ابھی بھی وقت ہے' سوچ لیں میرے جیسا شخص زندگی کی دوڑ میں آپ کے ساتھ کیسے چلے گا؟" ثنائلہ نے ایک دم نگاہ اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ موحد کی آنکھوں میں بے بسی کے سارے رنگ تھے۔
"محبت اگر سوچ سمجھ کر اور نفع و نقصان دیکھ کر کی جائے تو وہ محبت نہیں' ایگریمنٹ ہوتا ہے اور مجھے زندگی میں ایگریمنٹ کبھی اچھے نہیں لگتے۔" وہ بڑے پراعتماد انداز سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔
"اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ میں جو دونوں پاؤں زمین پر رکھے آپ کے سامنے موجود ہوں۔ آنے والے وقتوں میں بھی یہ زمین میرے قدموں کے نیچے رہے گی یا نہیں۔" وہ اس کی بات پر لاجواب ہوا تھا۔
"مجھے ہمیشہ اس چیز پر فخر رہے گا کہ آپ کے جسم کا ایک حصہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں ضائع ہوا۔ یہ عزت اور یہ مقام ہر شخص کے حصے میں نہیں آتا ہے۔ اللہ ایسے کاموں کے لیے اپنے خاص بندوں کا انتخاب کرتا ہے اور یہ بات میرے لیے بہت فخر کا باعث ہے۔" ثنائلہ کے لفظ موحد کے جسم میں ایک نئی توانائی کا خوبصورت اور بھرپور احساس بھر رہے تھے۔
"ایک بات بتائیں۔" وہ تھوڑی سی ہچکچاہٹ کا شکار ہوئی۔ "میں تو عام سی شکل و صورت کی لڑکی ہوں۔ آپ کو مجھ میں کیا خاص نظر آگیا؟" ثنائلہ کے لبوں پر وہ سوال آہی گیا جو وہ کافی دنوں سے کرنا چاہ رہی تھی۔
"آپ کی اپنے فرضی کردار سے محبت اور لگن۔"

موحد نے مسکرا کر کہا۔ "آپ مجھے بہت حیران کن لگیں' آپ کے جذبے میں سچائی تھی اور جب جذبوں میں سچائی ہو اور کچھ کر گزرنے کی دھن ہو تو منزلیں خود بخود سامنے آجاتی ہیں۔"

"ایک اور بات پوچھوں۔۔۔؟" ثنائلہ کے چہرے پر گہری سوچ کا تاثر ابھرا۔ موحد نے فوراً" اثبات میں سر ہلایا۔ "اگر زندگی میں آپ کے ساتھ یہ حادثہ نہ ہوا ہوتا' اور آپ اپنے قدموں پر کھڑے ہوتے تو کیا تب بھی مجھ جیسی عام سی لڑکی کے جذبوں کی پذیرائی کرتے؟؟"

"کیا مطلب۔۔۔؟" وہ بری طرح چونکا۔

"دیکھیں نا' آپ کے اور میرے اسٹیٹس میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ آپ کی وجاہت اور متاثر کن شخصیت کو اب بھی لڑکیاں مڑ مڑ کر دیکھتی ہیں۔ آپ کے پاس وہ سب کچھ ہے جو میرے پاس نہیں۔ ایسے میں کیا تب بھی آپ کی زندگی میں میری کوئی گنجائش نکلتی؟؟" اس نے انتہائی سفاک سوال بڑے سادہ لہجے میں پوچھا۔ موحد نے ایک لمبا سانس لیا۔

"میں اس حادثے سے پہلے قسمت پر یقین نہیں رکھتا تھا لیکن اس کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ اللہ کی پلاننگ میں جو چیزیں شامل ہوں' وہ ہو کر رہتی ہیں۔ آپ کو میری زندگی میں آنا ہی تھا۔ یہ کیسے ہوتا؟ یہ اللہ بہتر جانتا ہے چاہے یہ حادثہ ہوتا یا نہ ہوتا۔ آپ کی جگہ میرا گھر اور میرا دل ہی تھا۔"

موحد میں بڑی مثبت تبدیلی آئی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا جو اب کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

عائشہ نے کوئی آٹھویں بار اپنی گھڑی میں وقت دیکھا تھا۔ اس کی نگاہیں پارک کے داخلی گیٹ کی جانب تھیں' جہاں سے رامس نے آنا تھا۔ گزشتہ رات اس نے بڑے پژمردہ خیالات کے ساتھ بسر کی تھی۔ دل کے ساتھ ویسے ہی اس کی ٹھنی ہوئی تھی۔ ساری رات وہ اپنے بیڈ روم سے اسٹوڈیو کے چکر لگاتے ہوئے گزار دیتی۔ دل کو کسی بھی لمحے سکون حاصل نہیں تھا۔ ہر وقت یہی سوچ دل و دماغ کا احاطہ کیے رکھتی کہ اس شخص نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا۔

اس کو پوری دنیا میں بے وقوف بنانے کے لیے میں ہی ملی تھی؟؟" یہ سوچ اسے بری طرح جھنجلا کر رکھ دیتی۔ ان ہی پریشان کن سوچوں کی وجہ سے اس نے کئی تصاویر اپنی خراب کیں۔ کئی کینوس اٹھا کر اسٹور میں پھینکے۔

"شکل سے تو وہ بالکل بھی ایسا نہیں لگتا تھا۔" دل ہر وقت یہی دہائی دیتا رہتا۔

"شکلیں ہی تو دھوکا دیتی ہیں۔ یہ لوگوں کی فنکاری ہی تو ہوتی ہے کہ وہ ایک چہرے پر کئی چہرے سجا لیتے ہیں۔" دماغ بڑی مکاری سی مسکراہٹ کے ساتھ یاد دلاتا۔ وہ اپنی گاڑی کے ساتھ ٹیک لگائے شام کی واک کے لیے آنے والوں کو بے زاری سے دیکھ رہی تھی۔ دماغ میں مختلف سوچوں نے اودھم مچا رکھا تھا۔ وقت جیسے جیسے گزر رہا تھا عائشہ کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوتی جا رہی تھیں۔

"کہیں اس بے وقوف نے خودکشی تو نہیں کر لی' پہلے بھی یہ کارنامہ سرانجام دے چکا ہے۔" عائشہ کا دھیان اب رامس کی جانب ہوا۔

عائشہ نے آگے بڑھ کر شہتوت کے درخت سے ایک نرم سی ٹہنی توڑی۔ وہ اب رامس کو دل ہی دل میں کوستے ہوئے گیٹ کی طرف دیکھ رہی تھی۔

اسے وہاں کھڑے ہوئے پورے چالیس منٹ ہو چکے تھے۔

"رامس کو کال کر کے پوچھتی ہوں۔" اس نے گاڑی کی فرنٹ سیٹ سے ہینڈ بیگ اٹھایا۔

"ہیلو۔۔۔" وہ بالکل اس کے پیچھے سے گویا ہوا۔ عائشہ اچھل کر رہ گئی۔ اس نے حیرت سے پیچھے سیاہ جینز پر فیروزی سی شرٹ میں بالکل ترو تازہ رامس کو دیکھا۔ اسے کئی لمحوں تک یقین ہی نہیں آیا۔

"آپ زندہ ہیں۔۔۔؟" عائشہ کے طنزیہ انداز پر وہ قہقہہ لگا کر ہنسا اور ہنستا ہی چلا گیا۔

"مجھے ایک سو ایک فیصد یقین تھا کہ آپ یہی سوچ رہی ہوں گی کہ میں نے شاید سوسائیڈ کر لی ہے۔"

"خیر' ابھی بھی کوئی بات نہیں۔۔۔" وہ صاف مکر گئی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ اتنا ترو تازہ اور فریش بھی لگ سکتا ہے۔

"کیا سوچ رہی ہیں کہ میں اتنا نساد ہو کر دل لگا کر شیو کر کے کیسے آگیا؟" اس نے بڑی سرعت سے عائشہ کے ذہن میں ابھرتی سوچوں کو پڑھا۔

"یہ سب میں نے آپ کے لیے کیا ہے۔ اس لیے تو لیٹ ہو گیا ہوں۔" وہ گاڑی سے ٹیک لگائے بڑے مزے سے بتا رہا تھا۔ "کل میرے مجنوں والے حلیہ کو دیکھ کر آپ پریشان ہو گئی تھیں ناں تو میں نے سوچا کہ جو لوگ آپ کے لیے اپ سیٹ ہوتے ہوں ان کو مزید پریشان کرنا کہاں کی انسانیت ہے۔۔۔" وہ بھی سامنے درخت سے ایک لمبی سی ٹہنی توڑ لایا تھا۔ جب کہ عائشہ حیرانی سے اس پُراعتماد نوجوان کو دیکھ رہی تھی جو کبھی ماہم کے کلینک میں علاج کے لیے آیا کرتا تھا۔

"میں نے ساری رات اس بات کا سوگ منایا۔ تکیے میں منہ دے کر بالکل بچوں کی طرح آخری بار رویا۔ اس کے بعد صبح ناشتا کر کے اپنی محبت پر خوب ہنسا۔۔۔" وہ زمین پر لکیریں کھینچتے ہوئے بڑے دلچسپ انداز میں اپنا کارنامہ سنا رہا تھا۔

"آپ نے سوچا ہو گا کہ جذباتی سا بندہ ہے' کہیں خود کو کوئی نقصان نہ پہنچا لے۔ میں شاید ایسا بھی کر گزرتا اگر آپ نے مجھے اپنے بھائی موحد کا نہ بتایا ہوتا۔" عائشہ اس کی بات پر الجھ گئی۔

"میں نے سوچا کہ جب موحد جیسا بندہ جس نے ایک عظیم مقصد کی بنا پر اپنے جسم کا ایک حصہ کھو دیا۔ جب اس نے آپ جیسے شخص کی قدر نہیں کی تو میں اس کے سامنے کس حیثیت کا مولی ہوں۔" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا۔

"پھر اس نے جس معمولی بات کو وجہ بنا کر مجھے مسترد کیا' میں تو شاکڈ رہ گیا۔۔۔ مجھے وہ اچھی لگتی تھی لیکن اپنی شکل و صورت کی بنا پر نہیں' اپنے پروفیشن کی وجہ سے۔" اس کی بات پر عائشہ بری طرح چونکی۔

"میرا خیال تھا کہ اسے انسانیت سے محبت ہے۔ وہ مسیحائی کے پیشے سے وابستہ ہے۔ اس لیے میری زندگی میں آنے والے سارے خلا پر کر دے گی' لیکن۔۔۔" وہ دھیمے لہجے میں بولتے بولتے چپ کر گیا۔

"مجھے کئی دفعہ اس کی حرکتیں عجیب تو لگتی تھیں لیکن میں جان بوجھ کر نظر انداز کر دیتا تھا' لیکن مجھے اب پتا چلا کہ انسان اپنی ان چھوٹی چھوٹی چیزوں سے بہت جلد پہچانا جاتا ہے جو وہ روانی میں کر رہا ہوتا ہے۔" رامس نے پہلی دفعہ کھل کر اعتراف کیا۔

"خیر چھوڑیں' آپ میرے لیے کون سی پینٹنگ لائی ہیں۔۔۔" رامس نے جان بوجھ کر گفتگو کا رخ بدلا تو عائشہ بھی کندھے جھٹک کر گاڑی کی ڈگی کی طرف بڑھی۔

"واؤ۔۔۔ بیوٹی فل۔۔۔" رامس توصیفی نگاہوں سے اس خوبصورت پینٹنگ کو دیکھ رہا تھا۔

پہاڑوں کے درمیان بل کھاتا ایک خوبصورت راستہ تھا جو تاحد نگاہ صاف شفاف اور روشن دکھائی دے رہا تھا۔ جب کہ پہاڑ سرخ' زرد اور سبز رنگوں کے پھولوں سے اس طرح لدے ہوئے تھے کہ کوئی بھی حصہ خالی نظر نہیں آرہا تھا۔

"آپ کا تخیل بہت خوبصورت ہے۔" رامس نے کھلے دل سے سراہا تو وہ مسکرادی۔

"میرا خیال تھا کہ آپ میرے لیے ایسی پینٹنگ بنا کر لائیں گی جس میں ایک لمبی ریلوے لائن پر ایک نوجوان اپنا سر جھکائے مایوس اور پریشان کن حالت میں بیٹھا ہو گا۔ اس سے کچھ فاصلے پر ایک خوبصورت لڑکی اس کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے جا رہی ہو گی۔" وہ رامس کی بات پر بے ساختہ ہنس پڑی۔

"مجھے اگر رنگوں سے کچھ شدھ بدھ ہے تو میری کوشش ہوتی ہے کہ میری پینٹنگ سے کسی دوسرے

بندے کو مثبت تحریک ملے۔ مجھے مایوسی اور ناکامی کا کوئی بھی رنگ اچھا نہیں لگتا۔" وہ بہت سلجھے ہوئے انداز سے اپنا موقف بتارہی تھی۔

"آپ بہت اچھی لڑکی ہیں۔" رامس نے بڑے دل سے کہا۔ "وہ شخص بہت خوش قسمت ہوگا، جو زندگی کے سفر میں آپ کا شریک ہوگا۔" اس کی بات پر عائشہ کو جھٹکا لگا اور لاشعوری طور پر دل کے کئی ٹانکے ادھڑتے چلے گئے۔ ایک دفعہ پھر دھیان کا دریا اسی شخص کی سمت بہنے لگا۔ جس نے دوبارہ اس سے رابطہ کرنے کی بھی زحمت نہیں کی تھی۔

"کیا ہوا، آپ اداس کیوں ہوگئیں۔" وہ غضب کا چہرہ شناس تھا۔ اس کے چہرے کے نقوش میں ویسی ہی نرمی جھلکتی تھی جو اس دشمن جان کے چہرے پر بستی تھی۔

"ایسی کوئی بات نہیں، آپ سنائیں، آپ کا بزنس کیسا چل رہا ہے۔" عائشہ نے خود کو سنبھالتے ہوئے بات بدلی۔

"ابھی تو سب چیزوں کا آغاز تھا، لیکن آغاز میں ہی ایسا دھکا لگا ہے کہ ابھی تک جسم کی لرزش نہیں جارہی۔" وہ دانستہ خوشگوار لہجے میں کہہ کر ہنسا۔

"کوئی بات نہیں آغاز میں ملنے والی ناکامی بعض دفعہ کسی بڑی کامیابی کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔" عائشہ نے اسے ہمت دلائی۔ وہ اب اپنی گاڑی کے پاس کھڑے دس بارہ سالہ بچے سے شام کے سارے اخبار خرید رہی تھی۔ رامس نے بہت حیرانی سے یہ منظر دیکھا۔

"آپ اتنے سارے غیر معروف نام کے اخبار لے کر کیا کریں گی؟" رامس نے سخت تعجب سے اسے اپنے بیگ سے پیسے نکالتے ہوئے دیکھا۔ اس نے بچے سے کوئی بقایا نہیں لیا تھا۔ رامس اب اس بچے کے چہرے پر پھیلنے والی مسرت کو دیکھ رہا تھا جو سبز رنگ کا ایک نوٹ دیکھ کر اس کے چہرے پر ابھری تھی۔

"کچھ نہیں، بس اسٹور میں رکھ دوں گی۔" عائشہ نے اسے مزید حیران کیا۔

"تو اتنے سارے اکٹھے لینے کی کیا ضرورت تھی؟" رامس نے بے کلی سے پوچھا۔

"مجھے تو ضرورت نہیں تھی، لیکن اس بچے کو ضرورت تھی کیونکہ اس کے گھر کا چولہا انہی پیسوں سے جلتا ہے۔" اس کی بات پر رامس حیران ہوکر سادہ سی لڑکی کو دیکھنے لگا۔ جو اب ایک بوڑھی خاتون سے گاڑی صاف کرنے والے کپڑے کثیر تعداد میں خرید رہی تھی۔

"آپ کو اتنی زیادہ ہمدردی ہو رہی ہے تو آپ ویسے ہی مدد کر دیتیں اتنا سامان خریدنے کی کیا ضرورت تھی۔" وہ جیسے ہی فارغ ہوئی تو رامس نے اسے مشورہ دیا۔

"ہر شخص پیشہ ور بھکاری نہیں ہوتا، ہمیں اگر اللہ نے رزق کی فراوانی دی ہے تو اس کے ساتھ غریبوں کی عزت نفس کو مجروح کرنے کا پرمٹ تو نہیں دیا ناں" وہ اس کی بات پر کئی لمحے تک بول ہی نہیں پایا۔

"آپ ماہم سے بہت مختلف ہیں۔" وہ اس سے سخت متاثر ہو چکا تھا۔

"میں ماہم سے اتنی ہی مختلف ہوں جتنا ایک انسان دوسرے انسان سے ہوتا ہے۔" وہ اب ٹائم دیکھ رہی تھی۔ مغرب کی اذان کا وقت ہونے والا تھا۔

"کیا میں موحد سے ملنے کے لیے آپ کے گھر آسکتا ہوں؟" وہ اس کی اچانک فرمائش پر کچھ پریشان ہوئی۔

"کیوں؟"

"میں اس سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ جب کوئی کسی کی ذات کی نفی کردے۔ آپ کی پوری شخصیت مسترد کردے تو اس دکھ سے نکلنے میں کتنا وقت لگتا ہے؟" رامس کے سوال پر عائشہ کو لگا جیسے اس کی قوت گویائی سلب ہوگئی ہو۔ اپنے سامنے کھڑا خوش باش اور فریش سا نوجوان ابھی تک اس غم سے نہیں نکلا تھا۔ وہ ایک دفعہ پھر بے سکون ہوئی۔

☼ ☼ ☼

"نی سکینہ کیا کروں تیری کتابوں کا۔۔۔؟ اب اتنا سارا سامان ہم پنڈ تو نہیں لے کر جاسکتے ہیں۔۔۔" گھر جانے کے لیے پیکنگ کرتی جمیلہ مائی خاصی فکر مند تھیں کیونکہ رمضان المبارک کا آخری عشرہ چل رہا تھا اور اللہ دتا، حاجی کو لے کر اسپتال پہنچ گیا تھا تاکہ سکینہ اور اس کی ماں کو پنڈ لے جاسکے۔ اس وقت وہ کمرے کے ایک کونے میں جائے نماز بچھائے ظہر کی نماز پڑھنے میں مصروف تھا۔ جب کہ حاجی کو ریلوے اسٹیشن پر ٹکٹوں کی بکنگ کے لیے بھیجا ہوا تھا۔

"یہ کتابیں اسی کمرے میں چھوڑ جاؤ، واپس بھی تو آنا ہے ناں۔۔۔" سکینہ ہلکی سی جھنجلاہٹ کا شکار ہوئی۔

"کیسے چھوڑ دوں، وہ ہیڈ نرس کہہ رہی تھی کہ سارا کمرا خالی کرکے جانا۔" سکینہ کا دل دھک سے رہ گیا۔

"اماں! کہیں ایسا تو نہیں ہوگا کہ ہم عید کرکے واپس آئیں تو اسپتال والے یہ کمرا کسی اور کو دے چکے ہوں۔۔۔" سکینہ کے لہجے میں جھلکتا خوف جمیلہ مائی کو بھی فکر مند کر گیا۔

"اللہ خیر رکھے پتر! یہ کمرا نہ سہی کوئی اور مل جائے گا۔" جمیلہ مائی نے دلاسا دیا۔

"اماں! میں یہ کمرا کسی اور کو نہیں دوں گی۔ میری یادیں اس سے وابستہ ہیں۔۔۔" سکینہ کے لہجے میں بچکانہ سی ضد محسوس کرکے اللہ دتا مسکرایا۔ جائے نماز تہہ کرکے اس نے اپنی دھی کے ماتھے پر ایک بوسہ ثبت کیا اور۔

"پتر! جو چیزیں بندے کی قسمت میں ہوں ان کو کوئی بھی نہیں چھین سکتا۔۔۔" اس نے اپنی دھی کو تسلی دی اور بڑے مطمئن انداز سے جمیلہ مائی کو لوہے کے ٹرنک میں کپڑے تہہ کرکے رکھتے ہوئے دیکھنے لگا۔

"ابا! ڈاکٹر صاحب سے بات کرکے جانا کہ ہمارا کمرا کسی کو نہ دیں۔۔۔" سکینہ کی فرمائش پر اللہ دتا مسکرا دیا۔

"پتر! ویسے تو ڈاکٹر صاحب ویسے ہی ہمارا اتنا خیال رکھتے ہیں اور جو بھلا مانس ہمارا بغیر کہے مان رکھتا ہو اسے بار بار کہہ کر کیا شرمندہ کرنا۔"

"ڈاکٹر صاحب تو بیچارے خود بہت سیدھے سادھے اور اللہ لوک ہیں۔" جمیلہ مائی نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

"یہ سیدھے اور اللہ لوک بھی ہم جیسے عام لوگوں کے لیے امتحان ہوتے ہیں۔۔۔" اللہ دتے کمہار نے بہت عجیب بات کی۔

"وہ کیسے ابا!" سکینہ بھی حیران ہوئی۔

"یہ سیدھے سادھے لوگ من کے سچے اور اللہ کے بہت پیارے ہوتے ہیں۔ جو خود تو اللہ سوہنے کی خوشنودی کے سارے امتحان آسانی سے پاس کر جاتے ہیں لیکن ان کی سادگی دوسروں کے لیے بڑا امتحان بن جاتی ہے۔ ناسمجھ اور خود کو ہوشیار سمجھنے والے لوگ ان کی سادگی کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں اللہ سائیں کی نظروں سے گر جاتے ہیں۔ اس لیے ایسے لوگوں سے محتاط ہو کر ملنا چاہیے۔" اللہ دتے کی بات نے سکینہ کو سخت الجھن میں مبتلا کیا۔

"تو ابا! ان کو کیا ضرورت پڑی ہے اتنا اچھا بننے کی، جب ان کی اچھائی ہی دوسروں کے لیے امتحان بن جائے۔۔۔" سکینہ نے برا سا منہ بنایا تو اللہ دتا اپنی لاڈلی کی بات پر ہنس پڑا۔

"پتر! اگلے بندے کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ برائی کے راستے پر چلے، اللہ سوہنے نے عقل تو دی ہے ناں۔۔۔" جمیلہ مائی نے بھی اپنے گھر والے کی طرف داری کی۔ جو سکینہ کو ایک آنکھ نہیں بھائی۔

"اماں! تو نے بھی لگتا ہے کہ ابے کی ہر بات کی تائید کرنے کی قسم کھا رکھی ہے۔۔۔"

"ساری شریف عورتیں ایسا ہی کرتی ہیں ویسے بھی جس عورت سے اس کا میاں خوش ہو وہ سیدھی جنت میں جاتی ہے۔۔۔" جمیلہ مائی نے سکینہ کی پرانی فائل احتیاط سے ٹرنک میں رکھتے ہوئے اپنی طرف سے بڑی پتے کی بات بتائی۔

"اماں! تو تو ویسے بھی سیدھی جنت میں جائے گی۔" سکینہ نے ہنستے ہوئے اماں کا مذاق اڑایا۔

"کیا جانے کی تیاری ہو رہی ہے۔۔۔" دروازہ بجا کر

ڈاکٹر خاور اندر داخل ہوئے۔

"جی ڈاکٹر صاحب۔" وہ دونوں میاں بیوی مسکرائے۔

"ہاں بھئی سکینہ ٹھیک ہو؟ اتنا لمبا سفر کرلو گی نا؟" ڈاکٹر خاور کے خوشگوار انداز پر سکینہ نے بڑی عجلت میں سر ہلایا۔

"ڈاکٹر صاحب! آپ سے ایک بات پوچھوں؟"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔"

"کہیں ایسا تو نہیں ہوگا نا کہ میں واپس آؤں تو میرا یہ کمرا کسی اور کے نام کردیا جائے" سکینہ نے آخر کار وہ سوال کر ہی لیا جس نے اسے پریشان کر رکھا تھا۔

"ایسے کیسے ہوسکتا ہے سکینہ! آپ بے فکر ہوکر جائیں، میں ہوں نا۔" ڈاکٹر خاور کے تسلی آمیز انداز پر سکینہ نے سکون کا سانس لیا۔

"ہوگئی پتر اب تسلی۔" جمیلہ مائی کو اس کی بچگانہ حرکت پر غصہ آیا تھا۔

"اور ڈاکٹر صاحب! میں اپنی کتابیں اور رسالے اس الماری میں رکھ کر تالا لگادوں؟" سکینہ نے موقع غنیمت جان کر اگلی فرمائش کی۔ اس پر اماں کی تنبیہی نظروں کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے لیے اس کے مسئلے زیادہ اہم تھے۔

"ہاں تو رکھ جائیں نا اس میں کیا مسئلہ ہے۔" ڈاکٹر خاور نے اس کی فائل پر نوٹس لکھتے ہوئے بے دھیانی سے کہا۔

"لیکن وہ ہیڈ نرس تو کہتی ہے کہ سارا کمرا خالی کرکے جائیں۔" سکینہ کے الجھن بھرے انداز پر وہ چونکے۔

"اچھا! چلیں کوئی مسئلہ نہیں میں ان سے کہہ دوں گا۔ آپ اتنا ساز و سامان لے کر کیسے جائیں گے۔" ڈاکٹر خاور کے لہجے میں فکرمندی سکینہ کو اچھی لگی۔ جب کہ جمیلہ مائی اور اللہ دتا نے بڑی ممنون نگاہوں سے انہیں دیکھا جو ان کے لیے کم از کم رحمت کا فرشتہ بن گئے تھے۔

"لے تائی! اپنی سکینہ کے لیے پوری برتھ اور ہم تینوں کے لیے ایک علیحدہ برتھ کروا کے بڑی مشکل سے آیا ہوں۔" حاجی اپنی دھن میں کندھے پر رکھے صافے سے منہ پونچھتا ہوا اندر داخل ہوا اور پہلے قدم پر سٹپٹا کر رک گیا۔ بوکھلا کر ڈاکٹر خاور کو سلام کیا۔

"ہاں بھئی عید کی وجہ سے بکنگ بھی تو بہت مشکل ہوتی ہے نا۔" ڈاکٹر خاور نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جی ڈاکٹر صاحب! تیسرے درجے میں تو آرام بکنگ ہو رہی تھی لیکن ہم اپنی سکینہ کو اتنی گرمی اکانومی کلاس میں تو نہیں لے کر جاسکتے نا اس لیے ہی سہی لیکن اے سی والے ڈبے کی سیٹیں کروائی ہیں۔" حاجی کی سادگی سکینہ کے لیے سخت کوفت کا باعث بنی۔

"ہاں بڑی جہاز کی ٹکٹیں کروا آیا ہے نا شودا کہیں کا۔" سکینہ نے دل ہی دل میں اسے کوسا۔ جو ٹھنڈے پانی کے کولر سے برف نکال کر منہ پر پھیر رہا تھا۔

"آج تو تایا! بہت ہی رونو لگا ہے مجھے۔" اس نے جھینپ کر وضاحت دی کیونکہ کمرے میں موجود سب ہی لوگ بڑی دلچسپی سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"اس دفعہ بڑے عرصے بعد چکر لگا آپ کا۔" ڈاکٹر خاور نے ہنستے ہوئے حاجی کو دیکھا۔

"بس ڈاکٹر صاحب گندم کی کٹائی کا سیزن لگا کر آیا ہوں۔" اس نے اب گیلا تولیہ سر پر رکھا۔

"پھر اپنی شادی کے میٹھے چاول کب کھلا رہے ہو۔" ڈاکٹر خاور نے جاتے جاتے اسے چھیڑا تو حاجی کا منہ شرم سے سرخ ہوگیا۔

"بہت جلدی ڈاکٹر صاحب!" اس نے کن اکھیوں سے سکینہ کا غصے سے لال چہرہ دیکھا جس کا دل جل کر خاکستر ہوگیا تھا۔ جب کہ جمیلہ مائی اور اللہ دتا کے چہرے پر بڑے اطمینان کے رنگ پھیلے تھے۔ سکینہ نے بے زاری سے دیوار کی جانب منہ کرلیا۔

☼ ☼ ☼

سیل فون کان کے ساتھ لگائے گفتگو کرتے موحد کے چہرے پر اتنے رنگ تھے کہ ماہم کچھ لمحوں کے لیے ٹھٹک کر دروازے میں ہی رک گئی۔ کشن گود میں رکھے وہ اتنا مگن تھا کہ اسے اندر آتی ماہم کی بھی خبر نہیں ہوسکی۔

"خیر ہے! اتنی دھیمی آواز میں کہاں راز و نیاز میں مصروف ہو؟" ماہم کے طنزیہ انداز پر وہ چونکا۔ اس نے سیل فون پر مگن انداز سے ہی ماہم کو سامنے صوفے پر ہاتھ سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس کے بدلے بدلے رنگ ڈھنگ ماہم کے لیے بڑے حیران کن تھے۔ ماہم کو بٹھا کر وہ ابھی بھی بڑے اطمینان سے گپ شپ میں مگن تھا۔ اس کا یہ انداز ماہم کو سلگا گیا۔ اس نے بمشکل خود کو مشتعل ہونے سے روکا۔

"عائشہ کہاں ہے؟" ماہم نے قدرے ناگواری سے اس کی مصروفیت میں خلل ڈالا۔

"ایک منٹ۔" اس نے سیل فون پر دوسری جانب موجود شخصیت سے معذرت کی۔ "عائشہ اور ماما تو گھر پر نہیں ہیں۔" موحد کا انداز سراسر ٹرخانے والا تھا۔ ماہم کو لگا کسی نے کھینچ کر تھپڑ مار دیا ہو۔ غصہ کسی ابال کی طرح خون میں شریانوں کے ساتھ دوڑنے لگا۔

"اور تم بھی خاصے مصروف ہو اس لیے مجھے چلنا چاہیے۔" وہ تپ کر کھڑی ہوگئی۔ احساس توہین سے اس کا چہرہ سرخ ہوا۔ جب کہ موحد نے ایک دفعہ پھر ہاتھ کے اشارے سے اسے رکنے کو کہا اور خود فون پر موجود ہستی سے بڑے نرم لہجے میں معذرت کرنے لگا۔

"ہاں اب بتاؤ کہ کیا کہہ رہی ہو؟" وہ اس کی جانب متوجہ ہوا۔

"میرا خیال ہے کہ تم خاصے بزی تھے، میں نے خوامخواہ تمہیں ڈسٹرب کیا۔" ماہم کے کچھ جتلاتے ہوئے انداز پر وہ طنزاً مسکرایا۔

"ڈسٹرب تو خیر تم نے مجھے نہیں کیا، ویسے بھی تم تو عائشہ سے ملنے آئی ہوگی۔ اس لیے میرے ڈسٹرب ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"یہ کیا چل رہا ہے تمہارا بزنس؟" ماہم نے خود کو سنبھالتے ہوئے فوراً بات کا رخ بدلا۔

"الحمدللہ بہت شاندار۔" ماہم کو نہ جانے کیوں اس کے لہجے میں طنز کی واضح آمیزش محسوس ہوئی۔ وہ ہاتھ میں پکڑے ریموٹ کنٹرول سے ٹی وی آن کرتے ہوئے بولا تھا۔ ماہم کا دل چاہا کہ وہ فوراً سے پیشتر اٹھ جائے لیکن اب اچانک اٹھنا بھی عجیب لگ رہا تھا۔

"بابا نے ایک اور فیکٹری کا بھی سودا کیا ہے میرے لیے۔"

"یہ سب کچھ سنبھال لوگے؟" اس کے لہجے میں طنز کی کاٹ کی تھی۔

"میں نے کون سا اپنے کندھوں پر رکھ کر سنبھالنا ہے۔ ماشاء اللہ ملازمین کی ایک فوج ہے میرے ساتھ۔" موحد کا لہجہ ہی نہیں آنکھیں بھی سلگ رہی تھیں۔ اس کا لاتعلق سا انداز ماہم کے لیے ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا۔

"ویسے بھی بزنس ٹائیکون بننے کے لیے دماغ کی ضرورت ہوتی ہے، ٹانگیں نہ سہی ذہن تو اللہ نے دیا ہے نا۔" وہ اپنی سابقہ رو میں بولا۔

"کب تک آجائے گی عائشہ؟" ماہم کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو ہی گیا۔

"ماما کے ساتھ کسی بیوٹی سیلون گئی ہے اور تم سے زیادہ کون جان سکتا ہے کہ ان پارلرز میں کتنا وقت لگتا ہے۔" وہ اس پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ اس کا ہر جملہ ماہم کو اپنے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح برستا محسوس ہو رہا تھا۔

"کیا بنا ثمن آپی کے معاملے کا؟ وہ بے چارہ انعم تو اس سارے معاملے میں خوامخواہ ہی پس گیا۔" موحد نے اس کے چہرے کے تنے ہوئے نقوش سے حظ اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"پتا نہیں کون سے جاہلوں کے خاندان میں پھنس گئی ہیں میری آپی۔" ماہم بھی کھل کر میدان میں اتر آئی۔ ویسے بھی وہ زیادہ دیر تک ادھار رکھنے کے قائل نہیں تھی۔ اس نے اپنی طرف سے خاصا کڑا وار کیا۔

"ہاں جاہلوں کے خاندان میں جاکر وہ بھی جاہل بن گئیں۔" موحد دانستہ بلند آواز میں قہقہہ لگا کر ہنسا۔

ماہم کا چہرہ خفت کے احساس سے سرخ ہوا۔

"انتہائی دقیانوسی خیالات کا حامل ہے ان کا سسرال۔ کیوں نہیں دیتے آپی کو مارننگ شو کرنے کی اجازت۔" وہ جھنجلا ہوئی۔

"شریف لوگ ہیں بے چارے ان کے ہاں نہیں ہوتے ہوں گے ایسے تماشے۔" موحد نے بھی دو بدو جواب دیا۔

"کیسی بھی کیا شرافت کہ بندہ اپنا گھر ہی خراب کرلے۔ آپی نے خلع کا نوٹس بھجوا دیا ہے انہیں۔" اس نے اپنی تیکھی ناک چڑھا کر اطلاع دی تو موحد کا دل جل کر راکھ ہو گیا۔

"اب بندہ پوچھے کہ ٹی وی پر آنے کا ایسا بھی کیا جنون کہ اپنا گھر اور بچہ تک داؤ پر لگا دیا۔" موحد کے طنز پر وہ بھڑک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بات جنون کی نہیں اظہر بھائی کی بلاوجہ کی "انا" کی ہے۔ ان کے خود ساختہ اصولوں نے ثمن آپی کی زندگی کو عذاب بنا رکھا ہے۔" وہ چلتے چلتے بولی۔

"ان سارے اصولوں و قوانین سے ثمن آپی شادی سے پہلے بھی بخوبی واقف تھیں۔" موحد کے جتاتے ہوئے انداز پر وہ رکی۔

"ان کی شادی ارینج میرج تھوڑی تھی۔ زبردست قسم کے افیئر کے بعد یہ معرکہ سرانجام پایا تھا۔ یہ بات تم لوگ کیوں بھول جاتے ہو؟" موحد کی آواز بے ساختہ اونچی ہوئی۔ ماہم کو جھٹکا لگا۔ اس نے ایک غصیلی نگاہ بڑے پرسکون انداز میں بیٹھے موحد پر ڈالی اور پاؤں پٹختی ہوئی اس کے گھر سے نکل گئی۔

یہ اس کے لیے بلاشبہ ایک سخت دن تھا۔ اسے موحد کے سرد اور طنزیہ لہجے سے ہتک محسوس ہوئی تھی۔ گیٹ سے نکلی تو باہر ٹی سی ایس والے نمائندے کو عین سامنے کھڑے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

"آپ عائشہ عبدالرحیم ہیں۔" کوریئر کے مخصوص لباس میں موٹر سائیکل پر بیٹھا نوجوان جھجک کر بولا۔

"جی۔" ماہم نے کچھ سوچ کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"یہ آپ کے لیے بکے اور گفٹ پیک ہے سائن کر دیں۔" اس کی بات پر ماہم نے بڑی عجلت میں دستخط کرکے سرخ گلابوں کا خوب صورت بکے اور گفٹ پیک وصول کیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مڑ کر دیکھا تو چوکیدار اپنے مخصوص کیبن میں گھس کر کوریئر والا جا چکا تھا۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ بکے اٹھائے تیز تیز چلتے ہوئے اپنے گھر آ گئی۔

اپنے بیڈ روم میں پہنچ کر اس نے فوراً گفٹ پیک سے ریپر پھاڑا۔ اندر سے ایک خوب صورت بریسلٹ نکلا۔ جس کے گلے میں ہار ڈال کر ایک چھوٹا سا کارڈ ڈالا ہوا تھا۔ ماہم نے فوراً کارڈ کھولا۔

"دنیا کی سب سے اچھی لڑکی کے لیے جو مجھ سے جانے کیوں خفا ہو گئی ہے۔" اس فقرے کے نیچے بھیجنے والے نے اپنا نام علی لکھا ہوا تھا۔

پھول، کارڈ، گفٹ۔ یہ ساری چیزیں ماہم کے دل و دماغ کو درہم برہم کر گئیں۔ اس نے اپنے اندر ایک الاؤ بھڑکتا محسوس کیا۔ جس کے شعلے اسے اپنے اردگرد ہر طرف لپکتے ہوئے محسوس ہوئے۔ وہ شخص اس کے دل و دماغ پر بری طرح سے قابض ہو گیا تھا۔

"ماہم منصور کی زندگی میں شکست نام کا کوئی لفظ نہیں۔" وہ ایک ہی نقطے پر نگاہ جمائے اب بڑی سنجیدگی سے پلاننگ میں مصروف تھی۔

☼ ☼ ☼

"ڈاکٹر خاور! یہ محبت انسان کو اتنا خوار کیوں کرتی ہے؟" ڈاکٹر زویا نے آج ہمت کرکے یہ سوال کر ہی ڈالا تھا۔ وہ دونوں آج بڑی فرصت سے ڈاکٹرز روم میں بیٹھے کافی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ آج ان کی رات کی ڈیوٹی تھی اور اس وقت رات کے بارہ بج رہے تھے۔

"مائی ڈیر! محبت نہیں، بلکہ یک طرفہ محبت انسان کو خوار کرتی ہے۔ انسان دل دے پر آخر کب تک رہ سکتا ہے۔" ڈاکٹر خاور نے تھوڑا سا محتاط انداز میں ڈاکٹر زویا کی اکثر باتیں اب انہیں جھنجلاہٹ میں مبتلا کرنے لگی تھیں۔

"مجھے ایسے لگتا ہے کہ جیسے میں کسی صحرا میں سراب کے پیچھے بھاگ رہی ہوں۔ میرا حلق خشک اور ٹانگیں اب مزید چلنے سے انکاری ہو گئی ہیں۔" وہ کچھ درجہ افسردہ تھیں۔ ان کی آنکھوں میں موجود ہلکی سی نمی ڈاکٹر خاور کو تاسف میں مبتلا کر گئی۔

"زویا! آپ واپس چلی جائیں اپنے والدین کے پاس۔ یہ آپ کے حق میں بہتر ہو گا۔" ڈاکٹر خاور نے ہمت کرکے وہ مشورہ دے ہی دیا جو وہ کافی عرصے سے ان کی دل آزاری کے خوف سے نہیں دے پا رہے تھے۔

"کیوں؟" زویا نے شکوہ کناں نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

"دیکھیں! آپ کے والدین کا پاکستان میں شفٹ ہونے کا کوئی ارادہ نہیں۔ آپ نے اپنی میڈیکل کی تعلیم یہاں سے حاصل کی اور اب اسپیشلائزیشن بھی وہیں سے مکمل کریں تو زیادہ بہتر ہے۔" ڈاکٹر خاور نے بہت سنجیدگی سے گفتگو کا آغاز کیا۔

"آپ کو اچھی طرح علم ہے خاور! کہ میں پاکستان آپ کی وجہ سے آئی ہوں۔" اعتراف کا لمحہ آ چکا تھا۔

"میں آپ کو بہت پہلے بتا چکا ہوں کہ میری زندگی میں فی الحال میرے پروفیشن کے علاوہ کسی اور چیز کی گنجائش نہیں نکلتی۔" انہوں نے صاف گوئی سے کہا۔

"مجھ میں کسی چیز کی کمی ہے؟" زویا کے لہجے میں ٹوٹے ہوئے شیشوں جیسی چبھن تھی۔

"میں نے کب کہا کہ کمی آپ میں ہے۔" انہوں نے سنجیدگی سے اپنے سامنے بیٹھی نازک سی لڑکی کو دیکھ کر سوچا تھا کہ کسی بھی لمحے رو دے گی۔

"پھر آپ مجھے بار بار مسترد کیوں کرتے ہیں؟" زویا کے سوال پر ایک ناگواری کی لہر ان کے چہرے پر ابھری۔

"مجھے معاف کرے زویا! میں کون ہوتا ہوں کسی کو رد کرنے والا۔" ان کے لہجے میں ہلکی سی خفگی در آئی۔ "زندگی میں ساری اچھی چیزیں سب کے لیے نہیں ہوتیں۔ میری زندگی گزارنے کی اپنی ترجیحات ہیں جس میں ابھی ایسی کسی چیز کی گنجائش نہیں نکلتی۔" ان کے چہرے پر پھیلی زردی کو دیکھ کر ڈاکٹر خاور نے اپنا لہجہ نرم کیا۔

"میں آپ کا انتظار کر سکتی ہوں۔"

"لیکن میں آپ کو کوئی انتظار کی ڈور نہیں تھما سکتا کیونکہ میں جب بھی شادی کا فیصلہ کروں گا تو اس لڑکی کا تعلق کم از کم میڈیکل کے شعبے سے نہیں ہو گا۔"

ڈاکٹر زویا کا چہرہ تاریک ہوا۔ کافی دیر تک بول ہی نہیں سکیں اور جب بولیں تو ڈاکٹر خاور بو کھلا گئے۔

"کہیں آپ کو اپنی اسسٹنٹ سکینہ اللہ دتا سے تو محبت نہیں ہو گئی؟" اس وقت انتہائی بے تکی بات پر ڈاکٹر خاور کو سخت غصہ آیا لیکن وہ پی گئے۔ زویا کا بچکانہ انداز ان کو برا لگتا تھا۔

"کیوں اس سے محبت کرنا گناہ ہے کیا؟" وہ تھوڑا سا تلخ ہوئے تو زویا کو اپنے حلق میں کوئی چیز پھنستی ہوئی محسوس ہوئی۔ انہوں نے بڑی مشکل سے کھینچ کر سانس لیا۔

"آپ کے انتخاب پر مجھے ہنسی آ رہی ہے۔ آپ کے ٹیسٹ کو کیا ہو گیا ڈاکٹر خاور!" وہ بڑی جلدی بدگمان ہو گئیں۔

"میں بھی حیران تھی کہ آپ پورے وارڈ میں سب سے زیادہ اسے ہی کیوں اہمیت دیتے ہیں۔" ڈاکٹر زویا کی آنکھوں سے شعلے نکلے۔ "اس کے لیے خصوصی طور پر ٹی وی منگوایا گیا۔ مختلف مقابلہ جات میں اپنی گاڑی پر لے کر جاتے رہے۔ اس سے اصرار کرکے غزلیں سنی جاتی تھیں۔ واہ ڈاکٹر خاور واہ! سچ کہتے ہیں سیانے کہ محبت اندھی ہوتی ہے۔" زویا کا لہجہ، الفاظ اور زہریلی مسکراہٹ ان کے ضبط کے پیمانے کو چھلکا ہی گئی۔

"شٹ اپ زویا! نو مور۔" وہ ایک دم جھٹکے سے کھڑے ہوئے اور انگلی اٹھا کر زویا کو وارننگ دی۔ "ایک لفظ بھی مزید مت کہیے گا۔"

ایک سخت نگاہ ڈال کر وہ کمرے سے نکل گئے۔ وہ تیزی سے پارکنگ کی طرف جا رہے تھے جب انہوں نے لان میں ایک طرف پول کے پاس سکینہ اور سسٹر ماریہ کو دیکھا۔ ان کے پاس سے گزرتے ہوئے ان کے قدم خود بخود سست ہو گئے سکینہ بڑے جذب اور عقیدت بھرے انداز کے ساتھ آنکھیں بند کیے سلطان باہو کا کلام گانے میں مگن تھی۔

اس کے سانولے چہرے پر اس وقت اتنی روشنی اور پاکیزگی تھی کہ ڈاکٹر خاور کئی لمحوں تک ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتے رہے۔ اپنے چہرے پر نگاہوں کا ارتکاز محسوس کرکے سکینہ نے آنکھیں کھولیں تو سامنے ڈاکٹر خاور کو دیکھ کر گھبراہٹ کا شکار ہوگئی۔ وہ آج بہت ہی عجیب سے انداز سے اس پر نظریں جمائے ہوئے اپنی جگہ ساکت کھڑے تھے۔

"ڈاکٹر صاحب! آئیں یہاں بیٹھ جائیں۔" سسٹر ماریہ نے انہیں احتراماً بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ ایک دم ہی ہوش کی دنیا میں آئے۔

"آپ لوگ اس وقت یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

"کچھ نہیں ڈاکٹر صاحب! سکینہ کے اماں ابا تو سو گئے تھے اس کو گھٹن ہو رہی تھی اس لیے میں اسے لان میں لے آئی۔" سسٹر ماریہ نے گھبرا کر وضاحت دی۔

"اوکے۔ آپ یہاں سے جائیں' میں کچھ دیر کے لیے سکینہ کے پاس بیٹھوں گا۔" انہیں نہ جانے کیا ہوا جو یہ فرمائش کر بیٹھے۔ سسٹر ماریہ نے تعجب سے انہیں دیکھا جو اپنے حواسوں میں نہیں لگ رہے تھے اور اندر کی جانب بڑھ گئیں۔

"سکینہ! کوئی اچھی سی چیز سناؤ' جو تھکے ہوئے اعصاب کو پُرسکون کردے۔" انہوں نے اپنے پیچھے آتی ڈاکٹر زویا کو دیکھ کر بلا ارادہ کہا۔ ان کی فرمائش پر سکینہ کا دل بے قابو ہوا۔ وہ کچھ پل سخت بے یقینی سے ڈاکٹر خاور کو دیکھتی رہی جو آج بہت مختلف روپ میں اس کے سامنے تھے۔

"الف اللہ' چنبے دی بوٹی' مرشد لائی۔۔۔ ہو!"

سکینہ نے بالکل بے اختیاری کے عالم میں لے اٹھائی۔ اس کی آواز نے ڈاکٹر زویا کے قدم جکڑ لیے۔ انہوں نے ٹھہر کے دیکھا۔ سامنے سکینہ آنکھیں بند کیے کسی اور ہی دنیا میں پہنچی ہوئی تھی جب کہ اس کے بالکل سامنے براجمان ڈاکٹر خاور بڑی عقیدت بھری نگاہوں سے ٹکٹکی باندھے سکینہ کا سانولا چہرہ دیکھنے میں مگن تھے۔ زویا کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

"اللہ کرے مر جائے یہ بد صورت چڑیل۔" زویا نے نفرت کی انتہا پر پہنچتے ہوئے بڑے دل سے سکینہ کو بد دعا دی۔

☼ ☼ ☼

"سکینہ کی ماں! تیرا کیا خیال ہے کہ اس دفعہ اپنی دمی رانی کا نکاح نہ کردیں؟" اللہ دتا کی بات پر جمیلہ مائی پر شادیٔ مرگ طاری ہوگئی۔ وہ دونوں اس وقت سارا سامان باندھے پنڈ جانے کے لیے تیار تھے۔ رات کی ٹرین سے ان کی بکنگ ہو چکی تھی۔ اس وقت سکینہ کو اسٹاف نرس فزیو تھراپسٹ کے پاس لے گئی ہوئی تھی۔

"سکینہ کے ابا! کیا جاجی کی بے بے مان گئی؟" جمیلہ مائی بے تابی سے اٹھ کر اللہ دتا کے پاس آئیں جو آنکھیں بند کیے کسی گہری سوچ میں تھے۔

"اس کی بے بے کا تو پتا نہیں' لیکن اللہ رکھے نے مجھے تسلی دی ہے کہ پا جی آپ بے فکر رہیں۔" اللہ دتے نے اپنے چھوٹے بھائی اللہ رکھے کی رائے سے جمیلہ مائی کو مطمئن کرنا چاہا۔

"اللہ خیر سکھ رکھے۔ میری دمی کے نصیب کی خوشیاں اسے ضرور ملیں گی۔" جمیلہ مائی کو تسلی کے لیے سکینہ کے ابے نے بڑے پُریقین انداز میں کہا۔

"ان شاء اللہ۔" جمیلہ مائی کے دل سے بے ساختہ نکلا۔

"جاجی تو ماشاء اللہ بہت خوش دکھائی دیتا ہے۔" جمیلہ مائی نے خوش دلی سے کہا اور اگلے ہی لمحے ایک سوچ اسے پریشان کر گئی۔ "سکینہ کے ابا! مجھے مائی نے فون کرکے بتایا ہے کہ جاجی کی بے بے آج کل تعویذ گنڈوں کے چکروں میں ہے۔"

"تعویذ گنڈے۔" اللہ دتا چونکے۔ "وہ کیوں؟"

"وہ اس رشتے سے خوش جو نہیں ہے' کہتی ہے کہ جاجی کا تعویذ لیا ہے ذہن پھیر دے گی۔" جمیلہ مائی کی بات پر اللہ دتے نے تاسف بھرے انداز سے دیکھا۔

"سکینہ کی ماں! کیسی باتیں کرتی ہے تو' ان تعویذ گنڈوں کے چکروں میں کہاں سے آگئی؟" اپنے شوہر کی بات پر وہ ایک دم شرمندہ ہوئی۔

"جادو تو ہوتا ہے نا۔" انہوں نے دلیل دی تو اللہ دتے نے تاسف بھرے انداز سے اپنی بیوی کا چہرہ دیکھا۔

"سکینہ کی ماں! بے شک جادو ہوتا ہے لیکن اپنے ذہن میں ہمیشہ یہ سوچ رکھ کہ جو کرتا ہے' اللہ کرتا ہے اور اللہ جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔ اس میں کسی جادو ٹونے کا کوئی کمال نہیں۔ یہ سب کمزور عقیدے کی نشانیاں ہیں۔ جو اچھا اس نے تیری قسمت میں لکھ دیا ہے تجھے مل کر ہی رہے گا اور جو برائی تیرا مقدر ہے اسے دعا کے علاوہ کوئی چیز نہیں بدل سکتی۔ بس اپنا ایمان پختہ رکھ۔" اللہ دتے کے سنجیدہ انداز پر جمیلہ مائی پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

"سکینہ کے ابا!" جمیلہ مائی کی پکار پر انہوں نے مڑ کر دیکھا۔ "میری دمی جب بالکل ٹھیک ہو جائے گی تو میں اسے ڈاکٹر نہ سہی لیکن نرس ضرور بناؤں گی۔" جمیلہ مائی کی معصوم سی خواہش پر وہ بے ساختہ ہنس پڑے۔

"بھلیے لوکے! ابھی اس کے ویاہ کے بارے میں فکر مند ہو رہی تھی' اب تو اسے نرس بنانے پر تل گئی ہے۔"

"نرس تو وہ شادی کے بعد بھی بن سکتی ہے نا۔" جمیلہ مائی کی بات پر اللہ دتے مسکرائے۔ "مجھے کیا پتا' یہ سب پڑھے لکھے لوگوں کی باتیں ہیں۔ بس دعا کر کہ اپنی دمی رانی کو اللہ صحت یاب کردے' ساری چیزیں صحت کے ساتھ ہی اچھی لگتی ہیں۔"

"تائی! کیا بات ہے اکیلے اکیلے کیوں مسکرا رہی ہے۔" جاجی افطاری کا سامان لے کر اندر آیا تو جمیلہ مائی کو مسکراتے دیکھ کر تجسس بھرے انداز سے بولا۔

"اکیلے اکیلے تو نہیں۔ ابھی سکینہ کا ابا بھی یہیں تھا۔ نماز پڑھنے مسجد میں گیا ہے۔"

"تائی! سکینہ کہاں گئی؟" جاجی نے متلاشی نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھا تو جمیلہ مائی نے سادگی سے کہا۔

"وہ ڈاکٹرنی صاحبہ کے پاس گئی ہے ورزش کرنے۔"

"تائی! یہ اپنی سکینہ نے آج کل غصہ کرنا کم نہیں کردیا؟" جاجی کے شرارت بھرے انداز پر وہ ہنس دیں۔

"غصہ کم نہیں کیا' بس اپنے ابے کا لحاظ کر جاتی ہے۔ اس کے سامنے بولتی بند ہو جاتی ہے اس کی۔" جمیلہ مائی کی صاف گوئی پر جاجی نے بڑا جاندار قہقہہ لگایا۔

"اس کا مطلب ہے تائی کہ مجھے مستقبل میں تائے کو اپنے ساتھ ہی گھر میں رکھ لینا چاہیے۔" دوپٹے کے پلو سے اپنا چہرہ خشک کرتی جمیلہ مائی بڑے دل سے مسکرائیں۔ اپنی دمی کے خوشگوار مستقبل سے جڑی ہلکی سی سوچ بھی گھنٹوں خوش رکھنے کے لیے کافی ہوتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ شام افطاری تک بلاوجہ مسکراتی رہیں۔

☼ ☼ ☼

عائشہ ننگے پاؤں کارپٹ پر چلتے چلتے دیوار کے پاس لگے کیلنڈر کے پاس آکر رک گئی۔ اس کے چہرے پر بڑی تلخ سی مسکراہٹ پھیلی۔ اس دشمن جاں سے بات کیے ہوئے ایک مہینے سے زائد کا عرصہ ہو گیا تھا۔ اس نے غصے میں آکر جو اسے کال یا ٹیکسٹ نہ کرنے کا میسج کیا تھا۔ اس کے بعد بالکل خاموشی چھا گئی تھی۔ اس نے بھی دوبارہ رابطہ نہ کرنے کی شاید قسم کھالی تھی۔

"آخر وہ لڑکی کون ہو سکتی ہے جو اس کے ساتھ

اسپتال میں تھی؟" اس سوال کے جواب میں دماغ میں جو سوچ ابھرتی تھی وہ چاہتے ہوئے بھی وہ یہ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے اپنی گیلی ہوتی ہوئی آنکھوں کو سختی سے رگڑا اور بیگ اٹھا کر اپنے بیڈ روم سے نکل آئی۔
"عائشہ! کہاں جارہی ہو؟" ماما نے شاید اسے کچن کی کھڑکی سے باہر جاتے دیکھا تھا۔ اس لیے پیچھے سے پکار لیا۔
"کہیں نہیں ماما! بس یہ تھوڑا سا مال کی طرف جارہی ہوں۔" اس نے مختصراً جواب دیا لیکن ماما کے اگلے سوال نے اسے کوفت میں مبتلا کیا۔
"کیا! ہم کے ساتھ جارہی ہو؟"
"نہیں ماما! وہ آج کل پتا نہیں کن چکروں میں ہے۔" اس نے بے زاری سے اپنے سامنے کھڑی ماما کو دیکھا جن کی کھوجتی نگاہوں پر وہ کچھ مضطرب ہوئی۔ انہیں نہ جانے کس انہونی کا احساس ہوا جو وہ فوراً بولیں۔
"میں ساتھ چلوں تمہارے؟"
"کم آن ماما!" وہ جھنجلائی۔ "آپ تو تیار ہونے میں پورا گھنٹہ لگا دیں گی اور میں اس وقت تک واپس بھی آجاؤں گی۔"
"یہ رات کے نو بجے کیا کرنے جانا ہے تم نے اکیلے؟" ماما تھوڑا سا فکر مند ہوئیں تو عائشہ نے آگے بڑھ کر ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور ایک لمبی سانس فضا میں خارج کی۔
"ماما میں اس سے بھی زیادہ دیر سے گھر آتی رہی ہوں لیکن آپ کبھی ایسے پریشان نہیں ہوئیں۔ آج کیا ہوگیا ہے؟" اس کے نرم انداز پر وہ کچھ ڈھیلی پڑگئیں۔
"پتا نہیں بیٹا! ایسے ہی دل کچھ پریشان سا ہے۔ اس لیے کہہ دیا۔"
"چلیں پھر میں نہیں جاتی۔" وہ بڑے اطمینان سے سامنے پڑے صوفے پر بیٹھ گئی۔
"ارے نہیں بیٹا! میں نے ایسا کب کہا۔ کیا کوئی خاص چیز لینے جانا تھا؟"

"ماما! خاص کا تو پتا نہیں، موحد بھائی نے ایک معذور لڑکی کے لیے عید کی شاپنگ کا کہا تھا۔ وہی کرنے جارہی تھی۔" عائشہ کی اطلاع پر ان کو (ایک زبردست جھٹکا) لگا۔
"معذور لڑکی؟ وہ کہاں سے مل گئی موحد کو؟" فطری سی پریشانی نے ان کا گھیراؤ کیا۔ "کیا وہ وہی جس سے موحد فون پر باتیں کرتا ہے۔"
"تو ماما!" عائشہ ہنسی۔ "وہ لڑکی تو اچھی خاصی ٹھاک ہے۔ اپنے پیروں پر چلتی ہے۔"
"تمہیں کس نے بتایا؟" وہ بے صبری سے بولیں۔
"چوکیدار بابا نے یونہی ذکر کیا تھا کہ میری دوست ملنے آئی تھیں جب ہم ناران گئے تھے۔ ملیں نہیں۔ لیکن موحد صاحب کے ساتھ وہ کافی بیٹھی رہی ہیں لان میں۔" عائشہ کے انکشاف پر منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔
"تم نے پوچھا موحد سے؟"
"جی بتا رہے تھے کہ ان ہی کی کوئی دوست تھی۔" عائشہ نے مزے سے بتایا۔ اس کا موڈ خاصا بہتر ہو (چکا تھا)۔
"بہت چالاک نکلا یہ موحد، ہمیں بھی ملوا(یا نہیں)۔" انہوں نے منہ بناتے ہوئے کہا تو عائشہ مسکرائی۔
"لیکن اس معذور لڑکی کو کس چکر میں عیدی بھ(یجی) جارہی ہے؟" نہیں یاد آیا تو وہ تھوڑا سا جھنجھلائیں۔
"ماما! وہ لڑکی اسی ڈاکٹر کی اسسٹنٹ ہے جس کے (پاس) موحد آج کل جارہا ہے۔" عائشہ نے تفصیل سے (بتایا) تو انہوں نے سکون کا سانس لیا۔
"اور تو کوئی بات نہیں ہے نا؟" وہ اب بھی مشکوک تھیں۔ ان کے اس انداز پر عائشہ مسکرادی۔ "(ڈر ہے) کہ وہ کل کو اسی لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر گھر لے (آئے) ان سے ملیں یہ ہے آپ کی ہونے والی بہو۔"
"اگر ایسا بھی ہوجائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔" وہ مزے سے بولی۔ جب کہ اس بات پر (وہ) بھڑکنے لگی گئیں۔ "دماغ ٹھیک ہے تم دونوں کا، (ایک) اپاہج اولاد ہے میری۔ کان کھول کر سن لو اور (بتا دو) اپنے بھائی کو بھی۔ میں اس گھر میں کوئی اور دو(سری معذوری بر)داشت نہیں کروں گی۔" وہ پاؤں پٹختی ہوئیں اندر چلی گئیں۔ عائشہ کو ان کی بات سے خاصا صدمہ پہنچا۔
"واہ میرے مولا! انسان کتنا خود غرض ہے۔ اپنی اولاد کے لیے ہر لحاظ سے مکمل چیز چاہتا ہے اور دوسروں کے لیے اپنی اپاہج اولاد کا اتنا بڑا نقص بھی نظر نہیں آتا۔" وہ دل ہی دل میں کڑھتی ہوئی پورچ تک آئی اور گاڑی اسٹارٹ کی۔ وہ ابھی مین روڈ پر ہی آئی تھی کہ سیل فون پر رامس علی کال نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔
"مدر ٹریسا! اب کہاں خدمت خلق میں مصروف ہیں؟" اس کی چہکتی ہوئی آواز نے عائشہ کے اندر چھائی کثافت کو دور کیا۔
"مال جانے کا ارادہ ہے۔" عائشہ نے گاڑی کو میں روڈ گیئر میں ڈالتے ہوئے جواب دیا۔
"ہوں موجیں ہورہی ہیں۔" وہ ہنسا۔ عائشہ کو اس کی قوت ارادی پر حیرت ہوئی۔ وہ خود کو بہت جلد نارمل لائف کی طرف لانے کی کوشش کررہا تھا۔
"موجیں تو نہیں، بس تھوڑی بہت شاپنگ کا ارادہ تھا۔" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔
"میں بھی وہیں ہوں۔ ماما کی کل برتھ ڈے ہے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ ان کے لیے کیا کروں۔" اس نے اپنی الجھن کا اظہار کیا۔
"کچھ بھی لے لیں، خواتین کے لیے کچھ لینا ہو تو بہت چوائس ہوتی ہے۔" عائشہ نے سگنل پر کھڑے ہونے کے لیے کلچ دبا کر بریک پر پاؤں رکھا۔
"مثلاً؟" وہ ابھی بھی کنفیوژ تھا۔
"کوئی سوٹ، بیگ، جیولری یا پرفیوم۔" اس نے ایک ہی سانس میں کئی چیزیں گنوائیں تو دوسری جانب وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔
"مجھے تو سمجھ میں نہیں آرہا کہ کون سا لوں، ساری تجاویز ایک جیسی لگ رہی ہیں۔"
"یہ ہوئی نا بات بھی۔" عائشہ کے لہجے میں مصنوعی برہمی تھی۔ "تمہاری کوئی بہن نہیں ہے کیا؟"
"نہیں۔" وہ عجز سے بولا تو عائشہ کو اس کی بے بسی کا اندازہ ہوا۔
"اچھا! میں کچھ مدد کردیتی ہوں۔" اس کی آفر پر دوسری جانب وہ کھل اٹھا۔ اس نے مروتاً بھی انکار نہیں کیا۔ "تو کیا میرا انتظار کرو۔"
"اف لگتا ہے کہ سارا شہر ہی یہاں اکٹھا ہے۔" ویک اینڈ ہونے کی وجہ سے پارکنگ میں بھی خاصا رش تھا۔ اسے بمشکل جگہ ملی۔ گاڑی لاک کرکے وہ مال کی طرف بڑھی۔ فضا میں نم آلود ہواؤں نے اس کا استقبال کیا۔ اپنے بالوں میں لاپروائی سے ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ اندر داخل ہوئی۔ گراؤنڈ فلور میں کافی رش تھا۔ رامس کے انتظار میں ایک کارنر پر بنی فوڈ شاپ کے خوب صورت صوفے پر بیٹھ گئی۔
"کیا لوگ واقعی ہی اتنے خوش ہوتے ہیں جتنے نظر آتے ہیں۔" ہنستے مسکراتے لوگوں کو دیکھتے ہوئے وہ سوچنے لگی۔ ایک دم ہی اس کی نظر ایک منظر پر پڑی۔ اسے جھٹکا لگا۔ حیرت اور بے یقینی کی زیادتی سے وہ سامنے اسکیلیٹر سے اترتے اس خوش باش جوڑے کو کھڑے ہو کر دیکھنے لگی۔
اسے حقیقتاً "سو واٹ" کا جھٹکا لگا۔ دکھ، غم، بے یقینی اور صدمے کے تاثرات سے اس کے چہرے کے زاویے بگڑ گئے۔ دل کرب کی اتھاہ گہرائیوں میں گرتا گیا۔ وہ دھم سے دوبارہ سنگل صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کی گمان کی آخری سرحدوں پر بھی کہیں نہیں تھا کہ وہ آج علی کے ساتھ ہنستی مسکراتی ماہم کو دیکھے گی، جو اپنے سارے ہتھیاروں سے لیس سارے جہان پر بجلیاں گراتی پھر رہی تھی۔ کسی بات پر ہنستے ہوئے اس نے بے ساختہ اپنا ہاتھ علی کے بازو پر رکھا۔ وہ دونوں اس کی موجودگی سے لاعلم ایک دوسرے سے گفتگو میں مگن تھے۔
"واٹ اے بیوٹی فل اینڈ پرفیکٹ کپل۔" عائشہ کے بالکل سامنے دو ٹین ایجر لڑکیاں لیمن سلش میں اسٹرا گھماتی ان دونوں پر بلند آواز میں تبصرہ کررہی تھیں۔ عائشہ کو یوں لگا کہ جیسے کسی نے اسے مال کی بلند عمارت سے بڑا زوردار دھکا دے دیا ہو۔ آنسوؤں کی ایک پتلی سی لکیر اس کی آنکھوں سے نکل کر پورے چہرے پر پھیلتی گئی۔ (باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

قانتہ رابعہ

"ارے نھی! کہاں مر کھپ گئی ہو؟" دادی نے پاٹ دار آواز میں پوچھا۔ کوئی جواب نہ ملنے پر خود ہی پاؤں گھسیٹتے ہوئے برآمدے سے اتر کر طویل صحن عبور کیا۔

"ارے شنو... شنو کی بچی! کوئی تو جواب دے۔"

برآمدے سے اترتے ہی دائیں جانب درخت کے نیچے دونوں بہنیں چارپائی پر تشریف فرما تھیں۔ دبے پاؤں وہ قریب پہنچیں۔ ایک نے کسی موٹے سارے رسالے میں سر دیا ہوا تھا اور دوسری موبائل فون پر کوئی گانا سن رہی تھی اور ساتھ ساتھ سر دھن رہی تھی۔

دادی کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

"نگوڑ ماریو... یہ بے حیائی کے سارے کام تم دونوں کے کرنے کو ہی رہ گئے۔" گانا سننے میں مگن نھی کی پیٹھ میں ایک دھموکا جڑا۔

نھی بلبلا اٹھی۔ جب نظر اٹھائی تو سامنے انگارے چباتی اور آگ اگلتی دادی پر نظر پڑی۔

"مارے گئے۔" کہہ کر اس نے موبائل کو چھپانا چاہا مگر دادی نے چیل کی طرح جھپٹا مار کر موبائل چھین لیا۔ سریلی آوازوں میں وہ گانا چل رہا تھا۔

میرا تے تیرا...

تیرا تے میرا...

ازلاں دا سو ہنڑیے یارانی...

"الف... توبہ... میرے اللہ..." گزشتہ چالیس سالوں سے محلے کی بچیوں کو قرآن پڑھانے والی دادی کا بی پی شوٹ کر گیا۔ "بے غیرت! یہ کیا سن رہی ہے' شرم نہیں آتی تجھے؟"

انہوں نے کھا جانے والی نظروں میں "بے غیرت نھی" کو گھورا' جواب کافی حد تک سنبھل چکی تھی بلکہ دادی کے حملے کا جواب دینے کے لیے آمادہ تھی۔ ساتھ ہی دادی نے توپوں کا رخ شنو کی طرف کیا۔ جس نے موٹا سا رسالہ تکیے کے نیچے چھپانے کے بجائے کمر کے نیچے کر لیا تھا اور یوں سید می بات تھی کہ دادی کی سات پشتیں بھی رسالہ نہ ڈھونڈ پاتیں۔

"اور اسے دیکھو' میسنی' گھنی شنو... سارا دن رسالوں میں مگن رہتی ہے۔ خدا جانے ان رسالوں میں اسے کیا ملتا ہے۔" دادی کے منہ پر کالک ملوانی ہے' خوب نام روشن کریں گی میرا اپنے گھروں میں۔"

بہو کے انتقال اور دونوں بچیوں کی پرورش کی مشقتوں نے انہیں بہت چڑچڑا کر دیا تھا۔

شنو چونکہ میسنی' گھنی تھی سو خاموش رہی۔ نھی میدان جنگ میں اتری۔

"دادی! کتنی بار کہا ہے' ہم آپ کی نیک اور باعمل پوتیاں ہیں۔ ناول افسانے پڑھنے سے آپ کی تربیت پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔"

"اوئی... " دادی نے انگلی ناک پر دھری۔ "بے شرمی کے رسالے پڑھ کے اور ڈومنیوں کے گانے سن کر نیکی کہاں برقرار رہی؟"

"آپ کو تو ہم پر شک ہی رہے گا۔" نھی نے منہ کو غم زدہ کیا۔ "جن کتابوں اور رسالوں کو آپ بازاری رسالے اور بے شرمی کی کہانیاں کہتی ہیں' آپ کو کیا پتا ان میں کون کون سا سبق نہیں ہوتا ہمارے لیے اور جن گانوں کو آپ گندے کہتی ہیں' وہ کتنے اچھے گانے ہوتے ہیں۔"

دادی نے لاپروائی سے ہاتھ جھٹک کر چارپائی پر بیٹھنا چاہا۔ شنو نے کھسک کر دادی کے لیے جگہ بنانا چاہی اور اگلے ہی لمحے شنو کے نیچے دبا رسالہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ ٹائٹل پر ننگے سر' ننگے بازو' کھلے گلے والی بے حیا لڑکی آنکھیں پھاڑے دیکھ رہی تھی۔

دادی نے استغفراللہ پڑھ کر ٹائٹل کا صفحہ نوچا۔ "تمہارے دادا نے ساری زندگی ان رسالوں کو گھر میں نہ آنے دیا۔ اب پوتیوں کی دیدہ دلیری دیکھو۔"

نھی تو لاتعلقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔ لیکن ان رسالوں کے خلاف پچپن منٹ کے لیکچر سننے کے لیے شنو قابو میں آگئی تھی۔

✿ ✿ ✿

بھیج دے کر شنو گھر آئی تو دادی سارے گھر میں بولائی بولائی پھر رہی تھیں۔

"اے یہ صوفہ ٹیڑھا کیوں ہے۔ بستر کی چادر پر سلوٹ کیوں نظر آرہی ہے؟"

شنو نے منی سے پوچھا۔ "دادی کیوں اتنی پریشان ہیں؟"

منی کے بجائے دادی نے منہ توڑ جواب دیا۔

"تمہاری اماں خود تو جنت سدھاریں' بیٹیوں کے بوجھ مجھ ناتواں کے کندھوں پر۔ میری بوڑھی جان کیا کیا کرے۔"

"دادی! آپ کیا کہہ رہی ہیں؟" اس کی واقعی سمجھ میں نہ آیا کہ دادی ہوا کے گھوڑے پر کیوں سوار ہیں۔

"اے میں نے کیا کہنا ہے۔ تو ان نگوڑ مارے رسالوں کی دنیا سے باہر نکلے تو تجھے پتا چلے لڑکیوں پر کون کون سے مرحلے آتے ہیں۔ سدا کی بے خبر' بس رسالے چاٹ لو۔ چھوٹے بڑے' پتلے موٹے ہر سائز کے رسالوں کے ڈھیروں میں گم ہیں۔"

"اف۔ میرے خدایا دادی!" شنو نے پاؤں پٹخ کر کہا۔ "میرے رسالے بیچ میں کیوں لے آئیں۔"

"اس لیے بی بنو! کہ رسالوں سے آنکھیں ہٹاؤ' دیدے گھماؤ تو پتا چلے کہ آج کوئی خاص مہمان آرہے ہیں۔ اتنی بھی عقل نہ دی ان کتابوں نے؟" دادی نے ترنت جواب دیا۔

"توبہ ہے۔ آپ بھی نا بس۔" شنو کو کچھ کچھ سمجھ میں آیا تو وہ شرما کر اندر بھاگ گئی۔

☼ ☼ ☼

ایک تو لڑکے کے دوست کی بیوی' ایک لڑکے کی پھوپھی اور ایک دور پار کی کزن۔ تین خواتین شنو کا رشتہ دیکھنے آئیں۔ شنو اور منی کی کم سنی میں ان کی ماں کے انتقال سے لے کر اسکول میں داخلے' پڑھائی' مشاغل تک عام باتیں دادی نے خوب تفصیل سے بیان کیں۔

کھانا ٹیبل پر لگا تو دادی نے بغیر کسی لگی لپٹی رکھے تینوں خواتین کو بتا دیا کہ نہ تو قیمہ کریلے شنو نے بنائے اور نہ ہی پلاؤ' زردہ' تینوں چیزیں کام والی ماسی نے بنائی ہیں۔ چپاتیاں اور سلاد منی نے بنایا ہے اور قورمہ دادی نے۔

"تو کیا شنو نے کچھ نہ بنایا؟" لڑکے کی پھوپھی حیرت سے بولی۔

"ابھی چائے آئے گی نا۔ وہ اس کے ہاتھ کی ہو گی۔ چائے کے علاوہ اسے کچھ نہیں آتا۔"

لڑکے کی کزن اور دوست کی بیوی نے آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے کو دیکھا۔ دادی نے سلسلہ کلام جوڑا۔

"سچی بات ہے۔ ایک' دو دفعہ اس نے کھانا پکانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن ایسا حشر کیا کہ میں نے کبھی کچن کو ہاتھ لگانے نہ دیا۔ ویسے سیکھ لے گی۔ ایسی بھی کوڑھ مغز نہیں۔" دادی نے بے نیازی سے کہا۔

اتنے میں شنو بی بی چائے کی ٹرے ہاتھ میں پکڑے اندر داخل ہوئیں۔ سانولے رنگ کے باوجود اس کے چہرے پر بے پناہ معصومیت اور کشش تھی۔

چائے کا کپ ہاتھ میں پکڑتے ہوئے لڑکے کے دوست کی بیوی نے سوال کیا۔

"شہناز۔۔۔ آپ کی ہابیز کیا ہیں۔ کوکنگ؟ ڈرائنگ؟" شہناز عرف شنو کی آنکھوں میں چمک آئی اور بے ساختہ بولی۔

"دنیا جہان کی کتابیں' رسالے اور اخبار پڑھنا' مطالعہ' مطالعہ اور مطالعہ۔۔۔ یہی میرا اوڑھنا بچھونا ہے۔ میرے پاس اشفاق احمد کی زاویہ سے لے کر ... احمد تک کے تمام ناولز موجود ہیں۔ میرے پاس ... رسالے ہر ماہ آتے ہیں۔"

"چھ رسالے؟" سب کو جیسے جھٹکا لگا۔

"جی ہاں!" اس نے فخریہ کہا۔ "میرے پاس خواتین کے تعلیمی' اصلاحی' ادبی رسالے آتے ہیں' دیکھیں۔۔۔" اس نے کمرے کی قد آدم لائبریری کی طرف اشارہ کیا۔ جس میں ہر سائز کے رسالے نفاست اور ترتیب کے ساتھ موجود تھے۔

"چلو شنو بیٹا اٹھو۔ مجھے تو چائے میں اور دودھ ڈال کے دو۔" دادی نے چبا چبا کر کہا اور اسے منظر سے باہر کیا۔

شنو منہ بسورتی کچن میں چلی گئی۔ "اف! اس دفعہ عنیزہ سید کی قسط کیا غضب کی تھی۔ کاش! ان دونوں میں سے کوئی تو ان رسالوں کا رسیا ہوتا' تاکہ گفتگو میں جان پڑتی۔"

"مٹی کے آنسو" کی پندرہویں قسط ابھی تازہ تازہ پڑھی تھی۔ لہٰذا وہ سراپا اسی کے سحر میں جکڑی ہوئی تھی۔ پتا ہی نہ چلا کب مہمان رخصت ہوئے اور ابا کے ساتھ ساتھ دادی کے حضور اس کی بے عقلی کے ماتم کا ڈیڑھ گھنٹے کا لیکچر اس کا منتظر تھا۔

☼ ☼ ☼

"اے شنو! آج بچیوں کو ترجمہ تم پڑھا دو۔" دادی نے شنو کو مخاطب کیا جو کتاب پڑھتے ہوئے قل قل کر کے ہنسے جا رہی تھی۔

شنو بی بی ہنوز کتاب میں گم۔ کون سی دادی اور کہاں کے بچے۔ انہوں نے آگے ہو کے اس کا شانہ ہلایا۔ "تمہیں کہہ رہی ہوں باجی کتاب صاحبہ۔"

"جی کیا دادی!" شنو نے چونک کر دیکھا۔ "میں کہہ رہی ہوں میں ضروری کام سے جا رہی ہوں۔ تم بچیوں کا سبق سن لینا۔"

"جی اچھا۔" شنو نے تابعداری سے کہا۔ آنکھیں ابھی بھی سالیہ بخاری کے ناول کی قسط کی سطروں پر جمی تھیں۔ دادی نے کتاب اس کے ہاتھ سے چھینی اور دیوار کے پرے پھینک دی۔

"اللہ مارے ان کتابوں' رسالوں کو ترسو تم ساری زندگی ان کی شکل دیکھنے کو نہ ملے۔ غضب خدا کا۔ حد ہے اس موئی صاحبزادی کی۔ اللہ جانے کون سی جھوٹی سچی کہانیاں ہوتی ہیں۔ جن میں مگن رہتی ہے۔ دین کی فکر نہ دنیا کی۔" پاؤں پٹختے ہوئے وہ دروازے سے نکلیں تو شنو ٹھٹکی۔

"ارے ... دادی تو کبھی گھر سے باہر جانے پر آمادہ ہی نہیں ہوتیں۔ آج اکیلے اکیلے کہاں جا رہی ہیں۔" وہ بھی نیا سوٹ گیا جو تک کتاب پھینکنے کا غم ایک طرف۔ وہ اسی سوچ میں مگن رہی کہ دادی گئی کہاں ہیں۔ لڑکیاں آئیں۔ اس نے ناچار ان کا سبق سنا اور چھٹی دے دی۔ مغرب سے پہلے دادی بھی واپس آگئیں۔ بڑی خوش باش' ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ' ابا ان کے پیچھے پیچھے۔

"دادی! آپ کہاں گئی تھیں؟" منی نے پوچھا۔

"شنو کی بات پکی کرنے۔ گیارہ دن کے بعد بارات ہے۔ میرے تو ہاتھ پاؤں پھولے جا رہے ہیں۔ اتنی جلدی سب کیسے ہو گا۔"

شنو کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ "میری شادی؟"

"ہاں تو اور کیا۔ طلاق دو ان موئے رسالوں کو اور میرے ساتھ کام میں جت جاؤ۔"

شنو ٹھنڈا سانس بھر کے وہیں ڈھے سی گئی۔

☼ ☼ ☼

وقت جیسے چٹکی بجاتے گزر گیا اور بارات کے پہنچنے کی اطلاع مل گئی۔ ان دس دنوں میں شنو غریب ہاتھ باندھے بس ایک ایک کے آگے یہی عرضداشت پیش کرتی رہی کہ "وہ میرے رسالے تو نہیں چھڑوا دے گا۔ ہائے میں مر جاؤں گی۔ میں ان کے بغیر ایک پل نہیں رہ سکتی۔ منی! تم کچھ کرو۔"

منی صاف پہلو بچا جاتی۔ دادی نے پرورش ہی ایسے کی تھی کہ غیر مرد سے بات تو کیا سائے سے بھی بھاگتی تھیں۔ جب تک نکاح نہ ہو جاتا شنو کا منگیتر اس کا کیا لگتا تھا۔

بارات میں دس' پندرہ لوگ تھے۔ جہیز لینے سے سختی سے منع کیا تھا۔ لڑکے کا بنا بنایا سجا سجایا گھر موجود ہے۔ جہیز کے نام پر تنکا نہیں لیا جائے گا۔ یہ سن کر سب سے زیادہ خوشی شنو کو ہوئی۔

شادی کے تمام جملہ امور خوش اسلوبی سے نمٹ گئے۔ رخصتی کے وقت شنو کو جب گاڑی میں بٹھایا جانے لگا تو ابا بڑے سارے دو کارٹن اٹھا کر لائے۔

"کہ۔۔۔ آپ کو منع کیا تھا نا کچھ نہیں لینا۔" لب بھینچ کر دولہا نے کہا۔

"یہ۔۔۔ شنو آپی کی کتابیں' ناول اور رسالے ہیں۔" ننھی نے چہک کر بتایا۔

"رسالے۔" دولہا نے بلند آواز سے کہا۔ شنو کا اوپر کا سانس اوپر' نیچے کا نیچے رہ گیا۔

اس کی آئندہ زندگی کا انحصار اب دولہا کے آئندہ جملے میں چھپا ہوا تھا جو منہ سے ابھی برآمد ہوتا تھا۔ دولہا کی قدرے غصیلی آواز میں فقرہ سنائی دیا۔

"لاحول ولا۔۔۔"

ابا نے لاحول ولا کا مطلب سمجھنے میں لمحہ بھر کی تاخیر نہ کی اور دونوں کارٹن واپس گھر بھجوا دیے۔

سارا راستہ خاموشی سے کٹا۔ بس وہی رو رہی تھی جسے رخصتی' جدائی' ہجرت کا مفہوم "لاحول ولا" کے بعد سمجھ میں آیا تھا۔ وہ سارا راستہ آنسو بہانے میں ہی گزرا۔

☼ ☼ ☼

"جیسی بھی تھی میری جان تھی شنو میں۔ اللہ جانے کس حال میں ہوگی۔" دادی نے سارا دن کڑھتے ہوئے گزارا۔

رسالے واپس کرنے کے واقعے نے ننھی اور دادی دونوں کو ہولا دیا تھا۔ رسالوں کی سدا کی دشمن دادی کے منہ سے بھی فقرہ نکلا۔

"ہائے ہے! کیا تھا جو یہ ڈبے رکھ لیتا۔ دل تو خراب نہ ہوتا میری بچی کا۔" دادی کی آنکھوں میں ستارے چمکے اور ٹوٹ کر بہہ نکلے۔

ولیمہ کے ایک ہفتہ بعد شنو آئی خوب چہکتی دمکتی۔ پوری کی پوری بیگم صاحبہ بن کر۔ خوشی اس کے وجود سے خوشبو کی طرح پھوٹی پڑ رہی تھی۔

وہ مریل مرکھنی' روتی دھوتی شکل والی شنو کا تصور کہیں دور دفن ہوا۔ پورے بارہ گھنٹوں کے قیام میں ایک دفعہ بھی ذکر نہ آیا ان کتابوں' رسالوں کا۔ بس جاتے جاتے اس نے اپنے کمرے میں سے دو' تین کتابیں اور رسالے اٹھائے اور بیگ کے اندر ٹھونس لیے۔

☼ ☼ ☼

اگلے تین' چار ماہ میں شنو کا بس ایک ہی چکر لگا۔ ساس نہ نند' دیورانی نہ جٹھانی۔ خالی ڈھنڈار سا گھر کر کے آسرے پر چھوڑ کر آئے۔ فون پر وہ بہت مختصر بات کرتی۔ "سب ٹھیک ہے" اس کا تکیہ کلام بن چکا تھا۔ دادی پوچھتی رہ جاتیں۔

"ارے کھانا کیسے بناتی ہو؟"

"نعمان کا مزاج کیسا ہے؟"

"سارا دن اکیلے میں گھبراتی تو نہیں ہو؟"

اور۔۔۔ اور۔۔۔ وہ گفتگو کا اختتام اس فقرے پر کرتیں۔

"رسالے پڑھنے سے تو نہیں روکتا؟"

ہلکے پھلکے انداز میں شنو گھڑے گھڑائے جواب دے کر دادی کو مطمئن کر دیتی۔ البتہ ننھی "دعا منہ بیچ" لے کر خوب انصاف کرتی۔ دادی کو سن گن ملتی تو دل میں ہی سوچ کر رہ جاتیں۔ اللہ جانے اتنی لمبی روزانہ کیا گفتگو ہوتی ہے دونوں بہنوں میں۔

شادی کے بعد پہلی دفعہ شنو ایک ہفتہ رہنے کے لیے آئی۔ وہ پرانی شنو ڈھونڈے سے بھی نہ ملی۔ بردبار' سنجیدہ' کچھ نہ کچھ کرتے رہنے میں مصروف۔ دادی نے تو دیکھ دیکھ کے آنکھیں پھٹ رہی تھیں۔

"ہائے یہ تم ہو شنو! ایک کام کے لیے دس' دس دفعہ کہنا پڑتا تھا۔ بار بار بھول جاتی تھیں۔"

شنو بس مسکرا کے رہ جاتی۔

"اے شنو! تمہارا میاں مجازی خدا ہے یا مزاجی خدا؟"

شنو بی بی پھر مسکرا کے رہ گئیں۔ ایک ہفتہ بس چٹکی بجاتے گزر گیا۔ پر شنو نے اپنی خوشی غمی کا ذرا بھید نہ دیا اور رخصت کے لیے تیار۔ دادی بار بار دیکھ رہی تھیں۔ شاید کمرے میں جا کے رسالے ڈھونڈ رہی ہو۔ کبھی اس کا تکیہ بہانے سے آگے پیچھے

کرتیں۔ شاید کوئی موٹا ناول یا رسالہ نیچے دھرا نظر آجائے۔ مگر بات ندارد۔

اس دفعہ عجیب بات یہ تھی کہ جاتے وقت وہ کئی دفعہ رو چکی تھی۔ چھپ چھپ کے دوپٹے سے آنسو پونچھتی۔ دادی کا منا سا دل بھی دکھی ہو گیا۔ وہ بھی خوب روئیں۔ یہ تو ننھی جانتی تھی کہ رونے سے شنو کے دل کا غبار کیسے دھل گیا ہے۔

☼ ☼ ☼

دادی بیمار تو موسمی نزلے زکام سے ہوئی تھیں۔ مگر یہی نزلہ زکام بگڑا تو بوڑھی ہڈیوں کے جان کا روگ بن گیا۔ ہر وقت کی کھوں کھوں' بخار' سر درد نے ایسا بے چین کیا کہ بچوں کی طرح ایک ہی رٹ "شنو کو ایک دفعہ بلا دو۔ جی بھر کے باتیں کرنا چاہتی ہوں۔" شنو کا ایک ہی رٹا رٹایا جواب۔ "اللہ آپ کو صحت یاب کرے۔ ابھی تو میں مل کے گئی ہوں۔"

دادی نے تمام منت ترلے کر کے دیکھ لیے اور خود ہی لوٹ پوٹ کے ٹھیک ہو گئیں۔

☼ ☼ ☼

پڑوس میں مجید صاحب کے ہاں فوتگی ہو گئی تھی۔ دادی بھی تعزیت کے لیے گئیں۔ گو کہ آنا جانا محلے میں کم کم ہی تھا۔ لیکن دکھ سکھ میں جی جان سے حاضر ہوتیں۔ روتی بلکتی خواتین کو صبر کی تلقین کر کے مجید صاحب کی والدہ مرحومہ کی خوبیاں بیان کرنے لگیں۔ اب ماحول بن گیا تھا۔ مجید صاحب کی بہنیں جو رو' رو کے ہلکان ہو چکی تھیں۔ ہمہ تن گوش ہو گئی تھیں۔ دادی نے مجید صاحب کی بہن کے سر پر ہاتھ رکھا اور پیار دلار سے بولیں۔

"میری چندا! جانے والی تو چلی گئی کیا رونے دھونے سے وہ واپس آ جائیں گی۔ اگر وہ رونے سے واپس آ جاتیں تو ہم سب مل کر روتے' لیکن ہمیں تو حقیقت کو تسلیم کرنا ہے۔ صبر کرنا ہے اور ان کے حق میں گواہیاں دینا ہے۔"

"گواہیاں؟" سبھی خواتین اچنبھے میں پڑ گئیں۔

"جی! کہا جاتا ہے کہ مرنے والا ملزم کی حیثیت سے دنیا سے جاتا ہے۔ پس اس کی گواہیاں ہی ہیں جو اسے ملزم سے مجرم بناتی ہیں یا بری کرواتی ہیں۔ بس تم سب اپنی والدہ کی خوبیاں بیان کرو' تاکہ اللہ کے ہاں فرشتے ان گواہیوں کو پیش کریں۔"

خواتین کا منہ حیرت سے کھلا تھا۔ یہ تو کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ رونے دھونے سے ہی فرصت نہ ملتی تھی۔ اب گفتگو کا موضوع بدلا۔ سب والدہ مرحومہ کی سخاوت اور نیک دلی کی گواہ بن گئی تھیں۔ جب ایک مدبر سی خاتون نے دادی سے ہاتھ ملایا۔

"آپ نے بہت اچھی طرح سے صبر کا مفہوم سمجھایا۔ اللہ آپ کا بھلا کرے۔ آپ کا تعارف مانگ سکتی ہوں؟"

"تعارف تو بس اوپر والی ذات کا ہے۔ کیا میں اور کیا میرا تعارف۔" دادی نے عاجزی سے کہا۔

"پھر بھی بندوں میں نام پہچان تو ضروری ہے نا۔" خاتون مصر ہوئیں۔

"نام تو میرا حلیمہ بیگم ہے۔ اپنا نام کسی کے منہ سے سنے سالوں بیت گئے۔ اب تو ہر چھوٹے بڑے کی دادی ہوں۔"

"دادی؟" خاتون حیرانی سے گویا ہوئیں۔

"اصل میں میری بہو جوانی میں چل بسی۔ اس کی دونوں بیٹیوں کو پالا پوسا۔ ان کے منہ سے نکلا دادی محلے بھر میں پہچان بن گیا میری۔" دادی نے تفصیلی جواب دیا۔

"ارے نبیلہ۔ یہ شنو کی دادی ہے۔ وہ جو تمہاری بہو کے پڑوس میں رہتی ہے بہلول پور میں۔"

خاتون کے چہرے پر ایک دم ہوائیاں اڑنے لگیں۔ وہ ہکلا کر بولیں۔ "شن۔۔۔ نو۔۔۔ وہ نعمان اکبر کی بیوی۔"

ان کا کچھ ایسا انداز تھا کہ قریب بیٹھی سب ہی خواتین متوجہ ہو گئیں۔

"کیوں۔۔۔ تمہیں معلوم ہے میری شنو کے سسرال کا؟" دادی نے پوچھا۔

"ظلم... ارے وہ تو بڑا ہی ظالم بندہ ہے۔ آپ کو پہلے پتا نہ تھا؟" انہوں نے تیر چلایا جو سیدھا دادی کے دل پر لگا۔ دادی تڑپ کر بولیں۔

"لے ایسی بھی کیا بات ہے، جو تمہیں پتا ہے اور مجھے نہیں پتا۔"

وہ خاتون آہستہ آہستہ بولنا شروع ہوئیں۔ "کب میت کو نہلایا، کب کفنایا" دونوں کو ہوش نہ تھی۔

"وہ اپنی بیوی کو مارتا ہے۔ وہ بہت بد دماغ ہے۔ حد درجہ جھگڑالو ہے۔ کنجوس ہے۔"

ان انکشافات نے دادی کو ادھ موا کر دیا۔ گھر آئیں تو چارپائی پر ایسی گریں کہ مہینہ بھر اٹھنے کا نام نہ لیا۔ لیٹی لیٹی ٹھنڈی آہیں بھرتی رہیں۔

سب سے الگ تھلگ ہو گئیں تو بس پھپک پھپک کر رو پڑتیں۔ مہینے میں ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئیں۔

کبھی سارا دن بھاگ بھاگ کر کام کرتی۔ رات بھر دادی کے سرہانے بیٹھی رہتی۔ لیکن لگتا یہی تھا دادی کا سفر مکمل ہو چکا ہے۔ مہلت عمل ختم ہو چکی ہے۔ اللہ ہی جانے انہوں نے کن لفظوں میں شنو اور اس کے میاں سے بات کی کہ اگلے دن دونوں حاضر تھے۔

شنو کے میاں نعمان نے ہاتھ پھروانے کے لیے سر آگے کیا۔ دادی نے ہاتھ پھیرا اور منہ پیچھے کر لیا۔ وہ دن رہ کے نعمان تو واپس چلا گیا۔ شنو اصرار کر کے رک گئی۔ جوں ہی شنو کو اس کے میاں کا فون آیا کہ کوچ چل پڑی ہے۔ دادی اچھل کر بیٹھیں۔

"دادی! آپ کو کیا ہوا؟" شنو ہنسی۔

"چل میری بٹیا! پہلے کمرے کا دروازہ بند کر۔ چٹخنی چڑھا۔ میرے پاس آ کر بیٹھ اور جو پوچھوں سچ سچ بتانا۔" انہوں نے پراسرار لہجے میں کہا۔

"دادی! میں نے کبھی غلط بیانی نہیں کی۔" شنو نے ان کے سارے احکامات کی تعمیل کر کے جواب دیا۔

"نعمان کیسا شوہر ہے؟ مجھے معاف کر دے میری بچی! مجھے پتا نہیں تھا۔" اور ساتھ ہی انہوں نے تو دھواں دھار رونا شروع کر دیا۔

"کیا بات ہے؟ آپ سے نعمان نے کچھ کہا؟" اس نے پوچھا۔

"تمہیں نے اس سے کیا پوچھنا ہے، تم بتاؤ۔ تم نے اس کے ظلم کیوں چپ چاپ سہے؟ مجھے کیوں نہ بتایا؟"

شنو خاموش بیٹھی رہی۔ رو رو کر دادی ہلکان ہو گئیں۔ "میری پھول سی بچی پر اس نے اتنا جبر کیا۔ تو نے خبر ہی نہ دی۔ تو تو چیونٹی کاٹنے پر آسمان سر پر اٹھا لیتی تھی۔ کسی کی چھوٹی سی بات پر ہفتوں اینٹھی رہتی تھی۔ تجھے کس نے اتنا صبر دیا؟ کس سے دکھ سکھ کرتی تھی؟"

شنو کی آنکھوں میں جھلمل کرتا پانی چمکنے لگا۔

"اپنے اللہ سے۔ دادی یہ صبر، یہ حوصلہ، یہ گھر داری سب کچھ مجھے اسی ذات نے تو بخشا ہے اور دادی اللہ سے میرا رشتہ ان کتابوں اور رسالوں نے پکا کیا۔ جب بھی مجھے انہونی سہنا پڑتی، جب میں آتش کی بھٹی میں تپنے لگتی، دکھ کے بھاجھڑ مجھے کو تنکا بنانے لگتے میرے سامنے کسی کتاب کا کوئی فقرہ یا کسی ناول کا کوئی کردار آجاتا۔ کسی افسانے کی بنت، تانے بانے بنا کر مجھے قابو کر لیتی اور..." شنو کی آواز کانپنے لگی۔ دادی نے اپنے دوپٹے سے آنسو پونچھے اور بولیں۔

"تو نے ہمیں نہ بتایا؟"

"اس لیے کہ دو مختلف مزاج ملتے ہیں تو اونچ نیچ ہو ہی جاتی ہے۔ میں نے ایک ناول میں پڑھا تھا، جب آپ کسی دکھ سے نجات حاصل کرنے کا فیصلہ کریں تو ایک سادہ کاغذ پر لکیر کھینچ لیں۔ لکیر کے ایک جانب وہ مسائل اور مشکلات تحریر کریں جو فی زمانہ چل رہی ہیں اور لکیر کے دوسری جانب وہ مشکلات اور مسائل تحریر کریں جو فیصلہ کر لینے کے بعد ہوں گے۔ صحیح فیصلہ کرنا آپ کے لیے آسان ہو جائے گا۔ دادی! اسی طرح میں نے بھی کیا۔ لکیر کے ایک جانب صرف میرے دکھ اور مسائل تھے۔ لکیر کے دوسری جانب ان دکھوں کا شکار ابا، آپ اور ننھی تھے۔ آپ بتائیں پھر میں کیا کرتی؟"

دادی حیران پریشان اس کی بات سن رہی تھیں۔

"پھر یہ ہوا کہ میں نے اللہ کی کتاب قرآن شریف

پڑھا۔ 'اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔' میں نے اللہ کا ساتھ محسوس کرنے کے لیے صبر کرنا شروع کر دیا اور ویسے بھی۔" وہ بات کرتے کرتے مسکرائی۔

"آسیہ رزاقی کی تحریروں میں ہیروئن کو ہر طرح کے حالات میں صبر کرنا ہی تو سکھایا جاتا ہے۔ سو میں نے اپنے آپ کو آسیہ رزاقی کی ہیروئن تصور کرتے ہوئے جینا سیکھ لیا اور دادی! حالات تبدیل ہونا شروع ہوئے۔ اگر کبھی طعنے یا بد زبانی پر دل دکھتا تو میاں، بیوی کے حقوق پر لکھی گئی کتاب میں، میں نے پڑھا تھا کہ اگر سسرال بری ہے، خاوند اچھا ہے تو سسرال کی برائی کو زکوۃ سمجھ کر برداشت کر لو۔ میری تو کوئی ساس، نند ہی نہ تھی۔ شادی والے دن جب رسالوں کے کارٹن 'ادھر ہی' کہہ کر نعمان نے اندر بھجوا دیے تھے۔ تو ایک افسانے میں لکھی یہ بات مجھے فوراً یاد آ گئی کہ اگر عورت شادی کے ابتدائی دس سالوں میں مٹی بن جائے، کسی کو مارے، تو باقی زندگی سونا بن جاتی ہے اور اگر ابتدا ہی میں سونا بننے کی آرزو رکھے تو مٹی بن کے رل جاتی ہے۔ پھر دادی! میں نے عنیزہ سید کی تحریروں سے اپنے رب پر اتنا توکل حاصل کیا کہ کسی بھی پریشانی کی صورت میں ان کی تحریروں کے ان پڑھ دیہاتی کردار جو یقین کامل اور معرفت بلکہ ولایت کے درجے پر پہنچے ہوتے تھے۔ میرے سامنے آجاتے اور میرے لیے میرا دکھ حقیر بن جاتا۔ یہاں تک کہ جب چوتھے مہینے میں میرا ابارشن ہوا تو میں اپنے دکھ کو صبر سے برداشت کرتی رہی۔ لیکن پاتال میں گرنے سے بچ گئی۔"

"تیرا ابارشن کب ہوا؟" دادی تڑپ کر بولیں۔

"جب آپ بیمار ہوئی تھیں اور مجھے بار بار اپنے پاس بلا رہی تھیں۔" شنو نے کہا۔

انہوں نے شنو کو سینے سے لگایا۔ اسے بھینچ بھینچ کر پیار کیا اور بولیں۔

"میری شنو تو بہت اتنی سیانی ہو گئی؟"

"جب سے دادی! میں نے دنیا کا اصل چہرہ دیکھا۔ اس کی بدصورتی کا پتا چلا۔ اس کی چھپ کے پیچھے حقیقت میرے سامنے آئی اور یہ سب ان کتابوں اور رسالوں نے سکھایا جن سے آپ منع کرتی تھیں۔"

دادی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

شنو ہنسی۔ "دادی! میری پیاری دادی! میں نے ایک کتاب میں پڑھا تھا۔ 'بھلے خاوند کنجوس ہو، لڑاکا ہو، سنگ دل ہو، نظر اس کی خوبیوں پر رکھنی چاہیے۔' پوچھنے والی نے پوچھا۔ 'اگر خاوند میں کوئی صفت ہو ہی نہ پھر؟' تو کتاب کی مصنفہ نے بس ایک فقرہ لکھا کہ 'خاوند میں ہزار عیب اور برائیاں ہوں۔ وہ تمہاری عزت کا تو محافظ ہوتا ہے نا۔' دادی! مجھے برسوں پہلے کا پڑھا فقرہ جب یاد آیا تو میرا رواں رواں شکر گزار ہو گیا۔ میرا میاں مجھ سے زیادتی کرتا ہے تو معافی بھی مانگ لیتا ہے۔ میرا میاں بدزبانی کرتا ہے تو مجھے نان نفقہ تو دیتا ہے۔ گھر میں آئے تو مجھے سامنے دیکھنا پسند کرتا ہے۔ اللہ کا شکر ہے ان آٹھ مہینوں میں ان کا بدلتا ہوا انداز بھی واضح طور پر نظر آ رہا ہے۔ تو میں اللہ سے آنے والے دنوں میں اچھا گمان کیوں نہ رکھوں؟ بتائیں نا دادی! میں غلط کہہ رہی ہوں؟"

دادی نے بس ایک نظر اٹھائی۔

انہیں سوائے ٹائٹل کی عورت کی تصویر کے ان کتابوں، رسالوں میں کچھ نظر نہ آیا۔

اطمینان کی کیفیت سے بھرپور ایک لمبا سانس لے کر انہوں نے شنو کی چٹ پٹ بلائیں لے لیں۔

اگر شنو کی زندگی میں مطالعہ سے شعور نہ آتا تو آج معاملہ مختلف بھی ہو سکتا تھا۔

ناولٹ

راشدہ رفعت

"یہ معمولی سا تحفہ اس قابل تو نہیں کہ اس حسین مکھڑے کی نذر کیا جائے مگر فی الحال میری طرف سے یہ ہی قبول کیجیے۔" جگر جگر کرتی ڈائمنڈ کی انگوٹھی دلہن کی انگلی میں ڈال کر اس نے دلہن کا چہرہ ٹھوڑی سے پکڑ کر اوپر کیا۔

"تم۔" اگلے ہی پل دولہا حیرت اور صدمے کی زیادتی سے چیخ پڑا۔ دلہن نے استہزائیہ انداز میں آنکھیں گھما گھما کر اسے دیکھا اور اس سے پہلے وہ بھی کوئی ڈائیلاگ بولتی کمرشل بریک آگیا۔

"لو بھلا بتاؤ۔ اتنا ذرا سا سین اور پھر وقفہ۔" دادی جان جی بھر کر بدمزا ہوئی تھیں۔

"اور دیکھیں تو دادی جان! دلہن نے گھونگھٹ تک تو نکال نہیں رکھا تھا صرف سر جھکا کر بیٹھی تھی پھر بھی اس ڈفر کو پتا نہ چل سکا کہ یہ ستارہ نہیں بلکہ ... ہے۔" سارہ نے بھی اظہار خیال کیا۔

"تو اب گھونگھٹ کا فیشن ہی کہاں رہا ہے اب دلہنیں بھی گھونگھٹ نکالنے کی روادار نہیں۔ ایک ہمارا زمانہ تھا۔ شادی شدہ عورتیں سسرال میں سارا دن گھونگھٹ نکالے پھرتی تھیں جیٹھ دیور کے سامنے بے پردہ تھوڑی پھرا کرتے تھے۔"

"گھر کی ساری عورتیں گھونگھٹ نکالتی تھیں" سارہ نے حیرت سے استفسار کیا۔

"اور نہیں تو کیا۔ تین میری جیٹھانیاں تھیں دیورانیاں سب کے لیے ایک ہی اصول اور قاعدہ تھا۔" جہاں آرا بیگم تصور کی آنکھ سے پچھلا وقت ذہن میں لاتے ہوئے بولی تھیں۔

"تو دادی جان! پھر جو دادا لوگ تھے وہ اپنی اپنی بیوی کو پہچانتے کیسے تھے؟ آئی مین "آپ سب دیورانیاں جیٹھانیاں تو پردے میں رہتی تھیں۔" سارہ نے بڑے اشتیاق سے دریافت کیا۔

"تو انہوں نے پہچان کر کرنا بھی کیا تھا بھئی! بہنوں کے سامنے بیوی کو مخاطب کرنا انتہائی معیوب بات تصور کی جاتی تھی۔" وہ بے حد اطمینان سے بولیں۔

"امیزنگ دادی جان! یعنی میاں بیوی نے کوئی ضروری بات کرنی ہو تو رات کا انتظار کرنا پڑتا تھا؟"

اس نے تو سادگی سے پوچھا تھا مگر پاس بیٹھی رفیعہ بیٹی کے "بھولپن" پر جز بز ہو کر رہ گئیں۔ اپنی ساس سے ان کے مثالی تعلقات سہی لیکن ان کا اس بات پر ان سے سخت نظریاتی اختلاف تھا۔ ایک طرف وہ بار بار اپنے زمانے کا حوالہ دیتی تھیں پرانی روایات "اقدار" شرم و حیا وغیرہ کے قصے سناتے نہ تھکتیں اور دوسری طرف پوتی کے ساتھ بیٹھ کر ٹی وی کے انتہائی بے سروپا ڈرامے بہت شوق سے بیٹھ کر دیکھتیں بلکہ دونوں دادی پوتی ڈراموں پر سیر حاصل تبصرہ فرماتے ہوئے بات کو کہیں سے کہیں لے جاتیں۔

آج کل رمضان المبارک کی وجہ سے افطاری کے بعد ٹی وی لاؤنج میں محفل نہ جمتی تھی بلکہ نماز مغرب کے بعد سارہ کچن سمیٹتی اور عشاء کی اذان ہوتے ہی گھر کی تینوں خواتین کا نماز اور تراویح کے بعد تو بس بستر پر پڑنے کا ہی دل کرتا۔ ہاں چونکہ صبح کا وقت فراغت کا ہوتا تھا سو دونوں دادی پوتی نشر مکرر میں اپنی پسند کے ڈرامے اطمینان سے بیٹھ کر دیکھتیں۔ رفیعہ کو ان بے سروپا ڈراموں سے کوئی سروکار نہ تھا البتہ ساس کی وجہ سے وہ بیٹی کو زیادہ نہ ٹوکتی تھیں۔ ہاں کبھی کبھار ان کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو جاتا جیسا اس وقت ہوا تھا۔

"اٹھو سارہ! سنتی نہیں ہو گیٹ پر بیل ہو رہی ہے۔ جاؤ جا کر دیکھو۔" انہوں نے اسے تقریباً "ڈپٹتے" ہوئے مخاطب کیا تھا۔

"اس ٹائم کون ہو گا؟ وہی لوفی شیطان بچے ہوں گے۔ روزوں میں بھی چین نہیں لینے دیتے۔" سارہ بڑبڑاتے ہوئے پاؤں میں سلیپر ڈال کر باہر نکلی۔ کچھ دن ہوئے پڑوس میں ایک نئی فیملی آ کر آباد ہوئی تھی جوائنٹ فیملی سسٹم تھا اور ہر عمر اور ہر سائز کے بے شمار شرارتی بچے۔ جن کا محبوب مشغلہ پڑوسیوں کی گھنٹی بجا کر بھاگ جانا تھا۔ محلے والے عاجز آ گئے تھے ان سے۔ ایک دو بار پکڑے گئے مگر ایسی معصوم شکل بنا کر "سوری" کرتے کہ آگے سے کوئی کچھ کہہ نہیں پاتا۔

لیکن آج سارہ نے سوچ لیا تھا کہ اگر ملزم موقع واردات پر پکڑا گیا تو وہ حشر نشر کر دے گی۔ دبے پاؤں چلتی وہ گیٹ کی طرف بڑھی اور اتنے میں ہی دوبارہ بیل ہوئی۔

"بچو جی! آج تو میں تمہارا قیمہ کروں گی۔" اس نے دھاڑ سے دروازہ کھولا تھا۔

"اگر آج افطاری میں آلو قیمہ بنانے کا پروگرام ہے تو بتاؤ۔ میں بازار سے لا دیتا ہوں۔ میرا کیا قصور کہ میرا قیمہ بنانے کا ارادہ باندھ رہی ہو۔" سعد مسکراتے ہوئے اندر آیا تھا۔

"مجھے کیا پتا تھا کہ تم ہو میں تو سمجھی تھی کہ پڑوس کے شرارتی بچے ہیں۔" وہ بنا شرمندہ ہوئے ہنستے ہوئے اس کے پیچھے ہو لی۔

"کون ہے سارہ؟" اتنے میں رفیعہ بھی لاؤنج سے باہر نکلی تھیں۔

"السلام علیکم چچی!" سعد نے انہیں سلام کیا۔

"وعلیکم السلام جیتے رہو۔" انہوں نے بہت خوش دلی سے جواب دیا۔ اپنے جیٹھ کا یہ بیٹا انہیں بہت عزیز تھا اور کیوں نہ ہوتا؟ اس سے ان کی اکلوتی لاڈلی کا نصیب جڑنا تھا۔ یہ فیصلہ دونوں کے بچپن میں ہی جہاں آرا بیگم نے کیا تھا اور فریقین اس پر راضی تھے۔ سارہ اور سعد بھی اس حقیقت سے واقف تھے مگر دونوں جانب سے نہ کبھی محبت کا اظہار ہوا تھا نہ ایک دوسرے کے لیے اپنے دلوں میں چھپی بے پناہ چاہت کا اقرار۔ بنا کچھ کہے سنے ہی دونوں ایک دوسرے کے دل کا حال جانتے تھے اور اپنے بڑوں کے کیے گئے فیصلے سے پوری طرح مطمئن اور شاداں۔

"تو سعد بیٹا! بہت دن بعد چکر لگایا۔" رفیعہ نے محبت سے پوچھا۔

"نہیں چچی جان! روزوں کی وجہ سے گھر سے ہی نہیں ہو پاتا بس گھر سے آفس اور آفس سے گھر۔" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

"ارے میرا بچہ آیا ہے۔" جہاں آرا بیگم کی آواز سن کر باہر نکلی تھیں۔ سعد نے انہیں

کے ان کے آگے سر جھکایا ہمیشہ کی طرح جہاں آرا بیگم نے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کر پیشانی کا بوسہ لیا تھا۔

"جتنی محبت آپ اس سعد سے کرتی ہیں۔ کبھی مجھ پر تو ایسا پیار نہیں آیا آپ کو۔" پیار کے اس اظہار پر سارہ کے لبوں سے بے ساختہ شکوہ بر آمد ہوا تھا۔

"تم ہمیشہ کی طرح جل گئیں۔ بھئی میں پہلا پہلا پوتا ہوں دادی جان کا۔ مجھ سے زیادہ پیار ہے انہیں۔" سعد نے مسکراتے ہوئے اسے چڑایا تھا۔

"ارے نہیں یہ بھی تو میری پہلی پہلی پوتی ہے۔ اس سے بھی کم پیار تو نہیں مجھے۔" جہاں آرا بیگم نے جھٹ اسے ساتھ چپٹایا۔

سارہ نے بڑی اتراتی ہوئی نگاہوں سے سعد کو دیکھا تو وہ ہنس دیا۔ رفیعہ بھی سارہ کے بچپنے پر مسکرا دیں۔

"اچھا دادی جان کی چہیتی! اب دادی کی جان چھوڑو میں بہت مشکل سے دو گھنٹے کا آف لے کر دادی جان کو لینے آیا ہوں۔"

"یہ فاؤل ہے سعد! جب یہ طے ہوا تھا کہ آدھا رمضان دادی جان ہماری طرف گزاریں گی اور باقی آدھا تمہاری طرف تو تم تیرہویں روزے کو ہی انہیں لینے کس طرح آ گئے؟"

"دو دن سے کیا فرق پڑتا ہے۔" وہ اطمینان سے بولا۔

"تمہیں فرق نہیں پڑتا ہو گا اتنے ڈھیر سارے لوگ ہیں تمہارے گھر مجھے تو دو دن کیا دو گھنٹوں سے بھی بہت فرق پڑتا ہے۔" وہ روہانسی ہوئی۔ کبھی کبھار اسے اپنے اکلوتے پن کا شدت سے احساس ہوتا تھا ایسے میں تو دادی جان اس کی گہری سہیلی نہ تھیں۔ کتنا ہی کہتا تھا اس کا ان کی وجہ سے مگر یہ سعد کا بچہ کبھی بھی دادی جان کو دس پندرہ دن سے زیادہ یہاں رہنے ہی نہ دیتا۔ دونوں کے درمیان لڑائی کی واحد وجہ یہ ہی بنتی تھی کہ دونوں جہاں آرا بیگم پر پورا پورا حق جتاتے تھے۔

"میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ دادی جان کا بیگ تیار کرو اور تم ہو کہ ان سے چمٹی کھڑی ہو۔ مجھے انہیں گھر چھوڑ کر واپس آفس بھی جانا ہے۔"

"دیکھو سعد! روزوں میں اگر دادی جان۔۔۔" اس نے اس بار لجاجت سے کچھ کہنا چاہا تھا مگر سعد نے اس کی ادھوری بات سمجھتے ہوئے نفی میں گردن ہلا دی۔

"دادی جان دونوں گھروں کے لیے باعث رحمت ہیں سارہ! اور تم رمضان کے اس بابرکت مہینے میں اس رحمت پر قبضہ جمائے رکھنا چاہتی ہو۔ ارے تھوڑے سے دنوں کی تو بات ہے میں عید کے بعد انہیں خود چھوڑ جاؤں گا وعدہ۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ عید دادی جان تمہاری طرف گزاریں گی یہ کب طے ہوا تھا؟" حسب توقع سارہ چیخ ہی تو پڑی۔

"اچھا بابا یوں کھڑے کھڑے جھگڑا بند کرو اور اندر بیٹھ کر آرام سے طے کر لو کہ میں نے عید کہاں گزارنی ہے۔ میں اپنے چار جوڑے خود ہی بیگ میں ڈال لیتی ہوں۔" جہاں آرا بیگم مسکراتے ہوئے بولی تھیں۔ وہ دونوں لاؤنج میں جا بیٹھے۔ رفیعہ کو اچانک یاد آیا تھا۔

"ابھی رکنا سعد! میں نے چنے کی دال کا حلوہ بنایا ہے بھائی صاحب کو بہت پسند ہے۔ سحر اور افطار میں تھوڑا بہت میٹھا ضرور لیتے ہیں میں تمہیں ڈونگے میں نکال کر لا دیتی ہوں۔"

"آپ کے ہاتھ کا حلوہ تو ہم سب ہی بہت شوق سے کھاتے ہیں چچی جان! سحری کے لیے تو کچھ بچے گا بھی نہیں آج افطاری میں ہی چٹ ہو جائے گا۔"

"اس کے کہنے کا مطلب ہے امی کہ بڑے والے ڈونگے میں خوب سارا حلوہ ڈال کر دیجیے گا۔" سارہ نے اسے ہنس کر چھیڑا۔

"کتنا صحیح اندازہ لگایا تم نے لڑکی۔" وہ سعد تھا۔ مجال ہے جو شرمندہ ہو جاتا۔

رفیعہ مسکراتے ہوئے باہر نکل گئیں۔ اب کمرے میں صرف وہ دونوں رہ گئے تھے۔ دونوں کے مابین چند لمحوں کے لیے بے نام سی خاموشی چھا گئی اور اکثر ایسا ہی ہوتا تھا کہ سب کے سامنے ایک دوسرے سے

خوب چونچیں لڑانے والے جب تنہا ہوتے تو سوجھتا ہی نہ تھا کہ ایک دوسرے سے کیا کہیں۔

"اور سناؤ۔ کیسے روزے گزر رہے ہیں؟" آخر سارہ نے ہی اس کی سمت دیکھتے ہوئے بات کا آغاز کیا اور اس کا چہرہ دیکھ کر اسے کچھ عجیب سا احساس ہوا ذرا دیر پہلے کے برعکس کچھ بجھا بجھا اور مضمحل سا چہرہ۔

"گھر میں سب کیسے ہیں تایا ابو' تائی اماں' حسیب' انعم؟" اس نے گھر والوں کی خیریت جاننا چاہی۔ لیے پہلے سوال کی طرح اس سوال کا بھی جواب نہ ملا وہ چپ چاپ اسے تکے جا رہا تھا' جانے کس دھیان میں تھا وہ۔

"کیا بات ہے سعد! چپ کا روزہ بھی رکھ لیا ہے کیا۔" وہ جھنجلا ہی تو گئی۔ وہ جیسے یکدم چونکا تھا۔

"ہاں سب ٹھیک ہیں۔"

"کیا بات ہے تم اتنے تھکے تھکے کیوں لگ رہے ہو۔ کیا روزہ لگ رہا ہے۔" وہ گویا جرح پر اتر آئی۔ اس سے سعد کا یہ موڈ ہضم نہ ہو رہا تھا۔

"گرمیوں کے روزے ہیں۔ لگتے تو ہیں یار۔" سعد نے اس بار مسکرانے کی کوشش کی۔

"بہر حال روزہ لگنے سے بندہ اتنا پریشان حال نہیں لگتا جیسے اس وقت تم لگ رہے ہو۔"

"کوئی پرابلم ہے سعد؟" وہ پریشان ہوئی۔ سعد نے ایک گہرا سانس لے کر اسے دیکھا۔ کیا تھی یہ لڑکی اپنی دانست میں وہ اس سے بالکل نارمل انداز میں ملا تھا پہلے کی طرح چھیڑ چھاڑ' ہنسی مذاق مگر پھر بھی جانے کیسے وہ اس کے دل کا حال پا گئی تھی۔

"کوئی پرابلم نہیں ہے لڑکی! تم جلدی سے جاؤ دادی جان کی پیکنگ مکمل کرواؤ۔ دادی جان کو گھر چھوڑ کر مجھے فوراً آفس پہنچنا ہے۔ بہت امپورٹنٹ میٹنگ ہے اور چچی جان سے کہو کہ جلدی سے حلوہ ڈونگے میں ڈال دیں۔"

اس نے کلائی کی گھڑی پر نگاہ جماتے ہوئے کسی قدر افراتفری مچانا چاہی اور اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی ہو گیا۔ سارہ سرہلاتے ہوئے فوراً باہر نکلی تھی۔ سعد نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موندلی تھیں وہ اس پاگل لڑکی کو کیسے بتاتا کہ وہ کس قدر سے پریشان ہے۔ جہاں آرا بیگم اپنے چھوٹے سے بیگ میں اپنی ضرورت کی تمام اشیا رکھ کر جانے کے لیے تیار تھیں۔ سعد رفیعہ سے مل کر ان کا بیگ اٹھائے جانے کو آگے بڑھا۔ سارہ کے پاس سے گزرا' سرگوشی کے سے انداز میں بولا۔

"میرے اور اپنے لیے اچھی اچھی دعائیں کرنا۔" سارہ نے گردن تو ہلادی مگر وہ اس کی بات کا مفہوم نہ پائی۔ اس کی چھٹی حس کچھ انہونی کا احساس دلا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

اس بار اپنے بڑے بیٹے وجیہہ الحسن کے گھر جا کر جہاں آرا بیگم کو کچھ غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔ ان دونوں بہوؤں سے ان کے مثالی تعلقات تھے وہ خدا کا شکر ادا کرتے نہ تھکتی تھیں جس نے انہیں قدسیہ اور رفیعہ جیسی سمجھ دار بہوؤں سے نوازا تھا۔ دونوں بہوؤں نے بچوں کی تربیت بہترین انداز میں کی تھی۔ دونوں گھرانوں کے آپس میں مثالی تعلقات تھے۔ اپنی سہولت کے مطابق رہائش الگ الگ تھی۔ مگر دل جڑے ہوئے تھے۔

جہاں آرا بیگم کچھ دن بڑے بیٹے کے ہاں گزارتیں تو کچھ دن چھوٹے کے ہاں' وہ جہاں بھی جاتیں ان کی آمد پر اتنی خوشی کا اظہار کیا جاتا جیسے وہ چند دنوں بعد نہیں بلکہ چند مہینوں بعد آئی ہوں۔

ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر وہ ستانے کے لیے لیٹیں تو ان کی چھوٹی پوتی انعم ان کے پاس آگئی۔ اس کا چہرہ رویا رویا سا ہو رہا تھا۔

"سعد بھائی نے آپ کو کچھ بتایا دادی جان؟" وہ ان کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔ جہاں آرا بیگم نے ناسمجھی سے پوتی کو دیکھا پھر نفی میں گردن ہلا دی۔

"کچھ کیجیے دادی جان! سب کچھ گڑبڑ ہونے والا ہے۔ امی کو سمجھائیے۔" وہ ان کے ہاتھ تھامے رو ہی تو پڑی۔

"انعم بچے! کھل کر بات کرو۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔" جہاں آرا بیگم واقعتاً" پریشان ہو گئی تھیں۔

"امی! سعد بھائی کی بات علیزے سے طے کرنے جا رہی ہیں۔" اس نے گویا ان کے حواسوں پر بم گرایا۔

"علیزے۔۔" جہاں آرا بیگم نے حیرت سے پوتی کو دیکھا۔

"جی ہاں' آفاق ماموں کی علیزے۔" اس نے اپنے مرحوم ماموں کا نام لیا۔ جہاں آرا بیگم نے بے یقینی سے پوتی کو دیکھا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"یہ ہونے جا رہا ہے دادی جان! صرف آپ ہی ہیں جو امی کو اس جذباتی فیصلے سے روک سکتی ہیں۔ امی کہتی ہیں کہ یہ ماموں مرحوم کی آخری خواہش تھی۔ امی اپنے مرحوم بھائی کی آخری خواہش کا تو احترام کر رہی ہیں لیکن زندہ لوگوں کی خواہشوں اور خوابوں سے آنکھیں چرا رہی ہیں۔ آپ خود بتائیں دادی جان! سعد بھائی کیا سارہ آپی کے علاوہ کسی اور کے ساتھ زندگی گزارنے کا تصور بھی کر سکتے ہیں؟ اور ایک سعد بھائی ہی کیا ہم سب نے بھی جب کبھی سعد بھائی کے ساتھ کسی کا تصور کیا تو وہ سارہ آپی ہی تھیں بے شک دونوں کی باقاعدہ منگنی نہیں ہوئی لیکن بچپن سے ہم سب کے ذہنوں میں یہ ہی بات ڈالی گئی کہ سارہ آپی کو ہی ہمارے گھر آنا ہے اور علیزے بے شک وہ بھی بہت اچھی ہے لیکن سعد بھائی اور اس کا ایج ڈیفرنس تو دیکھیے سعد بھائی تو اسے بالکل چھوٹی بہنوں کی طرح ٹریٹ کرتے ہیں اور وہ تو۔۔"

"گھر میں کس کس کو یہ بات معلوم ہے؟" جہاں آرا بیگم نے اس کی بات کاٹتے ہوئے ٹھہرے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"سب کو ہی پتا ہے۔ چار دن پہلے امی نے یہ ذکر چھیڑا' تب ہی سے گھر میں بے تحاشا ٹینشن کی فضا ہے نہ کسی کو سکون کی نیند آتی ہے نہ سحری اور افطاری کے وقت کچھ کھانے کو جی چاہتا ہے۔" انعم دل گرفتہ ہو کر بولی۔

"تو کیوں پریشان ہو رہی ہے۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" جہاں آرا بیگم نے اپنی پریشانی چھپاتے ہوئے اسے دلاسا دیا۔

"سچ کہہ رہی ہیں نا آپ دادی جان! سب ٹھیک ہو جائے گا نا؟" انعم نے بہت آس سے پوچھا۔ انہوں نے بدقت مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ انعم مطمئن ہو کر چلی گئی وہ گہری سوچ میں ڈوب گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

افطاری پر معمول کا اہتمام ہوتے ہوئے بھی وہ پرانی والی رونق نہ تھی سب خاموشی سے دسترخوان پر بیٹھے سائرن بجنے کا انتظار کر رہے تھے۔

"اب سعد کو بھی بلا لاؤ۔ آفس سے آکر کہیں سو تو نہیں گیا۔" وجیہہ الحسن صاحب نے بیٹے کی غیر موجودگی کو محسوس کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

"سعد بھائی ابھی آفس سے آئے ہی کہاں ہیں ابو!" انعم نے نرم سے لہجے میں جواب دیا۔

"کیوں خیریت؟" انہوں نے پوچھا۔

"ابھی فون آیا تھا۔ کہہ رہا تھا کام زیادہ ہے' وہیں افطار کرے گا۔" اس بار قدسیہ بیگم نے جواب دیا تھا۔

وجیہہ الحسن صاحب نے تیکھی نگاہ بیوی کے چہرے پر ڈالی مگر کچھ بولنے سے گریز کیا۔ جہاں آرا بیگم ماحول کا بوجھل پن شدت سے محسوس کر رہی تھیں۔

رات جب وہ نماز عشاء اور تراویح ادا کر فارغ ہوئیں تب سعد دستک دے کر کمرے میں داخل ہوا۔ تھکا تھکا نڈھال سا۔ ان کے دل کو کچھ ہوا۔

"نماز پڑھ لی آپ نے؟" سعد نے پوچھا۔

"پڑھ لی بیٹا! لیکن تو اتنی دیر سے کہاں تھا۔ ایسا بھی کیا آفس کا کام کہ صبح کا گیا بندہ رات کو لوٹے۔" وہ بیڈ پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھیں۔ سعد کوئی جواب دیے بنا نیچے کارپٹ پر بیٹھ گیا اور ان کے گھٹنوں پر اپنا سر رکھ لیا۔

"کیا بات ہے میرے بچے! کیوں اتنا پریشان ہے۔"

انہوں نے پیار سے اس کے بال سنوارے۔

"آپ لوگوں نے ہمارے ساتھ بہت زیادتی کی دادی جان۔" کچھ دیر بعد اس نے دھیمے لہجے میں شکوہ کیا تھا۔

"کیسی زیادتی؟" جہاں آرا بیگم سمجھ نہ پائی تھیں۔

"بچوں کے رشتے کم عمری میں طے نہیں کرنے چاہئیں بچپن سے یہ بات ہمارے کانوں میں پڑی تو دل بھی اسی راہ پر چل پڑا۔ لیکن اب اندازہ ہو رہا ہے کہ کتنا کمزور رشتہ باندھا آپ لوگوں نے' یا پھر ہمیں ایک دوسرے کا ایسا پابند کر دیا ہوتا کہ کوئی اس بندھن کو توڑنے کا سوچ بھی نہ سکتا۔ ورنہ یہ بات ہمارے بڑے ہونے تک اپنے سینوں میں ہی دبی رہنے دیتے۔" وہ شکووں کی پٹاری کھولے بیٹھا تھا' جہاں آرا بیگم اسے ٹوک بھی نہ سکیں کہ اس کی کوئی بات غلط نہ تھی۔

"میں سارہ کے بغیر نہیں رہ سکتا دادی جان!" چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے بڑی بے بسی سے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

"تو میری سارہ کب رہ سکتی ہے تیرے بغیر۔" ان کی جھلملاتی آنکھیں مسکرائی تھیں۔

"تو بالکل فکر نہ کر' میں بات کروں گی تیری ماں سے۔ وہ یہ فیصلہ تنہا کرنے والی کون ہوتی ہے۔ میں زندہ ہوں ابھی اور شادی بیاہ کوئی بچوں کا کھیل تھوڑی ہے۔ زور زبردستی سے زندگی بھر کے بندھن کب باندھے جاتے ہیں۔ مجھے تو سمجھ نہیں آرہا کہ بیٹھے بٹھائے قدسیہ کے ذہن میں کیا بات سمائی کہ گھر بھر کو یوں پریشان کر ڈالا۔" زندگی میں پہلی بار انہیں بڑی بہو پر غصہ آیا تھا۔

"امی جانے اتنی کٹھور کیسے ہو گئی ہیں۔ آفاق ماموں نے ان سے آخری سانسوں میں یہ بات کی تھی اور وہ ان کی آخری خواہش پوری کرنا چاہتی ہیں حالانکہ میں جانتا ہوں کہ انہوں نے ہمیشہ میرے حوالے سے سارہ کا ہی تصور کیا ہے۔ میں نے ہمیشہ سارہ کے لیے ان کی آنکھوں میں بے تحاشا محبت محسوس کی ہے۔ لیکن جانے کیوں اب۔۔۔" سعد نے بے بسی سے بات ادھوری چھوڑی۔

"میں نے کہا نا سعد! میں سمجھاؤں گی قدسیہ کو اور بچی کیا بھلا نام ہے اس کا۔" انہوں نے ذہن پر زور دیا۔

"علیزے۔" سعد نے ہولے سے اپنی ماموں زاد کا نام لیا۔

"ہاں تو اتنی پیاری بچی کو کوئی رشتوں کا کال تھوڑی ہو گا پھر ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔"

"یہ ہی بات تو میں امی کو سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ علیزے اتنی چھوٹی ہے مجھ سے خدا گواہ ہے کہ میں نے جب بھی اس پر نگاہ ڈالی ہے تو چھوٹی بہن سمجھ کر پیار بھری نگاہ ہی ڈالی ہے۔ وہ میرے لیے ردا جیسی ہے اگر سارہ درمیان میں نہ ہوتی میں تب بھی علیزے سے شادی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔" وہ بہت پریشان تھا۔

"اچھا میرے بچے! تو ساری فکریں ذہن سے جھٹک دے اور اپنے کمرے میں جا کر سو جا۔ میں قدسیہ سے بات کروں گی۔ اس نے آج تک میری کوئی بات نہیں ٹالی اور یہ معاملہ تو ایسا ہے کہ اس سے میرے دونوں بیٹوں کا گھر متاثر ہونے کا خدشہ ہے اور پھر میری سارہ تو جیتے جی مر جائے گی۔" جہاں آرا بیگم کے کہنے پر سعد بھی اس کے تصور میں کھو گیا۔

"چل شاباش جا کر سو جا۔ پھر صبح سحری کے لیے بھی اٹھنا ہے۔" انہوں نے اسے پچکارا وہ سر ہلاتے ہوئے اٹھ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اور اگلے دن جب سب اپنے اپنے کام پر روانہ ہو گئے تو جہاں آرا بیگم نے بہو سے بات کرنے کی ٹھانی۔ قدسیہ ماسی کو صفائی کی ہدایات دے کر ساس کے پاس آ بیٹھیں۔ جہاں آرا بیگم بظاہر اخبار پڑھنے میں مصروف تھیں۔ انہوں نے قدسیہ کو آتے دیکھا تو اخبار اور چشمہ ایک سائیڈ پر رکھ دیا۔

"آؤ بہو! میں نے تم سے ضروری بات کرنی تھی۔" انہوں نے سنجیدگی سے قدسیہ کو مخاطب کیا تو انہوں نے سر اٹھا کر ساس کو دیکھا۔ وہ کیا کہنے جا رہی تھیں' قدسیہ بخوبی جانتی تھیں۔

"میں بھی آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں اماں جان!" انہوں نے سر جھکا کر دھیمے لہجے میں بات کا آغاز کیا۔

"ہاں کہو پہلے تم کہو۔" جہاں آرا بیگم نے فراخ دلی سے کہا۔

"میری اپنی ماں میرے لڑکپن میں ہی اللہ کو پیاری ہو گئی تھیں۔ ماں کیا ہوتی ہے آپ نے مجھے احساس دلایا کہ ماں کی محبت اور شفقت کیا چیز ہوتی ہے۔ خدا گواہ ہے کہ میں نے آپ کو کبھی وجیہہ الحسن کی ماں نہیں سمجھا بلکہ ہمیشہ اپنی ماں سمجھا ہے۔" بے بسی سے بولی تھیں۔

"کیسی باتیں کرتی ہے قدسیہ! میں ہوں تیری ماں۔" جہاں آرا بیگم بھی جذباتی ہو گئیں۔

"اگر میری ماں ہیں تو اماں خدا کے لیے میری مجبوری سمجھیں۔ آپ کی بیٹی آپ کے آگے ہاتھ جوڑ رہی ہے مجھے معاف کر دیجیے۔" قدسیہ کے آنسو ان کے گالوں پر تواتر سے بہنے لگے۔

"یہ کیا کر رہی ہے قدسیہ!" جہاں آرا بیگم نے خفا ہوتے ہوئے ان کے بندھے ہاتھ کھولے تھے۔ قدسیہ اس وقت انہیں اپنے حواسوں میں نہ لگ رہی تھیں۔

"میرا ایک ہی بھائی تھا اماں! مجھ سے پورے تیرہ برس چھوٹا۔ ماں کے انتقال کے بعد میں نے اسے ماں کی طرح سنبھالا۔ وہ مجھے اپنے بچوں کی طرح ہی عزیز تھا اور اس نے بھی اپنی زندگی کے ہر فیصلے کا اختیار مجھے سونپ رکھا تھا اسے کیا پہننا ہے۔ کون سے مضمون منتخب کرنے ہیں۔ کن لڑکوں سے دوستی کرنی ہے۔ مجھے اس سے کوئی بات دوسری بار کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی وہ سر جھکا کر میرا ہر فیصلہ' ہر بات مانتا چلا گیا۔ اس کے ساتھ کے لڑکے فارغ البالی کے مزے لوٹ رہے تھے مگر میں نے اس کی تعلیم مکمل ہونے کا بھی بمشکل انتظار کیا اور اسے شادی کے بندھن میں باندھ دیا۔ یہاں بھی اس نے میری پسند پر سر جھکا دیا۔

آپ کے سامنے کی تو بات ہے اماں! جب ہم سینہ کو آفاق کے سنگ رخصت کروا کر لائے تھے۔ بالکل کل کی بات لگتی ہے نا۔ میرا ماں جایا کتنی جان چھڑکتا تھا وہ مجھ پر' میرے بچوں پر اور سعد میں تو گویا اس کی جان تھی۔ زندگی کی آخری سانسوں میں اس نے اپنی بیٹی کے لیے مجھ سے میرے سعد کو مانگا تھا۔ وہ بہت فکر مند تھا علیزے کے لیے۔ اطمینان چاہ رہا تھا کہ اس کی لاڈلی کا مستقبل محفوظ ہو جائے۔ زندگی میں پہلی اور آخری بار میرا بھائی مجھ سے کچھ مانگ رہا تھا وہ آس بھری نگاہوں سے مجھے تک رہا تھا۔ ڈاکٹروں نے کہہ دیا تھا کہ اس کی مہلت ختم ہونے والی ہے لیکن میں اس کی تسلی کے لیے یقین دہانی کا ایک لفظ نہ بول پائی۔ میں نے کتنی سنگدلی' کتنی خود غرضی دکھائی نا اماں! مجھے اس وقت بھی اپنے بھائی کی آخری خواہش سے زیادہ اپنے بیٹے کے دل کی خوشی کا خیال رہا۔ میں جانتی ہوں اماں! سارہ میرے سعد کے لیے کیا حیثیت رکھتی ہے۔ میں نے خود بھی ہمیشہ سعد کے ساتھ سارہ کا ہی سوچا تھا لیکن میں کیا کروں' مجھے آفاق کی آخری نگاہیں نہیں بھول پاتیں۔ میں نے اس وقت تو خاموش رہ کر آس کی اس توڑ دی تھی لیکن اس کے جانے کے بعد مجھے ایک پل کا قرار نصیب نہیں ہوا۔

ایک سال لگا ہے اماں! مجھے فیصلے پر پہنچنے میں۔ میں نے جو ذہنی اذیت جھیلی ہے کوئی اس کا اندازہ ہی نہیں لگا سکتا۔ میں اس تمام عرصے میں دو کشتیوں کی سوار رہی ہوں۔ کبھی سارہ اور سعد کی خوشیوں کا خیال آتا تو کبھی اپنے بھائی کی آس بھری نگاہیں لیکن آخر کار میرے بچھڑے بھائی کی محبت میری ممتا پر غالب آ گئی۔ میں اپنے اندر اس کی آخری خواہش رد کرنے کا حوصلہ نہیں پائی۔ میں اپنے بچے کی خوشی قربان کرنے پر مجبور ہوں اماں۔"

قدسیہ زارو قطار رو رہی تھیں۔ جہاں آرا بیگم کا ہاتھ خود بخود ان کے سر پر ٹھہر گیا۔

"سارہ میں کس چیز کی کمی ہے اماں! اسے سعد سے

کہیں زیادہ اچھا رشتہ مل سکتا ہے۔ میں خود ڈھونڈوں گی اس کے لیے لڑکا۔ رقیہ اور شمس الحسن سے بھی ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ لوں گی۔ مجھے پتا ہے اماں کہ اس بات سے سب کو کتنا دھچکا لگے گا لیکن آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میرے سعد کے دل کو بھی قرار آہی جائے گا۔ علیزے اچھی بچی ہے' اس کا ذہن اسے قبول کرنے پر آمادہ ہو ہی جائے گا۔" قدسیہ نے بات مکمل کر کے جہاں آرا بیگم کو دیکھا جو چپ بیٹھی تھیں۔ وہ قدسیہ کی ذہنی اور جذباتی کیفیت سمجھ سکتی تھیں۔ انہیں سمجھانے کے لیے جہاں آرا بیگم کو اپنی سوچی گئی ساری دلیلیں بے کار لگنے لگی تھیں۔

"کچھ تو بولیں اماں! آپ مجھ سے خفا ہو گئی ہیں نا۔" قدسیہ نے اداسی سے انہیں دیکھا۔

"تم نے میرے بولنے کے لیے چھوڑا ہی کیا ہے بچی۔ جہاں آرا بیگم نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"بہرحال میں خفا نہیں ہوں تم سے' تمہاری مجبوری سمجھ سکتی ہوں لیکن تمہارے فیصلے کے جو اثرات مرتب ہوں گے ان سے نمٹنا بھی تو بڑی پریشانی کا باعث بنے گا۔" ان کے چہرے پر تفکر کے سائے چھانے لگے تھے۔

"آپ اگر میرا ساتھ دیں اماں تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" قدسیہ نے بہت آس سے انہیں دیکھا۔

"سچی بات تو یہ ہے قدسیہ! کہ ابھی میرے لیے اپنے دل کو سمجھانا بھی بڑا مرحلہ ہے۔ سعد اور سارہ دونوں میرے جگر کے ٹکڑے ہیں' کن کا دل ٹوٹے' یہ صدمہ میرا بوڑھا دل کیسے سہار پائے گا۔"

انہوں نے تھکے تھکے انداز میں خود کلامی کی۔ زندگی کی ڈھلتی چھاؤں میں یہ کیسا عجیب سا امتحان درپیش تھا۔

☆ ☆ ☆
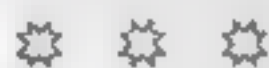
"تم اس وقت کہاں چل دیے بیٹا؟" جہاں آرا بیگم برآمدے میں بچھے تخت پر بیٹھی استغفار کی تسبیح پڑھنے میں مشغول تھیں جب انہوں نے کتابیں اٹھائے حسیب کو باہر کی جانب جاتے دیکھا۔

"دوست کی طرف جا رہا ہوں مل کر اسائنمنٹ [illegible] ہے دادی جان۔" حسیب نے جواب دیا۔

"اس وقت بیٹا! اب تو افطار کا ٹائم ہونے [illegible] ہے۔" جہاں آرا بیگم نے اسے نرمی سے مخاطب [illegible]

"اماں ٹھیک کہہ رہی ہیں' یہ کسی کے گھر [illegible] وقت ہے بھلا۔ افطار کے بعد چلے جانا۔" قدسیہ کچن سے ہاتھ پونچھتی باہر نکلی تھیں۔

"وہیں کر لوں گا۔" حسیب نے ان سے [illegible] ملائے بغیر خفا سے انداز میں جواب دیا تھا۔

"آج میں نے خاص تمہاری پسند کے [illegible] پکوڑے بنائے ہیں۔" قدسیہ نے اسے روکنا چاہا۔

"آپ کو اپنے بچوں کی پسند' ناپسند کا خیال [illegible] حیرت ہے امی!" حسیب نے روکھے انداز میں [illegible] قدسیہ کا چہرہ یک لخت سفید پڑ گیا تھا۔

"دیکھ رہی ہیں اماں! یہ میرے بچے ہیں؟ [illegible] ان کی ہر فرمائش' ہر خواہش بساط سے بڑھ کر پوری [illegible] ہے۔ زندگی میں پہلی بار ان کی خوشی پوری کرنا [illegible] بس سے باہر ہو گیا ہے تو اس بات کا قلق ان سے [illegible] مجھے ہے۔ اپنی ماں کی مشکل کوئی سمجھ ہی نہیں رہا۔ [illegible] سب مجھے سعد کی خوشیوں کی راہ میں رکاوٹ [illegible] رہے ہیں تو ٹھیک ہے میں ایک طرف ہٹ جاتی [illegible] میں اپنی اولاد پر ہر قسم کے حق سے دستبردار ہوتی [illegible]"

وہ روتے روتے حواس کھونے لگی تھیں۔

"امی!" انعم نے انہیں گرتے دیکھا تو چیخ مار کر [illegible] بڑھی۔ حسیب نے بھی کتابیں تخت پر پھینک [illegible] انہیں تھاما تھا۔ اتنے میں سعد بھی کمرے سے باہر [illegible] وہ ذرا دیر پہلے آفس سے لوٹا تھا اور کسی سے کوئی [illegible] کیے بنا محض سلام کر کے کمرے میں گھس گیا تھا۔ فوراً لپک کر ماں کے پاس آیا۔

"پانی لاؤ انعم۔" اس نے قدسیہ کے سرد پڑتے [illegible] اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے انعم کو مخاطب کیا۔ انعم [illegible] ہلاتے ہوئے مڑی لیکن پھر واپس پلٹی تھی۔

"امی کا تو روزہ ہے۔" اس نے گھبرا کر یاد دلایا۔

"قدسیہ! قدسیہ کیا ہوا بیٹی؟" جہاں آرا بیگم بھی ان کی متغیر حالت دیکھ کر بری طرح گھبرا گئی تھیں۔

"امی! میں آپ کا بیٹا ہوں' آپ مجھ پر ہر طرح کا حق رکھتی ہیں میری زندگی کے متعلق ہر فیصلے کا اختیار آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ کا کیا گیا ہر فیصلہ مجھے جی جان سے قبول ہے۔" سعد نے ماں کے ہاتھ بے اختیار لبوں سے لگا لیے تھے۔ جہاں آرا بیگم کی آنکھیں بھی ڈبڈبا گئی تھیں۔

"امی پلیز' کچھ تو بولیں۔ آپ ٹھیک ہیں نا؟" انعم نے بے قراری سے پوچھا۔ انہوں نے بدقت سرہلایا۔ آنکھوں میں نمی لیے وہ صرف اپنے اردگرد کھڑے اپنے بچوں کو دیکھ رہی تھیں۔

"مجھے معاف کر دینا سعد۔" بہت جتن کر کے ان کی زبان سے لفظ ادا ہوئے تھے۔

"کیسی باتیں کرتی ہیں امی آپ۔" سعد نے تڑپ کر انہیں گلے سے لگا لیا تھا۔

"تمہارے ماموں کے آخری لمحات کا مجھ پر قرض ہے بیٹا! میں اس کی آس بھری نگاہیں بھلا نہیں پائی۔ اپنی ماں کی مجبوری سمجھ کر معاف کر دینا اسے۔"

"آپ ہرگز ٹینشن نہ لیں امی! میں نے کہہ تو دیا کہ مجھے آپ کا ہر فیصلہ قبول ہے۔" سعد نے دل کی آواز کو سختی سے دباتے ہوئے ماں کو تسلی دی تھی۔

"بس اب بچے نے کہہ تو دیا۔ ہمت پکڑو' دیکھ نہیں رہیں سارے بچے کیسے پریشان ہو گئے ہیں۔" جہاں آرا بیگم نے انہیں مخاطب کیا تھا۔

"جی اماں۔" وہ حسیب اور سعد کا سہارا لیتے ہوئے اٹھ بیٹھیں۔

"چلو انعم اٹھو بیٹا' افطار کا وقت بس ہونے والا ہے جو کام رہ گئے ہیں وہ نمٹاؤ۔ دسترخوان لگاؤ۔" انہوں نے سب کی توجہ چاہی۔ انعم سرہلاتے ہوئے کچن کی طرف مڑ گئی تھی۔

✡ ✡ ✡

"سعد بیٹے! آج مجھے اپنے چچا کی طرف چھوڑ کر آفس چلے جانا۔" جہاں آرا بیگم نے سحری کے وقت سعد کو مخاطب کیا۔ ایک لمحے کے لیے سب کے ہاتھ تھم گئے تھے۔

"دادی جان! آپ اتنی جلد واپس جا رہی ہیں؟ ابھی آپ کو آئے تین دن ہی تو ہوئے ہیں۔" سب سے پہلے حسیب بولا۔

"کچھ دنوں میں پھر چکر لگاؤں گی بیٹا! وہاں سارہ اکیلے بور ہوتی ہے۔ ہم دونوں دادی پوتی اکٹھے ہوں تو کچھ جی بہل جاتا ہے ورنہ تو سارا دن بولائی بولائی پھرتی ہے۔" سارہ کا ذکر کرتے ہوئے ان کے لہجے میں محبت سمٹ آئی تھی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو سعد ان کے بیان پر ضرور احتجاج کرتا مگر آج اس نے جہاں آرا بیگم کے واپس جانے کا سن کر محض سرہلانے پر اکتفا کیا تھا اور جس وقت وہ صبح سعد کے ساتھ شمس الحسن کے ہاں جانے کے لیے تیار کھڑی تھیں' شرمندہ شرمندہ سی قدسیہ چلی آئیں۔

"آپ مجھ سے خفا ہو کر جا رہی ہیں نا اماں؟" ان کے لہجے میں عجب سی بے بسی تھی۔

جہاں آرا بیگم نے ٹھنڈا سانس بھر کر انہیں دیکھا۔ وہ جانتی تھیں کہ قدسیہ نے ایک پچھتاوے کے زیراثر یہ فیصلہ کر تو ڈالا ہے۔ مگر انجانے میں ایک دوسرے پچھتاوے کو بیٹنے کا بیٹھی ہیں نرمی سے بولیں۔

"دیکھو بیٹی! یہ سچ ہے کہ تمہارے فیصلے سے ہمیں دھچکا ضرور لگا ہے لیکن ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ تمہاری نیت اور ارادہ کسی کو دکھ پہنچانے کا نہیں ہے۔ میں ہرگز بھی تم سے خفا ہو کر نہیں جا رہی لیکن میرا وہاں جانا بھی ضروری ہے اس سے پہلے کسی اور طرح بات ان تک پہنچے اور ان کے دلوں میں غلط فہمیاں جنم لیں میں طریقے سلیقے سے یہ بات رفعہ اور شمس الحسن کو بتانا چاہتی ہوں اور پھر سارہ کو ساری بات جان کر جو جذباتی دھچکا لگے گا اسے سنبھالنے' سمجھانے کے لیے بھی میرا وہاں ہونا ضروری ہے۔"

"اماں! اگر آپ کہیں تو میں بھی آپ کے ساتھ چلوں۔ میں شمس الحسن اور رفعہ سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنا چاہتی ہوں۔"

"نہیں قدسیہ! فی الحال تمہارے جانے کی ضرورت نہیں اگر میں نے مناسب سمجھا تو تمہیں بلوا بھیجوں گی۔" جہاں آرا بیگم نے رسانیت سے ان کا شانہ تھپکا۔ اتنے میں سعد بھی آ گیا تھا۔

"چلیں دادی جان۔" اس نے ان کا بیگ اٹھایا۔

"ہاں چلو۔" وہ اس کی معیت میں آگے بڑھ گئیں۔

✡ ✡ ✡

گیٹ سارہ نے کھولا تھا۔ خوشی اور حیرت کی زیادتی سے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی تھی۔

"مجھے یقین ہی نہیں آ رہا کہ آپ اتنی جلدی واپس آ جائیں گی۔ میں نے کل افطار سے پہلے یہ ہی دعا کی تھی۔ آپ صحیح کہتی تھیں دادی جان! روزے دار کی اس وقت کی گئی دعا ضرور قبول ہوتی ہے۔" وہ ان سے لپٹتے ہوئے بولی اور اس کی بات میں شاید صداقت تو تھی۔ وہ بھی تو روزے دار تھا اور سارا سفر یہ ہی سوچتے کٹا تھا کہ کاش گیٹ پر ہی اس کی ایک جھلک دیکھنے کو مل جائے اگرچہ وہ اسے دیکھنے کا حق کھو چکا تھا مگر دل پر عقل کا زور کب چلتا ہے۔

"دیکھ لیجیے سعد صاحب! دادی جان کہہ رہی ہیں کہ میرے بغیر ان کا دل نہیں لگا اسی لیے واپس آ گئی ہیں۔" جہاں آرا بیگم نے تو نہیں یہ بات کی بھی تھی یا وہ اسے محض چڑا رہی تھی سعد بہت مشکلوں سے مسکرایا تھا۔

"کیا ہوا ہے سعد تمہیں! اتنی صبح صبح روزہ لگنا شروع ہو گیا؟" اس کے چہرے کی پژمردگی سارہ کی نگاہوں سے اوجھل نہ رہ پائی تھی جب ہی اپنی شوخی بھول کر تشویش سے دریافت کیا۔ سعد نے اس بار بھی کوئی جواب نہ دیا بس ذرا سا مسکرانے کی کوشش کی پھر دادی جان کو سلام کر کے واپس گاڑی کی طرف پلٹ گیا۔ سارہ حیرت سے اسے دیکھتی رہی اور وہ زن سے گاڑی بھگا لے گیا۔

"یہ سعد کو کیا ہوا دادی جان؟" جہاں آرا بیگم کے ساتھ اندر کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے حیرانی سے پوچھا۔

"تمہارے بابا آفس کے لیے نکل گئے یا گھر پر ہی ہیں؟" جہاں آرا بیگم نے بھی جیسے اس کا سوال ان سنی کر دیا۔

"پاپا کو نکلے پانچ دس منٹ ہی ہوئے ہیں۔ کیا بات ہے دادی جان! سب خیریت تو ہے نا؟ آپ تین دن بعد ہی کیوں واپس آ گئی ہیں؟" ذرا دیر پہلے ملنے والی خوشی پر اب خدشات حاوی ہو رہے تھے۔

"اے بچی! ذرا چھری کے نیچے دم تو لے لے۔ وہاں لوڈشیڈنگ نے زندگی عذاب میں ڈال رکھی تھی' اوپر سے جنریٹر خراب ہو گیا اور وجیہہ الحسن تو کہہ رہا تھا کہ آج کل میں ٹھیک ہو جائے گا لیکن نہ بھئی مجھ سے روزے کی حالت میں گرمی برداشت نہیں ہوتی بس اسی لیے آ گئی۔"

انہوں نے سچ میں ذرا سے جھوٹ کی آمیزش کی تھی وہاں جنریٹر واقعی خراب ہو رہا تھا حسب توقع یہ وضاحت سن کر وہ مطمئن ہو گئی۔ رفعہ ابھی انہیں دیکھ کر حیران ہو گئی تھیں۔ "آپ کس کے ساتھ ہیں اماں؟" رفعہ کو اچانک خیال آیا تو پوچھ لیا۔

"سعد آفس جاتے ہوئے چھوڑ گیا ہے۔" انہوں نے بتایا تھا۔

"اندر نہیں آیا؟" وہ حیران ہوئیں۔ سعد آئے اور بنا سلام کیے پلٹ جائے یہ کب ہوا تھا۔

"ہاں آفس سے لیٹ ہو رہا تھا۔" جہاں آرا بیگم نے کمزور سے لہجے میں پھر جھوٹ بولا مگر رفعہ نے ان کے لہجے پر دھیان دیے بغیر خوش دلی سے یہ عذر قبول کر لیا تھا۔

✡ ✡ ✡

کمرے میں اتنا سناٹا چھایا ہوا تھا کہ سوئی گرتی تو اس کی بھی آواز آتی۔ رفعہ اور شمس الحسن دونوں کے لیے یہ خبر اتنی اچانک اور تکلیف دہ تھی کہ وہ بہت دیر

تک کچھ بول نہ پائے۔

"قدسیہ کی نیت پر شک مت کرنا بیٹے! جتنی تکلیف تمہیں اس کا فیصلہ سن کر پہنچی ہے۔ اس سے کہیں زیادہ تکلیف اسے اس فیصلے پر پہنچنے تک سہنی پڑی ہے۔ وہ حد درجہ ذہنی اذیت سے گزر رہی ہے۔" جہاں آرا بیگم نے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں رگڑیں۔

"میں قدسیہ بھابھی کی ذہنی اذیت کا اندازہ لگا سکتی ہوں اماں! اپنے جوان بھائی کی ناگہانی موت کے بعد وہ مینٹلی بہت ڈسٹرب ہو گئی ہیں۔ ان کی مجبوری سمجھ میں آنے والی ہے لیکن ہم اپنے دل کو کیسے سمجھائیں سارہ کے ساتھ ہمیشہ سعد کا تصور کیا ہے یوں اچانک ـــــ"

رفیعہ نے روتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"کاش قدسیہ بھابھی نے ماضی میں میرا اتنا خیال نہ رکھا ہوتا تو میں ان سے جا کر لڑتی کہ وہ کیسے اکیلے یہ فیصلہ کر سکتی ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ بہنوں سے بڑھ کر میرا خیال رکھا۔ ہر مشکل وقت میں میری ہمت بندھائی۔ سارہ کی پیدائش ہوئی تو میں مرتے مرتے بچی تھی پھر جب ڈاکٹرز نے بتایا کہ میں آئندہ اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں رہی تو کیا کڑا وقت تھا وہ میرے لیے' آپ کی شفقت اور قدسیہ بھابھی کا ساتھ نہ ہوتا تو میں بکھر کر رہ جاتی اور میری سارہ کو تو شروع میں سنبھالا بھی انہوں نے ہی تھا۔ جب بھی مجھے قلق ستاتا کہ میں شمس الحسن کو وارث دینے کے قابل نہیں رہی تو قدسیہ بھابھی مجھے ڈانٹ دیتی تھیں' کہتی تھیں۔ میرے سعد کو اپنا ہی بیٹا سمجھو اور میں نے سعد کو ہمیشہ اپنا بیٹا ہی جانا اماں! اور جب دونوں کے بچپن میں آپ نے انہیں مستقبل میں ایک بندھن میں باندھنے کا فیصلہ کر لیا تب تو واقعی میرے دل سے بیٹا پیدا نہ کرنے کی محرومی بالکل ختم ہو گئی۔ میں جب بھی سعد پر نگاہ ڈالتی' یہ سکون رگ و پے میں اترتا جاتا کہ سعد جیسا شخص میری سارہ کا جیون ساتھی بنے گا۔ اتنا اچھا' اتنا پیارا' اتنا سلجھا ہوا لڑکا اور سارہ جتنی عقل سے پیدل ہے' میں کبھی اسے ڈانٹ کر عقل کی کوئی بات سمجھانے کی کوشش بھی کرتی تو قدسیہ بھابھی آڑے آ جاتیں کہ مجھے اپنی بیٹی کا بھولپن ہی عزیز ہے! اب۔" رفیعہ کی آنکھیں بھر بھر آ رہی تھیں۔

"سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے اماں کہ ہم لوگوں نے بات خود تک محدود نہیں رکھی بلکہ یہ خواب اپنے بچوں کی پلکوں پر بھی سجا دیے اور جب انہیں تعبیر دینے کا وقت آیا تھا تو فیصلہ بدل ڈالا۔" شمس الحسن نے انگلیوں سے کنپٹی مسلی تھی۔

بہرحال میں نہیں چاہتی کہ اس بات کو بنیاد بنا کر دونوں بھائیوں کے بیچ کوئی چپقلش جنم لے۔ اگر تم لوگوں کے درمیان کسی قسم کی رنجش پیدا ہوگی تو میرا بوڑھا دل یہ صدمہ سہار نہ پائے گا۔" جہاں آرا بیگم اپنی عمر سے کہیں زیادہ بوڑھی لگنے لگی تھیں۔

"اماں! وجیہہ بھائی کے علاوہ میرا ہے ہی کون۔ ایک ہی بھائی ہے میرا۔ اسے کیسے چھوڑ سکتا ہوں' لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہم اس بات سے ذہنی طور پر بہت ڈسٹرب ہو گئے ہیں۔" شمس الحسن تھکے تھکے لہجے میں گویا ہوئے تھے۔

"اصل مسئلہ میری سارہ کا ہے۔ جب اسے پتا چلے گا تو وہ کیسے سہار پائے گی یہ صدمہ۔ غلطی بلاشبہ ہماری ہے۔ بچپن میں بچوں کی بات طے نہیں کرنی چاہیے تھی۔ اب ہمیں سارہ کو بہت طریقے' سلیقے سے سمجھانا ہوگا۔" جہاں آرا بیگم نے بیٹے' بہو کو مخاطب کیا۔

"صحیح کہہ رہی ہیں اماں آپ۔" رفیعہ نے آنسو پونچھتے ہوئے ان کی تائید کی۔

"ویسے ہے کہاں سارہ۔ چائے بنانے بھیجا تھا اب تک آئی نہیں۔" جہاں آرا بیگم کی چھٹی حس نے خطرے کا الارم بجایا تھا۔

"میں دیکھتی ہوں اماں۔" رفیعہ اٹھی تھیں اور کچن کے دروازے میں سے اندر جھانکا تو سامنے سلیب پر دھری ٹرے میں چائے کے مگ سجے تھے وہ قریب گئیں چائے کی سطح پر جمنے والی تہہ نے بتا دیا کہ مگوں میں چائے انڈیلے کافی دیر ہو چکی ہے۔

"سارہ' سارہ بیٹے۔" وہ اسے آواز دیتی واپس مڑی تھیں۔

"چائے ٹھنڈی ہو گئی ہے امی! آپ چلیں۔ میں گرم کر کے لاتی ہوں۔" اتنے میں ہی سارہ بھی کچن میں داخل ہوئی تھی۔ وہ شاید منہ دھو کر آئی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں آنسو امڈے آ رہے تھے اور اس کی کپکپاتی ہوئی آواز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ ان کی سب باتیں سن چکی ہے۔

"چائے میں گرم کر کے لے جاتی ہوں۔ تم جاؤ' نماز پڑھ لو۔ دیر کرو گی تو تراویح پڑھنے میں سستی ہو جائے گی۔ انہوں نے اس سے نگاہیں ملائے بغیر نرم لہجے میں مخاطب کیا تھا۔

"جی امی۔" سارہ فوراً" واپس پلٹ گئی تھی۔ رفیعہ کا جی کٹ کر رہ گیا لیکن وہ بے بسی سے اسے جاتا دیکھنے کے سوا کچھ کر پائی تھیں۔

☼ ☼ ☼

رات کا جانے کون سا پہر تھا جب گھٹی گھٹی سسکیوں کی آواز سے جہاں آرا بیگم کی آنکھ کھلی رفیعہ انہیں بتا چکی تھیں کہ سارہ کے علم میں ساری بات آ چکی ہے لیکن جب جہاں آرا بیگم نماز سے فارغ ہو کر اس کے پاس سونے کے لیے آئیں تو وہ کھیس منہ تک تانے پڑی تھی۔ جانے سو چکی تھی یا سونے کی ایکٹنگ کر رہی تھی بہرحال جہاں آرا بیگم نے اسے مخاطب کرنا ضروری نہ سمجھا۔ وہ بھی اپنی تسبیح اور وظائف پڑھتی سونے کی غرض سے لیٹ گئیں اور پڑھتے پڑھتے ہی ان کی آنکھ لگ گئی تھی اور اب جانے کیا وقت ہو رہا تھا جب سارہ کی سسکیوں سے ان کی آنکھ کھلی۔ کچھ دیر تک وہ بے بسی سے اس کی سسکیاں سنتی رہیں پھر آخر ضبط نہ ہوا تو اس کا شانہ ہلاتے ہوئے اسے پکار بیٹھیں۔

"دادی جان۔" وہ کروٹ لے کر بے ساختہ ان کے سینے سے لگی تھی۔ جہاں آرا بیگم خاموشی سے اس کی پیٹھ سہلانے لگیں بعض اوقات تسلی دلاسے کے لیے الفاظ کا سہارا لینا بھی چاہیں تو الفاظ بے معنی لگنے لگتے ہیں۔

☼ ☼ ☼

قدسیہ اس وقت مرحوم بھائی کی قد آدم تصویر کے سامنے کھڑی تھیں۔ ہنستا مسکراتا خوب صورت چہرہ جو ہمیشہ کے لیے ان سے بچھڑ گیا تھا۔ قدموں کی آہٹ پر ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے پیچھے مڑیں۔

"پھپھو! اب جب بھی آتی ہیں۔ پاپا کو بھی اداس کرتی ہیں اور ہمیں بھی' دیکھیں' پاپا کتنی پریشانی سے آپ کو تک رہے ہیں۔" علیزے نے پیچھے سے آ کر ان کے گلے میں بانہیں ڈالی تھیں۔ قدسیہ نے مسکراتے ہوئے نم آنکھیں پونچھ لیں۔

"گڈ گرل۔" علیزے شوخی سے ہنسی۔ انہوں نے محبت سے مسکراتے ہوئے اپنی اس نٹ کھٹ سی بھتیجی کو دیکھا۔ یہ اس کی شوخیاں ہی تھیں جو آفاق ہاؤس میں زندگی محسوس ہوتی تھی ورنہ سچ تو یہ تھا کہ آفاق کے جانے کے بعد یہ گھر ویرانے کا منظر پیش کرتا تھا لیکن علیزے نے کم عمری کے باوجود بہت بہادری سے نہ صرف مشیت ایزدی کو قبول کیا بلکہ اپنی ماں اور چھوٹے بھائیوں کو بھی سنبھالا تھا۔

"سفینہ کہاں ہے بلاؤ اسے کیا ابھی سے کچن میں گھس گئی ہے۔" قدسیہ نے بھاوج کے متعلق استفسار کیا تھا۔

"جی جناب! اتنے دنوں بعد تو آپ آئی ہیں۔ ماما آپ کے لیے آج کی افطاری پر زبردست سا اہتمام کرنے لگی ہیں۔ فی الحال تو راجو کو سامان کی لسٹ بنا کر دے رہی ہیں۔" علیزے گھریلو ملازم کا نام لیتے ہوئے بتایا۔

"ابھی تو افطار میں بہت وقت پڑا ہے۔ اسے منع کرو' زیادہ تکلف کرنے کی ضرورت نہیں۔ آج کل تو پانی ہی زیادہ پیا جاتا ہے۔ کھایا کب جاتا ہے جو دال سبزی پکانے کا پروگرام تھا وہی پکا لو۔" قدسیہ نے رسانیت سے کہا۔

"توبہ کریں پھپھو! یہ جو آپ کے دونوں بھتیجے ہیں دال سبزی یہ عام دنوں میں نخرے کر کے حلق سے اتارتے ہیں۔ رمضان میں تو ان کی فرمائشی لسٹ لمبی سے لمبی ہو جاتی ہے۔" علیزے نے مسکراتے ہوئے بولی۔

"ہیں کہاں دونوں شیطان۔" قدسیہ نے مسکراتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا۔

"اسکول سے آتے ہی سو گئے ہیں۔ روزے رکھ کر جیسے ہم پر احسان کر رہے ہیں کسی کام کے نہیں رہے۔ سارا دن سوتے رہتے ہیں۔"

"ابھی ہیں بھی تو چھوٹے پھر گرمیوں کے روزے سخت ہیں بیٹا!" قدسیہ نے ان کی طرف داری کی۔

"پتا نہیں پھپھو! ہم لڑکیاں بھی تو ہیں ہماری روٹین پر تو زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ وہ حسیب صاحب انہیں بھی روزہ بہت لگتا ہے جب سے رمضان شروع ہوا ہے ایک بار شکل نہیں دکھائی۔ پہلے سنڈے کے سنڈے آجاتا تھا۔ اپنے سارے نوٹسوں کا پلندہ تو میرے حوالے کر دیا تھا لیکن مجھے اس کی رائٹنگ کب سمجھ میں آتی ہے ڈاکٹروں کی تعریف پر سو فی صد پورا اترتا ہے۔ اتنی خراب رائٹنگ جب تک اس کا لکھا اسی سے نہ پڑھواؤں تو کچھ پلے نہیں پڑتا۔ ہاں سمجھاتا بہت اچھا ہے۔ سچ پھپھو اکیڈمی میں تو میں بس وقت گزاری کے لیے جاتی ہوں۔ فائدہ صرف مجھے حسیب سے پڑھ کر ہی ہوتا ہے۔" اس نے فراخ دلی سے تسلیم کیا تھا۔ قدسیہ مسکرادیں۔

حسیب میڈیکل کے سیکنڈ ایئر میں تھا۔ ان کے بچوں میں سب سے زیادہ ذہین۔ خاندان کا پہلا ڈاکٹر بننے جا رہا تھا اور علیزے اس کا ریکارڈ توڑنے کے لیے بہت پرعزم تھی۔ ایف ایس سی پری میڈیکل کے فرسٹ ایئر میں اس نے بہت اچھے نمبر حاصل کیے تھے اور اب سیکنڈ ایئر میں بھی وہ سخت محنت کر رہی تھی۔

"مجھے لگتا ہے پھپھو میرے فرسٹ ایئر کے نمبر دیکھ کر حسیب جیلس ہو رہا ہے۔ کہیں اسی لیے تو مجھے پڑھانے سے ہاتھ نہیں کھینچ رہا۔" اس نے رازداری سے پوچھا تھا قدسیہ کو اس کے انداز پر ہنسی آگئی۔

"نہیں بیٹا! آج کل وہ بے چارہ خود بری طرح مصروف ہے۔ سیکنڈ ایئر کی پڑھائی اسے ٹف لگ رہی ہے۔"

"پھپھو! وہ تو بہت لاپروا سا ہے آپ بس وہ سارے نوٹس سنبھال کر رکھیے گا۔ آخر کو میرے کام آئیں گے۔" علیزے میڈیکل کالج میں داخلے کے لیے بہت پرامید تھی۔ قدسیہ نے مسکراتے ہوئے اقرار میں گردن ہلا دی۔ اتنے میں سنیعہ بھی چلی آئی تھیں۔

"جاؤ علیزے! دونوں بھائیوں کو اٹھاؤ [illegible] آنے والے ہیں۔ نہا دھو کر فریش ہو جائیں۔" انہوں نے علیزے کو مخاطب کیا۔

علیزے ماں کی بات سن کر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اٹھ گئی۔

"اور سنائیں قدسیہ باجی! گھر میں سب کیسے ہیں؟ بس روزوں کی وجہ سے گھر سے نکلنا نہیں ہو رہا ورنہ بچے تو کب سے کان کھا رہے تھے کہ پھپھو کی طرف چلنا ہے۔" سنیعہ کی بات سن کر قدسیہ مسکرادیں۔

"آنا تو میں نے بھی تھا تمہاری طرف پر سوچتے سوچتے مہینوں گزر گئے۔" قدسیہ نے لمبا سانس کھینچتے ہوئے خود کلامی سی کی۔

"میں آج تم سے کچھ مانگنے آئی ہوں سنیعہ۔" قدسیہ نے تمہید باندھنے کے بجائے سیدھی طرح بات کا آغاز کیا۔

"سعد کے لیے علیزے کا ہاتھ مانگ رہی ہوں اور جواب دیتے وقت یہ پہلو بھی ضرور ذہن میں رکھنا کہ یہ آفاق کی آخری خواہش بھی تھی۔"

"لیکن سعد کی بات تو اپنے چچا کی طرف تقریباً طے ہی ہے۔" سنیعہ حیران ہوئیں۔

"وہ معاملہ ختم سمجھو۔ ہمارے اپنے گھر کا معاملہ تھا۔ میری خواہش جان کر اماں سمیت سب راضی ہو گئے ہیں۔" انہوں نے سبھاؤ سے بات بتائی یہ اور بات کہ سارہ اور سعد کی شکلیں ذہن میں آتے ہی دل ایک

لمحے کو ڈوبا ضرور تھا۔

"سعد بھی راضی ہے؟" سنیعہ نے کچھ اچنبھے سے پوچھا۔

"میں نے کہا نا کہ ہمارے گھر میں سب راضی ہیں اور سعد میرے گھر کا ہی فرد ہے۔" انہوں نے سنیعہ کو اطمینان دلایا۔ جانتی تھیں کہ بیٹی ماں کے ذہن میں سو طرح کے خدشے ابھرتے ہیں لیکن انہیں یہ بھی یقین تھا کہ ان کا سعد ان کا مان کبھی نہ توڑے گا۔

"پھر میں تمہاری خاموشی سے کیا سمجھوں۔" انہوں نے بھاوج کو جانچتی ہوئی نگاہوں سے دیکھا۔

"قدسیہ باجی! آپ نے اچانک ایسی بات کر دی ہے جس کا میں کبھی سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ ہر ماں کی طرح میں بھی اپنی بچی کے مستقبل کے حوالے سے پریشان رہتی ہوں۔ میری علیزے کو جانے کیسے لوگوں سے واسطہ پڑے گا۔ آفاق ہوتے تو اور بات تھی۔ الحمدللہ کہ وہ اپنی زندگی میں ہمارے لیے اتنا چھوڑ گئے کہ ان کے بعد بھی کسی مالی پریشانی سے واسطہ نہیں پڑا لیکن ویسے تو زندگی کے ہر قدم پر ان کی کمی محسوس ہوتی ہے اور سچ پوچھیں تو آپ کے سعد میں مجھے آفاق کی جھلک نظر آتی ہے۔ وہ اپنے ماموں سے بے حد مشابہت رکھتا ہے۔ میرے دل میں اس کی جگہ کا تعین کرنے کے لیے ایک یہ ہی وجہ کافی ہے۔ وہ مجھے بہت عزیز ہے بہت پیارا۔ اتنی سلجھی ہوئی شخصیت ہے اس کی کہ میں اپنی بیٹی کا ہاتھ آنکھیں بند کر کے اس کے ہاتھ میں دے سکتی ہوں۔ سوچنے کے لیے ایک لمحے کی مہلت لیے بغیر لیکن۔۔۔" انہوں نے جھجکتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"لیکن سنیعہ...؟" قدسیہ نے بے تابی سے پوچھا۔

"میں خود ایک ٹیچر ہوں قدسیہ باجی! بچوں کو ہر گھڑی اعلا اخلاقی اصولوں اور اقدار کا سبق پڑھانے والی۔ میرا ضمیر مجھے اس خود غرضی کی اجازت نہیں دیتا کہ میں اپنی بچی کا گھر بسانے کے لیے اسی جیسی ایک اور بچی کی پلکوں پر سجے خواب اجاڑوں۔ بچپن سے اس نے اپنے نام کے ساتھ سعد کا نام سنا ہے۔ میرا اور رفعہ بھابھی کا جب بھی سامنا ہوا گفتگو میں ایک دو بار ضرور اس موضوع پر بھی بات ہوئی۔ وہ اپنی بچی اور سعد کی نسبت پر ہمیشہ ہی بہت مطمئن اور خوش لگیں۔ آپ کے بچوں نے بھی ہمیشہ سارہ کا تعارف اپنی ہونے والی بھابھی کی حیثیت سے کروایا۔ وہ بچی شرما جاتی تھی لیکن میں اس کے چہرے پر پھیلتے رنگوں سے واقف ہوں۔ میں پھر کس طرح اتنے بہت سے لوگوں کے دل توڑ کر اپنی علیزے کے مستقبل کی بنیاد رکھ سکتی ہوں۔" سنیعہ بے بسی سے بولیں۔

"تمہاری سب باتیں بجا سنیعہ لیکن میں نے بات کے آغاز میں تم سے کہا تھا کہ جواب دیتے وقت یہ پہلو ضرور مد نظر رکھنا کہ آفاق کی آخری خواہش یہی تھی جب میں بہن ہو کر اس کی خواہش کا پاس رکھ رہی ہوں تو کیا تمہیں مرحوم شوہر کی خوشی اور خواہش کا کوئی پاس نہیں۔"

قدسیہ کے لہجے میں گویا برسوں کی تھکن سمٹ آئی تھی۔

"آپ نے مجھے دوراہے پر کھڑا کر دیا ہے قدسیہ باجی! مجھے سوچنے کے لیے تھوڑا وقت چاہیے۔" وہ دھیمے لہجے میں گویا ہوئیں تو قدسیہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ان دو عورتوں نے آفاق سے ٹوٹ کر محبت کی تھی۔ بھائی کی محبت نے قدسیہ سے ایک مشکل فیصلہ کروا لیا تھا اور وہ جانتی تھیں سنیعہ سوچنے کی جتنی مرضی مہلت لے لیں۔ جواب انہوں نے اثبات میں ہی دینا تھا۔

۞ ۞ ۞

رمضان کا آخری عشرہ چل رہا تھا۔ سارہ ہر دفعہ کی طرح عید کی تیاریوں میں مشغول تھی۔ آہستہ آہستہ گھر کی تفصیلی صفائی کا کام بھی جاری تھا۔ کبھی کبھار ماں کے ساتھ بازار کا بھی چکر لگا لیتی۔ کوکنگ شوز دیکھ کر نت نئی ترکیبیں ٹرائی کرنے کا جو سلسلہ شروع رمضان سے جاری تھا وہ اب بھی تعطل کا شکار نہ ہوا۔ رفعہ

اور جہاں آرا اسے معمول کے کاموں میں مصروف دیکھ کر مطمئن تھے یا وہ بھی صرف مطمئن ہونے کا تاثر دے رہے تھے۔ آخری عشرے کی مبارک راتوں میں سب ذوق وشوق سے عبادات کا اہتمام کرتے تھے۔ اس بار سارہ انتہائی خضوع وخشوع سے نوافل ادا کرتی اور پھر دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتی تو پلکیں بھیگ بھیگ جاتیں۔

"اے اللہ اگر وہ کسی اور کا نصیب ہے تو میرے دل ودماغ سے اس کا خیال حرف غلط کی طرح مٹا دے۔ مجھے اس کا بہتر نعم البدل دے۔ میرے دل کو صبر اور قرار دے۔ حسد کی آگ سے مجھے بچا لے۔ ہمارے پورے گھرانے کی محبتیں اسی طرح قائم ودائم رہیں۔ میرا دل اس کے معاملے میں بے اختیار ہوا جاتا ہے لیکن اللہ جی میں زبان پر کوئی حرف شکایت نہیں لاتی۔ اگر میرے دل میں بھی کوئی شکوہ پیدا ہو تو اے اللہ میں اس معاملے میں بے بس ہوں۔ مجھے معاف کر میری خطاؤں سے درگزر کر۔ مجھے صبر دے بالک قرار دے۔ دنیاوی محبت نہ ملنے پر تیرے سامنے گریہ وزاری کرتے ہوئے میرا دل شرمندگی سے ڈوب مرنے کو کرتا ہے۔ خالق کائنات! اس دل میں اپنی محبت ڈال دے۔ اپنی رضا میں راضی ہونے کی توفیق دے۔"

پلکوں سے موتی گرتے رہتے اور وہ رات کی تنہائی میں اپنا دکھ اپنے حقیقی رازدار کو سناتی۔ حیرت انگیز طور پر ہر گزرتے دن کے ساتھ دل کو قرار ملتا جا رہا تھا۔

گیٹ پر اس تواتر سے بیل ہو رہی تھی کہ لگتا تھا کوئی گھنٹی پر انگلی رکھ کر ہی بھول گیا ہے۔ دوپہر بارہ بجے کا وقت تھا۔

"اس وقت کون ہے۔" قدسیہ حیران ہوتی گیٹ کھولنے بڑھیں گھر میں اس وقت حبیب بھی تھا۔ لیکن وہ سو رہا تھا۔ بہت دنوں بعد اس نے کالج سے چھٹی کی تھی۔ میڈیکل کی ٹف پڑھائی کی وجہ سے اسے آرام کا موقع کبھی کبھار ہی ملتا تھا۔ قدسیہ دن چڑھے تک بچوں کے سونے کے خلاف تھیں لیکن حبیب کو اس معاملے میں خاص رعایت حاصل تھی۔

بعجلت گیٹ کھولنے اس لیے گئی تھیں کہ کہیں تیز آواز حبیب کی نیند میں خلل نہ ڈالے کہ نیند بہت پکی تھی۔ گیٹ کھولنے پر جو صورت نظر آئی قدسیہ کو اس کی ہرگز توقع نہ تھی۔ یونیفارم، گلابی دوپٹے میں گرمی سے لال بھبھوکا چہرہ علیزے کھڑی تھی۔

"السلام علیکم پھپھو!" وہ سلام کرتے ہوئے اندر داخل ہوئی۔

"وعلیکم السلام۔ جیتی رہو۔" قدسیہ نے خوش دلی سے سلام کا جواب دیا۔

"کالج میں اسٹرائیک تھی۔ صرف پہلے دو پیریڈ ہوئے۔ کالج میں بیٹھ کر ڈھائی بجے تک وین کا انتظار کرنا بہت مشکل لگ رہا تھا۔ پھر میری ایک دوست کے ابو لینے آ گئے۔ آپ کا گھر ان کے راستے میں پڑتا تھا میں نے سوچا یہیں آ جاؤں۔ شام کو افطاری سے پہلے سعد بھائی یا حبیب گھر چھوڑ آئیں گے۔ بس ای کو فون کر دیا اور اپنی دوست کے ساتھ آ گئی۔ مین روڈ پر ڈراپ کر گئے ہیں وہ لوگ اور یہ آپ کی چند قدم کی گلی کراس کرنا مشکل ہو گیا۔ توبہ کتنی گرمی ہے پھپھو۔" علیزے عادت کے مطابق نان اسٹاپ شروع ہو چکی تھی۔

"اچھا آؤ بیٹھو سانس تو لو' روزہ نہ ہوتا تو تمہیں شربت وغیرہ پلاتی۔"

"پانی کی صحیح قدر روزے میں ہی معلوم ہوتی ہے۔ سچ اللہ کی کتنی بڑی نعمت ہے پانی۔ شکر ہے تھوڑے سے روزے رہ گئے۔ مجھ سے پیاس برداشت ہی نہیں ہوتی پھپھو۔" علیزے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولی۔

"نیک لوگ رمضان جانے کے غم میں روتے ہیں کہ جانے اگلا رمضان نصیب بھی ہو گا یا نہیں اور تم جیسے شکر مناتے ہیں۔ شرم کرو۔" جانے حبیب کب اٹھا تھا۔ علیزے نے بھی حیرت سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ "چلو میں نے تو شرم کر لی' لیکن تم بھی شرم کرو جوان جہان بیٹے کے ہوتے ہوئے پھپھو اتنی گرمی میں روزے کی حالت میں اتنی دور گیٹ کھولنے گئیں۔ تم سب پڑوں میں مہندی لگی تھی کیا؟"

"میں سو رہا تھا۔" وہ بے نیازی سے بولا۔

"اب کیسے اٹھ گئے؟" علیزے نے چمک کر پوچھا۔

"تمہاری آواز کسی صور اسرافیل سے کم ہے کیا۔ بیدار کر دیا مجھے۔"

"اچھا اب جاگ ہی گئے ہو تو ہاتھ منہ دھو کر اچھے بچوں کی طرح کنگھا بھی کر لو۔ اتنے ڈراؤنے لگ رہے ہو ان کھڑے بالوں میں۔"

"یہ اسٹائل ہے۔" اس نے جیسے اس کی عقل پہ ماتم کیا۔

"خاک اسٹائل ہے جیسے کسی نے بالوں میں بم پھوڑ دیا ہو۔" علیزے نے ناک چڑھا کر کہا۔ قدسیہ مسکراتے ہوئے باہر چلی گئیں۔ پتا تھا کہ علیزے اور حبیب دیر تک اسی طرح چونچیں لڑاتے رہیں گے۔ ان کے جانے کے بعد علیزے نے حبیب کو سنجیدگی سے مخاطب کیا تھا۔

"میں نے پھپھو سے جھوٹ بولا ہے کہ کالج میں اسٹرائیک تھی۔"

"کیوں؟" حبیب نے گھورا۔

"تمہیں پتا ہے پھپھو ہمارے گھر آئی تھیں۔"

"جانتا ہوں۔" حبیب نے نگاہیں چرائیں۔

"وہ میرے لیے سعد بھائی کا رشتہ لائی ہیں۔" علیزے نے احتجاجی انداز میں بتایا۔

"اوف۔ پھر تو تمہارا ادب کرنا پڑے گا۔ بھابھی جان جو بن جاؤ گی۔" حبیب نے مذاق کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کے چہرے نے الفاظ کا ساتھ نہ دیا۔

"مجھے خواب دکھا کر اب یہ کہہ رہے ہو' شرم سے ڈوب مرو۔" علیزے نے غصے سے پاس پڑا کشن اٹھا کر اسے دے مارا۔

"خدا کا نام لو علیزے! میں نے تمہیں کب دکھائے۔" حبیب کے تو پسینے چھوٹ گئے۔ اس نے گھبرا کر دروازے کی سمت دیکھا کہ کہیں قدسیہ نہ آ رہی ہوں۔

"شرافت اور بزدلی میں بہت معمولی سا فرق ہوتا ہے حبیب! میں آج تک تمہیں شرافت کا مارجن دیتی رہی' لیکن تم تو نرے بزدل نکلے۔" علیزے کی آواز بھرائی تھی۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا تم کیا کہنا چاہ رہی ہو۔" حبیب نے پست آواز میں اسے مخاطب کیا۔

"تم مجھے پسند کرتے ہو یا نہیں؟" علیزے نے آنسو پونچھتے ہوئے دو ٹوک انداز میں پوچھا۔

"تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔ یہ کوئی وقت اور جگہ ہے۔ امی کسی بھی وقت آ سکتی ہیں۔" حبیب نے اسے احساس دلایا۔

"میں پوچھ رہی ہوں حبیب! تم مجھے پسند کرتے ہو یا نہیں؟" علیزے نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہ تھی اور اسی لمحے حبیب کو دروازے کے پاس قدسیہ کے دوپٹے کی جھلک نظر آئی۔

"پلیز علیزے۔" حبیب نے آنکھوں سے اشارہ کیا تھا۔

علیزے نے اس کی آنکھوں کی سمت دیکھا۔ قدسیہ کے دوپٹے کی جھلک یقیناً" اس نے بھی دیکھ لی تھی۔ لیکن اسے جیسے اس بات سے کوئی فرق ہی نہ پڑا۔ اس نے ایک بار پھر اپنا سوال دہرایا۔

"تم میری کزن ہو۔ میں تمہیں ناپسند کیوں کرنے لگا۔" حبیب نے ماتھے پر آیا پسینہ صاف کیا تھا۔

"میں صرف تمہاری کزن ہوں۔" علیزے نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔ حبیب چپ رہا۔

"تم اتنے کنجوس کہ کسی فقیر کو دس روپے دینے سے پہلے دس بار سوچتے ہو اور ہر دوسرے دن سیکڑوں روپے کا پیٹرول پھونک کر شہر کے ایک کونے سے دوسرے کونے مجھے پڑھانے جاتے رہے۔ اپنی اتنی ٹف پڑھائی کے باوجود آدھی آدھی رات تک جاگ کر میرے نوٹس بناتے ہو۔ میری برتھ ڈے پر مجھے سب سے پہلا مبارک باد کا میسج تمہارے نمبر سے آتا ہے مستقبل کے بارے میں جب بھی تم نے کوئی بات کی تو

صرف اپناذکر نہیں کیا۔ بلکہ مجھے بھی اپنے ساتھ رکھا۔ تم ڈاکٹر بن جاؤ گی تو ہم اکٹھے اسپتال چلائیں گے۔ ہم ورلڈ ٹور پر جائیں گے علیزے ، ہم یہ کریں گے ہم وہ کریں گے اور پھر تم کہتے ہو کہ میں صرف تمہاری کزن ہوں؟ کس حیثیت سے تم مجھے دنیا گھمانے اپنے ساتھ لے کر جانا چاہ رہے تھے مسٹر حسیب احمد؟" وہ پھٹ پڑی تھی۔

تب ہی قدسیہ اندر داخل ہوئیں۔ ان کا چہرہ خطرناک حد تک سنجیدہ تھا۔ حسیب کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔

"حسیب! گوشت لادو۔ تمہارے ابو کہہ گئے تھے آج بھنڈی گوشت بنانا ہے۔" قدسیہ نے سپاٹ لہجے میں کہا تھا۔

وہ اتنا حواس باختہ ہو رہا تھا کہ سرہلاتے ہوئے فوراً" اٹھ کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد قدسیہ نے علیزے کو دیکھا۔ وہ کارپٹ پر بیٹھی گھٹنوں میں سر دیے روئے جارہی تھی۔

"شرم و حیا لڑکیوں کا زیور ہوتا ہے علیزے! جو بھی بات تھی۔ تمہیں مجھ سے کرنی چاہیے تھی۔ اپنی بھتیجی کی آج کی گفتگو سن کر میرا دل دکھ سے بھر گیا ہے۔"

"پھپھو۔" علیزے نے تڑپ کر سر اٹھایا تھا۔ "میں بے شرم لڑکی نہیں ہوں پھپھو! اپنا وقار اور بھرم مجھے بھی بہت عزیز ہے۔ لیکن صورت حال جس نہج پر پہنچ گئی ہے میرے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔" وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔

"اچھا رونا بند کرو' تسلی' سکون سے بھی بات کی جاسکتی ہے۔" قدسیہ کو اس کے آنسو تکلیف دے رہے تھے۔ علیزے نے آہستگی سے آنسو پونچھ ڈالے۔

"پرسوں مجھے امی نے بتایا تھا یقین جانیے مجھے شدید ترین شاک لگا۔ پھپھو آخر آپ نے میرے اور سعد بھائی کی شادی کے متعلق سوچ بھی کیسے لیا۔" ہمیشہ کی صاف گو علیزے گھما پھرا کر تو بات کرنا جانتی ہی نہ تھی۔ قدسیہ نے گہرا سانس اندر کھینچا۔

"تمہاری ماں نے پھر تمہیں یہ نہیں بتایا کہ تمہارے مرحوم باپ کی بھی خواہش تھی۔" قدسیہ نے تھکے تھکے انداز میں کہا۔

"مجھے یقین نہیں آتا کہ بابا نے آپ سے ... ہوگی۔ آپ کو سمجھنے میں غلطی بھی تو ہو سکتی ہے ... ہو سکتا ہے وہ صرف آپ سے یہ ضمانت چاہ رہے ... کہ آپ میرا ہمیشہ بیٹیوں کی طرح خیال رکھیں ... انہوں نے آپ سے مجھے بہو بنانے کی درخواست کی ہو گی تو ضروری نہیں کہ ان کے ذہن میں سعد ... ہوں۔ سعد بھائی کے علاوہ بھی تو آپ کا ایک ... ہے۔"

"اپنی خواہش کو میرے بھائی کی خواہش کا نام ... دو علیزے۔ اس نے جو کچھ کہا مجھے اس کا ایک ... لفظ یاد ہے۔" قدسیہ نے رنجیدگی سے کہا۔ کچھ ... بھتیجی کی بے باکی انہیں پسند نہ آئی تھی۔

"بابا کی خواہش تھی کہ میں بہت سارا پڑھوں۔ پھر ... کیسے اتنی جلدی میری شادی چاہ سکتے تھے؟ پھپھو! آپ میری پڑھائی مکمل ہونے کا انتظار کر سکتی ہیں ... سعد بھائی کے لیے تو شادی کی یہ ہی مناسب عمر ہے ... لیکن میں۔ آپ میرا اور ان کا ایج ڈیفرنس تو دیکھیں ... میں ابھی محض سیکنڈ ایئر کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ آپ ... بتاتی ہیں کہ حسیب جو مجھ سے تین سال بڑا ہے آپ ... دو' چار مہینے بعد اس کی شادی کا سوچ سکتی ہیں؟ کیسے ... ابھی اس کے اسٹیبلش ہونے میں ایک عرصہ پڑا ... ہے۔ پھر ہم لڑکیاں ذرا سا قد نکالتے کے ساتھ ہی سب ... کو شادی کے قابل لگنے لگ جاتی ہیں۔ جیسے زندگی ... ہمارا کوئی اختیار ہی نہیں۔ ڈاکٹر بننا میرا ابھی مشن ... اور میرے بابا کی خواہش بھی۔ آخری نہ سہی ہم ... خواہش تو تھی نا اور جس طرح آپ اپنے بھائی کی ... خواہش پوری کرنا چاہتی ہیں ویسے ہی میرے لیے ... میرے بابا کی خواہش اہم ہے۔ میں پانچ' چھ سال سے ... پہلے شادی کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ آپ سعد بھائی کی ... شادی اسٹالیٹ کر سکتی ہیں؟"

علیزے بھی گہری سنجیدگی سے مخاطب تھی۔ قدسیہ نے اس بار کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اسے محض دیکھ رہی تھیں۔

"سوری پھپھو! میں جانتی ہوں آپ کو میری باتیں بری لگ رہی ہیں اور کسی ایسے شخص کی آنکھوں میں اپنے لیے خفگی دیکھنا جس نے ہمیشہ آپ پر پیار بھری نگاہ ڈالی ہو بہت مشکل کام ہے۔ لیکن میں کیا کروں۔ اگر میں چپ رہوں گی تو صرف میری زندگی نہیں' بلکہ چار زندگیاں متاثر ہوں گی۔ میری' سارہ کی' حسیب کی اور سعد بھائی کی۔ ہم سب کے سب ہمیشہ غیر مطمئن رہیں گے۔

"سارہ بہت صابر بچی ہے۔ وہ تمہاری طرح شور مچاتی یہاں نہیں آئی۔ حالانکہ سب سے زیادہ متاثر وہ ہوئی ہے۔ بچپن سے اس نے اپنے نام کے ساتھ سعد کا نام سنا ہے۔ پسند کرتے ہیں وہ ایک دوسرے کو۔ پھر بھی اس نے نہایت صبر سے کام لیتے ہوئے یہ فیصلہ قبول کرلیا ہے۔"

"میں بھی تو یہ ہی کہنا چاہ رہی ہوں پھپھو کہ کیا سارہ جیسی اچھی لڑکی یہ ڈیزرو کرتی ہے جو ان کے ساتھ ہونے جارہا ہے۔ اگر آپ یہ سمجھ رہی ہیں کہ میں حسیب کی وجہ سے یہ سب کر رہی ہوں تو میرا یقین کریں پھپھو میں حسیب سے مکمل طور پر دستبردار ہوتی ہوں۔ مجھے اپنی باقی زندگی میں اس سے کوئی سروکار نہ ہوگا۔ لیکن میں سارہ اور سعد بھائی کے درمیان قطعی نہیں آسکتی۔ حیرت مجھے اس بات پر ہے کہ بابا بھی اس بات سے واقف تھے۔ پھر انہوں نے کس طرح آپ سے یہ بات کی۔"

وہ پہلے حیران پھر سرہلاتے ہوئے بولی۔

"شاید بابا کو اندازہ ہو گیا تھا کہ زندگی ان سے روٹھنے والی ہے اور وہ مجھے صرف محفوظ ہاتھوں میں دیکھنے کے خواہش مند تھے۔ اور بس۔ حسیب تو انہیں بچہ لگتا ہوگا۔ اس لیے ان کے ذہن میں سعد بھائی کا نام آیا۔ حالانکہ میرا اور سعد بھائی کا تو کوئی میچ ہی نہیں۔"

وہ روہانسی ہو گئی تھی۔ قدسیہ اب خاموشی سے اسے سنے جارہی تھیں۔

"سعد بھائی آپ کے بہت فرماں بردار بیٹے ہیں پھپھو بلکہ آپ کے سب بچے ہی آپ کے بہت فرماں بردار ہیں۔ وہ آپ کی بات مان کر خدانخواستہ مجھ سے شادی تو کرلیں گے۔ لیکن ہمیشہ ایک ان چاہی زندگی گزاریں گے۔ آپ خود بتائیں میں ایک شخص کی زندگی میں کمپرومائز کے تحت کیوں شامل رہوں۔ اور میں پھر کہہ رہی ہوں کہ بھلے سے آپ مجھ جیسی منہ پھٹ لڑکی کو حسیب کے لیے نہ منتخب کریں۔ مگر جو بھی کوئی اور شخص میری زندگی میں شامل ہوگا۔ وہ کم از کم مجھ سے مخلص تو ہوگا۔ سعد بھائی کی ماضی کی محبت سے واقف ہوتے ہوئے میں کیسے ان کے ساتھ خوشگوار زندگی گزار پاؤں گی اور پھر حسیب ہم کبھی بھی ایک دوسرے کا سامنا نہیں کرپائیں گے اور آج کے بعد تو بالکل نہیں۔ شاید آپ صحیح کہتی ہیں کہ لڑکیوں کو شرم و حیا کے دائرے میں رہ کر بات کرنی چاہیے۔ میں بلاوجہ اس کے سر پڑ گئی تھی۔"

بول بول کر علیزے کی توانائیاں ختم ہو چکی تھیں۔ وہ آنسوؤں سے تر چہرے اور سوکھے ہونٹوں کے ساتھ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ گویا اب بولنے کے لیے ایک لفظ نہ بچا ہوا۔

"سوری پھپھو! آپ سے جو بھی بدتمیزی کی اس کے لیے معاف کر دیجیے گا۔"

کچھ لمحوں کے توقف کے بعد اس نے پھر قدسیہ کو مخاطب کیا۔ قدسیہ نے ایک نظر اس کے تمتماتے ہوئے چہرے پر ڈالی۔ گلابی رنگت' بڑی بڑی بھیگی پلکیں' ستواں ناک' چہرے پر کم عمری کا بھولپن' وہ واقعی ابھی بہت چھوٹی تھی۔ کم عقل اور ناسمجھ' حد سے زیادہ جذباتی' لیکن پھر بھی ان کا خون تھی۔ ان کے مرحوم بھائی کی بے حد لاڈلی بیٹی اور انہیں بھی جان سے بڑھ کر پیاری بالکل اپنی سگی اولاد جیسی۔ اس کا آج کا طرز عمل نامناسب سہی' مگر اس بے وقوف سی لڑکی کی سب باتیں تو غلط نہ تھیں۔

"اور جہاں تک میرے بابا کی خواہش کا تعلق ہے

پھپھو تو میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ میرے بابا کی روح کو اس بات سے کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ بلکہ اگر آپ نے ان کی خواہش کو پورا کر ڈالا تو وہ ہمیشہ مضطرب رہیں گے۔ کیونکہ میرے بابا میری آنکھ میں ایک آنسو بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اگر میں ناخوش رہوں گی تو یہ کیسے ممکن ہے کہ بابا کو سکون نصیب ہوگا۔"

وہ اب خود کلامی کے انداز میں بول رہی تھی اور اتنی دیر سے خاموش بیٹھی قدسیہ نے مضطرب ہو کر پہلو بدلا۔ انہوں نے کیسے اس حقیقت کو فراموش کر دیا کہ آفاق کی علیزے میں جان تھی۔ آفاق واقعی اپنی لاڈلی کی آنکھ میں آنسو دیکھ کر تڑپ جاتا تھا۔

"یہاں آؤ علیزے میرے پاس۔" انہوں نے اسے پاس بلایا۔

"تمہارا باپ میرا بھائی تھا۔ مگر میں نے اسے ماں بن کر پالا ہے اور تم اس کی اولاد ہو۔ آفاق کو جتنی تم سے محبت تھی' مجھے اندازہ ہے اور تم اس کی نشانی ہو اور مجھے کتنی عزیز ہو تم چاہو بھی تو اس کا اندازہ نہیں لگا سکتیں۔" قدسیہ کی آواز بھرا گئی تھی۔

"پھپھو۔" علیزے ان سے لپٹ گئی تھی اور ذرا دیر بعد حسیب خالی ہاتھ آیا تو دونوں پھوپھی' بھتیجی ایک دوسرے سے لپٹی آنسو بہانے میں مصروف تھیں۔

"گوشت کی دکان بند ہو گئی۔" اس نے بوکھلائے ہوئے انداز میں مطلع کیا تھا۔

"کھلی بھی ہوتی تو کوئی فائدہ نہیں تھا۔ تم پیسے لے کر جانا بھول گئے تھے۔" قدسیہ نے نم آنکھوں کے ساتھ مسکراتے ہوئے کہا۔

حسیب نے خجل ہو کر سر کھجایا تھا۔

اس کی بوکھلائی ہوئی شکل دیکھ کر علیزے اپنی مسکراہٹ پر قابو نہ رکھ پائی تھی۔ اس کے روئے روئے چہرے پر مسکراہٹ اتنی پیاری' اتنی خوب صورت لگی کہ حسیب کو نگاہیں چرانے پڑ گئیں۔ قدسیہ نے ایک نگاہ علیزے پر ڈالی اور دوسری حسیب پر۔

نٹ کھٹ' جذباتی' مگر صاف شفاف دل [illegible] علیزے ان کی بہت پیاری بھتیجی اور شاید ہو[illegible] چھوٹی بہو بھی اس کی جس جذباتیت اور انداز [illegible] پہلے انہیں غصہ آ رہا تھا۔ اب وہ دل ہی دل [illegible] شکر ادا کر رہی تھیں کہ علیزے کی وجہ سے [illegible] صورت حال کو سمجھ کر صحیح فیصلے پر پہنچنے کا [illegible] مطمئن تھیں اور بے تحاشا خوش بھی۔ لیکن [illegible] اس خوشی میں بہت سے اور لوگوں کو بھی شامل کر [illegible] وہ جو ان کے اپنے تھے اور آج کل بہت رنجیدہ [illegible] پریشان بھی۔ قدسیہ اپنا سیل فون لینے کمرے [illegible] گئیں۔ رفیعہ کے نمبر سے بہت سی مس کالز [illegible] تھیں۔

"الٰہی خیر۔" انہوں نے پریشان ہو کر فوراً" نمبر [illegible] تھا۔

☼ ☼ ☼

رفیعہ' قرآن پاک کی تلاوت کر رہی تھیں۔ جب سارہ ان کے پاس آ کر بیٹھی۔

"کیا بات ہے سارہ۔" انہوں نے سپارہ ختم [illegible] پیار سے دریافت کیا۔

"امی! ایک بات کہوں۔ مانیں گی؟" اس [illegible] جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"اپنی بیٹی کی بات نہیں مانوں گی تو کس کی [illegible] گی۔"

"اس بار نہ تایا ابو کے گھر سے ہمیں افطار پر بلایا [illegible] نہ ہم نے انہیں مدعو کیا۔" سارہ نے رک رک کر [illegible] تھا۔

"پھر؟" رفیعہ سنجیدہ ہوئیں۔

"کیا دونوں گھرانوں کا رشتہ غرض پر قائم تھا امی؟" سارہ رنجیدہ ہوئی تھی۔

"نہیں بیٹے؟" رفیعہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "بھائی بھائی کا رشتہ اٹوٹ ہوتا ہے۔ خون کے بندھن اتنے کچے نہیں ہوتے کہ ان معمولی باتوں پر ٹوٹ جائیں۔ یہ قسمتوں کے کھیل ہیں جس کے [illegible]

[illegible] بے بس اور مجبور ہوتا ہے۔"

"دادی جان بہت اداس رہنے لگی ہیں امی! پہلے [illegible] نے بتایا۔ پاپا نے کہہ دیا کہ آپ لوگوں کو تایا جان کی [illegible] سے کوئی شکایت نہیں' لیکن آپ کو اس کا عملی [illegible] دینا ہوگا۔ اگر چاند ہو گیا تو آج آخری روزہ ہوگا۔ [illegible] آپ انہیں فون کر کے افطاری پر مدعو کریں۔ میں سوچتی ہوں کہ اس بات کی وجہ سے دادی جان کے [illegible] بیٹوں کے گھروں میں وقتی دوری بھی پیدا ہو۔"

رفیعہ بیٹی کو دیکھ کر رہ گئیں۔ اتنی متانت' اتنی سمجھ داری یہ ان کی بے وقوف سی سارہ کا کون سا روپ تھا۔ انہوں نے بے ساختہ اس کی پیشانی چوم لی۔

سیل پھر قدسیہ کے نمبر پر بہت بار ٹرائی کرنے کے باوجود کسی نے کال اٹینڈ نہ کی۔

"ہو بھی ہو سکتا ہے مصروف ہوں۔ میں کچھ دیر بعد ٹرائی کر لوں گی۔" رفیعہ نے سارہ کی مایوس شکل دیکھ کر تسلی دی' مگر اسی لمحے ان کے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ دوسری طرف قدسیہ تھیں۔ پریشان اور متفکر کہ رفیعہ نے کال کیوں کی ہے۔

"سب خیریت ہے بھابھی' بس آپ کو افطاری پر مدعو کرنا تھا۔" رفیعہ نے کوشش کی تھی کہ ان کا لہجہ بالکل پہلے جیسا ہو۔ گرم جوشی اور اپنائیت سے بھرپور۔

"رفیعہ! میری طرف سے معذرت۔ بہت سارا کام باقی ہے۔ ابھی سعد کی دلہن کے لیے عید کا جوڑا اور چوڑیاں بھی لینی ہیں۔ ان شاءاللہ عید ملنے آئیں گے۔"

"ٹھیک ہے بھابھی! جیسے آپ کی مرضی۔"

رفیعہ بدقت مسکرائی تھیں۔ شاید وہ توقع کر رہی تھیں کہ قدسیہ شرمندگی کا اظہار کریں گی۔ جہاں آرا بیگم کی بیلی بات ختم ہونے کا پتا چلنے کے بعد یہ ان کی پہلی ٹیلی فونک گفتگو تھی۔

☼ ☼ ☼

آج چاند رات تھی۔ ہر دفعہ کی چاند رات اور اس بار کی چاند رات میں بہت فرق تھا۔ ہر دفعہ سارہ رمضان المبارک کے اختتام پر شکر کا سانس لیتی تھی۔ وہ بھوک کی کچی تھی اور پچھلے ایک' دو برسوں سے تو روزے اتنے سخت تھے کہ بھوک سے زیادہ پیاس کی شدت نڈھال کر دیتی تھی۔ روزے چھوڑنے کا اس گھر میں کوئی تصور نہ تھا۔ مگر آج دل کی حالت ہی عجیب تھی۔ رمضان المبارک کا بابرکت مہینہ ختم ہو چکا تھا۔ کل عید تھی۔ اللہ کے روزے دار بندوں کو رب کی جانب سے ملنے والا انعام' خوشی کا تہوار' مگر نعمتوں' برکتوں اور سعادتوں کا مہینہ تو ختم ہو چکا تھا۔ اس کے دل میں عجیب سی بے کلی چھا رہی تھی۔ دادی جان بھی یہاں نہ تھیں۔ سعد دو دن پہلے انہیں آ کر لے گیا تھا تو وہ وہیں رک گئی تھیں۔

"کیا مجھے جو صبر ملا' وہ عارضی تھا۔" اس نے خود سے پوچھا' مگر اندر اترتے سناٹوں سے کوئی جواب موصول نہ ہوا۔ اس نے قصداً" خود کو گھر کے کاموں میں الجھایا۔ اپنے اور امی' پاپا کے کپڑے پریس کیے۔ گھر کی تفصیلی صفائی تو پہلے ہی کر چکی تھی۔ پردے' کشن کورز اور بیڈ شیٹس وغیرہ تبدیل کیں۔ پھر کچن میں رفیعہ کی مدد کو چلی گئی۔ چنا چاٹ اور دہی بھلے رفیعہ رات کو بنا کر فریج میں رکھ دیتی تھیں۔ میٹھے میں شمس الحسن کو کھیر پسند تھی' سو کھیر کے ڈونگے بھی ٹھنڈے ہونے کے لیے رات کو فریج کی زینت بن جاتے تھے۔ عید کی صبح کے لیے کوئی قابل ذکر کام نہ ہوتا تھا۔ آس پڑوس سے شمس الحسن صاحب کے کچھ دوست احباب عید ملنے آ جاتے۔ پڑوس کی کچھ خواتین رفیعہ کی شناسا تھیں۔

سارہ مہمانوں کی جلد رخصتی کی منتظر ہوتی کیونکہ اس کے بعد انہوں عید ملنے تایا جان کی طرف جانا ہوتا۔ عید کا پورا دن وہ وہیں گزارتے تھے۔ رفیعہ اور قدسیہ کچن سنبھال کر پرتکلف کھانے کا اہتمام کرتیں۔ عید کے دن انعم اور سارہ کو ماؤں کی طرف سے خصوصی رعایت تھی۔ بچوں کے لیے عید صرف انجوائے کرنے کا نام تھا۔ عموماً" سعد کی ماموں کی فیملی بھی آجاتی تھی۔ علیزے اس سے کافی چھوٹی تھی' لیکن وہ

اتنی دلچسپ لڑکی تھی کہ انسان اس کی کمپنی میں بور نہ ہو سکتا تھا۔ اس کی اور حسیب کی نوک جھونک سے سب ہی خوب محظوظ ہوتے۔ لیکن اس بار وہ علیزے سے خوش دلی سے کیسے مل پائے گی؟ عید کے دن وہاں نہ جانے کا کیا بہانہ بنائے ذہن اسی ادھیڑبن میں تھا۔

"سارہ! کیا بات ہے' بیٹے! کن سوچوں میں گم ہو؟" وہ کھیر کی سجاوٹ کے لیے پستے اور بادام کی ہوائیاں کاٹ رہی تھی۔ جب رفیعہ نے اسے مخاطب کیا۔ وہ یک دم چونکی۔

"نہیں امی! کوئی بات نہیں اور بتائیں کیا کام کروں' یہ تو ہو گیا۔" اس نے پلیٹ ایک طرف کھسکائی۔

"اور کوئی کام نہیں۔ بس تم مہندی لگوا لو اب۔ بینش آتی ہی ہو گی۔" بینش پڑوس میں رہتی تھی۔ اکثر شام کو سارہ سے انگلش پڑھنے آتی تھی۔ مہندی لگانے کی ماہر تھی۔ گزشتہ کئی سالوں سے سارہ چاند رات پر اسی سے مہندی لگواتی تھی اور اب بھی اس کا ذکر کرنے کی دیر تھی۔ وہ بوتل کے جن کی طرح نمودار ہو گئی۔

"سارہ باجی! آپ فارغ نہیں ہوئیں ابھی تک' میں تو آپ کو مہندی لگانے آ بھی گئی۔" آج سارہ کا مہندی لگوانے کا ذرا موڈ نہ تھا۔ مگر وہ رفیعہ پر اپنی پژمردگی ظاہر نہ کرنا چاہتی تھی۔

سو مسکراتے ہوئے مہندی لگوانے بیٹھ گئی۔ بینش نے بہت عرق ریزی سے ڈیزائن بنایا تھا۔

"پلیز جلدی مت دھوئیے گا۔" اس نے جاتے جاتے درخواست کی اور رات کو سونے سے قبل جب سارہ نے ہاتھ دھوئے تو مہندی کا رنگ دیکھ کر حیران رہ گئی۔ جہاں آرا بیگم کہتی تھیں جس کی ہتھیلیوں پر حنا زیادہ رنگ چھوڑ جائے وہ پیا کی من چاہی ہوتی ہے۔ سارہ کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"اے اللہ میرے دل کو قرار دے دے۔" رات کو سونے سے پہلے یہ ہی دعا اس کی زبان پر تھی اور پھر وہ کب نیند کی وادیوں میں اتری' پتا بھی نہ چلا۔

☆ ☆ ☆

"جیتی رہو' سدا خوش رہو۔" پاپا عید کی ن
آئے تو سارہ نے انہیں سلام کر کے عید کی م
دی تھی۔ جواب میں شمس الحسن نے بیٹی
کی پیشانی چوم کر دعا دی' پھر والٹ نکال کر ہزار
سے نوٹ اس کی ہتھیلی میں تھما دیے۔

ان کی محبت پر اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

اس نے نہا کر نیا سوٹ تو پہن لیا تھا اور بادامی کھلتی ہوئی رنگت پر سبز رنگ بہت جچ بھی رہا تھا اور کسی سنگھار کا اہتمام نہ کیا تھا۔

"سارہ بیٹے! چوڑیاں تک نہیں پہنیں اور کو لپ اسٹک ہی لگا لو۔"

"کیوں امی' بنا میک اپ کے اچھی نہیں لگ رہی۔" سارہ نے مسکرا کر پوچھا۔

"میری بیٹی اتنی پیاری ہے کہ ہر روپ میں اچھی لگتی ہے۔ لیکن بیٹا عید خوشی کا موقع ہے' ذرا سا سنگھار تو بنتا ہے نا آج کے دن۔" انہوں نے پیار سے اسے دیکھا۔

"میں تیار ہونے ہی لگی تھی امی! بس پاپا کی آواز تو عید مبارک کہنے آ گئی۔" اس نے ماں کو مطمئن
ورنہ آج صبح سے آنکھیں بار
گیلی ہوئی جا رہی تھیں۔ اتنے میں ہی باہر سے عید مبارک کی کئی آوازیں بیک وقت بلند ہوئی تھیں۔ سارہ کے لیے وہ آوازیں اجنبی نہیں تھیں۔ اس کا دل بے اختیار دھڑک اٹھا۔ باہر جو خوشگوار سا ہنگامہ اچانک برپا ہوا تھا اس کا سبب یقیناً" تایا جان کی فیملی کی آمد تھی۔

"عید مبارک سارہ آپی۔" انعم نے کمرے میں جھانکا۔ سارہ اٹھ کر اس سے گلے ملی۔

حسیب اور علیزے بھی کمرے میں آ پہنچے۔ سارہ کم از کم اس وقت یہاں علیزے کی آمد کی توقع نہیں کر رہی تھی۔ مگر جب علیزے نے اس سے گرم جوشی سے لپٹ کر عید مبارک کہا تو سارہ نے دل میں خود کو ڈپٹا تھا۔

"جو کچھ ہوا اس میں علیزے کا تو کوئی قصور نہ

تو ویسے بھی اب وہ تایا جان کی فیملی کا حصہ تھی۔ یہ حقیقت تلخ سہی۔ مگر قبول تو کرنی ہے نا۔"

وہ علیزے سے جواباً" اسی گرم جوشی سے ملی۔

"بہت ڈھیٹ لڑکی ہے سارہ آپی! شرم و حیا تو اس میں ہم کو تو نہیں حالانکہ یہاں عید ملنے کے بعد ہم سب نے ماموں کے گھر ہی جانا ہے محترمہ کو انگوٹھی پہنانے۔ مگر صبح ہی صبح گھر میں ٹپک پڑی۔ ایسا شخص جو گلے کا ہار بن جائے۔ عرف عام میں ڈھیٹ ہی کہلاتا ہے نا سارہ آپی؟" حسیب علیزے کو چھیڑ رہا تھا۔ سارہ کا چہرہ یکلخت سفید پڑا۔

"یہ جھوٹ بول رہا ہے سارہ آپی! پھپھو نے مجھے خود بلوایا ہے۔ صبح صبح سعد بھائی مجھے لینے پہنچ گئے تھے۔" علیزے نے احتجاج کیا تھا۔

"سعد بھائی۔" سارہ نے دل میں دہرایا۔ عادت جاتے جاتے ہی جائے گی۔ آخر بچپن سے وہ اسے بھائی کہتی آئی تھی۔

"میں دادی جان اور تائی جان سے تو مل لوں۔" سارہ کو خود کو کمپوز رکھنے میں دقت ہو رہی تھی۔

"ہاں" آئیں نا' سب آپ کا پوچھ رہے ہیں۔" انعم نے اسے پیار سے دیکھا تھا اور وہاں ڈرائنگ روم میں جانا کب آسان تھا۔ سامنے ہی وہ دشمن جاں بیٹھا نظر آ رہا تھا۔ مگر پھر دل کڑا کر کے وہ اندر داخل ہوئی اور سب کو اجتماعی سلام کر ڈالا۔

سب سے پہلے جہاں آرا بیگم نے اسے گلے لگا کر بھینچ کر پیار کیا تھا۔

"میں آپ سے ناراض ہوں دادی جان! کہا تھا نا میں اکیلی ہوں' پھر بھی وہاں رہ گئیں۔" ان کے سینے سے چمٹ کر اس نے ہولے سے شکوہ کیا۔

دادی جان نے اسے پیار سے الگ کیا تو قدسیہ نے اسے لپٹا لیا تھا۔ وہی اپنائیت' وہی محبت' قدسیہ ہمیشہ اسے اپنی دوسری بیٹی کہتی تھیں۔ اب وہ ان کی بہو بننے نہ جا رہی تھی تو کیا ہوا بیٹی تو تھی۔ اس نے خود کو سمجھایا تھا۔ پھر تایا جان کے سامنے سر جھکا دیا۔ ہمیشہ کی طرح اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے انہوں نے بے شمار

دعاؤں سے نوازا تھا۔

ایک غیر ارادی نگاہ تایا جان کے ساتھ بیٹھے سعد پر پڑی۔ اس کی آنکھوں میں چاہتوں کا ایک جہان آباد تھا۔ نظر کا دھوکا۔ سارہ نے خود کو تاویل دی۔ مگر سعد کی حدت بھری پر شوق نگاہیں بار بار اس کے چہرے کا طواف کرتی رہیں۔ سارہ خود کو زیادہ دیر نہ جھٹلا پائی تھی۔ وہ ہمیشہ کی طرح اسے بنا کچھ کہے، بہت محبت سے تک رہا تھا۔

"آخر کیوں۔ اب یہ مجھے دیکھنے کا ہر حق کھو بیٹھا ہے۔" سارہ کے اعصاب چٹخنے لگے تھے۔ وہ چپ چاپ جہاں آرا بیگم کے پہلو میں جا بیٹھی۔

"آج کا دن بہت مبارک ہے۔ میں عید کی ان خوشیوں بھری ساعتوں کو کھونا نہیں چاہتی۔ تم لوگ بعد میں بھلے سے بڑے پیمانے پر تقریب منعقد کر لینا۔ دنیا والوں کو اکٹھا کر لینا، لیکن میں تو آج ہی اپنے بچوں کی خوشی مناؤں گی۔" جہاں آرا بیگم نے بیٹوں بہوؤں کو مخاطب کیا تھا۔ سارہ نے الجھ کر انہیں دیکھا۔

"بڑے پیمانے پر تو اماں اب شادی کی تقریب ہی منعقد ہو گی۔ رفعہ! میں کہے دے رہی ہوں، میں نے بقر عید کے چاند پر شادی کی تاریخ رکھ لینی ہے۔" قدسیہ نے بہت مان سے دیورانی کو مخاطب کیا۔

"بھابھی جان! تیاری کے لیے یہ تو بہت کم عرصہ ہے۔" شمس الحسن کو فکر دامن گیر ہوئی۔ سارہ ٹکر ٹکر سب کی شکلیں دیکھ رہی تھی اور سعد کی متبسم نگاہیں سارہ پر مرکوز تھیں۔

"اگر تیاری سے تمہاری مراد جہیز وغیرہ کی خریداری ہے شمس الحسن! تو یہ خیال تم ذہن سے نکال دو۔ اس بات کو مذاق نہ سمجھنا۔ یہ تمہارے بڑے بھائی کا حکم ہے۔ ہم دونوں بھائی خود کو بہت روشن خیال سمجھتے ہیں۔ ہمیں اس پر عمل بھی کر کے دکھانا ہو گا۔ اس رسم کے خاتمے کی ابتدا اپنے گھر سے کرنی ہو گی۔" وجیہہ الحسن نے دو ٹوک انداز میں بھائی کو مخاطب کیا۔

"اچھا بس بھئی، یہ باتیں بعد میں طے ہوتی رہیں گی قدسیہ بیٹی! انگوٹھی نکالو۔" جہاں آرا بیگم نے ان لوگوں کی گفتگو میں مداخلت کی تھی۔

"جی اماں۔" قدسیہ سعادت مندی سے فوراً حکم بجا لائیں۔ انہوں نے پرس میں ہاتھ ڈال کر ڈبیا برآمد کی تھی اور ڈبیا جہاں آرا بیگم کے ہاتھ میں دی۔ دادی اور تائی کے درمیان ہونق بنی بیٹھی سارہ اب کچھ کچھ صورت حال کو سمجھنے لگی تھی۔

"ہاتھ دکھاؤ بیٹی۔" جہاں آرا بیگم نے انگوٹھی نکالتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ سارہ کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے برف ہو چکے تھے۔ زندگی میں یہ پہلا تجربہ تھا کہ اچانک ملنے والی خوشی میں بھی حواس ساتھ چھوڑنے لگتے ہیں۔ اس نے میکانکی انداز میں ہاتھ آگے بڑھایا تھا۔ اگلے ہی پل جڑاؤ انگوٹھی اس کی انگلی کی زینت بن چکی تھی۔ پہلے جہاں آرا بیگم نے پیشانی چوم کر دعا دی تھی۔ پھر قدسیہ نے اسے دوبارہ خود سے لپٹا لیا۔

"چند دن کا جو بھی کرب تم نے جھیلا، اس کے لیے اپنی تائی کو معاف کر دینا بیٹی۔" انہوں نے سرگوشی کی تھی۔

"بس کریں تائی جان۔" سارہ کی آنکھیں جھلملا گئی تھیں۔

"بھئی۔ اس خوشی کے موقع پر منہ بھی تو میٹھا ہونا چاہیے۔ سارہ بیٹے تمہاری تائی جان مٹھائی کا ٹوکرا بھی ہمراہ لائی ہیں۔ جاؤ پلیٹ میں مٹھائی نکال لاؤ۔" وجیہہ الحسن نے اسے محبت سے دیکھتے ہوئے مخاطب کیا۔

"جی تایا جان۔" سارہ تیزی سے اٹھی۔ سامنے براجمان سعد سب کی موجودگی سے بے نیاز اپنی مخصوص مسکراہٹ چہرے پر سجائے اسی کے چہرے کا مسلسل طواف کیے ہوئے تھا۔

"جاؤ انعم! تم بھی بہن کا ہاتھ بٹاؤ۔" کمرے سے باہر نکلتی سارہ کے کانوں میں تائی جان کی آواز پڑی تھی۔ کچن میں جانے کے بعد کئی منٹ گزر گئے۔ انعم آ نہ دی۔ وہ ہی تھی جو ساری گتھی سلجھا سکتی تھی۔

سارہ نے پہلے مٹھائی پلیٹ میں نکالی۔ پھر گلاس اسٹینڈ پر سے گلاس اتار کر ٹرے میں سجائے تھے

برف کے کیوبز نکالنے کے لیے فریج کی طرف مڑی ہی تھی کہ پیچھے سے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ یہ انعم نہیں تھی۔ جو تھا سارہ اس کی ہر آہٹ پہچانتی تھی۔ آج جانے کیوں پیچھے مڑ کر اس کا سامنا کرنا دشوار لگا تھا۔ پھر بھی اس نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ وہ سعد ہی تھا۔

"نہ سلام نہ دعا، نہ عید کی مبارک! آپ سے اس درجہ بے مروتی کی امید نہ تھی محترمہ۔" سعد مسکراتے ہوئے مخاطب تھا۔ چند پل لگے تھے سارہ کو اپنی شرم، گھبراہٹ اور جھجک پر قابو پانے میں۔ یہ وہی سعد تو تھا۔ پرانا والا۔ اس کا اپنا اس سے بھلا کیا گھبرانا۔

"السلام علیکم۔ جیتے رہو اور عید مبارک۔" اس نے پوری سنجیدگی سے تینوں کام بیک وقت نپٹا دیے۔ سعد کھل کر مسکرا دیا تھا۔

"امی اور دادی دونوں نے میرے ساتھ فاؤل کھیلا۔ میں نے گھر سے نکلنے سے پہلے دونوں خواتین کو بتا دیا تھا کہ انگوٹھی میں خود پہناؤں گا۔ مگر انگوٹھی دادی نے پہنا دی۔ پیار بھری سازش امی نے کر ڈالی۔ میرا کردار دودھ میں سے مکھی کی طرح باہر نکال پھینکا۔"

"تم سب کے سامنے مجھے انگوٹھی پہناتے۔ شرم کرو سعد! یہ کوئی مناسب بات لگتی۔" اس نے اسے خفگی سے ٹوکا تھا۔

"تو گویا تمہیں اعتراض سب کے سامنے پر ہے۔ مجھ سے انگوٹھی پہننے پر نہیں؟" اس نے سنجیدگی سے گردن ہلاتے ہوئے نتیجہ اخذ کیا۔ سارہ نے فقط اسے گھورنے پر اکتفا کیا تھا۔

"بہر حال میں آج ہی جیولر کو ایک اور رنگ کا آرڈر دے دیتا ہوں۔ امی کا پکا پروگرام ہے کہ عید قرباں پر میری بھی قربانی کر دی جائے گی۔ پھر تو شرعی اور قانونی طور پر تم میری ہو جاؤ گی۔ انگوٹھی پہناؤں یا کنگن۔ سب کے سامنے پہناؤں یا اکیلے میں۔ تم سمیت کسی کو جب تو کوئی اعتراض نہ ہو گا۔" وہ مسکراہٹ چھپاتے ہوئے بظاہر سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

وہ خود کو مصروف ظاہر کرنے کو جلدی جلدی گلاسوں میں کیوبز ڈالنے لگی۔ سعد نے اس سے بغیر کولڈ ڈرنک گلاسوں میں انڈیلنی شروع کر دی۔ کچھ لمحے بالکل خاموشی سے کٹے تھے۔

"جانتی ہو سارہ کچھ دنوں پہلے کی بات ہے۔ میں نے دستبرداری اختیار کر چکا تھا۔" خاموشی سے بیتے تھے اور اب وہ واقعی سنجیدہ تھا۔

"جانتی ہوں۔" اس نے اقرار کیا۔

"تمہیں مجھ پر غصہ تو آیا ہو گا۔ دل ہی دل میں مجھے بے وفا کا خطاب بھی دے ڈالا ہو گا۔" وہ دھیمے سے مسکراتے ہوئے مخاطب ہوا تھا۔

"سعد! تم نے امی ابا کا مان رکھا تھا۔ میں تم سے جب ناراض ہوتی اگر تمہیں جانتی نہ ہوتی۔ مجھے علم تھا کہ ضبط کے کن کڑے مراحل سے گزر کر تم ہر فیصلے پر پہنچے ہو۔ میں اسے تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کر چکی تھی۔ مجھے تم سے یا کسی اور سے کوئی گلہ نہ تھا۔" وہ سادگی اور سچائی سے گویا ہوئی تھی۔ سعد بس اسے دیکھتا رہ گیا۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو۔" وہ مسکرائی۔

"تم بہت اچھی ہو سارہ۔ اللہ کی طرف سے ملنے والا میری زندگی کا خوب صورت ترین تحفہ۔"

"ویسے، یہ سب کیسے ہو گیا؟ میرا ذہن ابھی تک اس حقیقت کو قبول نہیں کر رہا۔" سارہ نے بات بدل دی، مگر جو کہا وہ بالکل سچ تھا، وہ ابھی تک حیرت پر قابو نہ پا سکی تھی۔

اسی وقت ہی پیچھے سے حسیب آگیا۔

"بھائی آپ شاید پانی پینے آئے تھے اور سارہ آپی آپ مٹھائی لینے۔"

"سعد بھائی! عید مبارک کہنے میں صرف دو منٹ لگتے ہیں۔" انعم اور علیزے بھی آن پہنچے تھے۔

"سارہ آپی! میں آپ کی ہیلپ کروانے کچن میں آنے لگی تھی کہ بھائی نے میرے قریب سے گزرتے ہوئے سرگوشی کی کہ دو منٹ بعد آنا، میں سارہ کو عید مبارک کہہ آؤں۔" انعم نے شرارت سے سعد اور سارہ کو دیکھا تھا۔ سارہ جھینپ گئی۔

"مڑی تم بھی سارہ آپی سے کچھ شرم، حیا ادھار لے لو۔ بس بے تکلفی سے ہونے والے منگیتر کے ساتھ دم بھی بنی پھر رہی ہو۔" حسیب نے سارہ کی شرمائی شکل دیکھ کر ہنستے ہوئے علیزے کو چھیڑا تھا۔

"کیا چکر ہے؟ میں تو سمجھ رہی تھی کہ تم لوگوں نے ... کے بعد مجھ سے مذاق کیا تھا۔" سارہ کو صورت حال کی سمجھ اب جا کر آئی تھی۔

"ہمارے ملاپ کا سارا کریڈٹ اس چھٹنکی کو جاتا ہے سارہ۔" سعد نے پیار سے علیزے کے سر پر چپت لگائی۔

"سعد بھائی! میرا نام تو مت بگاڑیں۔ آخر میں آپ کی ہونے والی بھاوج ہوں۔" علیزے ٹھنکی تھی۔

"اس بار تو کہہ دیا، مگر خدا کے لیے آئندہ کسی کے سامنے یہ بات مت کرنا۔" حسیب نے اس کے سامنے باقاعدہ ہاتھ جوڑے تھے۔ سارہ، انعم اور سعد کا ہنستے ہنستے برا حال تھا۔

"کیوں میں نے کچھ غلط کہہ دیا؟" وہ ہونق بنی پوچھ رہی تھی۔

"آپ نے کچھ غلط نہیں کہا محترمہ! آپ نے بالکل صحیح وقت پر صحیح بات کی۔ آپ کی جرات پر تو آپ کو ستارہ جرات ملنا چاہیے۔" حسیب اسے پھر چھیڑ رہا تھا۔

انعم ہولے ہولے سارہ کو ساری تفصیل بتا رہی تھی۔

"بس سارہ آپی ہم سمجھ رہے تھے کہ حسیب آپ کے اور بھائی کی وجہ سے سب سے روٹھا بیٹھا ہے۔ ہماری طرح اس کو بھی آپ کا تعلق ٹوٹنا گوارا نہ تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ اس میں تو ان کا اپنا نقصان ہونے جا رہا تھا۔ جب ہی مجنوں بنے گھوم رہے تھے۔" انعم نے شرارت سے بھائی کو چھیڑا تھا۔

"جی نہیں، اگر میرا معاملہ نہ ہوتا تب بھی میرا اصولی موقف وہی ہوتا۔ ہم سعد بھائی کے ساتھ آپ کے علاوہ کسی کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔" حسیب نے اپنی پوزیشن واضح کرتے ہوئے سارہ کو مخاطب کیا۔

"اب ہم سب مل کر آفاق ماموں کی طرف جائیں گے۔ علیزے کو بھی منگنی کی انگوٹھی پہنائیں گے۔ بے شک شادی میں ایک طویل عرصہ پڑا ہے۔ مگر رشتہ تو استوار ہو جائے گا۔ اگر بچپن میں ہماری بھی منگنی وغیرہ ہو گئی ہوتی تو یہ کھڑاگ پیدا ہی نہ ہوتا۔" سعد نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

"کوئی بھی بندھن اتنا مضبوط نہیں ہوتا سعد! یہ سب قسمتوں کے چکر ہیں۔ اللہ کا ہماری ذات پر احسان ہے کہ اس نے ہمارے دل کی خوشی کو ہماری تقدیر کر دیا۔"

سارہ دل ہی دل میں سعد سے گویا ہوئی تھی۔ پھر جلدی سے ٹرے میں مٹھائی کی پلیٹ اور کولڈ ڈرنک کے گلاس لیے ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئی۔ ابھی اس نے سب بڑوں کا منہ میٹھا کروانا تھا۔ علیزے وغیرہ کی طرف جانے سے پہلے از سر نو اپنی تیاری کا جائزہ لینا تھا اور ہاں۔ اس سے پہلے اپنے رب کی بارگاہ میں دو نفل شکرانے کے بھی ادا کرنے تھے۔ اسے مانگنے کا سلیقہ نہ آتا تھا۔ اس نے خود کو رب کی رضا کے سپرد کر دیا تھا اور اس مہربان ذات نے اس کا دامن خوشیوں سے بھر دیا تھا۔ شکرانہ تو واجب تھا۔

☆

نظیر فاطمہ

"چلو اچھا ہوا تم بھول گئے
اک بھول ہی تھا میرا پیار ہو ساجنا۔۔۔!"

سحر بے سرے پن سے تان لگاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے دھلے ہوئے خشک کپڑوں کی ٹوکری اٹھا رکھی تھی۔ اس نے وہ ٹوکری امی کے تخت پر رکھی اور خود بھی جھومتے جھامتے وہیں ڈھیر ہو گئی۔

"ارے لڑکی! تمہیں کتنی بار کہا ہے کہ ہر وقت یہ بے ہنگم چیخ و پکار مت کرتی رہا کرو۔" یاسمین اس کے ہر وقت کے گنگنانے کے شوق سے عاجز آئی ہوئی تھیں۔

"ہائے اللہ امی جی! میرے فن کی ناقدری تو نہ کریں۔" وہ یک دم پرانی اداس ہیروئن کی طرح اپنا دوپٹا انگلی پہ لپیٹنے کھولنے لگی۔

"ارے ہٹو! جلدی سے یہ کپڑے ٹھکانے لگاؤ اور پھر کچن میں چل کر میری کچھ مدد کرواؤ۔ ابھی تمہارے بھائی بھوک بھوک کا شور مچاتے پہنچ جائیں گے۔" انہوں نے اس کے بازو پر دھپ لگا کر اسے حقیقت کی دنیا میں واپس کھینچا۔ وہ برے برے منہ بنا کر کپڑے تہہ کرنے لگی۔

"امی حضور! بہت دن ہو گئے آپ کی ہمشیرہ صاحبہ تشریف نہیں لائیں۔" اس کی زبان پھر پھر کھلی ہوئی۔

اب کے بات چونکہ امی کے مطلب کی تھی سو بغیر غصے کے فوراً جواب آیا۔

"ہاں کافی دن ہو گئے' آپا نے چکر بھی نہیں لگایا اور فون بھی نہیں کیا۔ آج شام کو فون کر کے ان کی خیریت پوچھوں گی۔ پہلے تو انہوں نے کبھی اس طرح نہیں کیا۔ اچھا خیر! تم جلدی سے یہ کام ختم کر کے کچن میں آؤ اور روٹیاں بنالو۔ میں ذرا ہانڈی بھون کر اتار لوں۔" وہ اپنی چپلیں پہن کر کمرے سے چلی گئیں۔

"او میرے شوخ صنم' او میرے شوخ صنم!" سحر میدان صاف دیکھ کر دوبارہ اپنے شوق کی تکمیل میں مصروف ہو گئی مگر آواز اتنی رکھی کہ کچن تک نہ جائے ورنہ یاسمین کے ہاتھوں شامت یقینی تھی۔

☼ ☼ ☼

سحر ایک بہن اور ایک بھائی سے چھوٹی تھی۔ سحر اس کے بعد دو بھائی کالج میں پڑھ رہے تھے۔ اس کی بڑی بہن کی شادی کو سال ہونے کو آیا تھا۔ جب تک کبھی سحر نے ہل کر پانی تک نہ پیا تھا۔ مگر اس کی شادی کے بعد تو گویا سحر کی حقیقی معنوں میں شامت آگئی تھی۔ نکمی نہیں تھی بس تھوڑی سی لاپروا تھی۔ بی اے کے پیپرز کے بعد وہ سارا دن امی کی ہدایات کے مطابق کام کرتی' غلطی کی صورت میں ڈانٹ کھاتی اور اپنے شوق کتابیں پڑھنا اور گانے گانا بھی پورے کرتی۔

شام کو سحر نے صحن دھو کر صاف ستھرا کیا اور ساتھ ہی پودوں کو بھی نہلا کر تازہ دم کر دیا۔ اطلاعی گھنٹی بجنے پر اس نے دروازہ کھولا تو سامنے اس کی خالہ جان کھڑی تھیں۔

"السلام علیکم خالہ جان!" اس نے انہیں اندر آنے کا راستہ دیا۔

"وعلیکم السلام میری جان! کیسی ہو؟" انہوں نے اسے خود سے لپٹا لیا۔ وہ انہیں کمرے میں بٹھا کر کچن میں آ گئی۔

"امی حضور! آپ کی ہمشیرہ صاحبہ تشریف لائی ہیں۔ آپ ان کے پاس جا کر بیٹھیں' میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔" اس نے ایک لوا سے اطلاع دی۔

انہوں نے بریانی کو دم پر رکھا اور ہاتھ دھو کر کچن سے باہر نکل گئیں۔

وہ چائے لے کر کمرے میں آئی تو اسے کمرے کا ماحول کچھ سنجیدہ بلکہ قدرے رنجیدہ سا لگا۔ اس نے خالہ جان کو چائے پکڑاتے ہوئے انہیں غور سے دیکھا تو اسے لگا جیسے وہ روئی ہوں۔ اس کی خالہ جیسی زندہ دل خاتون کا رونا اس کے لیے حیرت کا باعث تھا۔ اس نے امی کی طرف دیکھا تو وہ بھی کسی سوچ میں گم تھیں۔

"کیا ہوا امی؟" اس نے بے ساختہ پوچھا۔

"کچھ نہیں' تم جاؤ جا کر سلاد اور رائتہ بنالو۔" انہوں نے سحر کو صاف ٹالا تھا۔

خالہ ایک رات رک کر اگلے دن اپنے گھر چلی گئیں۔ جاتے وقت امی نے ان کا ہاتھ تھام کر کہا "آپا! آپ زیادہ پریشان نہ ہوں۔ میں کچھ روز میں آؤں گی پھر دیکھتے ہیں کہ اس مسئلے کو کیسے حل کیا جا سکتا ہے۔"

سحر کو کھد بد ہونے لگی مگر اسے امی سے پوچھنا مناسب نہ لگا۔

☼ ☼ ☼

خالہ کی دو بیٹیاں اور دو بیٹے تھے۔ خالو کا اپنا چھوٹا لیکن چلتا ہوا کاروبار تھا۔ گھر میں خوشحالی اور سکون تھا۔ انہوں نے تقریباً" دو سال پہلے اپنی بڑی بیٹی ماہرہ اور اس سے چھوٹے بیٹے اسد کی ایک ساتھ شادیاں کی تھیں۔ ماہرہ بیاہ کر دوسرے شہر چلی گئی تھی۔ اسد کے بعد یاسر تھا' جو دبئی میں ملازمت کرتا تھا اس کے بعد سب سے چھوٹی انیقہ تھی۔ انیقہ بہت ہی خود پسند اور نک چڑھی سی تھی۔ سحر کی ہم عمر تھی مگر سحر کی کبھی بھی اس سے نہیں بنی تھی۔ بس دور دور سے سلام دعا تھی۔

اگلے روز شام تک بلی تھیلے سے باہر آ ہی گئی۔ قصہ یہ تھا کہ دو سال پہلے اسد کی شادی فائزہ سے ہوئی تھی جو خاصی خوبصورت اور اس سے بڑھ کر خوب سیرت تھی۔ اسد اور فائزہ کی تقریباً" ایک سال کی بیٹی بھی تھی۔ یہاں تک تو سب ٹھیک تھا مگر بقول خالہ ہوا یہ تھا کہ فائزہ نے خوامخواہ گھر والوں سے لڑنا جھگڑنا شروع کر دیا تھا۔ خالہ تک کو پلٹ کر جواب دینے لگی تھی اور انیقہ سے تو اس کی بالکل نہیں بنتی تھی۔ خالہ ان تمام حالات کی ذمہ دار فائزہ کو ٹھہرا رہی تھیں۔ سحر کو یہ سب سن کر بہت حیرت ہوئی تھی کیونکہ پچھلے دو سالوں میں وہ جب بھی خالہ کے گھر گئی' فائزہ ان کے ساتھ بہت محبت اور عزت سے پیش آئی تھی۔ خالہ بھی اس سے بہت خوش تھیں کہ اس نے سارا گھر بڑے اچھے طریقے سے سنبھال لیا تھا۔ پھر اب ایسا کیا ہو گیا کہ وہ یوں سب سے لڑنے جھگڑنے لگی تھی۔

☆ ☆ ☆

"آپا بہت پریشان تھیں۔ مجھے تو سمجھ میں نہیں آرہا کہ فائزہ تو اتنی سمجھ دار لڑکی ہے، وہ ایسا کیوں کررہی ہے؟ کیوں اپنے گھر کا سکون برباد کررہی ہے؟ آپا کہہ رہی تھیں کہ وہ بھائی صاحب سے بات کرتی ہیں تو وہ انہیں ہی درگزر کا مشورہ دیتے ہیں۔" امی ابو سے بات کررہی تھیں۔

"تم ایسا کرو کہ دو تین دن کے لیے آپا کی طرف چلی جاؤ اور خاموشی سے حالات کا جائزہ لو اور کوشش کرکے فائزہ کے اس بدلاؤ کی وجہ تلاش کرو۔ تب ہی یہ مسئلہ حل ہوسکے گا۔ آپا نے تو سارا الزام اس پر رکھ دیا ہے مگر کچھ زیادتی تو ان کی طرف سے بھی ہو رہی ہوگی، جو وہ یوں بدل گئی ہے۔" سحر کے ابو نے یاسمین کو مشورہ دیا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں اس جمعے کو دو تین دن کے لیے آپا کی طرف جاتی ہوں۔" وہ اپنے میاں سے سو فیصد متفق تھیں۔

"امی! میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گی۔" سحر نے جھٹ سے کہا۔

"تم بھی جاؤ گی تو پیچھے گھر میں کون رہے گا؟" انہوں جواباً اسے گھورا۔

"ابو، بھائی، جنید اور احد۔" اس نے آرام سے سب کے نام انگلیوں پر گنوادیے۔

یاسمین نے اپنے سوال کا الٹا جواب سن کر سر تھام لیا۔ "بے وقوف لڑکی! میں یہ کہہ رہی ہوں کہ تمہارے ابو اور بھائیوں کے کھانے پینے کا کیا ہوگا؟" انہوں نے آنکھیں دکھائیں۔

"امی! ہم جانے سے پہلے دو تین سالن بنا جائیں گے۔ پلیز امی!" وہ ملتجی تھی۔

"اسے بھی ساتھ لے جانا، ہم لوگ کچھ نہ کچھ کرلیں گے۔" ابو نے اس کی حمایت کی تو وہ مسکرادی۔

☆ ☆ ☆

جمعے کی صبح ہی یاسمین اور سحر خالہ کے گھر چلی گئیں۔ سحر کو اپنے خالو کی ایک کمرے کی لائبریری بہت پسند تھی۔ ان کا انتخاب بہت منفرد تھا۔ وہ ان کے گھر آنے کے بہانے ڈھونڈا کرتی تھی تاکہ وہ ان کتابوں کو پڑھ سکے۔ خالو کو اچھی کتابیں پڑھنے اور جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ خالو کے کسی بچے کو یہ شوق نہ تھا۔ جب سحر آتی اور ان کی لائبریری میں گھس کر کتابیں پڑھتی اور پھر ان کے انتخاب کی تعریفیں کرتی تو وہ بہت خوش ہوتے۔ اس کے شوق کے پیش نظر خالو نے اسے اجازت دے رکھی تھی کہ وہ جب چاہے ان کی لائبریری میں جاسکتی ہے۔ ورنہ کسی اور کو وہاں جانے کی ہرگز اجازت نہ تھی۔ اب بھی وہ چائے وغیرہ پی کر خالہ سے لائبریری کی چابی لے کر وہاں جا گھسی تھی۔

☆ ☆ ☆

"امی! آپ نے کچھ محسوس کیا ہے؟" رات کو سحر نے ان کے پاس لیٹتے ہوئے کہا۔

"کیا؟" انہوں نے استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"یہ انیقہ، فائزہ بھابھی کے ساتھ کتنی بدتمیزی سے بات کرتی ہے جیسے وہ ان کی ملازمہ ہوں۔"

سحر کی بات سے ان کے ذہن میں کچھ کلک ہوا۔ وہ اپنی لاپرواسی بیٹی کی عقل مندی کی قائل ہوئی تھیں کہ جو بات وہ اب تک محسوس نہ کرسکی تھیں اس نے نہ صرف اسے محسوس کیا تھا بلکہ بیان بھی کردیا تھا۔ پھر انہوں نے اگلے دو روز سحر کی بات کی روشنی میں حالات کا باریک بینی سے جائزہ لیا تو وہ اس گتھی کو سلجھانے میں کامیاب ہوگئیں۔ انہیں وہ وجہ معلوم ہوگئی تھی جو آپا کے گھر کا سکون برباد کررہی تھی۔ وہ مطمئن ہوگئیں کہ اب یہ مسئلہ حل ہوجاتا تھا۔

رات کا کھانا کر سب اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔

"آپا! آپ نماز پڑھ کر میری بات سنیے گا۔" یاسمین نے وضو کرکے اپنے کمرے میں جاتی آپا کو پکارا۔ وہ سر ہلاتے ہوئے آگے بڑھ گئیں۔

"آپا! بہت غور کرنے کے بعد آپ کے گھر کے جھگڑوں کی جو وجہ مجھے سمجھ آئی ہے وہ انیقہ کی فائزہ کے ہر چھوٹے بڑے معاملے میں دخل اندازی ہے۔" نماز سے فراغت کے بعد وہ بہن سے گویا ہوئیں۔

"کیا مطلب؟ میں تمہاری بات سمجھی نہیں۔" انہوں نے وضاحت چاہی۔

"آپا! آپ نے شاید یہ بات نوٹ نہیں کی کہ فائزہ آپ یا بھائی صاحب کی ہر بات کا جواب بڑی تمیز اور تہذیب سے دیتی ہے۔ بلکہ اگر آپ غصے میں اسے کچھ کہہ بھی دیں تو وہ پلٹ کر جواب نہیں دیتی۔"

آپا سوچنے لگیں۔ واقعی ابھی کل ہی انہوں نے صحن گندا ہونے پر اسے سرزنش کی تھی اور اس نے تحمل سے "اچھا امی! ابھی صاف کردیتی ہوں" کہہ کر بات ختم کردی تھی۔

"مسئلہ تب پیدا ہوتا ہے جب انیقہ اس کے ہر معاملے میں نکتہ چینی کرتی ہے تو پھر وہ اس کے روبرو ہوجاتی ہے۔ ایسی صورت میں آپ ہمیشہ انیقہ کی حمایت کرتی ہیں کہ اگر ایسا کہہ دیا یا کردیا تو کیا ہوا۔ جب آپ انیقہ کی بے جا حمایت کرتی ہیں تو وہ آپ سے بھی لڑ پڑتی ہے۔" یاسمین نے بڑی سمجھ داری سے ساری صورت حال ان کے سامنے واضح کی۔

"میں نے ان دو روز میں انیقہ کو تین چار بار اس سے خوامخواہ الجھتے ہوئے دیکھا ہے۔ ابھی صبح کی بات ہے کہ فائزہ کو اٹھنے میں تھوڑی سی دیر ہوگئی تو انیقہ نے اسے بہت ہی بدلحاظی سے ٹوکا کہ گھر میں مہمان ہیں اور آپ اب اٹھ رہی ہیں۔ وہ تو شاید ہمارا لحاظ کرکے خاموش رہی ورنہ آج بھی ہنگامہ آرائی ہوجاتی۔"

آپا نے یاسمین کی باتوں پر غور کیا تو ایسے کئی واقعات ان کے ذہن کے پردے پر لہرانے لگے جب انیقہ کی بدتمیزی کی وجہ سے جھگڑا شروع ہوا اور ان کی طرف سے انیقہ کی بے جا حمایت کی بنا پر بات مزید بڑھ گئی تھی۔

"آپا! میں حیران ہوں کہ آپ کو سامنے کی یہ بات سمجھ کیوں نہ آئی؟ آپ نے پہلے دن ہی انیقہ کو کیوں نہ ٹوکا؟ ماہرہ آپ کی سب سے بڑی بیٹی ہے۔ آپ نے اپنے سارے بچوں کو اس کی عزت کرنا سکھایا ہے۔ کوئی اس کے ساتھ بدتمیزی تو دور اونچی آواز میں بات تک نہیں کرسکتا تو پھر آپ نے اسی اصول کو اپنی بہو کے لیے کیوں نہ اپنایا کہ چھوٹا دیور ہو یا نند... اپنی بھابھی سے بدتمیزی نہ کرے بلکہ تمیز و تہذیب سے بات کرے۔ آپ نے اس معاملے میں بیٹی اور بہو میں فرق کیوں کیا؟"

واقعی ان کے ہاں بڑوں کی عزت کرنا سکھایا جاتا تھا اور اس بات پر زور دیا جاتا تھا کہ بڑوں کے ساتھ تمیز اور ادب سے بات کی جائے۔ ان کے ہاں بچے بڑوں کو پلٹ کر جواب نہیں دیتے تھے اور نہ ہی چھوٹوں کو بڑوں کے معاملات میں بے جا دخل اندازی کی اجازت تھی۔ آپا کے چہرے پر شرمندگی کے تاثرات بڑے واضح تھے کہ یہاں واقعی ان سے چوک ہوگئی تھی۔

"آپا! میرا مقصد آپ کو شرمندہ کرنا ہرگز نہیں ہے۔ میں تو آپ کو وہ حقیقت بتانا چاہ رہی ہوں جو آپ کے گھر کے حالات کی خرابی کی اصل وجہ ہے۔ فائزہ بہت اچھی طبیعت کی ہے بس اس سے انیقہ کی بدلحاظی برداشت نہیں ہوتی۔ پلیز آپ سارا قصور اس کے سر ڈالنے کے بجائے انیقہ کو سمجھائیں۔ ان شاء اللہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔" یاسمین نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر نرمی سے دبایا۔

"یاسمین! اس طرف تو میرا دھیان ہی نہیں گیا اور میں لاعلمی میں فائزہ کے ساتھ زیادتی کرتی رہی۔ مگر اب ایسا نہیں ہوگا۔ فائزہ کو اس گھر میں وہی مقام ملے گا جو ماہرہ کا تھا اور ابھی تک ہے۔"

آپا فیصلہ کن انداز میں کہہ کر اس اطمینان کے ساتھ سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئیں کہ اب ایک نیا سویرا ان کا منتظر تھا۔

☆

مکمل ناول

سحر ساجد

بارش اتنے زور سے برس رہی تھی کہ جیسے آج کے بعد پھر نہیں برسے گی۔ اسے بارش جتنی اچھی لگتی تھی' آج اتنی ہی بری لگ رہی تھی۔ آسمان سے برسنے والا پانی صرف زمین کو ہی نم نہیں کر رہا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں کو بھی نم کر رہا تھا لیکن زمین کی نمی اور آنکھوں کی نمی میں فرق ہوتا ہے' زمین جب نم ہوتی ہے تو اس کی پیاس بجھتی ہے اور آنکھیں۔

آنکھیں جب نم ہوتی ہیں تو پیاس بڑھتی ہے۔

اس نے سر جھکا کر انگلی کی پور سے آنکھوں کی نمی کو خشک کیا۔

آف وائٹ فراک اور چوڑی دار پاجامے میں وہ ٹیرس پہ اداس کھڑی تھی۔ اس کے کانوں ہاتھوں یا پھر جسم کے دوسرے حصے میں کسی زیور کا شائبہ تک نہ تھا ماسوائے ناک کی لونگ کے۔ وہ ڈائمنڈ کی لونگ اس کی ستواں ناک میں بہت جچ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر کوئی بھی نئی شادی شدہ نہیں کہہ سکتا تھا۔

"ایک شادی شدہ آدمی سے دل لگانے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے زربا بی! اب بھگتو۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر خود کلامی کی۔

کھلے بالوں کو جوڑے کی شکل میں لپیٹے ہوئے وہ وہاں سے ہٹ گئی۔

"زربا بی۔" اسے سیماگل کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی تھی۔

"کیا ہے سیما گل؟" ٹیرس پہ پڑی کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے بے حد بے زاری سے کہا۔

"خان جی۔!" اور وہ کرنٹ کھا کر کرسی سے اٹھ

کھڑی تھی۔ اس نے جھک کر ٹیرس سے نیچے دیکھا تھا۔
مجتبیٰ خان کی گاڑی بیرونی گیٹ عبور کر کے اب ڈرائیو وے پر حرکت کر رہی تھی۔
"مجتبیٰ...!" لبوں نے بے آواز جنبش کی۔ اداسی یوں چہرے سے غائب ہوئی تھی جیسے بارش کے بعد پتوں سے مٹی غائب ہوتی ہے۔
وہ الٹے پاؤں مڑی اور بھاگتی ہوئی نیچے اتری۔
بھاگتے ہوئے اس نے لمبا سا ہال عبور کیا تھا۔ مجتبیٰ نے دروازہ کھولا۔
"مجتبیٰ...!" اور وہ بھاگتے بھاگتے یکدم اس کے سامنے جا کر رکی تھی۔ بال کھل چکے تھے۔ جھٹکے سے رکنے کی وجہ سے کھلے بال آگے کو ہو کر پیچھے جا گرے تھے۔ مجتبیٰ نے وارفتگی سے اسے دیکھا۔
اس عورت سے بڑھ کر حسین بھلا کون ہو گا اور اس سے بڑھ کر زور آور بھی بھلا کون ہو گا کہ جس کے قدموں میں مجتبیٰ خان کا دل رکھا ہے اور وہ عورت پوری شان سے اس تخت پر براجمان ہے۔
"مجتبیٰ بارش...!" چہکتی ہوئی آواز میں کہا گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس نے ایڑیاں اٹھا کر مجتبیٰ کے کندھے سے اوپر جھانک کر پیچھے کے منظر میں برستی بارش کو دیکھا۔
"کیا کہیں اور بھی برس رہی تھی بارش؟"
وہ برستی بارش کو نہیں زر کی آنکھوں کی نمی کو دیکھ رہا تھا۔
"جب بادل گھر کے آئیں تو بارش تو برستی ہے نا!" ذومعنی جواب آیا تھا۔ اس نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر ایک بازو اس کے کندھے کے گرد پھیلایا۔ "کیسی ہو؟"
"اب ٹھیک ہوں۔" اک شان بے نیازی سے بالوں کو جھٹک کر کہا۔
وہ دونوں یوں ہی ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بیڈ روم تک آئے تھے۔ مجتبیٰ آگے بڑھ گیا تھا جب کہ زر نے وہیں دروازے میں رک کر سیما گل کو چائے لانے کا کہا تھا۔ وہ صوفے پر بیٹھ چکا تھا۔ زر نے ایک نظر اسے دیکھا نظر نے جیسے پلٹنے سے انکار کر دیا تھا۔ خلاف معمول آج وہ کاٹن کے سفید سوٹ میں ملبوس تھا۔ جھک کر اپنے جوتے اتار رہا تھا۔
"آج کیا نظر لگانے کا ارادہ ہے؟" وہ زر کو دیکھے بغیر یونہی جھکے ہوئے بولا۔ زر بے ساختہ مسکرائی تھی۔
"نظر تو لگ چکی ہے۔ واپس لوٹ کر ہی نہیں آئی۔"
اب کے اس نے سیدھا ہو کر زر کو دیکھا تھا۔
"نور دل...؟"
"وہ تو کب کا اپنی جگہ سے غائب ہے۔"
وہ بیڈ پر اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولی تھی۔
"افسوس ہوا سن کر۔ کب ہوا یہ حادثہ؟" بہت سنجیدگی سے پوچھا گیا۔
"بس کچھ ہی عرصہ پہلے کی بات ہے۔ تجارت کی تھی کسی سے یہ دیکھنے کے لیے کہ فائدہ ہوتا ہے یا نقصان۔" زر نے بھی اسی سنجیدگی سے جواب دیا تھا جس سنجیدگی سے سوال پوچھا گیا تھا۔
"پھر؟ کیا ہوا؟"
"Totally Loss..." (مکمل نقصان)
فوراً جواب آیا تھا۔
"Loss It does not sound good"
مجتبیٰ سنجیدہ ہوا۔ اسے زر کی بات اچھی نہیں لگی تھی۔
اور اس سے پہلے زر کچھ کہتی، دروازے پہ دستک ہوئی تھی۔ سیما گل چائے لے کر آئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"کس چیز کی کمی تھی مجتبیٰ خان کو جو اس نے ایسی حرکت کی۔"
"سوری! مرد ہے وہ اور پھر مذہب نے حق بھی تو دیا ہے اسے، تو پھر میں اور آپ کون ہوتے ہیں روکنے والے۔" زرمینے نے دھیمی آواز سے کہا تھا۔

"زرمینے! خوب صورت بیوی مرد کے پیروں میں زنجیر کی طرح ہوتی ہے اور اوپر سے تم اس کے بچے کی ماں بھی ہو پھر آخر اسے کس کمی نے دوسری شادی پہ مجبور کیا؟"

"سورے! یہی تو بات ہے، میں پیروں کی زنجیر تھی۔ دل کی نہیں۔"

وہ عورت اس کے دل میں بستی ہے سورے۔ دل جو انسان کو اندھا کر دیتا ہے۔" وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولی۔

اس کا ایک ایک لفظ سچا تھا۔ یہ بات سکینہ جانتی تھیں اور وہ یہ بھی جان چکی تھیں کہ "زر" ہی وہ عورت ہے جو مجتبیٰ کے دل میں بستی ہے۔

☼ ☼ ☼

اس کے سامنے زرقون اور پرل کا سیٹ کھلا پڑا تھا۔

"اس طرح کی چیزیں میرے لیے کوئی قیمت نہیں رکھتیں مجتبیٰ! میری ضرورت میری اٹریکشن کچھ اور ہے مجتبیٰ!" وہ اس بے حد قیمتی سیٹ کو ہاتھ سے پرے کرتے ہوئے بے زاری سے بولی۔

"بات ضرورت کی نہیں محبت کی ہے زر۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ "میرا دل چاہتا ہے سارے جہاں کی دولت تمہارے قدموں میں ڈھیر کر دوں۔"

"اور میرا دل کہتا ہے کہ تم کچھ مت کرو۔ بس میرے پاس رہا کرو۔" وہ یکدم اس کے برابر میں سے اٹھ کر اس کے پیروں میں جا بیٹھی تھی۔

"ایسے مت کرو زر۔ تم جانتی ہو زرمینے میری مجبوری ہے۔" اس نے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کر کہا۔

"بیوی ہے وہ میری، میرے بچے کی ماں ہے اس کے حقوق سے کیسے آنکھیں بند کر لوں۔ میں ڈرتا ہوں زر! قیامت کے دن آدھا مفلوج جسم لے کر خدا کے پاس جانے سے۔" وہ اسے اٹھا کر دوبارہ اپنے برابر بٹھاتے ہوئے بولا۔

"مجبوری ہے تو پھر جب تم اس کے بارے میں ... کرتے ہو تو اس کی محبت تمہارے لہجے میں کیوں ... ہے۔" وہ سلگ کر بولی۔

"اچھا! حیرت ہے مجھے تو آج تک پتا نہیں چلا۔" وہ ہلکے سے ہنسا۔

"You really Love her?" (تم واقعی ... سے محبت کرتے ہو؟)

"یہ تم بتاؤ!"

بے اختیار زر نے سر جھکایا تھا۔

"میرے سامنے نام مت لیا کرو اس کا مجتبیٰ! برداشت نہیں ہوتا مجھ سے۔ جب اس کے پاس سے ہو کر آتے ہو تو لگتا ہے کہ جیسے۔"

"بس زر! اتنا غصہ نہیں کرتے۔ اس بے چاری کے پاس تو کچھ بھی نہیں بچا!" مجتبیٰ کے لہجے میں افسوس تھا۔

زر نے چونک کر اس کے چہرے کی جانب دیکھا۔ کیا تھا وہ شخص؟

ایک بیوی اور بچے کے ہوتے ہوئے اس نے دوسری شادی کی۔ اور اب یہاں اپنی محبت کے سامنے بیٹھا اپنی بیوی کی محرومی کا سوگ منا رہا تھا۔ انسان کو اتنا نرم دل بھی نہیں ہونا چاہیے۔ زر جھنجلائی تھی۔

☼ ☼ ☼

مجتبیٰ خان نیازی سردار اجمل خان نیازی کا بیٹا تھا اور یہ نام کسی تعارف کا محتاج نہیں تھا۔ وہ ملک کی مشہور سیاسی پارٹی کے چیئرمین تھے۔

وہ پشتوں سے کوئٹہ میں آباد تھے اور کوئٹہ کی سیاست میں سردار اجمل خان کا کافی اثر و رسوخ تھا۔ مجتبیٰ ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کی پہلی شادی اس کی چچازاد سے کم عمری میں ہی ہو چکی تھی۔

زرمینے کم عمر تھی خوب صورت تھی اور اس کے بچے کی ماں تھی۔ یہ سب چیزیں مل کر بھی مجتبیٰ کو "زر" سے محبت کرنے سے روک نہیں سکی تھیں۔

زرمینے سے اس کا رشتوں کا بندھن تھا دل کے سامنے رشتوں کے سارے بندھن کچے ثابت ہوتے ہیں۔

مجتبیٰ نے زر کو پہلی دفعہ اس کے اپنے گھر میں ہی دیکھا تھا۔ وہ حسن ملک کے گھر کچھ اہم پیپرز ڈسکس کرنے آیا تھا۔

وہ گاڑی سے اترا ہی تھا کہ اندرونی دروازہ کھلا اور وہ باہر آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

اس نے آئینے میں خود کو دیکھا تھا اور بے اختیار مسکرائی تھی۔ بلاشبہ وہ بہت حسین تھی مگر سرخ رنگ آج اس پر بہت سوٹ کر رہا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ آئینے سے وہی سوال کرے جو وہ بچپن میں کرتی تھی جیسا کہ سنو وائٹ کی سوتیلی ماں کرتی تھی۔

Mirror mirror on the wall
who is fair of them all

"دنیا میں سب سے زیادہ خوب صورت کون ہے"

آئینے نے اسے کیا جواب دینا تھا اور جواب اسے پتا تھا۔ اب وہ جانتی تھی۔ وہ اپنے قیامت خیز حسن سے آگاہ تھی۔

☼ ☼ ☼

جینز کے اوپر گھٹنوں کو چھوتا سرخ رنگ کا فراک پہنے وہ بلاشبہ افشین ملک کی بیٹی تھی جو کہ اندرونی دروازہ کھول کر باہر آئی تھی۔

ایک بازو پہ بیگ ڈالے اور اسی بازو والے ہاتھ میں سیل فون پکڑے وہ کچھ ٹائپ کر رہی تھی جبکہ دوسرا ہاتھ وہ اپنے کھلے بالوں میں چلا رہی تھی۔

"ریڈ کلر کسی کو اتنا بھی سوٹ کر سکتا ہے۔" بے اختیار مجتبیٰ کے ذہن میں خیال ابھرا تھا۔

اس نے مجتبیٰ کو دیکھ کر رسمی سا ہیلو کیا اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئی تھی۔

اور مجتبیٰ۔

وہ سر جھٹک کر اس مبہوت کر دینے والی کیفیت سے باہر آیا تھا۔

وہ بار بار حیرانی سے سوچ رہا تھا کہ کیا کوئی اتنا حسین بھی ہو سکتا ہے۔

☼ ☼ ☼

زر حیدر ملک افشین ملک اور حیدر ملک کی اکلوتی بیٹی۔

"زر" وہ واقعی اسم با مسمیٰ تھی۔

دولت، حسن اور ذہانت سے مالا مال

"حکومت" بھی اس کے گھر میں موجود تھی، مگر اسے اس سے دلچسپی نہیں تھی۔

اس کی ماں افشین ملک پارلیمنٹ کی ممبر تھیں، اپنے باپ کی جائیداد سے لے کر پیار تک کی وہ اکلوتی وارث تھی، مگر سیاست میں افشین ملک اسے اپنا وارث نہ بنا سکیں۔ سیاست اور سیاست دانوں دونوں سے ہی وہ الرجک تھی۔ زر کے والد حیدر ملک پلاننگ

کمیشن آف پاکستان میں ڈپٹی چیئرمین کے عہدے پر فائز تھے پیسہ بارش کی طرح برستا تھا جسے وہ پانی کی طرح ہی بہاتی تھی۔ اس میں حسن تھا' نزاکت تھی' تمکنت تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کلاس کی دوسری امیرزادیوں کے برعکس مضبوط کریکٹر کی مالک تھی۔ وہ کوئی معصوم بھولی بھالی لڑکی نہیں تھی مگر چالاک اور بہت ہوشیار نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ آج اسے دوسری دفعہ دیکھ رہا تھا۔

وہ ایک خالصتاً "سیاسی عشائیہ تھا اور اس کا چہرہ بے زاری کا اشتہار سا بنا ہوا تھا۔ وہ تیز تیز بولتے ہوئے افشین ملک سے کسی بات پہ بحث کر رہی تھی۔ ڈرنک کا گلاس ہاتھ میں پکڑے مجتبیٰ ان دونوں کی طرف آیا تھا۔

"السلام علیکم!" زر کو نظر انداز کر کے وہ افشین ملک سے بولا تھا۔

"ہے مجتبیٰ وعلیکم السلام! ہاؤ آر یو؟"

"فائن۔" اس نے مسکراتے ہوئے ڈرنک کا گھونٹ بھرا۔

"مائی ڈاٹر زر!" افشین نے زر کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اس کا تعارف کروایا تھا۔

"ہائے! نائس نیم۔!" مجتبیٰ اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا کر بولا تھا۔

"تھینکس۔" لبوں پہ ہلکی سی مغرورانہ مسکراہٹ لیے اس نے مجتبیٰ کا ہاتھ تھاما تھا۔

"زر۔ یہ مجتبیٰ خان ہے۔ معروف پولیٹیکل شخصیت اجمل خان نیازی کا بیٹا!"

"اوہ! سیاست دان کا بیٹا۔ یعنی سیاست دان "And I just hate Politicians" (مجھے سیاست دانوں سے نفرت ہے) وہ صاف گو نہیں۔ منہ پھٹ تھی۔

"کافی منہ پھٹ ہیں آپ۔ کیا میں اس کو آپ کی دوسری خوبی سمجھوں؟" ڈرنک کا ایک اور گھونٹ بھر پوچھا گیا۔

"نہیں۔ خوبی نہیں۔ Eminence (فوقیت)" وہ ذرا جو شرمندہ ہوئی ہو۔

"محترمہ مغرور نہ ہوتیں تو یقیناً "یہ حیرت کی بات ہوتی۔" اس نے سوچا۔

"خوبی اور خامی میں تھوڑا ہی فرق ہوتا ہے محترمہ! Good will gesture (اچھا رویہ) بھی کوئی چیز ہوتی ہے یا پھر یہ آپ کے ہاں پائی نہیں جاتی۔" لہجہ نرم مگر انداز طنزیہ تھا۔ مجتبیٰ کے اس طرح کہنے پر افشین ملک نے سخت نظروں سے زر کو دیکھا تھا ورنہ وہ جواب ضرور دیتی۔

"یہ ایکچوئلی ایسی پارٹیز کی عادی نہیں ہے نا! اس لیے بور ہو رہی تھی۔"

افشین ملک نے بے ساختہ وضاحت دی تھی۔

"اٹس اوکے۔ ہم سیاست دانوں کو اس سے سخت اور کڑوے جملے سننے کو ملتے ہیں۔ یہ تو کچھ بھی نہیں تھا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ کبھی کبھی حسین چہرے خاموش ہوتے ہیں تو زیادہ حسین لگتے ہیں۔"

آخری جملہ اس نے زر کو دیکھ کر کہا تھا۔ زر کے چہرے پہ سخت برہمی کے آثار نمودار ہوئے۔ وہ مسکرایا اور مڑ کر چلا گیا تھا۔

"مام! مجھے اس شخص سے دوبارہ ملنا ہے۔" حسب توقع وہ چڑ گئی تھی۔ اور افشین ملک نے جیسے سنا ہی نہیں تھا۔ وہ اس کے غصہ کو جانتی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"ممی! آپ کہیں جا رہی ہیں؟"

وہ ان کے کمرے میں کوئی بات کہنے آئی تھی مگر افشین ملک کے بالوں میں لگے رولرز کو دیکھ کر پوچھ بیٹھی تھی۔

"ایک ڈنر ہے۔ وہاں جانا ہے۔ کیوں؟"

نہوں نے ایک ابرو اٹھا کر پوچھا تھا۔

"ڈنر۔ مطلب سیاست دان۔ اور مجتبیٰ خان بھی۔" اس نے ایک سیکنڈ میں حساب لگایا تھا۔

"مجھے بھی آپ کے ساتھ جانا ہے۔" اس نے اطمینان سے کہا افشین ملک نے جھٹکے سے مڑ کر اسے دیکھا تھا۔

"کیا؟ تمہارا وہاں کیا کام؟" بے ساختہ ان کے منہ سے نکلا۔

"کیا مطلب؟ ویسے تو آپ مجھے اپنی ہر پارٹی میں گھسیٹ کر لے جاتی ہیں اور اب آپ کہہ رہی ہیں میرا وہاں کیا کام؟" وہ برا مان کر بولی تھی۔

"بھئی! یہ ڈنر ہے وہاں تمہیں میں کیسے لے جاؤں جبکہ صرف میں انوائیٹڈ ہوں۔ آکورڈ لگتا ہے۔"

"جب میں جانا نہیں چاہتی تو آپ کیا کرتی ہیں؟" وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر بولی۔

"میں تمہیں اصرار کر کے ساتھ لے جاتی ہوں۔"

"اور آج میں جانا چاہتی ہوں اور آپ لے کر نہیں جا رہی ہیں تو پھر میں کیا کروں گی؟" ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے ایک ابرو اچکا کر پوچھا تھا۔

"تم ایک سویٹ گرل کی طرح اپنے روم میں جا کر ریسٹ کرو گی اور مام کو تنگ نہیں کرو گی۔" افشین ملک نے کسی بچی کی طرح اسے بہلایا حالانکہ وہ پورے تیئس سال کی تھی۔

"فائن!" اس نے کہا اور مڑ کر چلی گئی۔ اور افشین ملک نے مصیبت کے ٹل جانے پر شکر ادا کیا تھا مگر مصیبت کتنی ٹلی تھی' یہ انہیں اپنی گاڑی میں پہلے سے موجود "زر" کو دیکھ کر پتا چل گیا تھا۔ وہ نک سک سے تیار بیٹھی تھی۔

"زر۔" وہ بری طرح سے زچ ہو کر بولی تھیں۔ زر نے گاڑی کا دروازہ کھولا تھا۔

"ممی! جلدی کریں آپ لیٹ ہو رہی ہیں۔"

"ضدی لڑکی!" منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر وہ گاڑی میں گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

اس کی نظریں اسے تلاش کر رہی تھیں مگر وہ اسے نظر نہیں آیا تھا۔ اس نے افشین ملک کو دیکھا وہ نوجوان سیاست دانوں کے ایک گروپ کے ساتھ تھیں۔

"ممی! پلیز جسٹ ون سیکنڈ!" اس نے افشین ملک کو مخاطب کیا۔

افشین ملک نے مڑ کر اسے دیکھا اور معذرت کر کے وہاں سے ہٹی تھیں۔

"بولو؟"

"مجتبیٰ خان کدھر ہے؟" اس نے براہ راست پوچھا۔

افشین ملک نے حیران نظروں سے اسے دیکھا۔

"مام پلیز' سوال جواب کا سیشن گھر چل کر ہو گا' فی الحال مجھے میری بات کا جواب دیں۔" وہ افشین ملک کے بولنے سے پہلے بول پڑی تھی۔

"وہ نہیں آیا۔"

"کیوں؟" زر جی بھر کر بدمزا ہوئی۔

"وہ میرا یا پھر تمہارے باپ کا نوکر نہیں ہے کہ بتا کر جاتا کہ وہ آج یہاں کیوں موجود نہیں ہے' خاص طور پر جب محترمہ زر حیدر ملک اسے دیکھنے آئی تھیں۔" وہ بری طرح بور ہو رہی تھی اوپر سے افشین ملک کا رویہ وہ پاؤں پٹختی وہاں سے چلی گئی۔

"اسٹوپڈ!"

وہ گھر واپس آ چکی تھی اور اسے شدید غصہ آ رہا تھا۔ مجتبیٰ اس کی انسلٹ کر کے گیا تھا۔ وہ اسے جواب دینا چاہتی تھی۔

اس نے مام سے کہہ کر لی' پھر پورا ایک گھنٹہ اتنے بور لوگوں کی بور سی گفتگو کو برداشت کیا اور نتیجہ کیا نکلا۔

اس نے کھینچ کر تکیہ دیوار پہ دے مارا تھا۔ چند لمحے وہ کارپٹ پر گرے ہوئے تکیے کو دیکھتی رہی اور پھر پوری قوت سے دوسرا تکیہ دیوار پہ دے مارا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ اسلام آباد ایئرپورٹ کے لاؤنج میں بیٹھی تھی۔

ابھی فلائٹ میں ٹائم تھا۔ کانوں پہ ہینڈز فری لگائے اس نے چاکلیٹ کھانے کے لیے منہ کھولا اور پھر کھلے منہ کو بند نہیں کر سکی۔

مائے گاڈ! ابھی چھ مہینے پہلے جس شخص کو دیکھنے کے لیے وہ پوری پلاننگ کے ساتھ ڈنر میں گئی تھی وہ اس کے سامنے موجود تھا۔ اب جب وہ اس بات کو بھول بھی گئی تھی تو وہ اس کے سامنے تھا۔

"اف! کیا بے وقوفی تھی۔ بالکل بچوں والی بات تھی۔" وہ بڑبڑائی تھی۔

"مس بی ہیو میں نے کیا تھا اس نے تو صرف مجھے جواب دیا تھا۔"

یکدم اسے شرمندگی محسوس ہوئی اور اس نے پاس پڑا میگزین اٹھا کر اپنے منہ کے سامنے کر لیا کیونکہ وہ ساتھ والے صوفے پر بیٹھ چکا تھا۔

"میگزین آپ کا چہرہ تو چھپا رہا ہے، مگر سوال یہ ہے کہ آپ چہرہ چھپا کس سے رہی ہیں؟" اس نے بھاری گمبھیر آواز سنی تھی۔

ایک گہرا سانس بھر کر اس نے میگزین سائڈ میں رکھ دیا اور مجتبیٰ کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے سیل پر کوئی نمبر ملانے میں مصروف تھا، مگر اس کے چہرے پہ ایک محظوظ ہوتی مسکراہٹ ضرور تھی۔

"ہائے!" زر نے کھسیا کر کہا۔

"ہیلو! کیسی ہیں آپ؟" اب کے بھرپور مسکراہٹ سے جواب آیا تھا۔

"فائن...!"

"کہیں جا رہے ہیں آپ؟" بہت سنبھل کر اور انتہائی مہذب انداز میں اس نے پوچھا تھا۔ مجتبیٰ کے چہرے پر مضحکہ اڑانے والے تاثرات ابھرے تھے۔

"نہیں جانا وانا تو کہیں نہیں ہے۔ بس یہ دیکھنے آیا تھا کہ جہاز اڑتا کیسے ہے؟" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اور بے حد دلچسپ نظروں سے مجتبیٰ کو دیکھا۔ وہ ابھی تک مسکرا رہا تھا۔

"اچھا سینس آف ہیومر ہے آپ کا جو کہ عموماً سیاست دانوں میں نہیں ہوتا۔" مجتبیٰ نے تھوڑا سا آگے ہو کر ایک ابرو اچکا کر اسے دیکھا تھا۔

"یہ طنز ہے یا تعریف؟"۔

"سوری۔" وہ پہلے سے بھی زیادہ کھسیاہٹ [illegible] ہوئی تھی۔

"اٹس او کے۔ پہلے بھی عرض کیا تھا کہ ہم [illegible] دان ہر چیز کے لیے تیار رہتے ہیں۔ اچھی [illegible] بری۔"

چند لمحوں کے لیے وہ خاموش ہو گئی تھی۔

"سوری ایین۔ اس دن کے لیے بھی۔ میں [illegible] زیادہ ہی بول گئی تھی۔"

"جی معلوم ہے مجھے۔ مسز ملک نے بتایا تھا کہ [illegible] مجھ سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے آئی تھیں، مگر بدقسمتی کہ میں وہاں موجود نہیں تھا۔" وہ خاصا محظوظ ہوا تھا۔

"واٹ؟" وہ حقیقت میں اچھلی۔ "ممی نے آپ [illegible] بتا دیا؟" زر سخت حیران تھی۔

"جی! کافی نائس لیڈی ہیں آپ کی ممی۔" مجتبیٰ نے جیسے اسے چھیڑا تھا۔

"اینی ہاؤ۔ فلائٹ کی اناؤنسمنٹ ہو رہی ہے۔ مجھے جانا ہے کیونکہ اگر میں لیٹ ہو گیا تو جہاز کو اڑتا ہوا دیکھنے سے محروم رہ جاؤں گا جبکہ میں تو آیا ہی اسی لیے تھا۔" وہ بے ساختہ مسکرائی۔

"نائس ٹو میٹ یو۔"

"مائی پلیژر میم!" وہ سر کو خم دے کر بولا۔

وہ اسے جاتے دیکھتی رہی تھی اور پھر ہلکا سا مسکرا کر سر جھٹکا تھا۔

پہلی ملاقات میں وہ اس لیے زر کو برا لگا تھا کہ وہ سیاست دان تھا جبکہ دوسری ملاقات میں اس نے [illegible] کے لیے "سیاست دان" کی تعریف کو بدل دیا تھا۔

وہ اپنی ممی کا لیپ ٹاپ لیے بیٹھی تھی اور [illegible] ملک کے آفیشل فیس بک پیج کو اپ ڈیٹ کر رہی تھی۔

ان کی سیکرٹری چھٹی پر تھی سو یہ کام اسے کرنا [illegible] تھا۔ زر نے اس آفیشل پیج پہ مجتبیٰ خان کو add

ہو سکے گا۔

کچھ سوچتے ہوئے وہ اپنے اکاؤنٹ سے Login ہوئی تھی اور مجتبیٰ خان کے پیج کو سرچ کیا تھا۔

اس سے پہلے وہ کوئی کمنٹ یا میسج کرتی یکدم اس کے ذہن میں یہ بات آئی تھی کہ یہ تو اس کا بھی آفیشل پیج تھا تو وہ خود تو اسے مین ٹین نہیں کرتا ہوگا لہٰذا وہ زر کے میسج یا کمنٹ کو بھی نہیں پڑھ پائے گا۔

یکدم اسے افسوس ہوا تھا۔ اس نے مجتبیٰ کا پرسنل اکاؤنٹ سرچ کرنے کی کوشش کی مگر نہیں ملا۔

بہرحال مجتبیٰ کی پرسنل آئی ڈی حاصل کرنا اس کے لیے مسئلہ نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

اور پھر تھوڑی کوشش کے بعد اسے مجتبیٰ کی آئی ڈی مل ہی گئی تھی۔

"آپ نے جہاز کو اڑتے دیکھا؟ کیسا لگا؟"

بے حد مسکراتے ہوئے اس نے ٹائپ کیا تھا۔ وہ آن لائن نہیں تھا مگر وہ جانتی تھی کہ وہ پڑھے گا ضرور اور جان بھی لے گا کہ یہ زر حیدر کی طرف سے تھا۔

کیونکہ اس کی D.P اس کی اپنی ہی تصویر تھی۔ اور چند دن بعد جب اس نے اپنا اکاؤنٹ چیک کیا تو اس کی خوشی بڑی بے ساختہ تھی۔

"میں جہاز کو اڑتے دیکھ کر اتنا خوش اور حیران نہیں ہوا تھا زر بی بی! جتنا کہ آپ کا میسج دیکھ کر ہوا ہوں۔" اس کا جواب موجود تھا۔ وہ دل کھول کر ہنسی تھی۔

زندگی بہت تیزی سے رخ بدلتی ہے اور انسان کی زندگی میں بہت کچھ ایسا ہوتا ہے کہ جس کے ہونے کے بارے میں "کیوں اور کیسے" جیسے سوالوں کا جواب ڈھونڈنے پر بھی نہیں ملتا۔ سو اگر وہ دونوں بھی اپنے بارے میں ایسے سوالات کا جواب ڈھونڈتے تو نہ ملتا۔ حیرت کی بات یہ نہیں تھی کہ وہ ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ مختلف انسان ہونے کے باوجود بھی ایسا ہو گیا تھا۔

"مجتبیٰ! اگر میں تم سے کہوں کہ تم یہاں میرے ساتھ اپنی موجودگی کو جسٹی فائی کرو... تو تم کیسے کرو گے؟"

ایک ایسی ہی ملاقات میں زر نے پوچھا تھا۔ وہ خاصی سنجیدہ تھی۔

مجتبیٰ نے ایک نظر اسے دیکھا۔

بلیک کلر کی بیگی اسٹائل شرٹ اور جینز میں ملبوس وہ بے حد جاذب نظر لگ رہی تھی۔

مجتبیٰ کی جگہ شاید کوئی اور ہوتا تو وہ یہ سوال نہ کرتی مگر یہ سوال مجتبیٰ سے کیا گیا تھا... اور اس سے کیا جانا بھی چاہیے تھا کیونکہ وہ "شادی شدہ" تھا۔

مجتبیٰ نے ایک گہرا سانس بھرا تھا۔

"میں اسے جسٹی فائی نہیں کر سکتا زر بی بی! محض یہ کہہ کر کہ تم میری ایک اچھی دوست ہو... میرے اور بھی بہت سے اچھے دوست ہیں مگر میں ہر کسی سے یوں نہیں ملتا جس طرح تم سے ملتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی وقت آئے کہ میں تم سے اپنے تعلق کو بہتر طریقے سے ڈیفائن کر سکوں... مگر ابھی... میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

کرسی سے ٹیک لگا کر اس نے براہ راست زر کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا تھا۔

زر نے ایک گہرا سانس بھر کر اس پر سے نظریں ہٹائی تھیں۔ آنکھوں میں آنے والے نمکین پانی کو گلے میں اتارتے وقت تکلیف ہوتی ہے... سو اس وقت اسے بھی ہوئی تھی۔

اگر مجتبیٰ اس سے اس تعلق کو جسٹی فائی یا پھر ڈیفائن کرنے کو کہتا تو وہ صرف "ایک لفظ" میں کر دیتی۔

لیکن وہ چاہتی تھی کہ وہ ایک لفظ کی جسٹی فکیشن مجتبیٰ دے وہ نہیں۔

☼ ☼ ☼

"معیذ! بہت مس کر رہا تھا آپ کو۔" وہ [illegible] آیا

ہوا تھا جب زرمینے نے اس سے کہا تھا۔
اس نے مسکرا کر عبدل کو گود میں اٹھایا۔
"عبدل مس کررہا تھا اور عبدل کی ماں؟"
مجتبیٰ نے نرمی سے پوچھا تھا۔ اس کی بات کا جواب زرمینے کا سرخ ہوتا چہرہ تھا۔
اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا تھا۔
"زرمینے! آج کہہ کر دیکھو۔ تم مجھے مس کررہی تھیں۔ میں بھی دیکھوں بھلا کیا ہوتا ہے۔" اس نے جیسے زرمینے کو اکسایا تھا۔
"خان پلیز...!" وہ بری طرح سے بلش کررہی تھی۔
"کہو نا زر...!" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا تھا اور زرمینے نے ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔
اسے جھٹکا ہرگز نہ لگتا اگر پچھلے پانچ سالوں میں مجتبیٰ نے کبھی اسے زر کہہ کر بلایا ہوتا۔
اس سے پہلے کہ مجتبیٰ اسے کوئی وضاحت دیتا وہ "میں کھانا لگواتی ہوں" کہہ کر باہر چلی گئی تھی۔
"یہ کیا ہوا؟" مجتبیٰ خود حیران تھا۔

☼ ☼ ☼

اس نے اپنے تھیسس کا جو ٹاپک چنا تھا' وہ تھا
"Reasons of low literacy rate in Balochistan"
(بلوچستان میں خواندگی کی گرتی ہوئی شرح) اور اس لیے چنا تھا کہ مجتبیٰ اسے گائیڈ کرسکتا تھا۔ اور اس نے واقعی ہی "زر" کی ہر ممکن مدد کی تھی۔
اس کی فیملی میں سے تین چار لوگ منسٹری آف ایجوکیشن سے وابستہ تھے اور اس کے علاوہ اس کا ایک دوست یونیسکو کے پروجیکٹ سے وابستہ تھا۔
اس نے ان تمام لوگوں سے میٹنگز ارینج کروائی تھیں۔ وہ خود اسے لے کر ان لوگوں کے آفسز میں جاتا رہا تھا۔ بلوچستان کے کئی علاقوں کے بارے میں مجتبیٰ نے خود زر کو بریفنگ دی تھی۔

وہ اتنی نرمی سے بولتا تھا' وہ اتنا متحمل مزاج' دھیمی طبیعت کا تھا کہ زر نے اس سے کہا تھا۔
"تم اتنے نرم مزاج ہو مجتبیٰ خان! کہ تمہارے پختون ہونے پر شک ہونے لگتا ہے۔"
اور وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا تھا۔
زر کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے غلطی سے وہ مکڑی کے جالے پر پاؤں آگیا تھا اور اب وہ پھنستی چلی جارہی تھی... جکڑتی ہی جارہی تھی۔
دن کے چند گھنٹے جو وہ اس کے ساتھ گزار کر آتی تھی۔ ان چند گھنٹوں کے سحر سے وہ باقی سارا وقت خود کو آزاد نہیں کرپاتی تھی۔
ابھی وہ اس سے مل کر آئی تھی اور جب سے آئی تھی یوں ہی بیٹھی تھی۔
اس کے ہنسنے کا اسٹائل' بات کرنے کا طریقہ' بولتے بولتے بالوں میں ہاتھ چلانا' عادتاً "بال پوائنٹ کو ہونٹوں پر رکھنا' اس کا زر بی کہہ کر اسے پکارنا... اس کی نگاہوں کے سامنے ایک فلم سی چل رہی تھی۔
"ہائے گاڈ" اس نے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر جھٹکا تھا۔
"میرے لیے... میری محبت کے لیے کیا دنیا میں صرف مجتبیٰ خان ہی بچا تھا؟"
بہت بے بس ہو کر اس نے سوچا تھا۔
وہ شخص جو کہ ایک بچے کا باپ ہے اور وہ شخص جو مجھ سے ایک تعلق کو ثابت نہیں کرسکتا۔
اس نے کسی گرم چیز کو بہت نرمی سے گالوں پر پھسلتے ہوئے محسوس کیا تھا۔
"یہ ٹھیک نہیں ہوا۔" وہ بڑبڑائی تھی اور اس گرم چیز کے پھسلنے میں شدت آگئی تھی۔

☼ ☼ ☼

تھیسس مکمل ہونے کے بعد زر کچھ عرصے کے لیے پاکستان سے باہر چلی گئی تھی۔
اور آج پورے دو ماہ بعد وہ مجتبیٰ سے ملنے آئی تھی۔ اور آتے وقت وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ جس

شخص نے دو ماہ میں اسے دو دفعہ بھی فون نہیں کیا تھا وہ اسے یوں کسی کافی شاپ میں پرپوز کردے گا۔
وہ اپنے سامنے رکھے کھلے کیس کو دیکھ رہی تھی جس میں پلاٹینم کی انگوٹھی جگمگا رہی تھی۔
اسے زبردست جھٹکا لگا تھا۔ حیرت' خوشی اور بے یقینی۔
"Isnt Dream" وہ چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا کر رو دی تھی۔
"اب مانگو۔ جو بھی جیسی بھی Justification مانگنی ہے..." لبوں پہ ہاتھوں کی بند مٹھی رکھے وہ بولا۔
"تم بتا نہیں سکتے تھے مجتبیٰ... میرا ہارٹ فیل ہوجاتا تو...؟"
اس نے زر کو دیکھا اور ہلکا سا مسکرایا۔
زر کو چند منٹ اور لگے تھے خود کو سنبھالنے میں۔
پھر اس نے انگوٹھی کو لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا۔
"زر... ایک منٹ...!"
اس نے چونک کر مجتبیٰ کو دیکھا۔
"اس رنگ کو پہننے سے پہلے یہ ضرور سوچ لینا کہ تم ایک بٹے ہوئے شخص کے ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ کررہی ہو۔ تمہارے لیے مستقبل میں مجھ سے زیادہ بہتر آپشنز ہوں گے سو اموشنل (جذباتی) ہو کر نہیں۔ سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا۔"
"میں تم سے صرف ایک سوال کرنا چاہوں گی مجتبیٰ! جب تم نے یہ رنگ کیس میرے سامنے کھول کر رکھا تو یہ تمہارا جذباتی فیصلہ تھا یا تم نے سوچ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔"
مجتبیٰ نے ایک نظر اسے دیکھا تھا۔
"مجھے اپنے اس جذباتی عمل کے لیے ایک لمبی جنگ لڑنی ہے زر..."
"اور مجھے بھی اگر اپنے اس جذباتی عمل کے لیے کوئی جنگ لڑنی پڑی تو میں ضرور فائٹ کروں گی مجتبیٰ..." وہ رکی۔ پھر بولی۔
"اور میرے لیے... تم سے بہتر کوئی آپشن اور ہو ہی نہیں سکتا۔"

وہ دونوں بے حد سنجیدگی سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ یہ دونوں کی ٹین ایج چاہت نہیں تھی۔ یہ اس عمر کی چاہت تھی جو یا تو ہوتی نہیں اور اگر ہوتی ہے تو پھر کچھ دیکھتی نہیں۔
زر نے وہ انگوٹھی اٹھا کر اپنے بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں پہن لی تھی۔
"اگر وہ...
میری آنکھوں میں...
مجسم دیکھ لے خود کو
مجھے پورا یقین ہے کہ...
اسے میری محبت سے...
بلا کا "عشق" ہوجائے..."
وہ ہی نرم سا لہجہ تھا مگر نہ جانے کیوں آج وہ لہجہ اس کی دھڑکن کو اپنا رول کررہا تھا۔
مجتبیٰ نے زر کو اس طرح سے چاہا تھا کہ زر کو خبر تک نہ ہوسکی تھی اور اب جب خبر ہوئی تھی تو اسے یوں محسوس ہورہا تھا کہ جیسے یہ اس کی "خوش قسمتی" نہیں تھی یہ خوش قسمتی سے بڑھ کر کچھ اور تھا...
اور آج اسے اس ایک لفظ کی وضاحت مل گئی تھی جسے محبت کہا جاتا ہے۔

☼ ☼ ☼

حیدر ملک اس کی بات سن کر چائے پینا بھول گئے تھے اور خاموشی سے ہاتھوں کو ایک دوسرے میں پھنسا کر ہونٹوں پر رکھے سوچ رہے تھے۔
"تم نے اگر یہ بات کی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ تمہارے پاس ٹھوس وجوہات ہیں۔ لیکن ایک باپ ہونے کے ناتے میرا مشورہ یہی ہے جانی! ڈونٹ ڈو دس..." وہ بہت پیار سے اس کا ہاتھ تھام کر بولے۔
زر ہاتھ چھڑا کر خاموشی سے اٹھ کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔
"میں جانتی تھی کہ آپ اس بات کو پسند نہیں کریں گے لیکن ڈیڈی! کیا یہ بات اہم نہیں ہے کہ میری پسند کیا ہے؟"

اس نے قدرے اداسی سے کہا۔
"بات تمہاری پسند کی اہمیت کی نہیں ہے' بات تمہاری سلیکشن کی ہے۔"
"اس کا مطلب یہ ہے کہ میرا انتخاب غلط ہے؟"
"ہنی! تمہیں جو چیز پسند آئی ہے تم اسے فوراً حاصل کرنا چاہتی ہو۔"
زر نے مڑ کر انہیں دیکھا۔ وہ اس کے باپ تھے' بچپن سے وہ اس کی تمام عادات سے واقف تھے اور وہ صحیح کہہ رہے تھے مگر وہ اس بات سے واقف نہیں تھے کہ "مجتبیٰ" کوئی چیز نہیں تھا۔
وہ آہستہ سے چلتے ہوئے ان تک آئی تھی۔
"ڈیڈی! وہ چیز نہیں ہے۔"
ان کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اس نے کہا۔
بے ساختہ انہوں نے ایک گہرا سانس بھرا تھا۔
"ممی کو کوئی Objection (اعتراض) نہیں ہے تو۔۔۔"
"ہنی ممی کی بات کو چھوڑو زر! اسے تو سیاست سے آگے کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا۔" وہ ذرا ناراضی سے بولے تھے۔
"بیوروکریٹس اور سیاستدانوں کی آپس میں کبھی نہیں بنتی' میں حیران ہوں کہ آپ دونوں نے شادی کیسے کرلی؟" وہ مسکرائی۔
"آپ کی چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی تھی۔
"ہنی۔۔۔!"
وہ دروازے میں پہنچی تھی جب حیدر ملک نے اسے پیچھے سے پکارا تھا۔
"TakeYourTime....."
اس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا اور چلی گئی تھی۔
حیدر جانتے تھے کہ وہ ان کے کہنے پر ٹائم تو ضرور لے گی مگر فیصلہ نہیں بدلے گی۔ اور اگر کسی وجہ سے اسے فیصلہ بدلنا بھی پڑا تو وہ مجتبیٰ کے بعد وہ کسی اور سے شادی ہی نہیں کرے گی۔ وہ جانتے تھے کہ ان کی Extremist (شدت پسند) تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی بال بنا رہی تھی جب سیما گل دستک دے کر اندر داخل ہوئی تھی۔
"مہمان آئے ہیں۔" وہ کچھ جھجک کر بولی۔
"اچھا ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ' آتی ہوں میں۔" اس نے بے توجہی سے کہا۔
سیما گل کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی مگر اس کی بے توجہی پا کر چلی گئی تھی۔
پیچ کلر کے شیفون کے فراک کے اوپر اس نے بیذ سے سرخ دوپٹا اٹھا کر گلے میں ڈالا۔
کھلے بالوں کو پیچھے سے لا کر ایک کندھے پر گرایا۔ ڈریس سے میچنگ لپ گلوس لگایا۔ اور آئینے میں ایک نظر اپنا جائزہ لینے کے بعد وہ باہر چلی آئی تھی۔
اس کے خیال میں مہمان ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے مگر وہ تو لاؤنج میں ہی براجمان تھے اسے حیرت ہوئی۔
وہ دو خواتین تھیں۔ جن میں ایک ادھیڑ عمر کی خاتون تھیں جبکہ دوسری اکیس بائیس سال کی لڑکی تھی۔
خاتون بڑی شان سے صوفے پر براجمان تھیں' جبکہ وہ لڑکی کچھ نروس سی نظر آرہی تھی۔
"السلام علیکم!" ادھیڑ عمر خاتون نے اس کے سلام کا جواب نہیں دیا تھا بلکہ وہ بڑی تنقیدی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔
زر کے ماتھے پر بل پڑے تھے اور ایسے ہی کئی بل ان خاتون کے ماتھے پر بھی موجود تھے۔
"آپ کی تعریف؟" اس نے براہ راست اس لڑکی سے پوچھا۔
"یہ کیا بتائے گی' ہم بتاتے ہیں اس کی تعریف۔" زر کے ذہن میں یکدم کلک ہوا تھا۔ اردو ٹھیک تھی مگر لہجے میں پٹھانوں والا لہجہ ضرور تھا۔
"یہ مجتبیٰ خان کی پہلی اور "خاندانی" بیوی اور اس کی وراثت کے وارث کی ماں "زرمینے" ہے۔" لہجہ

طنز تھا۔ زر تلملا گئی وہ خاموشی سے انہیں دیکھتی رہی۔ جس طرح انہوں نے لفظ "خاندانی" کہا تھا اس وہ برداشت کرنے کی کوشش بھی کر رہی تھی۔
وہ مجتبیٰ کی مورے تھیں اب یہ کلیئر ہو گیا تھا۔
"اب آپ ذرا میری تعریف بھی سن لیجیے' میں مجتبیٰ خان کی دوسری بیوی مگر پہلی محبت اور اس کے دل کی وراثت کی وارث ہوں' وہ وراثت جسے اس نے اپنی پہلی اور "خاندانی" بیوی کے نام کرنا پسند نہیں کیا۔"
اس نے مورے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر' ان سے بھی زیادہ تیز لہجے میں بات کی تھی۔ اس نے زرمینے کا چہرہ فق ہوتے دیکھا تھا۔
"زبان کا صحیح استعمال نہیں سکھایا کسی نے تم کو؟" اس کی توقع کے عین مطابق وہ بھڑک اٹھی تھیں۔
وہ مسکرائی۔ "سکھایا ہے اور بہت ہی اچھی طرح سے سکھایا گیا ہے کہ جو جس زبان اور لہجے میں بات کرے آپ اسے اسی زبان اور لہجے میں جواب دو۔" کیا ہی دل جلانے والی مسکراہٹ تھی۔
اور پھر اس نے ردعمل کا انتظار کیے بغیر سیما گل کو آواز دی۔
"جی بی بی!"
"مہمانوں کی خاطر داری میں کوئی کسر نہ رہے ان کو پتا چلنا چاہیے کہ وہ زر مجتبیٰ کے گھر تشریف لائی ہیں۔" پھر اس نے ڈرائیور کو آواز دے کر کہا تھا۔
"بشیر۔۔۔ بشیر گاڑی نکالو۔"
وہ پلٹ کر چلی گئی تھی۔
تھوڑی دیر بعد "مورے" نے اسے پاؤچ ہاتھ میں پکڑے باہر جاتے دیکھا تھا۔
زرمینے نے ڈرتے ڈرتے ایک نظر مورے کو دیکھا۔ غصے کی شدت سے ان کا چہرہ سرخ ہو چکا تھا۔
اور وہ خود۔۔۔
اسے غصہ آیا تھا نہ طیش۔۔۔
"ہاں! تم اتنی خوبصورت ہو کہ کوئی بھی مرد ایک کیا چار چھوڑ کر تمہیں اپنا سکتا تھا۔"
وہ سوچ رہی تھی۔
وہ تب چونکی جب اس نے مورے کی طیش بھری آواز سنی تھی۔
وہ پشتو میں زر کے بخیے ادھیڑنے میں مصروف تھیں۔

☼ ☼ ☼

جو کچھ ہوا' وہ اس کے بارے میں سوچنا نہیں چاہتی تھی مگر بار بار زرمینے کا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے آرہا تھا۔ زر کو ماننا پڑا تھا' وہ بھی کچھ کم خوبصورت نہیں تھی۔
اور سکینہ خاتون کے "خاندانی بیوی" کے الفاظ۔۔۔
ایک بار نہیں بار بار اس کے کانوں میں سیسہ انڈیل رہے تھے۔
وہ ابھی آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر یہ نہیں پوچھ سکتی تھی کہ "خوبصورت ترین عورت کون ہے۔"
اس کے پاس کوئی ایسا آئینہ فی الوقت موجود نہیں تھا۔ اس وقت اس کے سامنے بشیر ڈرائیور تھا اور بڑی شدت سے اس کا دل چاہا کہ وہ بشیر سے ہی پوچھ لے کہ
"وہ ساری دنیا سے نہ سہی' کیا وہ زرمینے سے خوبصورت ہے؟"
مگر وہ جانتی تھی کہ وہ ایسا نہیں کرسکتی تھی' وہ صرف کڑھ سکتی تھی۔
سو وہ کڑھ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ جانتا تھا کہ آج زر کا موڈ کس قدر "خوشگوار" ہو سکتا تھا۔ اسے مورے کے آنے کی اطلاع مل چکی تھی۔
"سیما گل!" کمرے میں جانے کے بجائے اس نے سیما کو آواز دی تھی۔
"بی بی کدھر ہے؟"
"کمرے میں۔۔۔"
"کھانا کھایا؟"
"نہیں صاحب۔۔۔!"

"ٹھیک ہے۔۔۔ جاؤ کھانا لگاؤ۔"

ایک گہرا سانس بھر کر اس نے کمرے کا دروازہ کھولا ماتھے پر ہزاروں تیوریاں چڑھائے وہ بظاہر میگزین کھولے بیٹھی تھی۔

"کیسی ہو؟" ٹائی ناٹ ڈھیلی کرنے کے بعد اس نے ہاتھ میں پکڑا کوٹ بیڈ پر اچھالتے ہوئے پوچھا۔

"فائن!" تند و تیز سی آواز آئی تھی۔

اس سے پہلے وہ کچھ اور کہتا۔ دروازے پر دستک ہوئی تھی۔

زر نے گھور کر دروازے کو دیکھا جبکہ اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔

"کھانا لگ گیا ہے صاب!" سیما گل کہہ کر واپس چلی گئی۔

"زر! تم چلو ڈائننگ ٹیبل پر۔ میں چینج کر کے آتا ہوں۔" وہ اس کے تیور دیکھے بغیر واش روم میں چلا گیا۔

اور جب وہ واپس آیا تو حسب توقع وہ وہیں بیٹھی تھی۔

وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر بال بنانے لگا تھا۔

"چلیں!" مڑ کر اس نے کہا۔

زر نے کاٹ دار نظروں سے مجتبیٰ کو دیکھا' میگزین بند کر کے اسے زور سے سائیڈ ٹیبل پر پٹخا اور اٹھ کر مجتبیٰ کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ آنکھوں میں نرم سا تاثر لیے وہ اپنی مسکراہٹ کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"بہت اچھی ایکٹنگ کر لیتے ہیں آپ!" کاٹ دار آواز میں کہا گیا تھا۔

"او میم! تھینکس فار دا کمپلمنٹ۔" سینے پہ ہاتھ رکھ کر اس نے جھک کر کہا۔

"تم! تم ایسے بی ہیو کر رہے ہو جیسے کچھ ہوا ہی نہیں اور وہ تمہاری مدر۔۔۔ انسلٹ کر کے گئی ہیں میری۔۔۔ ایک عورت میرے ہی گھر میں کھڑی ہو کر مجھے میرے ہی شوہر کی خاندانی بیوی سے متعارف کرا رہی ہے۔ کس قدر ہتک آمیز ہے یہ۔" اس نے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کیے تھے۔

"ایزی۔ ایزی۔ ایزی۔" اس نے زر کے دونوں ہاتھ پکڑ کر نیچے کرتے ہوئے کہا تھا اس نے ہاتھ چھڑا لیے۔

"چلو چل کر کھانا کھاتے ہیں۔" اس نے زر کے کندھے پر ہاتھ پھیلا کر کہا تھا۔

"تمہیں میری بالکل پروا نہیں ہے مجتبیٰ! I am hurt" اس نے سر اٹھا کر مجتبیٰ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تھا جبکہ اس کی اپنی آنکھیں نم تھیں۔

مجتبیٰ نے ایک گہرا سانس بھرا تھا۔

"یہاں بیٹھو!" اس نے زر کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اسے وہاں موجود صوفے پر بٹھایا اور خود بھی اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ چند لمحے وہ کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔

"زر! پہلے ایک بات ذہن میں کلیر کر لو۔" وہ اس کی طرف مڑا۔

"اس شادی سے اگر کوئی خوش ہے تو وہ صرف اور صرف ہم دونوں ہیں۔ سو اس کا کیا مطلب ہوا؟"

"اس کا جو بھی مطلب ہوا کرے مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہونا چاہیے مجتبیٰ! کہ جس کا دل کرے' میرے گھر آئے اور میری انسلٹ کر کے چلا جائے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو' سو فیصد بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو' مگر یہ بھی تو دیکھو' مورے باتیں کرنے کے علاوہ کچھ کہہ نہیں سکتیں اور اور پھر تم نے بھی تو حساب برابر کر دیا تھا نا۔ گھر سے جا کے۔"

"واٹ! تو کیا میں گھر میں بیٹھ کر ان کی باتیں سنتی' اور وہ بھی تمہاری خاندانی بیوی کے سامنے۔" وہ بھڑک اٹھی۔

"او کے او کے۔ بھول جاؤ اسے۔ چلو کھانا کھاتے ہیں۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے پچکارتے ہوئے بولا۔

"مجتبیٰ!" اس نے بے زار ہو کر کہا تھا۔

"زر پلیز۔ میں کیا کروں اب اگر وہ یہاں آ ہی گئی تھیں تو میں نے تو انہیں نہیں کہا تھا نا ایسا کرنے کو۔" وہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔

زر خاموشی سے اسے دیکھتی رہی تھی۔

"ہو گے فائن! اب یہاں کوئی بھی نہیں آئے گا۔ ... مورے اب ٹھیک ہے؟" وہ خاموش رہی

"مم ... زر ... کھانا ٹھنڈا ہو چکا ہو گا اور مجھے بھوک ..."

"تم چلو۔۔۔ آتی ہوں میں۔" وہ برا منہ بنا کر بولی۔

"شکر ہے خدا کا۔" وہ کھڑے ہوتے ہوئے منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

"سنو!" وہ دروازے کے قریب جا کر رکا پھر اور مڑ کر ...

"تم بڑے برے منہ بناتی ہو تم Land کے کسی کریکٹر کی طرح لگ رہی Zombi تھیں۔"

"مجتبیٰ!" وہ چیخی تھی اور کھینچ کر پاس پڑا کشن اسے دے مارا تھا۔ جو کہ دروازے سے ٹکرا کر نیچے گر گیا تھا کیونکہ مجتبیٰ نے بروقت دروازہ بند کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

زر سے شادی کے بعد مجتبیٰ اپنی دونوں بیویوں کو برابر وقت دیتا تھا۔ دوسری شادی کا ہرگز مطلب یہ نہیں تھا کہ اس نے زرمینے کو نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ اب زرمینے اور عبدل کا پہلے سے بھی زیادہ خیال رکھتا تھا مگر اپنی سیاسی اور بزنس کی مصروفیات کی وجہ سے اس کا زیادہ تر وقت اسلام آباد میں ہی گزرتا تھا۔ گو کہ زرمینے اس سے شکایت نہیں کرتی' مگر وہ خود کو مجرم محسوس کرتا تھا۔

ابھی بھی وہ کوئٹہ پورے ماہ بعد آیا تھا' وہ بھی عبدل کی بیماری کا سن کر۔

"کیسی ہو زرمینے؟" اس نے پوچھا۔

"شکر ہے' خان۔۔۔ ٹھیک ہوں۔" مدھم لہجہ جھکا سر' مرجھایا چہرہ یقیناً" وہ عبدل کی وجہ سے پریشان تھی۔

"عبدل کدھر ہے؟"

"سو رہا ہے۔"

"طبیعت کیسی ہے اب اس کی؟"

"بہتر نہیں ہے۔ بخار ہی نہیں اتر رہا اس کا۔" یہ کہتے ہوئے زرمینے کی آواز رندھ گئی تھی۔ وہ اٹھ کر عبدل کی کاٹ تک آیا۔

عبدل کے ماتھے پہ ہاتھ رکھ کر اس نے بخار چیک کیا۔ بخار کی شدت کم تھی مگر ابھی بھی مکمل طور پر اترا نہیں تھا۔

وہاں سے پلٹ کر وہ اپنے سیل پر نمبر پش کرنے لگا تھا وہ کسی ڈاکٹر سے بات کر رہا تھا۔

اور پھر عبدل کی وجہ سے اسے کوئٹہ میں معمول سے زیادہ وقت لگ گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ عبدل مکمل طور پر صحت یاب ہو جائے تو ہی وہ واپس اسلام آباد جائے۔

عبدل کی طبیعت کافی بہتر تھی' مگر وہ چڑچڑا سا ہو گیا تھا' روتا بہت تھا اور اس کی نیند بھی کم ہو گئی تھی۔

ابھی بھی زرمینے بیڈ پر عبدل کے ساتھ نیم دراز تھی اور اسے سلانے کی کوشش کر رہی تھی جبکہ وہ بیڈ کے دوسری طرف اس طرح لیٹا ہوا تھا کہ عبدل اس کے اور زرمینے کے درمیان تھا۔ عبدل نیم غنودگی کی سی حالت میں تھا' اچانک مجتبیٰ کے سیل نے بیپ کیا تھا۔

زرمینے نے فوراً" بڑے ہی بے ساختہ انداز میں سیل فون کی طرف دیکھا کیونکہ اس کی آواز سے عبدل جاگ سکتا تھا۔

اور مجتبیٰ نے زرمینے کی نظروں کا مفہوم سمجھتے ہوئے رنگ ٹون کو پورا بجنے بھی نہیں دیا تھا اور فوراً" دیکھے بغیر سیل آف کر دیا تھا۔ یہ سب کچھ سیکنڈز میں ہوا تھا۔

عبدل تھوڑی دیر بعد مکمل طور پر سو چکا تھا۔

اس نے ہاتھ کے اشارے سے زرمینے کو اپنے پاس بلایا تھا۔ سر پہ دوپٹا ٹھیک کرتے ہوئے وہ اس کے پاس آئی۔ زرمینے کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اس نے کبھی بھی نظریں اٹھا کر مجتبیٰ سے بات نہیں کی تھی۔

چند لمحے سر جھکائے وہ کچھ سوچتا رہا۔
"زرمینے! یہ کبھی مت سمجھنا' میں نے دوسری شادی اس لیے کی کہ تم میں کوئی کمی تھی۔ تم بہت اچھی بیوی ہو' مگر انسان کبھی کبھی دل کے ہاتھوں بہت مجبور ہو جاتا ہے۔ تم اور عبدل بہت اہم ہو میرے لیے۔ کبھی سوچنا بھی مت کہ مجتبیٰ خان کسی بھی حال میں تم دونوں سے آنکھیں بند کرلے گا۔ یہ میری غیرت کے خلاف ہے۔"
اس کے ہاتھوں پہ ہاتھ رکھے وہ بے حد آہستگی سے بول رہا تھا۔
"جانتی ہوں خان! آپ کبھی بھی میری حق تلفی نہیں ہونے دیں گے اور کچھ بھی حالات ہوں آپ مجھے چھوڑیں گے بھی نہیں۔ سمجھتی ہوں میں آپ کو خان! میں نے بہت کھلے دل سے آپ کے فیصلے کو قبول کیا ہے اور یہ ایک پختون عورت کی غیرت کے خلاف ہے کہ وہ اپنے شوہر کے لیے مشکلات پیدا کرے۔"
جھکے ہوئے سر کے ساتھ وہ مدہم لہجے میں بے حد سادگی سے بات کررہی تھی۔ وہ مجتبیٰ کے پہلو میں ذرا فاصلے پہ بیٹھی تھی۔ اس نے ہاتھ سے زرمینے کے چہرے پر سے دوپٹا ہٹایا۔ زرمینے کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور اپنے پاس بٹھالیا۔
"ادھر دیکھ کر کہو ذرا۔" بے اختیار وہ گھبرائی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے والا اعتماد یکدم ختم ہوا تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس کا چہرہ سرخ' دھڑکن تیز اور سر مزید جھک گیا تھا اگر عبدل کے اٹھنے کا ڈر نہ ہوتا تو وہ ضرور دل کھول کر ہنستا۔ مجتبیٰ چند لمحے اسے دیکھتا رہا تھا۔
"اتنا صبر کیسے ہے تم میں زرمینے؟" اپنے ساتھ لگاتے ہوئے اس نے مدہم سے لہجے میں پوچھا۔
"زرمینے کے صبر کے لیے یہ ہی کافی ہے کہ "مجتبیٰ خان نیازی" اب بھی اس کا شوہر ہے۔"
مجتبیٰ سے بھی مدہم آواز میں جواب آیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ کب سویا اور کب زرمینے اس کے پاس سے اٹھ کر گئی تھی' اسے پتا ہی نہیں چلا تھا۔ آنکھ کھلتے ہی اسے پہلا خیال "زر" کا آیا تھا جب سے ... اس نے زر سے کانٹیکٹ ہی نہیں کیا تھا۔
ادھر ادھر ہاتھ مارتے ہوئے اس نے سیل فون تلاش کیا اور اٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔
ہلکی سرخ آنکھیں' بے ترتیب بال' سفید رنگت اس وقت سرخی مائل ہورہی تھی۔
زرمینے بے اختیار ہی اسے دیکھے گئی تھی۔ وہ لاؤنج سے گزر کر باہر چلا گیا تھا اور زرمینے مڑ کر باہر جاتا دیکھتی رہی تھی۔
"اگر پہلے ایسے دیکھ لیتیں تو یوں نہ پچھتا رہی ہوتیں تم۔ زرمینے!" وہ نہیں جانتی تھی کہ مور اسے دیکھ رہی ہیں۔
وہ چونک کر مڑی اور ہلکا سا مسکرائی۔
"میں اب بھی نہیں پچھتا رہی ہوں مورے! ... کرنے کے لیے کیا یہ کافی نہیں ہے کہ خان ... کمرے میں موجود تھا مورے! میں ناشکری عورتوں میں سے نہیں ہوں۔"
اس نے نرمی سے کہا اور واپس چلی گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

فون آن کرتے ہوئے اس کی نظر لان میں پھرتے ہوئے مور پر پڑی تھی۔ وہ چند سیکنڈز کے لیے اس طرف متوجہ ہو گیا تھا اور پھر جب اس کا سیل آن ہوا تو دماغ بھک سے اڑ گیا تھا۔ کیونکہ زر کی مسڈ کالز تھیں۔ بے اختیار اس نے یاد کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ کتنی دیر تک سوتا رہا تھا اور اس کا سیل کتنی دیر بند رہا تھا۔
اتنا ٹائم تو زر تو کیا' کسی کے لیے بھی ایک عدد کہانی بنانے کے لیے کافی تھا۔
اس نے زر کا نمبر یہ توقع کرتے ہوئے ہی ملایا تھا، وہ آف ہوگا اور وہ آف ہی تھا۔ بے ساختہ اس نے سانس بھرا اور پھر اس نے گھر کا نمبر ملایا تھا۔
"زر کہاں ہے سیما گل؟" سیما گل کے فون اٹھاتے ہی پوچھا۔

"وہ تو کمرے میں نہیں ہے۔"
"کہاں گئی ہے؟"
"پتا نہیں صاب۔ گاڑی لے کر نکلا ہے بی بی۔"
"ٹھیک ہے۔" اس نے فون بند کردیا۔ وہ بہت اچھی طرح سے زر کے مزاج کو سمجھتا تھا اور وہ یہ بھی جانتا تھا۔ وہ بدگمان ہونے میں ایک سیکنڈ کا وقت بھی نہیں لگائے گی۔

☼ ☼ ☼

"زر! بات مت کرنا اس سے حد ہوتی ہے لاپروائی کی۔" حیدر ملک جب کمرے میں داخل ہوئے تو افشین ملک زر سے کہہ رہی تھیں۔
"بجائے اسے سمجھانے کے آپ الٹا اس کا دماغ خراب کررہی ہیں۔" وہ ذرا غصے سے بولے۔
"آپ چپ رہیں گے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ مجھے معلوم ہے کیسے ہینڈل کرنا ہے اس معاملے کو۔" افشین ملک نے تیز لہجے میں جواب دیا۔
"یقیناً" آپ بہتر جانتی ہیں کہ کیسے اس معاملے کو خراب کرنا ہے۔"
"حیدر!" افشین ملک تلملا کر پلٹیں۔
"پلیز! کیا آپ مجھے' میری بیٹی سے بات کرنے کا موقع دیں گی؟" ایک ہاتھ اٹھا کر انہوں نے افشین کو مزید بولنے سے منع کرتے ہوئے کہا۔
وہ ایک تیز سی نظر ان پر ڈالتے ہوئے باہر چلی گئی تھیں۔ ایک گہرا سانس بھرتے ہوئے وہ زر تک آئے تھے۔
"بیٹا! مرد کو وہی بیوی اچھی لگتی ہے جو اس کی پرابلم کو سمجھے۔ نہ کہ اس کے لیے پرابلم پیدا کرے۔ پرابلم پیدا کرنے والا ہر کسی کو بھی ناپسند ہوتا ہے۔ اور مجھے پتا ہے میری بیٹی بہت سمجھ دار ہے۔" اس کے ساتھ بیٹھ کر اس کے کندھے کے گرد ہاتھ پھیلاتے ہوئے انہوں نے کہا۔
"بٹ ڈیڈی!
بات اتنی بڑی نہیں ہے جتنا ایشو تم اور تمہاری ماں کری ایٹ کررہی ہیں۔۔۔ کم آن زر۔ ڈونٹ بی چائلڈش۔"
او کے وہ برے دل سے بولی۔
"مجتبیٰ تمہارا انتظار کررہا ہے۔ میں اسے بھیجتا ہوں۔"
دروازے تک جاتے جاتے وہ مڑ کر بولے تھے۔

☼ ☼ ☼

مجتبیٰ کمرے میں داخل ہوا تو وہ گلاس وال کے سامنے کھڑی تھی۔ باپ کے سمجھانے کا اتنا اثر ہوا تھا کہ وہ اب تک خاموش تھی۔
وہ اس کے پاس جاکر کھڑا ہو گیا تھا۔
"زر!" مجتبیٰ نے مدہم آواز میں اسے پکارا۔
اس نے جواب نہیں دیا' مگر آنسو آنکھوں سے گرنے لگے تھے۔
"اوں۔۔ ہوں۔۔ نہیں۔۔ رونا نہیں۔" اس کا رخ اپنی طرف موڑتے ہوئے اس نے انگلی کی پور سے اس کے آنسو صاف کیے تھے۔
"مجتبیٰ کے لیے دنیا کی سب سے زیادہ تکلیف دہ چیز ہے' تمہاری آنکھوں میں آنسو دیکھنا۔" اس کا ہاتھ ابھی تک زر کے بازوؤں پہ ہی تھا۔
زر نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔
متورم آنکھیں' بھیگی پلکیں اور ان بھیگی آنکھوں کی خوب صورتی۔ کیا یہ کم تھا اس پہ فدا ہونے کے لیے۔
"تکلیف بھی تو تم ہی دیتے ہو۔" آنسوؤں سے بوجھل آواز میں جواب آیا۔
"میں۔۔؟" وہ حیران ہوا۔ "میں تمہیں تکلیف دے سکتا ہوں؟"
"فون میرا تم نے کاٹ دیا' پورے اتنے دن لگا کر آئے ہو اور ابھی بھی کہتے ہو کہ تم مجھے تکلیف نہیں دے سکتے۔" نم آنکھیں لیے وہ خفا ہو رہی تھی۔
"ادھر آؤ۔ یہاں بیٹھو۔" مجتبیٰ اسے روم چیئر پہ

بٹھاتے ہوئے بولا اور دوسری چیئر گھسیٹ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس نے زر کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے۔

بلیک سی شرٹ اور بلیک پینٹ کے اوپر اس نے گلے کے گرد گرے کلر کا مفلر یوں لپیٹا ہوا تھا کہ اس کے دونوں سرے آگے کو گرے ہوئے تھے۔ بلیک کلر میں وہ ہمیشہ سے زیادہ اچھا لگ رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ نظریں اٹھاتا' زر نے فوراً" منہ پھیر لیا۔

"یہ جو دل ہوتا ہے نا زر۔ ! یہ ایک وقت میں کسی ایک کے نام پہ نہیں دھڑکتا۔" اسے دھچکا لگا۔ حیران ہو کر اس نے مجتبیٰ کو دیکھا تھا۔

"حیران مت ہو۔۔۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ اس میں بہت سے خانے ہوتے ہیں اور ہر خانہ کسی ایک کی محبت کے نام فکس ہوتا ہے۔ جیسے باپ کی محبت' جیسے ماں کی محبت' بہن' بھائی کی محبت جیسے عبدل کی محبت اور جیسے تمہاری محبت۔۔۔ جو تمہارے نام کا خانہ ہے نا۔ وہ کبھی بھی' کسی بھی حالت میں کسی اور کے نام نہیں ہو سکتا۔ کیا یہ کافی نہیں ہے؟" اس نے سوال کیا۔ وہ خاموش رہی تھی۔

"کیا کہیں۔۔۔ میری محبت میں کمی ہے؟" ایک اور سوال آیا۔

زر نے بے اختیار آنکھیں بند کی تھیں۔

"نہیں مجتبیٰ۔۔۔ کمی نہیں ہے۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرا "دل" صرف ایک نام پہ ہی دھڑکتا ہے۔ اس میں خانے نہیں ہیں اور یہ مجھے کسی اور طرف دیکھنے ہی نہیں دیتا۔" وہ اس کے ہاتھوں پہ اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے بولی۔

"میرا دل کہتا ہے کہ تم اک پل سے ساعت تک' ساعت سے لمحے تک اور لمحے سے ہر وقت تک میرے ساتھ رہو۔ میری آنکھوں کے سامنے۔"

"زر! میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔ ہر وقت' ہر لمحہ' ہر ساعت' مگر میں اپنی ذمہ داریوں سے آنکھیں بند نہیں کر سکتا۔" وہ کس "ذمہ داری" کی بات کر رہا تھا۔ زر اچھی طرح جانتی تھی۔

اس نے اپنے ہاتھ چھڑا لیے۔

"تمہارے دل میں زرمینے کے نام کا [illegible] نا!" اس نے اچانک پوچھا۔

مجتبیٰ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا تھا۔

"ہاں ہے۔" پھر اس نے صاف گوئی سے [illegible]

"ہاں ہے۔" زیرِ لب دہراتے ہوئے [illegible] مجتبیٰ کی آنکھوں کو دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں [illegible] ہی جھلس تھا' مگر اسے وہ عکس نظر ہی نہیں [illegible] کیونکہ وہ دو لفظ۔۔۔ لفظ نہیں تھے کوئی منتر تھا [illegible] جلا کر بھسم کرنا شروع ہو گیا تھا۔

"ہم جو پختون ہوتے ہیں نا زر۔۔۔ شاعری [illegible] اور جذبات کی حد تک تو عشق و عاشقی کو بہت [illegible] ہیں' لیکن جہاں بات آتی ہے حقیقی زندگی کی ذمہ [illegible] عاشقوں کو اپنی جان دینی پڑتی ہے' کوئی نئی فکشن [illegible] کرنے کے لیے۔ تم شکر کرو زر۔۔۔ مجتبیٰ کو اپ[illegible] نہیں دینی پڑی۔

تمہیں کیا معلوم کہ کس کس طرح سے چیز[illegible] ہینڈل کرنا پڑتا ہے۔"

☼ ☼ ☼

اور واقعی اس معاملے کو بڑی سیاست سے ہینڈل [illegible] کیا تھا۔

سردار اجمل کے پاس زیادہ آپشنز نہیں تھے۔ [illegible] مجتبیٰ کو روک سکتے تھے۔

وہ الشفین ملک کو منع کر سکتے تھے۔

یا پھر وہ نعیم خان سے بات کرتے۔

مجتبیٰ ماننے والا نہیں تھا۔ الشفین ملک کو یوں [illegible] راستہ روکنا انہیں مناسب نہیں لگتا تھا اور [illegible] خان۔۔۔ اس سے بات کرنے کا مطلب تھا کہ ان کے ووٹرز جن کا تعلق ان کے بھائی کے علاقے سے تھ[illegible] ان سے سردار صاحب کو ہاتھ دھونے پڑتے۔ مطل[illegible] ان کا ووٹ بینک بری طرح سے متاثر ہوتا۔ نعیم خا[illegible] ان کی پارٹی کا ستون تھا۔ وہ کیسے اسے کرنے دیتے جب

بہ ضد کی بیٹی پہ سوکن لا رہا تھا۔۔۔

[illegible] کیسے سمجھاتے۔ بہرحال اس مسئلے [illegible] بھی تھا ان کے پاس اور یہی تو سیاست ہے کہ [illegible] بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

[illegible] کی راہ سیاست کا مشہور زمانہ طریقہ تھا جسے "ونی" کہتے ہیں۔

[illegible] "تھی کس کے ساتھ؟

نعیم خان۔۔۔ زرمینے کے باپ کے ساتھ۔

انہوں نے مجتبیٰ کی شادی کے بدلے نعیم خان کے بیٹے سخاوت خان کو منسٹری دلانے کا وعدہ کیا تھا۔

سخاوت نعیم خان کا وہ بیٹا تھا جو ابھی تک سیاست میں اس طرح سے کامیاب نہیں تھا جس طرح ان کے باقی بیٹے کامیاب تھے۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ابھی تو کوئی سیٹ خالی نہیں ہے اور الیکشن میں تو کافی ٹائم پڑا ہوا ہے۔" نعیم خان حیرت سے بولے۔

"سیٹ خالی نہیں ہے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ سیٹ خالی ہو بھی نہیں سکتی۔ آج کل جعلی ڈگریوں کا بہت شور ہے۔"

وہ خشک میووں کی ٹرے نعیم خان کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔ نعیم خان نے کاجو اٹھا لیے تھے' وہ سوچ رہے تھے کہ کس کی ڈگری جعلی تھی ان کی پارٹی میں اور یکدم ان کے دماغ میں ایک جھماکا ہوا تھا۔

"زبیر۔۔۔ زبیر بلوچ۔" بے ساختہ انہوں نے کہا تھا۔

"ٹھیک پہنچے آپ۔۔۔!" اجمل خان کی مسکراہٹ مزید گہری ہوئی۔

"تم اس کے خلاف انکوائری شروع کراؤ گے اجمل؟ وہ کافی اسٹرانگ ممبر ہے ہماری پارٹی کا۔"

"اس کے خلاف ابھی تک انکوائری شروع نہیں ہوئی تو اس میں بھی میرا ہی ہاتھ ہے اور اگر ہوئی تو تب بھی یہ کام میں ہی کروں گا مجتبیٰ کی وجہ سے مجھے یہ اسٹیپ لینا پڑ رہا ہے وہ اڑا ہوا ہے اپنی ضد پہ۔۔۔ زبیر کی ڈگری جعلی نکلے گی تو اس سیٹ پر ہم سخاوت کو کھڑا کریں گے۔ ایک دفعہ وہ ضمنی الیکشن جیت کر ایم این اے "ایم پی اے" بن جائے پھر اسے منسٹری دلانا میرا کام ہے۔" اجمل خان نے تفصیل سے سمجھایا تھا۔

"تم اپنے بیٹے کے سر سے یہ عشق کا بھوت نہیں اتار سکتے۔"

"یہ چار دن کا ایسا بخار ہے اجمل خان جسے اترنا ہی ہے۔ تم دیکھنا یہ شادی زیادہ عرصہ نہیں چلے گی۔"

نعیم خان نے قہقہہ لگایا تھا۔

ان دونوں کی ڈیل "ڈن" ہو چکی تھی۔

نعیم خان اب مجتبیٰ کو ایک کیا دو اور شادیوں کی اجازت بھی دے سکتے تھے۔ ان کے خاندان کے نام ایک اور منسٹری جو لگنے والی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کہاں جا رہے ہو مجتبیٰ؟" آنکھیں کھلنے پر اس نے مجتبیٰ کو ڈریسنگ کے سامنے کھڑا پایا تھا۔

"اوہ۔۔۔ اٹھ گئیں تم؟" وہ مڑا۔

"ہاں!" وہ کھلے بالوں کا جوڑا بناتے ہوئے بیڈ سے اتری۔

"چلو تم فریش ہو جاؤ۔ پھر ناشتا ساتھ کرتے ہیں۔" اس نے زر کے سوال کو ٹالتے ہوئے کہا۔

"تم کہاں جا رہے ہو مجتبیٰ؟" اب کے زر نے الفاظ ذرا چبا چبا کر ادا کیے تھے۔ مجتبیٰ نے گہرا سانس بھرا۔

"بابا جان آئے ہوئے ہیں۔ کچھ میٹنگز اٹینڈ کرنی ہیں ان کے ساتھ۔"

"ابھی تو تم آئے ہو کوئٹہ سے۔۔۔ واپسی کب ہو گی؟"

"رات تک آ جاؤں گا۔" اس نے زر کو آئینے میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"اسی لیے میں نے کہا تھا کہ "I hate politicians" (مجھے سیاست دانوں سے نفرت ہے) وہ برا سا منہ بنا کر بولی۔

مجتبیٰ ہنس پڑا۔

"پھر تو مجھے یہاں بالکل نہیں رکنا چاہیے۔"

"تم!" وہ دانت پیس کر رہ گئی۔

"اوکے! صبح صبح موڈ خراب مت کرو اور اس طرح سے کی آف کرو کہ میں سارا دن فریش رہوں۔"

"نہیں کرتی۔" بڑی ادا سے جواب دیا۔

"وہ! نو پرابلم۔ ہم خود کر لیتے ہیں۔" اس نے کہتے ہوئے زر کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا تھا۔

زر کو ہلکا سا جھٹکا لگا اور اس کے بندھے ہوئے بال کھل گئے تھے۔

"تم کچھ زیادہ ہی نہیں پھیل رہے مجتبیٰ خان!" دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پہ رکھ کر اس نے مجتبیٰ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس "پھیلنے" کا قانونی سرٹیفکیٹ لے رکھا ہے ہم نے محترمہ! کوئی اعتراض؟"

"یس!" ایک ابرو اچکا کر زر نے جواب دیا تھا۔

"اوبجیکشن رد کیا جاتا ہے۔" اس نے زر کے دونوں ہاتھ کندھوں سے ہٹاتے ہوئے اسے ساتھ لگایا۔ وہ کھل کر ہنسی تھی۔

وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا اور پھر ہلکا سا مسکرایا۔

"یہ جو تمہاری ہنسی ہے نا زر۔ جو تمہاری آنکھوں سے چھلکتی ہے اس سے بڑھ کر قیمتی چیز اور کیا ہوگی؟"

زر نے مجتبیٰ کی آواز سنی تھی۔

اور اس نے آنکھیں بند کر کے اس کے کندھے پر سر رکھا تھا۔

"سکون۔ جو مجھے تمہارے ساتھ سے ملتا ہے مجتبیٰ! میرے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا؟"

کچھ لمحوں بعد مجتبیٰ نے اس کی آواز سنی تھی۔

"مجھے جانا ہے زر!" تھوڑی دیر بعد وہ بولا۔

زر کے منہ کے زاویے بگڑے تھے۔

"کچھ چاہیے؟" والٹ پاکٹ میں رکھتے ہوئے اچانک اس نے پوچھا۔

"نہیں۔"

"یہ اے ٹی ایم اور کریڈٹ کارڈ رکھ لو شاید ضرورت پڑ جائے۔" وہ اپنے والٹ سے کارڈز نکالتے ہوئے بولا۔

"تم آج شام کو ہی واپس آ گے نا؟" [illegible] پوچھنے پر وہ بے ساختہ ہنسا تھا۔

"ہاں! لیکن کیا پتا آپ کا دل دنیا خریدنے [illegible] تو۔"

"دنیا چھوڑو۔ اپنی بات کرو۔ تیار [illegible] لیے۔"

"ارے میم!" وہ حیران ہوا۔

"آپ کو یہاں sold کا ٹیگ نظر نہیں [illegible] کیا؟" دل پہ ہاتھ رکھ کر وہ تھوڑا سا خم ہوا۔

زر نے گھور کر اسے دیکھا۔

"باتوں میں کوئی کب جیتا ہے تم سے۔" وہ [illegible] ہاتھوں کے بل بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

مجتبیٰ نے آئینے میں سے اسے دیکھا اور ہنس دیا۔ وہ اب پرفیوم کا اسپرے کر رہا تھا۔

"اوکے! خیال رکھنا اپنا۔" وہ اس کا گال تھپتھپا [illegible] باہر نکل گیا۔ سارے کمرے میں پوائزن کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

بالوں کا ڈھیلا سا جوڑا بناتے ہوئے اس کی نظر [illegible] پڑے کارڈز پہ پڑی تھی۔ مجتبیٰ نے یہ جاننے کے باوجود کہ اس کے پاس اچھا خاصا بیلنس موجود ہے پھر بھی یہ کارڈز نہیں اٹھائے تھے۔

"تم کب سمجھو گے مجتبیٰ خان کہ تمہارا پیسہ میری ضرورت پوری نہیں کر سکتا۔" کارڈز اٹھاتے ہوئے [illegible] ذرا ناگواری سے بڑبڑائی تھی۔

☼ ☼ ☼

"میم! زبیر بلوچ صاحب آئے ہیں۔"

افشین ملک نائلہ کی اس اطلاع پر چونکی تھیں۔ زبیر بلوچ کی ڈگری جعلی ثابت ہوئی تھی اور وہ آج کل بہت جارحانہ بیان بازی پہ اترا ہوا تھا۔ ایسے میں ان سے ملاقات۔؟

"بھیجو اندر۔" ایک گہرا سانس بھر کر انہوں نے نائلہ سے کہا۔

"آئیے۔ آئیے زبیر صاحب!" اپنی سیٹ سے اٹھ کر افشین نے خوش اخلاقی سے کہتے ہوئے [illegible] سے ہاتھ ملایا۔

"تشریف رکھیے۔" آفس میں ایک سائیڈ پہ رکھے صوفوں کی طرف لے جا کر انہوں نے کہا۔

"[illegible] ہیں آپ محترمہ؟"

"اللہ کا شکر ہے آپ سنائیے بلوچ صاحب۔"

اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے سائیڈ ٹیبل پہ رکھے انٹرکام کا ریسور اٹھایا۔

"اچھی سی ریفرشمنٹ بھیجو۔" آرڈر کر کے وہ بلوچ کی طرف متوجہ ہوئی تھیں۔

"کیا بات ہے بلوچ صاحب! آپ کچھ ناراض سے لگ رہے ہیں۔" افشین ملک مسکراتے ہوئے شگفتگی سے بولیں۔

"ابھی تو میں ناراض ہو رہا ہوں نا۔ محترمہ چند دن گزرنے دیں۔ پھر آپ بھی خوش نہیں رہیں گی۔" بلوچ کافی تلخ ہو رہا تھا۔ افشین ملک نے چونکے بغیر اسے دیکھا۔

"کیسے؟" انہوں نے مسکراتے ہوئے دلچسپی سے پوچھا۔

"وہ ایسے محترمہ کہ ابھی جو منسٹر برطرف ہوا ہے۔" بلوچ نے اپنی طرف اشارہ کیا۔ "اس کی جگہ پہ آپ جانتی ہیں کہ کس کو ملے گی منسٹری؟" وہ آگے جھک کر افشین ملک کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

"کسے ملے گی؟"

افشین ملک نے بھی اسی طرح سے آگے جھکتے ہوئے کہا تھا مگر فرق یہ تھا کہ وہ مسکرا رہی تھیں جبکہ بلوچ بے حد سیریس تھا۔ وہ دونوں کچھ دیر تک ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے رہے اور پھر زبیر بلوچ سیدھا ہوا۔ ایک تمسخر اڑاتی ہوئی نظر افشین ملک پہ ڈالی۔

جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی اور لائٹر سے اسے سلگایا۔ وہ یوں پوز کر رہا تھا جیسے وہ وہاں سگریٹ پینے ہی تو آیا تھا۔

اور وہ بھول چکا تھا ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے افشین ملک کو کچھ بتانا تھا۔

افشین ملک نے بمشکل اپنے اندر ابلتے غصے جیسی کسی چیز کو دبایا اور آگے بڑھ کر کافی کا کپ اٹھا لیا جو کہ ابھی ابھی سرو کیا گیا تھا۔

وہ بھی یوں ہی پوز کر رہی تھیں کہ جیسے انہیں یہاں کافی پینے کے علاوہ کوئی کام نہیں تھا۔

زبیر بلوچ نے ایک نگاہ ان پر ڈالی۔ وہ چاہتا تھا کہ افشین ملک اسے کریدیں۔ مگر وہ۔

اس نے دل ہی دل میں مسز ملک کو گالی دی تھی۔

"چھوڑیں محترمہ! منسٹری کسے ملتی ہے، کسے نہیں۔ یہ یقیناً آپ کا مسئلہ نہیں ہے۔" افشین ملک خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"کبھی آپ نے سوچا ہے کہ آپ کا فیوچر اس پارٹی کے ساتھ کیا ہوگا؟ آخر کو پچھلے پچیس برس سے آپ اور آپ کے بھائی اس پارٹی کی بے لوث خدمت کر رہے ہیں اور ان پچیس برسوں میں کبھی کوئی قابل ذکر وزارت نہیں ملی آپ کو۔ یا آپ کے بھائیوں کو۔"

افشین ملک خاموش تھیں مگر اب ان کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہو چکی تھی اور وہ تیکھی نگاہوں کے ساتھ اسے دیکھ رہی تھیں۔

"خیر! ابھی یقیناً آپ نے فیوچر کے بارے میں نہیں سوچا ہوگا اور اگر جو سوچا ہوگا۔ سو اچھا ہی سوچا ہوگا لیکن۔"

وہ ذرا سا ٹھہرا اور طنزیہ مسکرایا۔

"کچھ عرصے بعد۔ جب آپ کو "فیوچر" کے بارے میں سوچنا پڑے گا تو زبیر بلوچ کے دروازے ہمیشہ آپ کے لیے کھلے رہیں گے۔ ناچیز کو یاد رکھیے گا محترمہ! ایسے میں آپ کا داماد بھی کچھ نہیں کر سکے گا۔"

افشین ملک نے ایک گہری سانس بھری۔

اب انہیں زبیر بلوچ کا مدعا سمجھ میں آ گیا تھا۔ وہ پارٹی بدلنے والا تھا اور اس کے لیے وہ سردار اجمل کی پارٹی کے ممبرز کو توڑ رہا تھا۔

"اور کچھ زبیر صاحب۔؟" تیکھے انداز میں افشین

ملک نے پوچھا۔

"مجھے نہیں پتا تھا کہ آپ نے پالیٹکس چھوڑ کر آسٹرالوجی پڑھنی شروع کردی ہے۔ اینی ہاؤ! بہت شکریہ۔"

کھڑے ہو کر افشین ملک نے اپنا ہاتھ زبیر بلوچ کی طرف بڑھایا۔

بلوچ نے ایک اچٹتی سی نگاہ اس بڑھے ہوئے ہاتھ پہ ڈالی۔

"یقیناً "بہت خوب صورت ہے۔" اس نے سوچا اور پھر بڑھ کر وہ ہاتھ تھام لیا۔

"مجھے یقین ہے اب یہ ہاتھ... ملانے آپ آئیں گی۔" ہلکا سا دباؤ ڈالتے ہوئے اس نے کہا اور دروازے کی طرف مڑ گیا۔

افشین ملک نے اسے جاتے دیکھا اور زیر لب گالی ان کے منہ سے نکلی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ جب گھر سے آیا تھا تو زر سو رہی تھی۔ اسے آج ایک انتہائی ضروری کام کرنا تھا جو وہ کافی دنوں سے کرنا چاہ رہا تھا مگر اسے اس کام کے لیے "وقت" ہی نہیں مل رہا تھا۔

"السلام علیکم سر!" اس کا منیجر دستک دے کے اندر آیا تھا۔

"فرحان... ابھی نہیں۔ تھوڑی دیر بعد آنا اور ہاں مجھے کوئی کال فارورڈ مت کرنا ابھی۔ کچھ دیر کے لیے میں بزی ہوں۔" اس نے فرحان کے بولنے سے پہلے ہی اسے منع کرتے ہوئے کہا تھا۔

وہ اب اپنا سیل فون نکال رہا تھا۔

فرحان یس سر کہتے ہوئے چلا گیا۔

سیل فون نکال کر اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر اس نے کال ملائی۔

"کیسی ہو زرمینے؟" کال ملنے پہ اس نے پوچھا تھا۔

"میں... ٹھیک۔" اسے زرمینے کی آواز میں کچھ محسوس ہوا تھا۔

"عبدل کیسا ہے؟ مس کرتا ہے بابا کو؟"

"عبدل ٹھیک ہے اور بہت یاد کرتا ہے آپ کو۔"

"میں بھی اسے بہت مس کر رہا ہوں میں..."

"آپ زرمینے کو مس نہیں کرتے خان!" اس نے بات کاٹ کر پوچھا گیا۔ مجتبیٰ کا دماغ بھک سے... وہ زرمینے سے ایسی بات کی توقع نہیں کر سکتا تھا۔ گہرا سانس بھر کر اس نے خود کو کمپوز کیا۔

"اتنے مشکل سوال نہیں پوچھتے زرمینے! اور ہی ایسے سوال جن کے جواب سے انسان کو وہ... اندیشہ ہو۔"

نرم لہجے میں بہت آہستگی سے اس نے کہا۔

زرمینے دکھ سے ہنسی تھی۔

"انسان کو اتنا بھی شفاف نہیں ہونا چاہیے کہ دوسرے لوگ اس میں اپنا عکس دیکھ کر ہی خوف زدہ ہو جائیں۔"

مجتبیٰ لاجواب ہوا۔

چند لمحوں کے لیے خاموشی ان کے درمیان... رہی تھی اور اسے ہمیشہ اسی خاموشی سے ہی تو ڈر لگتا تھا۔

"کیا خیال ہے خان! وہ جھوٹ زیادہ بہتر نہیں ہو، جس سے اک لمحے کو ہی سہی کوئی خوش تو ہو جاتا ہے۔"

ایک اور سوال...

زرمینے یقیناً اپنے حواسوں میں نہیں تھی۔

"تم جانتی ہو زرمینے! اس جھوٹی خوشی کے پیچھے ایک سچ بھی چھپا ہوا ہوتا ہے اور وہ سچ زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے کہ یہ اک پل کی خوشی... یہ جھوٹی ہے۔

خدائے پامان۔" اس نے پشتو میں کہا اور فون کاٹ دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"خدائے پامان۔"

زرمینے نے بھی کہا تھا مگر مجتبیٰ اسے سن نہیں سکا تھا... وہ زرمینے کی بھیگی ہوئی آواز نہیں سن سکا تھا۔

آنسوؤں کی روانی میں تیزی آ گئی تھی۔

"خوب صورت وہ خوب صورت میں بھی ہوں... خوب صورت وہ بھی ہے تو کس چیز نے مجتبیٰ کو جکڑا...؟" گھٹنوں پہ سر رکھ کر اس نے سوچا تھا۔

"یقیناً "خوب صورتی" وہ چیز نہیں تھی جس نے مجتبیٰ کو مجبور کیا تھا... یہ اس کا اپنا دل تھا۔" اور پھر اس نے خود ہی... اپنے سوال کا جواب دیا تھا۔

"کیا زرمینے کو اسی طرح آزمائے جانا تھا... اور کیا آزمائش ہے کہ ایک عورت ہوتے ہوئے اس کے شوہر کے دل پہ کوئی دوسری عورت راج کرے۔

ہے کوئی چیز اس سے بڑھ کر تکلیف دہ۔ کتنا مشکل ہوتا ہے "صبر کرنا"۔" اس کی سوچوں میں بھی آنسوؤں جیسی روانی تھی۔

"کیا ہے میرے پاس؟" اس نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے تھے۔ "اس کی خاندانی بیوی، اس کے بیٹے کی ماں... بس یہ سب ہوتے ہوئے بھی خالی ہاتھ ہوں میں اور وہ..."

شدت جذبات سے زرمینے کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

"اس کا دامن تو بھرا ہوا ہے۔ کیونکہ وہ جس کے ہونے سے سب کچھ ہے، وہ اس کا ہے۔

کیسے کروں میں صبر؟"

بہت بے بس ہو کر وہ رو دی تھی۔

"مگر صبر کرنے والوں کے ساتھ تو اللہ ہوتا ہے۔"

اسے جیسے کچھ یاد آیا تھا۔

وہ اٹھی اور تیزی کے ساتھ کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی کھڑکی کی چوکھٹ پر دونوں ہاتھ جما کر اس نے آسمان کو دیکھا۔

"تو کیا تو میرے ساتھ ہے؟" آسمان کی طرف اٹھی پانی بھری آنکھوں نے سوال کیا تھا۔

اور وہاں خموشی تھی سکوت تھا۔

☆ ☆ ☆

"زرمینے نے ایسے کیوں کیا؟ وہ کیوں اتنی..."

اور اسی اتنی کے بعد وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کون سا لفظ لگائے۔ وہ الجھا ہوا تھا۔ زرمینے کا رویہ اسے الجھائے جا رہا تھا۔

اس نے منیجر کو دوبارہ اندر بلایا۔ اس کا منیجر اسے آج کے دن کا شیڈول بتا رہا تھا اور وہ وہیں زرمینے پہ اٹکا ہوا تھا۔

"مجھے کوئٹہ جانا ہوگا۔" چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے جیسے فیصلہ کیا تھا۔

وہ اگر ایک بیوی کے آنسو پونچھنے کے لیے کوئٹہ سے اسلام آباد آسکتا تھا تو دوسری بیوی کے لیے وہ اسلام آباد سے کوئٹہ بھی جا سکتا تھا۔ کیونکہ حقوق میں وہ دونوں برابر تھیں۔

تو پھر فرق کہاں تھا؟

اگر وہ زر کے آنسو صاف کرتا تھا تو اسے ایسا کرنے پر محبت مجبور کرتی تھی۔

اور اب وہ چند دنوں میں کوئٹہ... جانے والا تھا۔ تو یہ احساس فرض تھا۔ جو کہ اسے کھینچ رہا تھا۔

فرق یہاں تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ سو کر اٹھی تو اس نے غیر ارادی طور پر وہیں لیٹے لیٹے اپنے اردگرد دیکھا۔ اردگرد ایسا کچھ نہیں تھا جو وہ توقع کر رہی تھی۔

وہ چند لمحے اسی طرح لیٹی انتظار کرتی رہی تھی۔ مگر وہ نہیں ہو رہا تھا جس کا اسے انتظار تھا۔ جھنجلا کر وہ اٹھ گئی تھی۔

سیدھا اٹھ کر وہ گلاس وال کے پاس آئی اور پردے ہٹا کر باہر دیکھا۔ پورچ میں مجتبیٰ کی گاڑی نہیں تھی۔

اسے صحیح معنوں میں جھٹکا لگا تھا۔ وہ وہیں شاکڈ کھڑی رہ گئی۔ یہ جھٹکا اسے مجتبیٰ کی گاڑی کی غیر موجودگی سے نہیں لگا تھا۔ یہ اسے مجتبیٰ کے آج کے دن کو بھول جانے کی وجہ سے لگا تھا۔

"یہ کیسے ممکن ہے؟" اس کا شاک دکھ میں بدلنے لگا تھا۔ پھر اچانک اسے ایک خیال آیا تھا۔ "ممکن...

اس نے کچھ سرپرائز پلان کر رکھا ہو۔ کچھ ایسا جو کہ بہت رومانٹک ہو۔"

مسکراتے ہوئے وہ اٹھی۔

آج کے دن کرنے کے لیے اس کے پاس بہت کچھ تھا۔

☆ ☆ ☆

ایک دفعہ پہلے اسے لگا تھا کہ جیسے سرخ رنگ زر کے علاوہ کسی اور کو سوٹ نہیں کر سکتا تھا۔ مگر اب وہ زر ہی تھی جو کہ گلابی کلر کی لانگ فراک میں ملبوس تھی۔

اور وہ وہیں کھڑے کھڑے مجتبیٰ نے جیسے فیصلہ کیا تھا کہ سارے رنگ جس قدر اس پہ جچتے تھے شاید ہی کسی اور پہ جچتے ہوں گے۔

وہ کافی اہتمام سے تیار ہوئی تھی۔ وہ گلابی کلر کا ڈریس خاصا خوبصورت اور نفاست لیے ہوئے تھا۔

فراک کے دائیں کندھے پہ امبرائیڈری اور کٹ ورک کا ایک بڑا سا پھول بنا ہوا تھا اور باقی سارا فراک سادہ تھا۔ البتہ اس کی چوڑی دار سلیوز کے سرے پہ بھی ویسی ہی امبرائیڈری اور کٹ ورک ہوا ہوا تھا۔ بالوں کا نیا اسٹائل تھا اور وہ سرخی مائل نظر آرہے تھے۔ اس کے گلے میں وہ ہی پرل کا سیٹ تھا جو کہ مجتبیٰ نے اسے دیا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر دلکشی سے مسکرائی تھی۔

مجتبیٰ نے ہونٹ سکیڑ کر ستائشی انداز میں سیٹی بجائی اور مسحور اس کی طرف بڑھا تھا۔

"تمہارا کیا ارادہ تھا کہ میں وہیں کھڑے کھڑے ہی گر جاتا۔"

"وہاں کیوں۔ یہاں آکر گرتے نا۔" گہری ہوتی مسکراہٹ کے ساتھ زر نے کہا تھا۔

وہ ہلکا سا قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔

Beauty is like beast

It just killed

(خوب صورتی بھی ڈائن کی طرح ہوتی ہے کبھی کبھی مار ڈالتی ہے۔)

اسے کندھوں سے پکڑ کر اپنے نزدیک کرتے ہوئے اس نے کہا زر شرمائی۔

اس نے بے اختیار اس کے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ مجتبیٰ کے ہاتھ خالی تھے۔ تو اس کا گفٹ کہاں تھا؟ الجھ کر اس نے سوچا تھا۔

"شاید میرا گفٹ کوئی ڈائمنڈ یا پلاٹینم رنگ ہو۔ ہو سکتا ہے کسی جگہ کے ٹور کا ریٹرن ٹکٹ ہو جو کہ مجتبیٰ کے کوٹ کی پاکٹ میں ہو۔" صبح سے جس مفروضے کی بنیاد پر اس نے اتنا اہتمام کیا تھا۔ ابھی بھی اس کا سلسلہ جاری تھا۔

"کہیں جا رہی ہو کیا۔" اس کی سوچوں کا سلسلہ اس سوال سے ٹوٹا تھا۔ اس کے چہرے کی مسکراہٹ سیکنڈز میں غائب ہوئی تھی اور اس نے چونک کر مجتبیٰ کا چہرہ دیکھا تھا۔

اس کے چہرے پر ایسی کوئی بات ایسا کوئی تاثر نہیں تھا جس سے ثابت ہو تا کہ وہ مذاق کر رہا تھا۔ یہ ایسے ہی تھا جیسے کسی نے یخ ٹھنڈا پانی اس پہ گرا دیا تھا۔ اسے جیسے کرنٹ لگا تھا۔

"کیا وہ پاگل تھی جو صبح سے۔" نمکین پانی اس کے گلے کو کاٹنے لگا تھا۔

"تم کھانا میرے ساتھ کھاؤ گی' آفٹر ویٹ تم نے جہاں جانا ہے چلی جانا۔"

وہ اس کے تاثرات سے بے خبر نہیں تھا' البتہ بے نیاز ضرور نظر آرہا تھا۔ ایک اور تکلیف دہ بات۔

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ڈائننگ ٹیبل پہ لے آیا۔

"ٹھیک ہے۔ اسے نہیں یاد تو۔ میں بھی نہیں بتاؤں گی۔" اس نے مجتبیٰ کے ساتھ والی کرسی سنبھالتے ہوئے سوچا۔

کھانا اس کے حلق سے نیچے نہیں اتر رہا تھا۔ اس نے ایک نظر مجتبیٰ کو دیکھا۔

وہ تو یوں کھا رہا تھا جیسے آج سے پہلے کبھی اسے کھانے کو ہی نہ ملا ہو۔ اسے یک دم تپ چڑھی تھی۔ وہ کرسی دھکیل کر کھڑی ہو گئی۔

"کیا ہوا؟" مجتبیٰ نے چونک کر پوچھا۔

دکھا لیا ہے۔" کھا جانے والے انداز میں جواب دے کر مجتبیٰ نے حیران ہو کر اسے جاتا دیکھا اور پھر اس کے پیچھے مجتبیٰ کی حیرت مسکراہٹ میں بدلی تھی۔

"کیا بکواس ہے۔ اتنے خاص دن کو کسی عام دن کی طرف ٹریٹ کرنا۔" بڑبڑاتے ہوئے وہ کمرے میں چلی گئی تھی۔

مجتبیٰ کمرے میں آیا تو وہ شیشے کی دیوار کے سامنے خاموشی سے کھڑی تھی۔

وہ ابھی تک اسی لباس میں ملبوس تھی۔ مجتبیٰ نے پہلے چینج کیا تھا اور پھر سائیڈ ٹیبل' الماری کی درازوں سے کچھ ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ ان آوازوں سے تنگ آکر زر نے مڑ کر دیکھا۔

"کیا مصیبت ہے۔ بندہ اپنے کمرے میں بھی سکون محسوس نہیں کر سکتا۔" غصے سے کہتے ہوئے وہ کمرے سے جانے کے لیے مڑی۔

"ارے۔ ارے۔ کہاں جا رہی ہو؟" وہ بولتا ہوا تیزی سے اس کے سامنے آیا۔

"وہیں جہاں جانے کے لیے اتنا اہتمام کیا تھا۔" مشتعل ہو کر ایک قدم پیچھے ہٹ کر وہ دونوں بازو پھیلا کر بولی۔ مجتبیٰ نے سنجیدہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"زر! میں کچھ بھی نہیں بھولا۔ ذرا سا بھی نہیں۔"

"تو اسے یاد تھا۔" زر نے شاکڈ ہو کر اسے دیکھا۔

"پھر بھی اتنا خاص دن برباد کر دیا اس نے۔"

"تمہیں لگتا ہے کہ کینڈل لائٹ ڈنر یا کسی اچھے سے ہوٹل میں کوئی گرینڈ پارٹی اس دن کو یادگار بنا سکتی تھی۔"

زر خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

"مگر مجھے ایسا نہیں لگتا۔ یہ میرا اور تمہارا دن ہے۔ دن' لمحے' وقت ایسے خاص نہیں بنتے' دل کی خوشی انہیں خاص بناتی ہے۔ اور اب میں تمہیں بتاؤں گا کہ چیزوں کو کیسے خاص بناتے ہیں۔"

اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے باہر لے جاتے ہوئے وہ بہت نرم لہجے میں بولا۔

وہ سخت حیران تھی۔ اس عام سے حلیے میں اس وقت وہ اسے کہاں لے کر جانے والا تھا۔

وہ اسے لے کر لان میں آیا تھا۔ لان میں رکھی کرسیوں میں سے ایک پہ بیٹھتے ہوئے اس نے دوسری کرسی۔ زر کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

زر کو اب یہ دیکھنا تھا کہ وہ وہاں اس وقت کیسے اپنی فرسٹ ویڈنگ اینی ورسری کو یادگار بنانے والا تھا اور تب ہی اس کی نظر مجتبیٰ کے ہاتھ میں موجود ماؤتھ آرگن پہ پڑی تھی۔ تو وہ اسے ڈھونڈ رہا تھا۔

کیا کرنے لگا تھا وہ۔

چند لمحوں بعد اس نے بھدی سی ٹون سنی تھی۔ شاید وہ ابھی کوئی دھن سیٹ کر رہا تھا۔

زر نے بدمزا ہو کر آسمان کو دیکھا۔ وہ پورے چاند کی رات تھی۔ ہر سو چاندنی۔ اتنی کہ ہر چیز نقرئی دکھ رہی تھی۔

وہ رات کی خنکی محسوس کر سکتی تھی۔ مگر اس وقت یہ وہ چیز نہیں تھی جو وہ محسوس کرنا چاہتی تھی۔

ایک دفعہ پھر سے وہ تاسف کا شکار ہونے لگی تھی۔ اتنا خاص دن برباد کر دیا تھا اس نے۔

اچانک اس نے ایک بے حد سریلی سی دھن سنی تھی۔ آسمان سے نظریں ہٹا کر اس نے مجتبیٰ کو دیکھا۔

وہ ماؤتھ آرگن بجا رہا تھا۔

وہ اس کا فیورٹ سانگ تھا۔

چاندنی رات۔ آرگن پہ بجتا ہوا اس کا فیورٹ سانگ اور سامنے من پسند شخصیت۔ اسے یکدم سارے منظر میں دلچسپی پیدا ہونے لگی تھی۔

اس کے ہونٹ بے آواز حرکت کرنے لگے تھے۔

چاندنی جیسے اور بڑھ گئی تھی۔ وہ بے حد خوب صورتی سے بجا رہا تھا۔

اور اسے بھی لگا تھا جیسے کہ وہ کسی سرکل میں گھوم رہی تھی۔

سارے منظر ایک جیسے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ الگ بات تھی کہ اسے سب مناظر میں مجتبیٰ کا چہرہ ہی

نظر آرہا تھا۔
مجتبیٰ نے سر نہیں چھیڑا تھا۔ وہ کوئی جادو تھا۔

Id never lived before
your love

(تمہارے پیار سے پہلے زندگی نہیں تھی۔) وہ کتنا محو ہو کر بجا رہا تھا اور اس کی آواز سیدھی دل میں اترتی محسوس ہو رہی تھی۔

چاند جیسے کچھ اور نزدیک آیا تھا۔
سارے یقیناً" آسمان پہ نہیں تھے۔ وہ تو وہیں تھے۔ ان دونوں کے آس پاس۔ فضا میں یک دم سکوت پھیلا تھا۔ گانا ختم ہو گیا تھا۔
مجتبیٰ نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ "واقعی تمہارے پیار سے پہلے زندگی کس نے دیکھی تھی مجتبیٰ۔" چند لمحوں بعد وہ اس کے ہاتھوں پہ ہاتھ رکھتے ہوئے نم لہجے میں بولی۔

"یہ یقیناً" کسی بھی چیز سے بڑھ کر ہے اور مجھے یہ وقت یہ لمحہ ہمیشہ یاد رہے گا۔ کیونکہ میں خوش ہوں۔ بہت خوش' ان لیکٹ میں پراؤڈ فیل کر رہی ہوں۔"
اس کی آنکھیں نم تھیں اور لب مسکرا رہے تھے۔
"تم یقیناً" دنیا کی پہلی خاتون ہو جو خوشی میں بھی روتی ہے۔" مجتبیٰ نے مسکراتے ہوئے ہاتھ کے انگوٹھے سے اس کے آنسو صاف کیے۔
"نہیں' مجھے خوشی نے نہیں' تمہاری محبت نے رلایا ہے۔" وہ بھی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔
"دنیا میں بہت سے خوش قسمت ہوں گے۔ مگر جیسی میں ہوں شرطیہ ویسا دوسرا کوئی نہیں۔" بھیگی آنکھوں کے ساتھ وہ مسکرائی تھی۔

اور پھر اسی نم لہجے میں پوچھا گیا تھا۔
"تم میرے لیے یہ دوبارہ بجاؤ گے؟"
"میں تمہارے لیے رات بھر یہ بجا سکتا ہوں۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے گہری ہوتی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔
زر نے اس کے کندھے سے سر ٹکا لیا اور فضا کی خاموشی ایک دفعہ پھر آرگن کی آواز سے ٹوٹنے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

"یہ عورتوں کا کام ہوتا ہے مجتبیٰ خان جو ہمیشہ گھر کے اندر رہنا' مرد ایسا کرنے لگے تو جانتے ہو اسے کیا کہتے ہیں؟"
مجتبیٰ نے بے اختیار پہلو بدلا۔ وہ چند دنوں کے لیے کوئٹہ آیا ہوا تھا جب ہی بابا جان سے ملاقات ہوئی۔ اسے یہ بات سننے کو ملی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ان کا اشارہ کس طرف تھا۔
"میں چند روز میں اسلام آباد آنے والا ہوں اور زیب بلوچ کے پارٹی چھوڑنے سے جو نقصان ہوا ہے' اسے میں یہ سمجھ کر برداشت کروں گا کہ میرے بیٹے نے مجھ سے فرمائش کی تھی۔ اس کی جو بھی قیمت بھرنا پڑی سو بھری ہم نے۔ مگر کچھ توقعات تم سے بھی ہیں۔"
"جی بابا جان!" اس نے سعادت مندی سے سر جھکایا۔ وہ ان کی اس بات کا مطلب بھی سمجھ گیا تھا۔
"افشین ملک سے رشتے داری کا مطلب یہ تو نہیں کہ تم سیاست سے دستبردار ہو گئے ہو۔ اگر ایسا کوئی ارادہ ہے تو بتا دو۔ تاکہ ہم مینیج کر سکیں۔"
وہ مسلسل اسے شرمندہ کر رہے تھے۔
"آپ کب آئیں گے اسلام آباد؟" اس نے جیسے موضوع بدلا۔
سردار صاحب نے ایک گہری نظر اس پہ ڈالی اور پھر اسے تفصیلات بتانے لگے تھے۔
اور مجتبیٰ نے اپنے بھنچے ہوئے اعصاب کو پرسکون ہوتے ہوئے محسوس کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ کوئٹہ زرمینے کی فرسٹریشن دور کرنے گیا تھا۔ مگر جب سے وہاں سے آیا تھا' خود فرسٹریشن کا شکار ہو رہا تھا۔

سردار اجمل خان اس کے ساتھ ہی آئے تھے۔ دن رات کی میٹنگز۔ ہر طرف منسٹر اور وہ بھی ان کی پارٹی کا جعلی ڈگری کا الزام' بلوچ کا پارٹی چھوڑنا سب چیزیں جیسے ایک دوسرے میں مدغم ہو کر مشکلات کا پہاڑ

بنائے ہوئے تھیں۔
ابھی پارٹی کو یہ بھی فیصلہ کرنا تھا کہ خالی ہونے والی سیٹ پہ کس کو کھڑا کیا جائے گا۔ ایک تو وہ خود مصروف تھا دوسرا اس کا رویہ زر کو بھی چڑچڑا بنا رہا تھا۔
وہ صحیح معنوں میں پھنسا تھا یا پھر سردار صاحب اسے پھنسا رہے تھے۔
بہر حال' جو بھی تھا' ان میٹنگز کا سلسلہ اختتام پذیر ہی تھا کہ اچانک سردار صاحب کی طبیعت خراب ہو گئی۔ انہیں انجائنا کا اٹیک ہوا تھا۔
وہ اس رات گھر ہی نہیں آیا تھا اور ایمرجنسی کی وجہ سے زر کو اطلاع بھی نہیں کر سکا تھا۔ سردار صاحب کی طبیعت کی خرابی کی خبر زر کو اگلے دن نیوز چینل سے پتا چلی تھی۔
افشین ملک بھی ان دنوں ملک سے باہر تھیں۔
بہر حال اتنے ممنز تو وہ بھی جانتی تھی کہ اسے سسر کی عیادت کے لیے جانا چاہیے تھا۔

☼ ☼ ☼

سفید سوٹ میں ملبوس آنکھوں پہ سیاہ گاگلز لگائے وہ گاڑی سے اتری۔ اس کے ہاتھ میں پھولوں کا بکے تھا۔
اس نے آدھے سر پہ دوپٹا اوڑھ رکھا تھا۔
ہونٹوں پہ پنک کلر کا لپ گلوس لگائے اور سفید موتیوں کا نیکلس پہنے ہوئے تھی۔ ریسپشن پہ رک کر اس نے سردار صاحب کا روم نمبر پوچھا۔
سردار صاحب کا کمرہ فورتھ فلور پر تھا۔
فورتھ فلور پہ پہنچ کر جیسے ہی وہ کوریڈور کی طرف مڑی تھی تو یک دم جیسے ساکت ہو گئی۔
وہ کچھ ایسا ہی منظر تھا۔ مجتبیٰ کا ہاتھ زرمینے کے کندھے پہ تھا اور وہ اسے ساتھ لگائے کمرے سے باہر نکلا تھا۔ وہ وہیں پہ رک کر اس سے کچھ کہہ رہا تھا۔ جبکہ زرمینے بری طرح سے رو رہی تھی۔ کیسی نرمی تھی اس کے چہرے پہ۔ زر کا دل چاہا کہ وہ ہاتھ میں پکڑے پھول اس شخص کے چہرے پہ دے مارے اور وہیں سے پلٹ جائے۔
مگر نہیں۔
وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ان دونوں تک آئی۔ اس کی ہائی ہیل کی ٹک ٹک کی آواز سے مجتبیٰ نے سر اٹھا کر دیکھا تھا۔
زر کو لگا کہ جیسے وہ چونکا تھا۔ مگر پھر بھی اس نے زرمینے کے کندھے سے ہاتھ نہیں ہٹایا تھا۔ اسے خود سے الگ نہیں کیا تھا۔ وہ یقیناً" بھول رہی تھی کہ زرمینے مجتبیٰ کی کوئی گرل فرینڈ نہیں تھی' بیوی تھی۔ اور وہ کوئی غلط کام نہیں کر رہا تھا جو یوں اس کے آنے پہ بدحواس ہو جاتا۔ البتہ زرمینے ضرور بدحواس ہوئی تھی۔ وہ ان کے پاس سے ہو کر اندر کمرے میں چلی گئی تھی۔
"السلام علیکم!" جھک کر سردار صاحب کے بیڈ کے ایک جانب پھول رکھتے ہوئے وہ بولی تھی۔
سردار صاحب نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر سر کے اشارے سے جواب دیا تھا اور تب ہی اس کی نظر مورے پہ بھی پڑی تھی۔
اس نے انہیں بھی سلام کیا۔ مگر انہوں نے ناگواری سے منہ موڑ لیا۔
زر کو خود پر قابو پانے میں وقت لگا تھا۔
"کیسی طبیعت ہے آپ کی؟"
"بہتر ہوں۔" اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے جواب دیا تھا۔
مجتبیٰ ابھی تک اندر نہیں آیا تھا۔
"مسز ملک کیا ملک سے باہر ہیں؟"
"جی ہاں۔۔۔ پرائیویٹ ٹور ہے ان کا' ورنہ ضرور آتیں۔" مورے نے پشتو میں تیز تیز بولنا شروع کر دیا تھا۔ زر نے چونک کر انہیں دیکھا۔
سردار صاحب کے چہرے پہ غصے کے تاثرات نظر آرہے تھے اور وہ بھی جواباً" پشتو میں انہیں کچھ کہہ رہے تھے۔
زر معذرت کرتے ہوئے اٹھ گئی۔ وہ جب کمرے سے باہر نکلی تو مجتبیٰ وہاں تھا۔ نہ زرمینے۔ ایک اور شاک۔

وہ ایک پل کو ساکت رہ گئی اور پھر تیز تیز چلتے ہوئے وہ وہاں سے نکل گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

مسز ملک گئیں تو پرائیویٹ دورے پہ تھیں، مگر دراصل وہ زبیر بلوچ سے ملاقات کرنے گئی تھیں۔
سخاوت خان نہ صرف الیکشن جیت چکا تھا، بلکہ اس کا نام وزارت کے لیے بھی پرپوز کر دیا گیا تھا۔
مسز ملک کو پہلے ہی اس بات کی بھنک پڑ چکی تھی۔ وہ صرف انتظار میں تھیں۔ وہ واقعی وزارت کی حق دار تھیں اور اس زیادتی نے جیسے انہیں ۔۔۔ آتش فشاں پہاڑ بنا دیا تھا۔
زبیر بلوچ نے ٹھیک کہا تھا۔ انہیں واقعی اس سے ہاتھ ملانے جانا پڑا تھا۔ دبئی یا اس جیسا دوسرا کوئی ملک ہوتا تو پاکستانی میڈیا سے یہ ملاقات چھپی نہیں رہتی، مگر یہ ملاقات ساؤتھ افریقہ میں ارینج کی گئی تھی۔ اسی لیے ملک میں کسی کو پتا تک نہیں چلا تھا۔
وہ کیا کرنے والی تھیں۔ یہ بات وہ خود جانتی تھیں یا پھر سردار جمال صاحب۔
کیونکہ یہ ان کے پلان کا پارٹ بی تھا اور اگر یہ بھی اسی طرح سے کامیاب ہو جاتا جس طرح سے پارٹ اے کامیاب ہوا تھا تو پھر واقعی ان کا کہا سچ ثابت ہونے والا تھا۔
مجتبیٰ اور زر کی شادی حقیقت میں چار دن کی ثابت ہونے والی تھی۔

☆ ☆ ☆

اس کے کمرے کے دروازے پہ دستک ہوئی تھی۔ یہ انداز سیما گل کا نہیں تھا۔ وہ حیران ہوئی۔ رات کو اس وقت کون آ سکتا تھا۔ اس کے دروازے پہ۔
اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا تھا۔
اور۔۔۔
اسے سمجھنے میں ایک سیکنڈ کی تاخیر بھی نہیں لگی تھی کہ اس شخص کو رات کے اس وقت وہاں پہ بلانے والا کون تھا؟

"سیما گل؟" اس نے غصے سے مجتبیٰ کے پیچھے کھڑی سیما گل کو دیکھا۔ "صبر نہیں ہوا تم سے۔ ایک دن کھانا نہ کھانے سے کوئی مرتا نہیں۔" وہ حلق کے بل چلائی۔
مجتبیٰ جانتا تھا یہ وہ غصہ تھا جس کی حق دار سیما نہیں وہ تھا۔
"ارے ارے۔ اسے کیوں ڈانٹ رہی ہو؟" اس نے اندر آ کر پیچھے سے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔
زر نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر وہ دروازہ کھول کر باہر چلی گئی تھی۔
مجتبیٰ نے دونوں ہاتھ اوپر کر کے ایک گہرا سانس بھرا تھا۔ وہ اس کے پیچھے نہیں گیا تھا۔
اس نے بیڈ کے سائیڈ ٹیبل میں سے سلیپنگ پلز نکالی تھیں اور پھر انہیں لے کر کچن میں گیا تھا۔ جوس کا پیکٹ کھول کر اسے گلاس میں انڈیلا تھا اور پھر ان پلز میں سے چند کو اس جوس میں مکس کیا تھا۔ وہ مشروب کا گلاس ہاتھوں میں لیے بالکونی میں آیا تھا۔ اس کے اندازے کے مطابق وہ رو رہی تھی اور وہ بھی بری طرح سے۔
"تمہیں لگتا ہے کہ اس وقت تمہیں دیکھ کر مجھے زرمینے کو دھکا دے کر خود سے الگ کر دینا چاہیے تھا؟ میں تم سے ملا نہیں، تمہیں کال نہیں کی، کیا یہ باتیں اتنی امپورٹنٹ ہیں جس کے لیے تم یہاں بیٹھ کر اپنے آنسو بہاؤ؟"
"تمہیں لگتا ہے کہ ان سب باتوں کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔" وہ مشتعل ہو کر چلائی۔
"اہمیت تو تب ہوتی جب ان باتوں سے اس تعلق میں فرق آتا جو میرے اور تمہارے درمیان ہے۔" وہ بولا تو اس کا لہجہ ہمیشہ کی طرح نرم تھا۔
"تمہیں ایسا کچھ محسوس ہوا کہ میری چاہ میں کمی آئی ہو؟ تمہاری حیثیت میں کمی آئی ہو؟ اور اگر ایسا ہوتا تو پھر یہاں میں۔۔۔ اس وقت موجود نہ ہوتا۔"
زر کے پاس جو شکایتوں کا انبار تھا وہ دھواں بن کر تحلیل ہوا تھا۔

"تو تم مجھے یہ بتانے آئے ہو کہ تمہیں میری پروا ہے۔" نم لہجہ آخر تک کر پوچھا گیا تھا۔
"نہیں ہے۔" اس نے مسکرا کر جھک کر اس کے کان میں ہلکے سے کہا تھا۔
ضروری نہیں کہ ہر "نہیں" کا مطلب انکار ہی ہوتا ہو۔ کچھ ایسے بھی لفظ ہوتے ہیں جنہیں کچھ خاص دل سے ادا کرتے ہی تو اس کا مطلب ہاں ہی ہوتا ہے۔
"یہ جوس پیو۔" اس نے بڑے رعب سے کہتے ہوئے اس کی طرف جوس بڑھایا۔
"نہیں۔۔۔"
"کوئی آرگومنٹ نہیں۔" گلاس منہ سے لگاتے ہوئے وہ مسکرایا۔
"میں ہرٹ ہوئی تھی مجتبیٰ! تم نے میری طرف دیکھا تک نہیں تھا۔"
وہ دونوں ٹانگیں اوپر کر کے کرسی پہ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے بازوؤں کو ٹانگوں کے گرد لپیٹ ہوا تھا اور اس کے ایک ہاتھ میں مشروب کا خالی گلاس تھا۔
اس کے لہجے میں جو واحد چیز محسوس کی جا سکتی تھی۔ وہ بھیگی ہوئی اداسی تھی۔
"کیا فرق پڑتا ہے زر۔۔۔ تم جانتی ہو کہ تمہارے بعد ہر عورت کا کیا مقام ہے۔"
"پتا نہیں مجھے کیا ہو جاتا ہے۔ بس برداشت نہیں ہوتا۔" اس نے مشروب کا خالی گلاس مجتبیٰ کو پکڑایا تھا۔
"زندگی میں کوئی نہ کوئی، کہیں نہ کہیں، کسی حد تک کمپرومائز تو کرنا پڑتا ہے، سب چیزیں آپ کی مرضی کے مطابق تو نہیں ہوتیں۔"
"ٹھیک کہہ رہے ہو۔" اس نے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھاما تھا۔ وہ بھاری ہو رہا تھا۔
"مگر تم نے مجھے دیکھا کیوں نہیں، تمہیں اندر تو آنا چاہیے تھا نا۔"
اس کی آواز لڑکھڑانے لگی تھی۔ مجتبیٰ خاموش رہا تھا۔
اس نے آگے بڑھ کر زر کو کرسی سے اٹھایا اور سہارا دے کر سیڑھیوں سے نیچے اتارنے لگا۔
"کبھی کبھی مجھے لگتا ہے جیسے۔۔۔ جیسے۔۔۔" گولیوں کے زیر اثر وہ اپنی ہی اگلی بات جو اسے کہنی تھی بھول رہی تھی۔
"تم۔۔۔ را۔۔۔ دل۔۔۔ کر۔۔۔ تا۔۔۔ ہے میں۔۔۔ زر۔۔۔ مینے۔۔۔ میں۔۔۔ زر۔۔۔ مینے۔۔۔ زر۔۔۔ مینے۔" مجتبیٰ نے اسے بیڈ پہ لٹا کر کمبل برابر کیا تھا۔
وہ اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ "میں اپنے باپ کو اسپتال میں چھوڑ کر آ رہا ہوں۔ میری ماں اور بیوی ہوٹل میں اکیلی ہیں اور میں یہاں پاگلوں کی طرح تمہارے چہرے کو دیکھ رہا ہوں اور تم کہتی ہو کہ مجھے تمہاری پروا نہیں ہے۔" وہ سر جھٹک کر ہنسا تھا۔
"یا تو پاگل میں ہوں، یا پھر تم۔۔۔ جسے ابھی تک سمجھ ہی نہیں آیا مجتبیٰ نے دوسری شادی کیوں کی؟"
ایک گہرا سانس لے کر وہ وہاں سے ہٹا تھا۔
"سیما گل!" باہر نکل کر کمرے کا دروازہ آہستگی سے بند کرتے ہوئے اس نے آواز دی تھی۔
"دیکھو! بی بی! جب صبح اٹھے تو اسے یہ مت بتانا کہ میں رات کو ہی چلا گیا تھا۔ کہنا کہ میں صبح گیا ہوں اور یہ بات سب کو سمجھا دینا۔ او کے۔" وہ اسے سمجھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔
کبھی کبھی سیدھی بات کو سمجھانے کے لیے بندے کو الٹا ہونا پڑتا ہے۔ اب اگر وہ یہ سب نہ کرتا تو زر یقیناً ساری رات روتی رہتی۔
اب وہ رونے کے بجائے سو رہی تھی۔ یہ اس کے لیے زیادہ اطمینان بخش بات تھی۔

☆ ☆ ☆

سردار صاحب کو دو دن بعد ڈسچارج کر دیا گیا تھا۔ وہ فوراً "کوئٹہ" جانا چاہتے تھے۔ مگر مجتبیٰ نے انہیں منع کر دیا تھا۔ سو وہ ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔
مورے اور زرمینے کو وہ واپس بھجوا چکا تھا۔ سردار صاحب کی صحت کے پیش نظر جو میٹنگز انہیں اٹینڈ کرنا تھیں۔ وہ بھی اب مجتبیٰ کر رہا تھا۔
میٹنگز۔۔۔ سیاسی کشیدہ صورت حال۔۔۔ سردار

صاحب کی صحت اور پھر زر' وہ ان سب کے درمیان جیسے شٹل کاک بن گیا تھا۔

اسے بریک اپ چاہیے تھا۔ مگر وہ دور' دور تک کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔

ان ہی دنوں تقریباً" ایک ہفتے کے ریسٹ کے بعد سردار صاحب نے اسے واپسی کا ٹکٹ کروانے کو کہا تھا۔ ظاہر ہے وہ انہیں اکیلا نہیں بھیج سکتا تھا۔

اس دن وہ غیر متوقع طور پر گھر آیا تھا۔

زر اسے دیکھ کر بے تحاشا خوش ہوئی تھی۔ مگر دوسرے ہی لمحے وہ اتنی ہی پریشان ہو گئی تھی۔

"تم ٹھیک تو ہو؟" اس کے گال پہ ہاتھ رکھ کر اس نے بے ساختہ پوچھا۔

"تھکاوٹ ہے بس!" وہ کوٹ لاؤنج میں رکھے صوفے پہ پھینکتے ہوئے اسی صوفے پہ نیم دراز ہو گیا۔

"ایک اچھی سی کافی چاہیے اور سیماگل سے میرا سوٹ کیس تیار کروادو۔"

"سوٹ کیس؟" زر نے جیسے کچھ اور سنا ہی نہیں تھا۔ وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی تھی۔

"پلیز۔ میں اس وقت کوئی بھی وضاحت دینے کے موڈ میں نہیں ہوں۔" اس نے بے زاری سے زر کو ٹوکا۔

زر خاموشی سے وہاں سے ہٹ گئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ کافی لے کر آئی تو مجتبیٰ نے اسے بھی پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس نے کافی سینٹرل ٹیبل پہ رکھی اور خود اس کے پاس بیٹھ گئی۔

وہ دونوں ہی خاموش تھے۔ مجتبیٰ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھ لیا۔ اسے اس وقت صرف سکون چاہیے تھا اور اس کے سینے پہ دھرا اس کے ہاتھ کا لمس اسے اس وقت سکون ہی تو پہنچا رہا تھا۔ اس کا سر بوجھل ہونے لگا تھا۔ زر اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ بے اختیار وہ ہلکا سا مسکرائی تھی۔ ہمیشہ اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے وہ جن جذبات کا شکار ہوتی تھی' وہ خود اس کی سمجھ سے بھی باہر تھا۔

"مجتبیٰ! کافی ٹھنڈی ہو رہی ہے۔" چند لمحوں بعد اس نے آہستہ سے کہا۔

مجتبیٰ کو اس کی آواز اتنی دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی کہ وہ اس کے الفاظ بھی نہیں سمجھ سکا تھا۔

"صاحب کا سوٹ کیس۔" سیماگل بولتی' ہوئی اندر آئی۔

زر نے ہونٹوں پہ انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے واپس جانے کا اشارہ بھی کیا۔ وہ جانتی تھی کہ مجتبیٰ کو اپنے بابا کے ساتھ جانا تھا مگر وہ خود غرض عورت تھی جسے اپنے سوا کچھ نہیں دکھائی دیتا تھا۔

مجتبیٰ شاید فلائٹ نہ لے پاتا۔ اگر بروقت اسے ذکا کی کال نہ آتی۔

وہ بری طرح چونک کر اٹھ گیا تھا۔ ذکا نے اسے سیدھا ایئرپورٹ آنے کو کہا تھا اور اگلے پندرہ منٹ میں وہ گھر سے جاچکا تھا۔ زر ہمیشہ کی طرح اسے جاتا دیکھتی رہی تھی۔ وہ اسے سی آف کرکے واپس لاؤنج میں آئی تھی۔ اس کی کافی وہیں پہ پڑی تھی۔ زر کو اس کافی کو دیکھ کر اتنا غصہ آیا تھا کہ اس نے ہاتھ مار کر کافی کے کپ کو گرادیا تھا۔

☼ ☼ ☼

افیشن ملک نے کوئی بھی فیصلہ لینے سے پہلے ایک دفعہ سردار صاحب سے ملاقات کرنا بہتر جانا تھا۔ وہ دیکھنا چاہتی تھیں کہ واضح طور پر پارٹی چھوڑنے کی بات پہ سردار صاحب کا ردعمل کیا ہوگا۔ کیا وہ رشتے داری کا لحاظ کریں گے؟ ویسے بھی ان کی علالت کے وقت وہ پاکستان میں نہیں تھیں' سو بہانہ اچھا تھا۔

ایسے میں کوئٹہ جانا بہت مناسب تھا' جبکہ مجتبیٰ ابھی وہاں تھا۔

"السلام علیکم!" دوپہر کے کھانے کے بعد ان کی ملاقات سردار صاحب سے ہوئی۔ یہ مکمل طور پر گھریلو ملاقات تھی۔

"وعلیکم السلام محترمہ! تشریف رکھیے۔"

"اب تو کافی بہتر طبیعت محسوس ہو رہی ہے آپ کی۔"

"ہوں بہت بہتر ہے۔"

"ٹور کیسا رہا آپ کا؟" قہوے کی پیالی اٹھاتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

"یہ تو اس ملاقات کے بعد ہی پتا چلے گا۔" قہوے کا ایک گھونٹ لیتے ہوئے افیشن ملک نے بے حد مسکرا کر کہا۔

"میں جانتا ہوں محترمہ! آپ کو شکایت ہے۔"

"شکایت نہیں' شکایات سردار صاحب!" انہوں نے بات کاٹی تھی۔

"آپ کو نہیں لگتا اس وزارت پر میرا حق تھا جو کہ آپ نے اپنے بھتیجے کے نام کردی' جبکہ اسے سیاست میں آئے جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے۔" ان کا طنزیہ لہجہ اشتعال میں بدلا۔

"تحمل سے بی بی۔ عورتوں کی اونچی آواز سننے کا عادی نہیں ہوں میں۔ یہ بات۔ جس پہ آپ شکوہ کرنے اسلام آباد سے کوئٹہ تشریف لائی ہیں۔ اس وقت معلوم نہیں تھی آپ کو جب آپ اپنی بیٹی کی شادی مجتبیٰ سے کر رہی تھیں۔ یوں سمجھیے میں نے دوسری بہو اور آپ نے اکلوتے داماد کا تاوان بھرا ہے۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔"

افیشن کو سردار صاحب سے اتنی صاف گوئی کی توقع نہیں تھی۔

"تاوان نہیں۔ سزا کہیے۔ سردار صاحب!"

"آپ کی سمجھ پہ پابندی نہیں' جیسے مرضی سمجھیے اس بات کو۔" انہوں نے بے حد سرسری سے انداز میں کہا تھا۔

تھوڑی دیر کے لیے وہ دونوں خاموش ہوئے تھے۔

"آپ کے اس فیصلے کی وجہ سے میں کسی بھی انتہا پہ جا سکتی ہوں سردار صاحب!"

چند لمحوں بعد افیشن نے تیکھے انداز میں کہا۔

"آپ کے کسی فیصلے پہ بھی پابندی نہیں ہے۔ جیسے آپ مناسب سمجھیں۔"

ان کا انداز پہلے سے بھی زیادہ لاپروائی لیے ہوئے تھا۔ افیشن کو بے حد سبکی محسوس ہوئی۔ وہ چند لمحے انہیں دیکھتی رہیں' پھر اٹھ کر وہاں سے چلی گئیں۔

مجتبیٰ وہاں موجود نہیں تھا۔ کیونکہ سردار صاحب نے اسے منع کردیا تھا۔ وہ افیشن ملک کو اتنا غصہ دلانا چاہتے تھے کہ وہ خود ہی پارٹی چھوڑنے کا فیصلہ کریں۔ اور وہ کس قدر کامیاب رہے تھے۔ یہ بات انحصار کرتی تھی کہ افیشن کتنے روز بعد پریس کانفرنس منعقد کرتی ہیں۔

☼ ☼ ☼

"تمہارے جانے کے بعد سب کچھ کتنا بے معنی' کتنا خالی سا لگتا ہے۔" وہ رات کے وقت لان میں ٹہلتے

پاؤں چکر لگا رہی تھی۔

"پھول کھلتے ہیں تو کھلا کریں' چاند نکلتا ہے تو نکلا کرے' کسے پروا ہے۔ اس ایک بات کا انتظار کہ آج نکلنے والا سورج جلدی ڈوبے' تاکہ کل کا سورج نکل سکے اور کل کے بعد پرسوں کا اور... تم جب میرے ساتھ ہوتے ہو تو لگتا ہے کہ جیسے میرے قدم ہوا پہ ہوں اور وہ ہوا مجھے آسمان کی بلندیوں تک پہنچا آئی ہو۔"

اس نے نظریں اٹھا کر آسمان کو دیکھا تھا۔ "جب نہیں ہوتے۔" بے اختیار اس نے گہرا سانس بھرا "تو یوں لگتا ہے کہ جیسے میرے قدم پانی پر ہو۔ جہاں اوپر جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' بس خوف ہوتا ہے ڈوبنے کا۔"

وہ تھک کر وہیں لان میں گھاس پہ بیٹھ گئی۔

"محبت نے مجھے کیا بنا دیا ہے۔" اس نے دونوں ہاتھوں کو پھیلا کر سوچا۔ "ایک مڈل کلاس عورت۔"

ایلیٹ کلاس کی عورت محبت کرنے سے پہلے نفع نقصان کا حساب کرتی ہے۔ جبکہ مڈل کلاس عورت محبت کرنے سے پہلے آنکھیں بند کر لیتی ہے جیسے وہ اندھی ہو۔

کچا گھڑا اٹھاتے وقت بھی سوہنی اندھی تھی اور تب بھی جب وہ دریا میں اتری تھی۔ بے وقوف کو پتا ہی نہیں چلا کہ دریا چڑھا ہوا تھا۔ زر بھی کچھ ایسی ہی بے خوف تھی مگر تھوڑا سا فرق تھا اور وہ یہ تھا کہ...

محبت میں وہ مر تو سکتی تھی مگر مارنے سے بھی وہ ڈرتی نہیں تھی...

دراصل وہ بے وقوف نہیں... جنونی تھی۔

وہ لاؤنج میں بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ یک دم زر بولتے ہوئے لاؤنج میں آئی۔

مجتبیٰ نے فوراً" چینل بدلا۔

"تم نے چینل کیوں بدل دیا؟" وہ حیران ہوئی۔

"ایسے ہی' تم کچھ دیکھنا چاہو۔" اس نے ریموٹ زر کو تھمایا۔

زر نے صرف ریویو کا بٹن دبایا اور وہ نیوز چینل اس کے سامنے تھا' جہاں اس کی ماں پریس کانفرنس کر رہی تھیں۔

"زر پلیز۔" مجتبیٰ نے ریموٹ اس کے ہاتھ سے لینا چاہا۔

زر پلکیں جھپکے بنا ٹی وی دیکھنے لگی۔ اس نے اپنے ہاتھ سے مجتبیٰ کا ہاتھ ہٹایا۔

افشین کا لب و لہجہ' الزامات کی بوچھاڑ' طنز' تشنیع۔

"میرے خدا!" زر کے ہاتھوں سے ریموٹ نیچے گرا اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ منہ پر رکھ لیے۔

مجتبیٰ نے ایک گہرا سانس بھر کر ریموٹ اٹھایا اور ٹی وی آف کر دیا۔

"مجتبیٰ اب کیا ہوگا؟ مما نے یہ کیا کیا؟" وہ پریشان تھی۔

"زر! یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔"

"کیسے نہیں ہے۔ وہ ماں ہیں میری اور تمہارے بابا... کیا وہ تمہیں اب پریشرائز نہیں کریں گے۔ ماما نے ان کی مخالف پارٹی جوائن کی ہے۔ تم دیکھ رہے تھے نا انہیں۔" اس نے خشک ہوتے ہونٹوں پہ زبان پھیری۔

"یہ اچھا نہیں ہوا۔ ناٹ گڈ۔ ناٹ گڈ۔" وہ اس کے ہاتھ ہٹاتے ہوئے بولی۔

"اس بلڈی پالیٹکس سے تمہارا یا تمہارے اس گھر کا کوئی تعلق نہیں ہے تم کیوں اتنی ان سیکیور ہو رہی ہو؟"

"اور تمہارے بابا؟"

"تم ان کی فکر نہ کرو۔"

مجتبیٰ نے کہنے کو کہہ دیا تھا مگر یہ اتنا آسان نہیں تھا' وہ جانتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ڈیڈی! کم از کم آپ کو مما کو سمجھانا چاہیے تھا۔" وہ ان کی اسٹڈی کی مخصوص کھڑکی کے سامنے کھڑی تھی۔

"کیا اسے خود سمجھ نہیں ہے کہ اس کی حرکتیں اس کی بیٹی کو کب اور کہاں متاثر کر سکتی ہیں۔" انہوں نے جگ میں سے پانی گلاس میں ڈال کر اسے پکڑایا۔

"نہیں منسٹری ان کی بیٹی کے گھر سے زیادہ اہم ہے؟" اس نے پانی نہیں پیا تھا۔

"جواب تکلیف دہ ہے۔" انہوں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کندھے اچکائے۔

"ڈیڈ!" پانی کا گلاس سائیڈ پہ رکھتے ہوئے وہ زچ ہو کر بولی۔ "مجتبیٰ کور کر لے گا۔ یہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مگر میں شرمندگی فیل کر رہی ہوں۔"

انہوں نے اس کا گال تھپتھپایا۔

"تم ان باتوں کے لیے کیوں شرمندہ ہو گی جو کہ تم نے کی ہی نہیں' ویٹ از ناٹ یور فالٹ۔"

"ہاں۔ یہ میری غلطی نہیں ہے' لیکن ڈیڈی! آپ جانتے ہیں کہ میری غلطی میرے گھر کو اس طرح سے ہرٹ نہ کرتی جس طرح مما کی غلطی کر سکتی ہے۔"

"زر! بات یہ ہے کہ تمہیں ایسی باتوں... ایسی پریشانیوں کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ آفٹر آل تمہاری مما کوئی عام خاتون تو ہیں نہیں۔"

اس نے کچھ جواب نہیں دیا تھا مگر اپنی پیشانی مسلنے لگی تھی۔

"ریلیکس زر ریلیکس... کچھ نہیں ہو گا۔" اس نے سر ہلا دیا تھا۔ سر ہلانے کے علاوہ وہ اور کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

☼ ☼ ☼

اسے محسوس ہو رہا تھا جب سے اس کی مما نے پارٹی چھوڑی تھی۔ مجتبیٰ اس سے دور ہوتا چلا جا رہا تھا۔ حالانکہ ایسا تھا نہیں۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ حسب معمول مصروف تھا۔

ایک ڈیڑھ سال کافی ہوتا ہے اپنے لائف پارٹنر کو سمجھنے کے لیے مگر وہ عجیب عورت تھی اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد... ذرا سی بات سے وہ اپنی خود ساختہ وہمل اور شکوک و شبہات کا شکار ہونے لگتی تھی۔

ابھی بھی اس نے بڑے برے منہ کے ساتھ مجتبیٰ کو آتے دیکھا تھا۔ وہ سیل فون کان سے لگائے کسی سے بات کر رہا تھا۔

"ستے حال دا مورے۔" (کیا حال ہے مورے) وہ زر کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔ مورے کا لفظ سن کر اس کا موڈ اور بگڑ گیا۔

"خیر دے۔" (خیریت سے ہوں) اس نے جواب دیا۔ وہ اس سے کچھ کہہ رہی تھیں جبکہ زر کو مجتبیٰ کا صرف "ہوں... ٹھیک ہے..." اور سر ہلانا نظر آ رہا تھا۔

"دا گل فراز ودا مور؟" (گل فراز کی شادی ہے ماں) پوچھنے کے بعد وہ ایک دفعہ پھر سے بات سننے میں مصروف ہو گیا۔

"خدائے پامان"

اس نے کہا اور فون بند کر دیا تھا۔

اور زر کو سخت افسوس ہوا کہ ایک پختون سے شادی کرنے کے بعد کم از کم اسے پشتو ضرور سیکھ لینی چاہیے تھی۔

"خیریت؟"

"ہاں! کچھ نہیں' بس ایسے ہی مورے کا فون تھا۔" اس نے زر کو ٹالا۔

☼ ☼ ☼

حیدر صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ انہیں دیکھنے آئی تھی۔ اس سے باتیں کرتے کرتے وہ میڈیسن کی وجہ سے سو گئے تھے۔ ایک نظر حیدر صاحب کے چہرے پر ڈالتے ہوئے وہ ان کے کمرے سے باہر آ گئی تھی۔ لاؤنج میں ہی اسے افشین ملک نظر آئی تھیں... وہ غالباً" چائے بنا رہی تھیں اپنے لیے۔

جب سے وہ واقعہ ہوا تھا افشین ملک سے وہ کم ہی بات چیت کرتی تھی بلکہ افشین سے اس کی ملاقات ہوتی ہی بہت کم تھی۔ وہ خاموشی سے ان کے ساتھ والے صوفے پہ جا کر بیٹھ گئی۔

"اتنی پریشان کیوں ہو؟"

"اچھا لگا سن کر کہ آپ کو بھی دوسروں کے چہرے پہ پریشانی نظر آتی ہے۔" وہ تلخ ہوئی۔

"مجتبیٰ ٹائم نہیں دے رہا آج کل کیا؟" اپنے لیے بنایا ہوا چائے کا کپ وہ اسے پکڑاتے ہوئے مسکرا کر بولی تھیں۔

"یو نو زر! تم جیسی بیویاں شوہروں کے لیے واقعی نعمت سے کم نہیں ہوتیں جنہیں مرد اپنی مرضی کے خواب دکھاتے ہیں اور پھر اپنی مرضی کی تعبیریں بھی نکلوا لیتے ہیں۔ جانتی ہو ایسا کیوں ہے؟" اس نے سوالیہ نظروں سے افشین ملک کو دیکھا۔

"کیونکہ تم مکمل طور پر ایک احمق عورت ہو۔"

زر کا حلق تک کڑوا ہو گیا تھا۔ وہ بولنا نہیں چاہتی تھی مگر اسے یکدم غصہ آیا تھا۔

"مجتبیٰ کیسا مرد ہے یہ مجھے آپ کو اور آپ کو مجھے سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجتبیٰ پر آنکھیں بند کر کے اعتماد کیا جا سکے۔ ہاں میں ہوں احمق اور ہر وہ عورت احمق ہوتی ہے جس کا شوہر مجتبیٰ جیسا ہو۔" وہ بہت مشتعل ہو کر بولی تھی۔

"تم جیسی عورتیں سر پہ ہاتھ رکھ کر روتی ہیں۔"

"اور آپ جیسی عورتوں کے شوہر سر پہ ہاتھ رکھ کر روتے ہیں۔"

"شٹ اپ!" افشین ملک حلق کے بل چلائیں۔ "اس طرح آنکھیں بند کر کے چلنے سے منہ کے بل گرو گی تم!"

"وہ مجھے گرنے نہیں دے گا۔" بڑے فخر سے زر نے کہا تھا۔

"ہاں! وہ تمہیں گرنے نہیں دے گا بلکہ خود گرائے گا تب تم کیا کرو گی۔ ذرا سوچنا اس بارے میں بھی۔" وہ طنز کرنے سے باز نہیں آئی تھیں۔

زر نے جواب نہیں دیا تھا۔ اس نے اپنا بیگ اٹھایا اور وہاں سے چلی گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

رات کو بہت دیر سے مجتبیٰ کی کال آئی تھی۔ وہ اس کی غیر موجودگی میں سیما گل کو اطلاع دے کر شہر سے باہر چلا گیا تھا۔

"ابھی تک جاگ رہی ہو؟"

"ہاں۔ بس نیند نہیں آ رہی۔ تم کہاں ہو۔"

"آؤٹ آف سٹی۔"

"کیا کوئٹہ؟"

"نہیں۔ بس کچھ پرابلمز ایسے ہو گئے تھے مجھے جانا پڑا۔" بات کرنے کے دوران مجتبیٰ نے ہونٹوں پہ انگلی رکھ کر کسی کو خاموش رہنے کا بولا تھا۔

"کب تک آؤ گے؟"

"شاید ایک ہفتہ لگ جائے۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

زر نے بے ساختہ گہرا سانس بھرا۔

"اب تک تمہیں عادی ہو جانا چاہیے۔" وہ اس کے جذبات کو بہت اچھی طرح سے سمجھتا تھا۔

"ٹرائی کر رہی ہوں۔" اس کی آواز میں ایسی بے زاری تھی جیسے کسی ناپسندیدہ بات کو قبول کرنے میں ہوتی ہے۔

"اچھی بات ہے۔ سو جاؤ اب تم۔" اس نے مجتبیٰ کو کہتے سنا۔

"او کے۔ خیال رکھنا اپنا۔" زر نے فون بند کر دیا۔

مجتبیٰ چند لمحے خاموشی سے بند سیل کو دیکھتا رہا۔ بعض اوقات کسی کو تکلیف سے بچانے کے لیے "مصلحتاً" جھوٹ بھی بولنے پڑتے ہیں سو اس نے بھی بولا تھا۔ ایک گہرا سانس بھر کر وہ زرمینے کی طرف متوجہ ہوا۔

"ہاں کہو اب۔ کیا کہہ رہی تھیں تم؟"

موبائل جیب میں رکھتے ہوئے وہ زرمینے کی طرف متوجہ ہوا۔

☼ ☼ ☼

وہ چپس کھاتے ہوئے میگزین پڑھ رہی تھی۔ تب اس کے کمرے کے دروازے پہ دستک ہوئی۔

"بی بی۔ بیگم صاحبہ آئی ہیں۔"

"کون۔ مورے؟" اسے جھٹکا لگا۔ یک دم وہ سیدھی ہوئی۔

"نہیں۔ آپ کی۔"

"آ۔ ہا۔ واٹ آ سرپرائز۔" وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو وہ اسے دیکھ کر مسکرائیں۔

"تمہیں کیسے لگتے ہیں سرپرائزز؟" زر نے ایک نظر انہیں دیکھا اور سیما گل کو مشروب لاتے دیکھ کر خاموش رہی۔

"آپ یہاں یہ پوچھنے آئی ہیں کیا؟" اس نے گلاس افشین کو پکڑایا۔

"مجتبیٰ کہاں ہے؟" وہ ان کے بات بدلنے پر چونکی

"آؤٹ آف سٹی گیا ہے۔" وہ صوفے پہ بیٹھتے ہوئے بولی۔

"کہاں؟" اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بہت مسکرا کر پوچھا گیا ایک لمحے کو وہ گڑبڑائی۔

"پتا نہیں۔ میں نے نہیں پوچھا۔" اس نے لاپروائی سے جواب دیا۔

"اچھی بیوی کی نشانی نہیں ہے یہ۔ یا پھر یہ کہنا چاہیے کہ یہ اچھے شوہر کی نشانی نہیں ہے۔ کیوں زر۔ کون اچھا نہیں تم دونوں میں سے؟"

"ڈیڈی کیسے ہیں؟" اس نے بات پلٹی انہوں نے جواب نہیں دیا۔ وہ بس مسکرا کر اسے دیکھ رہی تھیں۔

"مما واٹ؟ آپ یہاں کیا گیم کھیلنے آئی ہیں؟" وہ زچ ہوئی تھی۔

"تو ہنی! گیم کون کھیل رہا ہے؟ کس کے ساتھ کھیل رہا ہے جلد ہی کلیئر ہو جائے گا۔" وہ اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے بولیں۔

زر سمجھ نہیں سکی تھی ان کا آنا اور پھر ان کی باتیں۔ وہ بری طرح سے الجھی تھی۔

"ہو نو زر! تمہارے ارد گرد مجتبیٰ نے اپنی سو کالڈ محبت کی اتنی اونچی دیواریں کھڑی کر دی ہیں کہ تمہیں کچھ نظر ہی نہیں آتا۔" وہ اس کے سامنے کھڑی تھیں۔ وہ مڑیں اور باہر نکل گئیں۔ زر ایک لمحے اسی الجھن میں گھری کھڑی رہی پھر ان کے پیچھے بھاگی۔

"یہ آپ کی سیاست نہیں مما۔ میرا گھر ہے۔ اس پالیٹکس کو مجھ سے اور میرے گھر سے دور رکھیں۔" وہ انہیں گاڑی میں بیٹھتے دیکھ کر چلائی۔ افشین ملک نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ آنکھوں پہ گاگلز چڑھائے اور ڈرائیور کو چلنے کا اشارہ کیا تھا۔ ان کی گاڑی گیٹ سے باہر نکلنے تک وہ کھولتی رہی۔

افشین ملک صرف یہ جاننے آئی تھیں کہ زر کو معلوم بھی ہے کہ مجتبیٰ کہاں ہے؟ اور انہیں اپنے سوال کا جواب مل گیا تھا۔

☼ ☼ ☼
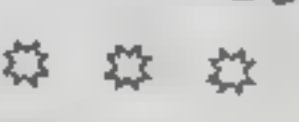
"شادی کے پانچ چھ سالوں میں پہلی مرتبہ اس طرح میں آپ کے ساتھ آئی ہوں۔"

وہ بہت فریش لگ رہی تھی۔ مجتبیٰ مسکرا دیا۔

"تم پڑھی لکھی ہو خوب صورت ہو اور حیرت ہے کہ جاہل نہیں۔ تم نے کیسے کمپرومائز کیا میری دوسری شادی پہ ان فیکٹ محبت پہ۔" زرمینے ہلکا سا ہنسی تھی۔

"آپ کی سوئی ابھی تک وہیں اٹکی ہے۔ اب تو یہ زندگی کا حصہ بن چکا ہے۔"

"کیا پڑھے لکھے ہونے کا مطلب ہمیشہ یہ ہی ہوتا ہے کہ انسان کمپرومائز نہ کرے۔ میرے خیال میں اگر میں شور مچاتی۔ گھر چھوڑ کر چلی جاتی۔ چیخنا چلانا یہ خاصا جاہلانہ کام ہے۔ تعلیم شعور دیتی ہے سو میں نے اسی کا استعمال کیا۔" وہ سر جھکا کر مدہم لہجے میں بول رہی تھی۔

"اپنا حق لینا بھی تو سکھاتی ہے یہ تعلیم۔"

"تو میرا کون سا حق مارا ہے آپ نے۔" اس نے

زرتنت جواب دیا۔ مجتبیٰ ہنس دیا۔

"اچھا... اب اور کتنی شاپنگ رہ گئی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ایک ہفتہ اور لگ جائے گا۔" اس نے شرارت سے جواب دیا تھا۔

"تم مرواؤ گی مجھے۔" وہ موبائل پہ بٹن دباتے ہوئے بولا۔

ایک بار پھر وہ ہنس دی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ مجتبیٰ زر کی بات کر رہا تھا۔ ابھی بھی وہ اسے ہی کال کر رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"بی بی! یہ کوریئر سروس سے آیا ہے۔" چوکیدار اسے ایک لفافہ پکڑاتے ہوئے بولا۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے ایک سرے سے لفافہ پھاڑا اندر کچھ پرنٹ آؤٹ تھے۔ اس نے نظر دوڑائی۔ وہ ایک ایئرلائن کی دبئی جانے والے پیسنجر کی لسٹ تھی اور اس لسٹ میں دو نام نمایاں کیے گئے تھے۔ اس نے ان دو ناموں کو دیکھا۔ اسے لگا جیسے سب کچھ تھم گیا تھا۔ ماسوائے اس کی دل کی دھڑکن کے۔ وہ ابھی بھی دھڑک رہا تھا۔

وہ دو نام... مجتبیٰ خان اور زرمینے مجتبیٰ کے تھے۔

ایک گہرا سانس بھر کر اس نے اپنے یک دم امڈ کر آنے والے آنسو کو روکنا چاہا تھا مگر وہ بے اختیار تھے۔ پتا نہیں اسے یک دم اور بات بات پہ رونا کیوں آ رہا تھا اچانک اسے خیال آیا تھا۔ اسے تو مجتبیٰ کے پاکستان کے نمبر سے ہی کالز آتی تھیں تو پھر یہ...

اس نے فوراً اپنے سیل سے مجتبیٰ کے نمبر پہ کال کی۔ بیل جا رہی تھی۔ اس نے فوراً سیل آف کر دیا تھا۔ وہ اس وقت مجتبیٰ سے بات کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔

یہ کوئی اتنی بڑی پہیلی نہیں تھی جو وہ بوجھ نہ پاتی۔ مجتبیٰ کا سیل انٹرنیشنل رومنگ پہ تھا۔ پیپرز اس کے ہاتھ سے نیچے گر گئے۔

☼ ☼ ☼

"آپ جب گھر آئی تھیں تب مجھے نہیں بتا سکتی تھیں۔ یہ گیم کھیلنا ضروری تھا کیا؟" زر افتشین ملک کے آفس میں ان کے سامنے موجود تھی۔ وہ خاموش رہیں۔

"آپ تو یہ دیکھنے آئی ہوں گی کہ مجھے معلوم ہے یا نہیں۔ بہت شوق تھا نا آپ کو مجھے نیچا دکھانے کا۔"

"وہ! کم آن زر... ماں ہوں میں تمہاری۔ جتنا میں اس فیملی کو جانتی ہوں۔ تم نہیں جانتیں۔ مجھے تمہاری بہت پروا ہے جانی!"

"کیا یہ اچھا نہ ہوتا کہ آپ مجھے بے خبر رہنے دیتیں۔" اس کی آواز بھیگ رہی تھی۔

"کیوں بے خبر رہنے دیتی میں تمہیں۔ وہ کیا کر رہا ہے معلوم ہونا چاہیے تمہیں۔"

"وہ کوئی جرم نہیں کر رہا اور نہ ہی یہ غلط ہے۔ بیوی کے ساتھ گیا ہے۔ کسی گرل فرینڈ کے ساتھ نہیں گیا۔" یک دم وہ میز پہ ہاتھ مار کر اونچی آواز میں بولی تھی۔

"تو تمہیں کیوں نہیں بتایا اگر یہ اتنا ہی صحیح عمل تھا تو بتا کر جاتا نا۔ تمہارا وہ رائٹ مین تمہیں..." انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ وہ بھی خاموش تھی۔

"ڈیڑھ سال ہو گیا تم دونوں کی شادی کو۔ ابھی تک اولاد نہیں ہوئی۔ کبھی نام لیا مجتبیٰ نے تمہارے اور اپنے بچے کا۔"

"اسے کیوں ضرورت ہوگی بچے کی۔ جبکہ اس کا پہلے سے ایک بیٹا موجود ہے۔" وہ کھٹ سے بولی۔

"اور اسے کیوں ضرورت ہوگی کسی دوسری بیوی کی جبکہ اس کے پاس پہلے سے ایک بیوی موجود ہے۔" جواب اس سے بھی زیادہ تیزی سے آیا۔ اس نے دہل کر اپنی ماں کو دیکھا۔ ایسی باتیں تو کبھی اس نے سوچی ہی نہیں تھیں۔

"اس نے شادی کی ہے میرے ساتھ۔ افیئر نہیں چلایا اور کوئی خفیہ میرج نہیں ہے یہ۔ ساری دنیا کو پتا ہے۔" اس نے دکھ اور غصے سے کہا۔

"تم سے بچہ کیوں نہیں چاہتا پھر وہ۔" زر نے

بے ساختہ نظریں چرائی تھیں۔ "کبھی... ہماری اس ٹاپک پہ کبھی بات نہیں ہوئی۔" وہ دھیمی پڑ گئی۔

"کیوں نہیں ہوئی... ہونی چاہیے تھی نا۔ ہر نارمل شخص کرتا ہے بس وہ ہی نہیں کرتا جسے سرے سے اولاد ہی نہ چاہیے ہو۔"

"آپ کیا چاہتی ہیں آپ؟" وہ زچ ہوئی۔

"میں کیا کہوں گی زر... تم خود بتاؤ۔ زرمینے نے تمہیں کیوں قبول کیا۔ اس سے طلاق کیوں نہ لی؟" وہ خطرناک حد تک سنجیدہ تھیں۔

"تم سے شادی کی قیمت چکائی ہے مجتبیٰ نے۔ اس شادی کے عوض زرمینے کے بھائی کو وزارت دلوائی گئی ہے اور اس کام کے لیے انہوں نے اپنے ہی سینئر پارٹی ممبر کے خلاف جعلی ڈگری کا کیس چلوا کر سیٹ خالی کروائی وہاں سے زرمینے کے بھائی کو جتوایا اور پھر اسے وزارت دی گئی۔ اور تمہاری شادی مجتبیٰ سے کروانے کی سزا کے طور پہ مجھے پارٹی سے بے دخل کیا گیا۔ مجھ پہ پریشر تھا کہ میں یہ شادی نہ ہونے دوں میرا خیال تھا تمہیں سب پتا ہوگا۔"

وہ سانس روکے انہیں سن رہی تھی۔

"کاش کہ مجھے پتا ہوتا کہ وہ شخص اتنا کمین ہے تو میں تمہاری شادی اس سے کبھی نہ کرواتی اور جب سے مجھے پتا چلا ہے میں تمہیں وارن کر رہی ہوں ہنی! کہ آنکھیں کھلی رکھو۔" اب کے وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر نرم لہجے میں بولی تھیں۔ یک دم ہاتھ چھڑا کر اس نے کرسی سے ٹیک لگا لی۔

"وہ ایسے کیسے برباد کر سکتا ہے وہ میری زندگی کو۔"

وہ بڑبڑائی۔

"وہ مجھ سے پیار کرتا ہے۔" وہ خود سے بولے جا رہی تھی۔ اس کی حالت خراب ہونے لگی۔

"ہنو! میں تمہیں گھر چھوڑ دیتی ہوں۔" وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کر زر کے پاس آئیں۔

"آپ سچ نہیں کہہ رہی ہیں۔" آنسو بھری آنکھوں سے انہیں دیکھتے ہوئے وہ شکی لہجے میں بولی۔

"جلد ہی ہر بات صاف ہو جائے گی۔" اس کے گالوں پہ بہنے والے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے انہوں نے بہت آہستگی سے جملہ دہرایا۔

☼ ☼ ☼

وہ آج کل سلیپنگ پلز لے کر سو رہی تھی۔ اس لیے اسے پتا ہی نہیں چلا تھا کہ وہ کب آیا تھا۔

اس کی آنکھ کھلی تو وہ کرسی پہ بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ اس کے سامنے فریش جوس کا گلاس رکھا ہوا تھا اور وہ خود بھی بہت فریش نظر آ رہا تھا۔ کھڑکیوں کے پردے ہٹے ہوئے تھے اور ان سے اندر آنے والی روشنی بتا رہی تھی کہ وہ کافی دیر تک سوتی رہی تھی۔

"سرپرائز!" وہ اسے دیکھ کر مسکرا کر بولا۔

دنیا کا سب سے خوب صورت لگنے والا چہرہ جب یک دم بدصورت لگنے لگے تو کیا ہوتا ہے۔ حقیقت نے کسی تیزاب کا کام کیا تھا اس نے زر کو تو جھلسایا تھا ہی مگر سلامت تو اس کا چہرہ بھی نہیں رہا تھا۔ اس نے ایک نظر اسے دیکھا اور اٹھ کر کھلے بالوں کو سمیٹتے ہوئے بیڈ سے نیچے اتری۔

"بٹ ناٹ آ پلیزنٹ سرپرائز۔" عام سے لہجے میں کہتے ہوئے وہ واش روم چلی گئی۔

مجتبیٰ کو دھچکا لگا تھا۔ اور وہ اسے کمزور بھی محسوس ہوئی۔ جیسے وہ بیمار رہی ہو۔ عین اسی وقت یہ اسے خیال آیا تھا کہ دو دن سے اسے زر کا سیل بھی آف مل رہا تھا۔ مصروفیت میں وہ اس سے رابطہ نہیں کر پایا تھا تو کیا اس کے پیچھے کچھ ہوا تھا؟ بے ساختہ وہ پریشان ہوا تھا۔ وہ چینج کر کے آ چکی تھی اور اب آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بال بنا رہی تھی۔ اس کا چہرہ ابھی بھی ہلکا سا نم تھا مگر اس کے تاثرات وہ سپاٹ تھے۔

"کیا اس طرح ٹریٹ کیا جاتا ہے۔ اتنے دن بعد گھر آنے والے شوہر کو۔" عین اس کے پیچھے کھڑا آئینے میں اسے دیکھتے ہوئے وہ بولا۔

زر کے ہاتھ رکے۔ اس نے نظریں اٹھا کر شیشے میں

سے اسے دیکھا۔ وہ عام طور پر اتنا برداشت نہیں کرتی تھی جتنا اس وقت کر رہی تھی۔ وہ منہ پہ جواب دینے کی عادی تھی مگر اب... اس نے برش ڈریسنگ پہ رکھا اور مڑی۔

"کیا کروں؟" وہ سیدھا اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

"اوف... زر..." مجتبیٰ نے آگے بڑھ کر اسے ساتھ لگایا تھا مگر اس کے ہاتھ اس کے دونوں پہلوؤں میں ہی گرے تھے اور پھر یک دم اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر پوری قوت سے مجتبیٰ کو دھکا دیا وہ بری طرح سے لڑکھڑایا تھا۔ وہ اتنا شاکڈ تھا کہ چند لمحے اپنی جگہ سے ہل تک نہ سکا۔

چند لمحے وہ وہیں کھڑی ہونٹ بھینچے اپنے جذبات پہ قابو پانے کی کوشش کرتی رہی اور پھر مجتبیٰ نے بے حد حیرت سے اس کو کمرے سے باہر جاتے دیکھا تھا۔

دوسرا ابھرنے والا احساس غصے کا تھا۔

وہ اٹھا اور تیزی سے اس نے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل سے گاڑی کی چابیاں اٹھانا چاہیں مگر جتنی تیزی سے اس کے ہاتھوں نے حرکت کی تھی۔ وہ اتنی ہی تیزی سے ساکت ہوئے تھے۔

جس چیز نے اس کے ہاتھ ساکت کیے تھے۔ وہ میپنگ پلز کی بوتل تھی۔ شیشی کو دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے کہ بڑی مقدار میں ڈوز لی گئی تھیں۔

کیا ہوا تھا اس کی غیر موجودگی میں... اس کا غصہ جیسے رفوچکر ہو گیا۔

شیشی واپس رکھتے ہوئے وہ چونکا۔ کوریئر کمپنی کا لفافہ سامنے تھا۔ اس نے لفافہ دیکھا۔ وہ افیشن ملک کی طرف سے زر کے نام بھیجا گیا تھا۔ لفافہ خالی تھا۔ ایسا کیا تھا جو افیشن ملک کو کوریئر کے ذریعے زر کو بھجوانا پڑا تھا۔ وہ مزید الجھ تھا۔

اس کے وہم و گمان میں یہ بات تھی ہی نہیں کہ زر کو اس بات کا پتا چل سکتا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تم نے بات کی مجتبیٰ سے؟"

افیشن اسے جوس کا گلاس پکڑاتے ہوئے بولیں۔ وہ اس وقت ان کے گھر پہ موجود تھی۔

"نہیں۔" مختصر سا جواب دے کر اس نے گلاس پکڑا۔ وہ انہیں بہت ڈسٹرب لگی تھی۔

"تمہیں کرنی چاہیے تھی اس سے بات... یہ کوئی مذاق تھوڑی ہے۔ حالت تو دیکھو تم اپنی۔" ان کا موڈ بری طرح سے خراب ہوا۔

"کیا ہوا زر..." دونوں نے چونک کر حیدر صاحب کو دیکھا تھا۔ وہ کب وہاں آئے تھے۔ ان دونوں کو پتا ہی نہیں چلا تھا۔

"آپ کیسے ہیں ڈیڈی!" وہ جوس کا گلاس رکھ کر کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

"آئیم فائن... کوئی مسئلہ ہے کیا؟" انہوں نے دوبارہ پوچھا۔

زر نے افیشن کو دیکھا تھا۔

"نہیں کچھ خاص نہیں' بس وہی میرڈ لائف کے چھوٹے موٹے پرابلمز۔" انہوں نے اس مسئلے کو اتنا ہلکا پھلکا بنا دیا تھا کہ زر نے بے ساختہ انہیں حیران ہو کر دیکھا تھا۔

"ہنی! کیا تم مجھے کچھ بتاؤ گی؟" حیدر نے براہ راست زر سے کہا۔

زر کشمکش کا شکار ہوئی۔

"کم آن۔" اس کے کندھے کے گرد ہاتھ پھیلا کر کہا۔ زر خاموشی سے ان کے ساتھ چلی آئی تھی۔ افیشن ملک نے نہایت غصے سے حیدر کی اس حرکت کو دیکھا تھا مگر مصلحتاً خاموش رہیں۔

وہ اسے لے کر اپنی اسٹڈی میں آئے تھے۔

"اب بولو کیا ہوا ہے؟" زر نے ایک نظر انہیں دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں نم تھیں ہمیشہ کی طرح۔

"ڈیڈی! آپ صحیح کہتے تھے۔ مجھے واقعی مجتبیٰ سے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی۔" وہ سر جھکائے آہستگی سے بولی۔

"اتنی جلدی پچھتاوے کا شکار نہیں ہوتے زر! میرڈ لائف میں ایک دوسرے کو بہت اسپیس دینی

پڑتی ہے۔"

"اگر آپ کا لائف پارٹنر چیٹ کرے' تو کیا کرنا چاہیے؟"

"میرا نہیں خیال مجتبیٰ ایسا لائف پارٹنر ہے جو دھوکا دے۔ ایسا ہوا کیا ہے جو تمہیں یہ احساس ہوا؟"

"اس نے مجھ سے کہا کہ وہ شہر سے باہر جا رہا ہے مگر حقیقت میں وہ زرمینے کے ساتھ دبئی گیا تھا۔"

حیدر صاحب نے بے ساختہ گہرا سانس بھرا تھا۔

"بہرحال جو بھی ہے میں تمہیں... تمہاری ماں کے مشوروں پر عمل کرنے کے لیے کھلا نہیں چھوڑ سکتا۔ تمہیں مجتبیٰ سے کھل کر بات کرنا چاہیے۔"

"وہ تو میں کروں گی ہی۔" اس نے سخت لہجے میں کہا تھا۔ "اسے اپنی زندگی میں میری حیثیت ڈیفائن کرنا ہو گی۔" وہ آہستہ سے بڑبڑائی۔

حیدر صاحب نے حیران ہو کر اسے دیکھا تھا۔ ابھی بھی اسے اپنی حیثیت کی وضاحت چاہیے تھی۔

☼ ☼ ☼

پیون نے اس کے سامنے روزانہ کی ڈاک لا کر رکھی اس ڈاک میں زر کی طرف سے بھیجا جانے والا ایک لفافہ بھی تھا۔ وہ حیران ہوا۔

اس نے سب سے پہلے وہ ہی اٹھایا۔

اندر سے وہ پسنجر لسٹ نکلی تھی۔

"اوہ نو۔ ڈیم اٹ۔" اس نے ان کاغذات کو ٹیبل پہ پٹخا۔ سب کچھ واضح ہو گیا تھا۔

"زر کو کیسے معلوم ہوا یہ سب؟ یہ لسٹ... اسے حاصل کرنا کسی عام آدمی کے بس کی بات نہیں تھی۔ ایئر لائنز والے ایسے ہی تو اپنا ڈیٹا ہر کسی کو نہیں دیتے۔ یہ یقیناً کسی اثر و رسوخ والے آدمی کا کام تھا۔"

اور پھر جیسے ایک کلک ہوا تھا۔

گھر میں موجود کوریئر کمپنی کا لفافہ اور مسز افیشن کا نام۔

ایک ابال سا اٹھا تھا اس کے اندر۔

"وہ عورت کیا چاہتی تھی۔" وہ یہ جانتا تھا۔ مگر سوچنے کی بات یہ تھی کہ وہ یہ سب زر کو کیسے سمجھائے گا۔ وہ بھی ایسے وقت میں جبکہ وہ غلطی پر بھی تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ جب سے گھر آیا تھا' جوتوں سمیت ٹیبل پہ ٹانگیں رکھے ہوئے صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا سر صوفے کی بیک پہ تھا اور وہ آنکھیں بند کیے کافی دیر سے اسی طرح بیٹھا ہوا تھا۔

"صاحب! کھانا لگا دوں؟"

"بی بی نے کھایا کھانا؟" وہ سیدھا ہوتے ہوئے بولا تھا۔

"نہیں... انہوں نے تو صبح سے کچھ نہیں کھایا۔"

"تم لگا دو کھانا۔" سیما کو کہہ کر وہ کمرے کی طرف گیا۔

کمرے کے دروازے پہ ایک لمحے کو وہ رکا اور ایک گہرا سانس بھر کر اس نے دروازہ کھولا۔

وہ سامنے صوفے پر دونوں پاؤں اوپر کر کے بیٹھی تھی۔ دروازہ کھلنے پر اس نے ایک نظر مجتبیٰ کو دیکھا اور پھر رخ موڑ لیا۔ وہ آہستگی سے دروازہ بند کر کے اس کی طرف آیا۔

"کھانا کیوں نہیں کھایا؟" وہ اس کے سر پہ کھڑا پوچھ رہا تھا۔ زر کو اس سوال کی توقع نہیں تھی۔

"بھوک نہیں ہے۔" سرد سی آواز میں جواب آیا۔

"صبح سے کچھ نہیں کھایا تم نے؟" وہ اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"مرنے والی نہیں میں... وہ بھی اتنی جلدی۔" وہ اسے دیکھے بغیر کاٹ دار لہجے میں بولی۔ مجتبیٰ رخ بدل کر سیدھا ہوا۔

"زرمینے کے بھائی کی شادی ہے اگلے ماہ۔ مورے کے کہنے پہ اسے شاپنگ کروانے دبئی لے کر

گیا تھا۔ تمہیں صرف اس لیے نہیں بتایا کہ تمہیں تکلیف ہوتی تو میں نے تم سے چھپانا ہی مناسب سمجھا۔"

اس کی آواز بہت مدہم تھی۔ وہ خاموش رہی۔ اس نے کچھ نہیں کہا۔

"میرا خیال تھا کہ یہ بات تم سے چھپی رہے گی۔ میں یہ کیسے بھول گیا کہ کچھ لوگ تو خاص طور پر میری جاسوسی پہ ہی لگے ہوئے ہیں۔" اب کہ اس نے براہ راست مجتبیٰ کو دیکھا۔

"زر پلیز۔ اپنے اور میرے تعلق کو کسی تیسرے کی وجہ سے زہر آلود مت کرو۔ پلیز۔" اس کا لہجہ ملتجی ہوا تھا۔

"میری ماں کوئی تیسرا فرد نہیں ہے مجتبیٰ!"

"وہ اگر اتنی ہی فیئر ہوتیں تو وہ یہ سب تمہیں نہ بتاتیں۔ انہیں مجھ سے بات کرنی چاہیے تھی۔ مجھ سے سوال کرتیں وہ۔" وہ تاسف اور غصے کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ بول رہا تھا۔

"کیوں کی تم نے مجھ سے شادی۔" اس سوال نے مجتبیٰ کو بہت حیران کیا۔

وہ محض اس کی شکل دیکھ کر رہ گیا۔

اس نے تھوڑی دیر رک کر مجتبیٰ کے جواب کا انتظار کیا اور پھر بڑی ہی طنزیہ مسکراہٹ اس کے چہرے پہ پھیلی تھی۔

"تم نے کبھی اپنے اور میرے بچے کے بارے میں بات نہیں کی کیوں؟"

ایک اور سوال۔ اس سوال نے مجتبیٰ کو مزید چونکایا تھا۔ وہ کس نہج پہ سوچ رہی تھی۔ اب وہ سمجھ سکتا تھا۔

"بچے تو ہونے ہی تھے زر! اتنی جلدی کیا تھی۔ میں نے اس لیے توجہ نہیں دی۔" اس نے تحمل سے جواب دیا تھا۔

"تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو۔ ہو سکتا ہے کہ مجھ میں کوئی پرابلم ہو۔ کبھی تم نے بات کی کہ مجھے کسی گائنا کالوجسٹ کے پاس جانا چاہیے' نہیں نا۔ تم یہ بات کیوں کرتے مجتبیٰ! جبکہ تمہارے پاس پہلے سے اولاد موجود تھی۔ پھر کیوں خواہش ہوتی تمہیں مجھ سے اولاد کی۔"

وہ جواب کا انتظار کیے بنا بول رہی تھی۔

"ہاں ٹھیک ہے کہ میری زندگی میں عبداللہ موجود ہے۔ سو میں نے اس بات کو اہمیت نہیں دی مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ مجھے تم سے اولاد ہی نہیں چاہیے۔ تم جانتی ہو کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"تم اپنی باتوں سے مجھے مطمئن نہیں کر سکتے۔ تم نے مجھے دھوکا دیا۔ تم صرف کھیل رہے ہو میرے ساتھ۔"

"زر پلیز! اب مجھے تمہاری باتوں سے تکلیف ہو رہی ہے۔ آئندہ میں۔"

"آئندہ۔؟" اس نے تیز نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے اس کی بات کاٹی۔ "کس آئندہ کی بات کر رہے ہو تم۔" وہ طنزیہ ہنسی۔

وہ خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگا تھا۔

"میں کوئی ہنگامہ کری ایٹ نہیں کرنا چاہتی۔ مجھے ایک پرسکون زندگی چاہیے۔ ایسی زندگی نہیں جس میں مجھے اپنے شوہر کا پتا دوسرے لوگ آکر بتائیں۔"

مجتبیٰ کی باتیں اس کے دلائل اس کے جوابات سب کچھ جیسے ختم ہو رہا تھا۔ زر کیا کہنے والی تھی۔ وہ سمجھ سکتا تھا۔

"زر اور زرمینے۔ ان کے درمیان کتنا فرق ہے۔ میں نہیں جانتی۔

اور کمال تو یہ ہے کہ میں یہ تک نہیں جانتی کہ ان دونوں میں سے کون تمہارے دل کے زیادہ قریب ہے۔"

مجتبیٰ نے رنج سے اسے دیکھا۔ ڈیڑھ سال بعد بھی وہ یہ بات کہہ رہی تھی۔

"بہرحال۔" وہ مڑی۔ مجتبیٰ کے دل پہ جیسے گھونسا پڑا تھا۔ وہ رو رہی تھی۔

"فیصلہ تو تمہیں کرنا ہے کہ تم کس کے ساتھ زندگی گزارو گے۔ زر یا زرمینے۔"

"یہ کسی شے کے انتخاب کا مسئلہ نہیں ہے۔ ایک انسان سے بہت سے لوگ وابستہ ہوتے ہیں۔ میں ایک بند گلی میں کھڑا ہوں۔ تم دونوں میں سے کسی ایک کو چھوڑنا میرے لیے ایسا ہی ہے جیسے زندگی چھوڑ کر موت کا انتخاب کرنا۔"

وہ یک دم کھڑا ہو کر تیز لہجے میں بولا۔

"زر! ایک چھوٹی سی بات کو لے کر تم کیوں اتنی بڑی بات کر رہی ہو۔ میں نے تم سے جھوٹ بولا۔ اس کا مطلب یہ تو نہیں ہو گیا کہ میں تم سے محبت نہیں کرتا۔ میں تو تمہیں صرف اس تکلیف سے بچانا چاہتا تھا جو تمہیں میرے زرمینے کے ساتھ ہونے پر ہوتی ہے۔" "ایم سوری فار دیٹ۔" اس کے کندھوں کو دونوں ہاتھوں سے پکڑتے ہوئے بولا۔

زر کے بہنے والے آنسو اور تیزی سے بہنے لگے تھے۔ اس نے مجتبیٰ کو دیکھتے ہوئے اس کے دونوں ہاتھ کندھوں سے ہٹائے۔

"ایک بات بتاؤ گے تم مجھے۔ میں کیا ہوں؟ تمہاری بیوی یا پھر قانونی رکھیل۔"

کوئی تیز دھار آلہ اتنی تیزی سے نہیں کاٹتا ہو گا جتنی تیزی سے اس بات نے مجتبیٰ کو چیرا تھا۔ وہ سن ہو کر رہ گیا۔ یک دم اس کا چہرہ سرخ ہوا تھا اور پھر دوسرے ہی لمحے اس نے کھینچ کر زر کے منہ پر تھپڑ دے مارا۔ یہ بہت غیر شعوری حرکت تھی۔

زر بے ساختہ لڑکھڑائی تھی۔ اسے اس جواب کی توقع نہیں تھی۔

"یہ تھپڑ تمہیں بتائے گا کہ تم کیا ہو؟"

ایک بازو سے پکڑ کر اسے سختی سے سیدھا کرتے ہوئے اس نے کہا' پھر ایک جھٹکے سے اسے چھوڑتے ہوئے وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

زر وہیں کی وہیں کھڑی رہ گئی۔ اس تھپڑ نے کم از کم اس کی حیثیت ضرور واضح کر دی تھی۔ اور اسے یہ بھی بتا دیا تھا کہ کیا فرق تھا زر اور زرمینے میں۔ مزید کسی تشفی کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔

مجتبیٰ۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ مسز افشین کے پروپیگنڈہ نے وہ کام نہیں کیا۔ جو اس کا ایک تھپڑ کر گیا تھا۔

وہ نرم مزاج ضرور تھا مگر بے غیرت نہیں تھا۔ زر محبت سے بڑھ کر اب غیرت تھی اس کی اور یہ بات زر کو کیسے سمجھا سکتا تھا؟

☼ ☼ ☼

"بی بی کہاں ہیں سیما؟" وہ رات کے بعد ابھی گھر آیا تھا۔

"وہ تو رات سے گھر پہ نہیں ہیں۔"

"تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟" وہ بے تحاشا پریشانی کا شکار ہوا تھا۔

"آپ کا نمبر آف جا رہا تھا خان!" اس نے سیما کی بات نظر انداز کرتے ہوئے جیب سے فون نکالا۔

اس کا نمبر حسب توقع آف تھا۔ فون کان سے ہٹا کر اس نے ایک لمحے کو سوچا اور پھر وہ انہی پیروں پہ مڑ گیا۔

وہ بہت تیزی سے ڈرائیو کر رہا تھا اور اس وقت وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا سامنا مسز افشین ملک سے ہو۔ مگر چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ مسز افشین ملک اس کے سامنے تھیں۔

"زر سے ملنا چاہتا ہوں۔" اس نے بغیر کسی توقف کے کہا۔

"میں اسے بتا دیتی ہوں۔" اسے ان کے یوں چلے جانے پہ حیرت ہوئی۔ بس پریشانی سے ادھر ادھر چکر کاٹ رہا تھا۔

"مما! مجھے اس کی شکل تک نہیں دیکھنی اور آپ کہہ رہی ہیں کہ میں اس سے مل لوں۔" پیغام ملنے پر وہ غصے سے پھٹ پڑی تھی۔

"زر تم اس سے بات تو کرو۔ آفٹر دیٹ دیکھیں گے کہ کیا کرنا ہے۔" انہوں نے پیار سے اسے سمجھایا۔

پھر وہ اسے بازو سے پکڑ کر گیسٹ روم میں لے آئیں۔ زر نے ایک نظر بھی اس پر نہیں ڈالی تھی۔ وہ بس خاموشی سے سینے پہ ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔ مجتبیٰ

کچھ لمحے مسز افشین کے جانے کا انتظار کیا تھا۔ مگر وہ وہیں موجود رہیں۔

"پلیز۔ مجھے اکیلے میں اس سے بات کرنی ہے۔" وہ کندھے اچکا کر باہر چلی گئیں۔

"یہ کیا پاگل پن ہے زر؟" وہ زچ ہوا تھا۔

"یہ پاگل پن ہے یا جو کچھ بھی ہے۔ مجھے نہیں معلوم۔ میں اس وقت تک گھر نہیں آؤں گی جب تک تم زرمینے کو طلاق نہیں دیتے۔"

"میں زرمینے کو طلاق نہیں دے سکتا۔" اس نے صاف انکار کیا۔ "کیوں؟ میں کیوں کروں ایسا کام جس سے عرش تک ہل جائے۔ میں کیوں کروں اس سے زیادتی جبکہ اس نے کبھی کوئی غلط کام نہیں کیا۔"

"تم یوں کیوں نہیں کہتے کہ تم اسے طلاق دے ہی نہیں سکتے۔ کیونکہ اس سے تمہارے باپ کی سیاست کا جنازہ نکل جائے گا۔" وہ بے حد تلخ ہو رہی تھی۔

"میرے باپ کی سیاست کا جنازہ نکلے یا کچھ اور۔ وہ میری زندگی میں اس وقت بھی موجود تھی جب تم نے مجھے قبول کیا تھا۔" یکدم اس نے سپاٹ لہجے میں کہا تھا۔

"ٹھیک ہے! تمہیں مجھ سے بڑی محبت کے دعوے ہیں ناتو پھر میرے لیے۔ چھوڑ دو اسے میری محبت کے لیے۔ اپنے گھر کے لیے۔"

"تمہارا مطالبہ ایسا ہی ہے جیسے کسی کی ناحق جان لے لی جائے۔ سو میں یہ کام نہیں کر سکتا۔ تمہیں چلنا ہے تو چلو، میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔ لیکن وہ تمہارا گھر ہے اور رہے گا۔" اس نے جیسے ہار مانی تھی۔

زر انتہائی دکھ کا شکار ہوئی تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا مجتبیٰ اتنی جلدی اسے چھوڑ دے گا۔

"تم اسے نہیں چھوڑ سکتے؟" اسے اپنی آواز کی لرزش پہ قابو نہیں رہا تھا۔

"نہیں۔" مجتبیٰ کی آواز دھیمی مگر مضبوط تھی۔

"تو مجھے چھوڑ دو۔" اس مطالبے پہ اس کا منہ کھلا اور پھر وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔ وہ آہستہ سے چلتا ہوا اس کے پاس آیا۔ زر نے ذرا سا رخ موڑا۔

"مصیبت یہ ہے کہ سویٹ ہارٹ کہ میں تمہاری یہ فرمائش بھی پوری نہیں کر سکتا۔" اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے مجتبیٰ نے ہلکے سے اس کے گال کو چھوا۔ وہ اب وارفتگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"تم ایسا اس لیے کہہ رہے ہو تاکہ حق مہر شاید کی رقم بہت زیادہ ہے۔"

زر نے براہ راست اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ مجتبیٰ کے چہرے کے نرم تاثرات فوراً" غائب ہوئے۔ ایک اور کاٹ کر رکھ دینے والی بات۔

وہ جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا تھا۔ اس بات پہ وہ اپنی نظریں تک پھیر نہیں سکا تھا۔ پلکیں تک جھپک نہ سکا تھا۔ چند لمحوں بعد اس نے جیب میں سے ہاتھ نکالے۔ زر کو کندھوں سے پکڑا۔ وہ بے ساختہ چونکی تھی۔ مگر اس کے ہاتھ نہیں ہٹا سکی۔

وہ اسے یوں ہی دیکھتا رہا۔ مسلسل۔ پلک جھپکائے بنا۔ اور پھر ذرا سا آگے جھک کر اس نے زر کی پیشانی چوم لی۔

"خوش رہو۔" اس کی آواز بے حد دھیمی اور اتنی ہی نرم تھی جتنی کہ ہمیشہ ہوا کرتی تھی۔

مزید کوئی بات کیے۔ بنا کوئی اور وضاحت دیے۔ وہ چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

نیند کی گولی لیے بغیر اسے نیند نہیں آتی تھی۔ ایک ادارہ لینے کے بعد آنسوؤں کو خشک ہو جانا چاہیے تھا۔ مگر اب بھی وہ پہلے دن کی طرح بہتے تھے۔ کیسا لگتا ہے جب وہ شخص جسے آپ کے سوا کچھ نظر نہ آتا ہو اور پھر اسے آپ ہی نظر نہ آئیں۔ جسے آپ کے علاوہ کسی کی پروا نہ ہو اور پھر وہ یوں بے پروا ہو جائے۔

وہ تو یوں لاتعلق ہوا تھا جیسے کہ کبھی تعلق تھا ہی نہیں۔ دکھ تھا کہ کم ہو ہی نہیں پا رہا تھا۔ غم تھا کہ اسے کھائے جا رہا تھا۔

آنسو ابھی بھی اس کی تھوڑی کے نیچے قطروں کی

صورت گر رہے تھے۔ افشین ملک نے اسے دیکھا اور پھر یکدم انہیں غصہ آگیا۔

"وہ تو تمہیں یوں پھینک کر چلا گیا ہے جیسے کوئی گھر کا فالتو کباڑ پھینکا جاتا ہے اور تمہارا رونا دھونا ہی نہیں ختم ہوتا۔ تم کوئی فیصلہ کیوں نہیں کرتی ہو؟"

"اتنی توہین، اتنی ذلت۔" افشین کی باتوں سے اس کا چہرہ سرخ ہوا۔

"مما پلیز۔"

"کمال ہے۔ ابھی تک تمہاری سمجھ میں نہیں آیا۔" کندھے اچکا کر انہوں نے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کیا۔

وہ ان کے یوں بلاوجہ ٹی وی آن کرنے پہ الجھی تھی۔ اس نے بالکل غیر ارادی طور پر ٹی وی کی طرف دیکھا۔ وہ یقیناً" مجتبیٰ تھا۔

وہ اینکر کی کسی بات پہ زور سے ہنسا تھا۔ اس طرح سے ہنسا اس کی عادت تو نہیں تھی۔ زر کو بے ساختہ تکلیف ہوئی۔

تو کیا واقعی خوش تھا؟ کیا واقعی اسے ذرا سا بھی فرق نہیں پڑا تھا۔ کیا مسکراہٹ بھی بھلا آگ لگاتی ہے؟ مگر اس وقت مجتبیٰ خان کی مسکراہٹ یہ کام کر رہی تھی۔ وہ زخم لگا رہی تھی۔ آگ سلگا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ذکا پلیز۔ اب کچھ اور نہیں۔ کوئی میٹنگ۔ کچھ بھی نہیں۔" وہ ذکا کو فائلز کے ساتھ اندر داخل ہوتے دیکھ کر حد سے زیادہ بے زار لہجے میں بولا۔

"کمال کرتے ہوئے مجتبیٰ۔ صرف ایک ٹاک شو ہی تو اٹینڈ کیا ہے آج تم نے۔ آج کل تم کچھ زیادہ ہی بے زار نہیں رہنے لگے۔" وہ پیپرز اور فائلز ٹیبل پہ رکھتے ہوئے بولا۔

"بے زار؟" ہلکے سے ہنستے ہوئے وہ زیر لب بولا۔ "تم نے کبھی زندگی کو یکدم عذاب بنتے دیکھا ہے ذکا!" اچانک اس سوال پہ ذکا حیران ہوا تھا۔ وہ اس سوال کا مقصد سمجھ پایا تھا نہ پس منظر۔ "کوئی مسئلہ ہے کیا؟" اس نے سنجیدگی سے پوچھا تھا۔

"نہیں کچھ خاص نہیں۔ شاید تھکاوٹ کا شکار ہو رہا ہوں۔"

"تو تم کچھ دنوں کے لیے آف کیوں نہیں لے لیتے۔" وہ دائرے کی شکل میں پین کو ٹیبل پہ حرکت دے رہا تھا۔ اس کا ہاتھ رکا تھا اور اس سوال پر اس نے چونک کر سر اٹھایا تھا۔

"رات تو پہلے ہی عذاب ہوتی ہے۔ اب کیا دن کو بھی تکلیف دہ بنا لیا جائے۔" اس کی طرف دیکھتے ہوئے وہ محض سوچ سکا تھا۔

"نہیں ذکا۔ مصروفیت وہی کام کرتی ہے جو کہ کوئی بھی اینٹی بائیوٹک میڈیسن کرتی ہے۔" ذکا اب بھی الجھا تھا۔ وہ کس تکلیف کی بات کر رہا تھا۔ کون سا ایسا درد تھا جسے وہ مصروف رہ کر ختم کرنا چاہتا تھا۔ مگر وہ خاموش رہا تھا۔ اگر کوئی شیئر کرنے والی بات ہوتی تو وہ ضرور کرتا۔

"یہ سب اٹھا کر لے جاؤ یار۔ ابھی کسی چیز کا موڈ نہیں۔" ذکا کو اس کے چہرے پہ تھکاوٹ نظر نہیں آئی تھی۔ وہ کچھ اور تھا۔ کچھ ایسا جسے وہ بھی سمجھنے سے قاصر تھا۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر باہر چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

وہ مرد تھا، مضبوط اعصاب کا مالک تھا اور اوپر سے جس شعبے میں وہ تھا۔ وہاں پہ یکدم برے حالات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ سو وہ کسی حد تک عادی تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ زر اس بات کو لے کر اتنا سیریس ہو جائے گی۔ غلطی مجتبیٰ نے کی تھی۔ سزا کی حق دار زرمینے کیسے ہو گئی؟ اور وہ کیوں دیتا اسے طلاق۔ کیا زرمینے بری عورت تھی؟ کیا اس نے مجتبیٰ کی عزت کی حفاظت نہیں کی تھی؟ کیا وہ اس کی فرماں بردار نہیں تھی؟

ہمیشہ محبت کو ایسے ہی کیوں آزمایا جاتا ہے۔ جس سے کسی دوسرے کی زندگی ہی داؤ پہ لگ جائے اور کیا بنا دیا تھا اس عورت نے ایک صاف ستھرے حلال اور

پاک رشتے کو۔ ایک مذاق۔ ایک گند بھرا تعلق؟ اور کتنا گرا لیا تھا خود کو اس مقام سے۔ جو کتنا معتبر تھا۔

"قانونی رکھیل" مجتبیٰ کو ان الفاظ نے پہلے سے کہیں زیادہ تکلیف دی تھی۔ سب سے بڑھ کر مذاق یہ کہ اس نے اپنے لیے طلاق کا مطالبہ بھی کر دیا۔

وہ نہ تو اس کے کہنے پہ زرمینے کو طلاق دینے والا تھا اور نہ ہی اس کا وہ بے ہودہ مطالبہ ماننے والا تھا۔ وہ صرف خاموش تھا۔ وہ اسے وقت دینا چاہتا تھا۔ اس کا غصہ اتر جائے تو وہ اسے منا کر دوبارہ گھر لے آئے گا۔ مگر پھر بھی وہ بہت پریشان تھا۔ اس کی پریشانی زر نہیں تھی۔

پریشانی مسز افشین ملک تھیں۔ وہ اس عورت سے کچھ بھی توقع کر سکتا تھا۔

☼ ☼ ☼

اپنا کچھ ضروری سامان منگوانے کے لیے زر نے گھر کال کی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ سیما گل سے کہہ کر وہ چیزیں پیک کروائے گی اور ڈرائیور اسے وہ چیزیں ممی کے گھر دے جائے گا۔

بیل جا رہی تھی۔ مگر کوئی ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ اس نے ایک دفعہ پھر کیا۔ اب کی بار فون ریسیو ہو گیا۔

"ہیلو!" وہ نرم سی آواز سیما گل کی نہیں تھی۔ بے ساختہ وہ خاموش ہوئی تھی۔ "آپ کون؟"

"مسز مجتبیٰ اسپیکنگ۔" یہ الفاظ نہیں تھے۔ الٹے ہاتھ کا وہ تھپڑ تھا جو بہت زور سے اس کے منہ پہ پڑا تھا۔ اس کا خون ابل پڑا۔ ریسیور پر اس کے ہاتھ کی گرفت مضبوط ہوئی۔ دوسری طرف سے زرمینے کچھ کہہ رہی تھی۔ مگر وہ اب بھلا کیسے کچھ سن سکتی تھی۔

اس گھر میں۔ یہ تعارف صرف۔ زر کے لیے تھا مگر اب۔ شدت سے سرخ ہوتے منہ کے ساتھ اس کی ہاتھ کی گرفت مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ اور پھر۔ اس نے پوری قوت سے ریسیور کو دور پھینکا تھا۔

شاک غم میں بدلا تھا۔ غم غصے میں اور اب وہ آنکھوں سے بہہ رہا تھا۔

"اتنی آسانی سے میں تمہیں اپنی زندگی برباد نہیں کرنے دوں گی۔" وہ روتے روتے بڑبڑائی۔

"مسز مجتبیٰ اسپیکنگ۔"

"تو میرے چلے جانے سے اسے کوئی فرق نہیں پڑا۔ میں نہیں تو کیا ہوا۔ لے آیا نا اپنی "خاندانی بیوی" کو۔" روتے روتے یک دم اس پہ "خاندانی بیوی" کا مطلب بہت اچھی طرح سے واضح ہوا تھا۔

"تو کیا واقعی میں اس کے لیے چند دن کی انجوائے منٹ تھی۔"

اس کے دل پہ رکھ کر کسی نے گھونسا مارا تھا۔ ایسی تکلیف تھی کہ سانس آنا بند ہو جائے۔

☼ ☼ ☼

"آپ نے پھر سے سگریٹ پینا شروع کر دیا ہے خان؟" وہ نڈھال سی آواز میں بولی۔ "زر منع کرتی آپ کو۔"

"میں نے اس کے سامنے سگریٹ پی ہی کب ہے۔" بے ساختہ اسے خیال آیا تھا۔

اسلام آباد میں گل فراز کا آفیشل ڈیرہ تھا۔ اسی دوران اچانک زرمینے کی طبیعت بگڑی تھی۔ وہ شاید فوڈ پوائزن کا شکار ہوئی تھی۔ سے چکر آنے کے ساتھ مسلسل الٹیاں بھی ہو رہی تھیں۔

وہ اسے ساتھ لے کر گھر آگیا تھا۔ ورنہ وہ ہوٹل میں ٹھہری تھی۔ مجتبیٰ نے جیسے زرمینے کی بات سنی ہی نہیں تھی۔ وہ سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے نمبر ڈائل کرتے ہوئے باہر چلا گیا تھا۔ اسی دوران لینڈ لائن فون کی بیل بجی تھی۔ زرمینے نے اٹینڈ کیا مگر آگے سے کسی نے جواب ہی نہیں دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ غور کرتی یا پھر سی ایل آئی سے نمبر چیک کرتی مجتبیٰ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانے کے لیے آچکا تھا۔

اور پھر وہ اپنی خراب طبیعت کے باعث یہ بات بھول گئی تھی کہ کسی کی کال آئی تھی۔

"خان صاحب۔ یہ فوڈ پوائزن نہیں ہے۔ بہتر یہ ہے کہ آپ پریگنینسی ٹیسٹ کروا لیں۔ بلکہ اسی

ہسپتال میں ڈاکٹر مصباح کو ریفر کرتا ہوں۔" معائنہ کرنے کے بعد ڈاکٹر نے مجتبیٰ سے کہا۔

اس جواب پہ ان دونوں نے حیران ہو کر ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ انہوں نے دوسرے بچے کا ابھی نہیں سوچا تھا۔

ڈاکٹر مصباح نے اسے کچھ ٹیسٹ کروانے کو کہا زرمینے کی حالت کو دیکھ کر وہ اندازہ کر سکتا تھا کہ رپورٹ پوزیٹو ہی ہو گی۔ وہ زر کی وجہ سے اتنا الجھا ہوا تھا کہ اس وقت اپنی کیفیت خود بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

"زر آ نہیں گئی ہوئی ہے کیا؟" زرمینے نے اچانک پوچھا تھا۔ گاڑی چلاتے ہوئے گاڑی کو ایک جھٹکا لگا۔

پہلا سوال۔ اور پھر بہت سے سوالات۔ سب کو خبر ہو جائے گی وہ جسے بہت شوق سے بیاہ کر لایا تھا۔ کیا کرنے والی تھی۔ وہ خاموش رہا تھا۔

"آپ کو خوشی نہیں ہوئی؟" چند لمحوں کی خاموشی کے بعد زرمینے نے دوبارہ سوال کیا۔ اسے مجتبیٰ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔

"حیرت زیادہ ہے مجھے۔ ابھی تو عبدل بہت چھوٹا ہے اور اب۔"

"جس کا آنا طے ہو چکا ہو۔ اس کو آنے سے میں یا آپ روک نہیں سکتے۔ اللہ کے کاموں میں انسان بھلا کیسے دخل دے سکتا ہے۔"

زرمینے کے کہنے پہ مجتبیٰ نے سر ہلایا تھا۔

"گھر لے چلوں؟"

"نہیں۔ ہوٹل میں ٹھہروں گی۔"

مجتبیٰ نے اس بات کا جواب بھی نہیں دیا تھا۔ وہ اب خاموشی سے گاڑی چلا رہا تھا۔ اس کی پیشانی پہ کئی بل تھے۔

☼ ☼ ☼

انہوں نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے اسے دیکھا۔ وہ لان میں پڑی کرسی پہ دونوں پاؤں اوپر کر کے بیٹھی تھی۔ دور سے وہ انہیں سانس لیتی ہوئی بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ وہ اتنی ہی ساکت تھی۔

"بے وقوف لڑکی! ابھی تک سوگ منا رہی ہے کیا؟" بڑبڑاتے ہوئے وہ وہاں سے ہٹیں۔ اس کی نظریں گھٹنوں کے گرد بندھے اپنے ہاتھوں پر تھیں اور پلکیں جھپکائے بنا انہیں دیکھ رہی تھی۔

"زر کیا ہوا؟ کیوں اس طرح سے بیٹھی ہو۔" اس کے قریب جا کر اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے افشین نے بے حد پیار سے کہا تھا۔ زر کی نظروں کا ارتکاز ٹوٹا اور اس نے خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھا۔

"کوئی نئی بات ہوئی کیا؟"

"گھر کال کی تھی؟" تھوڑی دیر بعد وہ آہستہ سے بولی۔

"پھر؟" افشین بہت گہری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"مما!" وہ رونے لگی۔ "آپ ٹھیک تھیں۔ آپ بالکل ٹھیک تھیں۔ میری خوب صورتی اس طرح عذاب نہیں بنی تھی کبھی جس طرح یہ اب عذاب بن گئی ہے۔" وہ سسکیوں کی وجہ سے صحیح طرح سے بات نہیں کر پا رہی تھی۔

"میں اسے پسند آئی۔ اس نے سوچا کہ ویسے تو میں اس کے ہاتھ نہیں آؤں گی۔ آپ سے تعلقات بھی خراب ہوں گے۔ تو ایسے ہی سہی۔ میں نہیں تو کیا ہوا؟" نظریں ابھی تک ہاتھوں پہ تھیں اور آنسوؤں کے قطرے مسلسل ان پر گر رہے تھے۔

"لے آیا وہ اپنی بیوی کو میرے گھر۔" اس کی ہچکیاں تیز ہو گئیں۔

"اف۔ میری جان! بس کرو، بس کرو زر! تکلیف ہو رہی ہے مجھے۔ تمہیں اس طرح دیکھ کر۔" اسے اپنے ساتھ لگائے ہوئے بولی تھیں۔

مگر اس کا رونا بند ہی نہیں ہو رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

زر کی وجہ سے انہیں پہلے ہی دیر ہو چکی تھی۔ آج

شام انہیں ایک پارٹی میں جانا تھا۔ حیدر کے ایک بہت قریبی دوست کے بیٹے نے تاپ کیا تھا۔

حیدر تو ابھی پاکستان میں تھے نہیں۔ سو انہیں جانا پڑا تھا۔ علی رضا کی فیملی سے ان کی اچھی جان پہچان تھی۔ ابھی بھی مسز علی ان کو لوگوں سے ملوا رہی تھیں۔

"مسز افیشن۔ آپ حیران ہوں گی جب میں ان کا تعارف آپ سے کراؤں گی۔" اس بات پہ افیشن نے مسکرا کر مسز علی کو دیکھا۔

"آپ کی پارٹی کے ہیں نا نذیر بلوچ صاحب۔ یہ ان کی ہمشیرہ۔ ڈاکٹر مصباح ہیں۔"

"اوہ۔ نائس ٹو میٹ یو۔" انہوں نے بڑی گرم جوشی سے ڈاکٹر صاحبہ سے ہاتھ ملایا تھا۔

"آپ ہمیں نہیں جانتیں تو کیا ہوا؟ ہم تو جانتے ہیں نا آپ کو۔" ڈاکٹر صاحبہ نے بھی گرم جوشی سے جواب دیا۔

مسز علی رضا معذرت کرتے ہوئے وہاں سے ہٹ گئی تھیں۔

"آپ کی بیٹی کی طبیعت کیسی ہے اب؟ اس دن تو کافی خراب تھی اس کی طبیعت۔"

اچانک ڈاکٹر مصباح نے پوچھا مسز افیشن نے چونک کر حیران ہوتے ہوئے انہیں دیکھا تھا۔

"زر؟ اسے کیا ہوا تھا؟ کب آئی تھی وہ آپ کے پاس؟" بے ساختہ انہوں نے کہا۔ سیاست میں ان کی دلچسپی کے ساتھ ساتھ معلومات بھی صفر تھیں۔ وہ بس اتنا جانتی تھیں کہ مجتبیٰ ان کا داماد تھا۔ اب ان کی بیٹی زر تھی یا زرمینے۔ یہ وہ نہیں جانتی تھیں۔ انہوں نے سوچا زر تک ہی ہوگا۔

"زرمینے پریگننٹ ہے نا۔ مجھے تو آپ کا سَن اِن لاء کچھ پریشان سا لگا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ پریگیننسی اس کے لیے اچانک سی خبر والی بات تھی۔ شاید انہوں نے ابھی بےبی پلان نہیں کیا تھا۔"

زیادہ بولنے والی عورتیں ہمیشہ کانوں کے لیے عذاب ہی نہیں ہوتیں۔ جیسے اس وقت ڈاکٹر مصباح کا زیادہ بولنا۔ افیشن کے کانوں کو بہت اچھا محسوس ہو رہا تھا۔

"دونوں کی شادی کو ابھی عرصہ ہی کتنا ہوا ہے۔" اب کہ افیشن نے مسکرا کر کہا تھا۔

"اب کیسی ہے وہ؟" "نہیں جیسے پھر سے یاد آیا تھا۔

"ہاں۔ ٹھیک ہے۔ بالکل ٹھیک۔"

اور اب ڈاکٹر مصباح مسز افیشن کے سامنے وہیں پہ اپنا گائنی کلینک کھول کر بیٹھ گئی تھیں۔

اور اب ان کا بولنا افیشن کے کانوں کے لیے واقعی ہی عذاب ثابت ہو رہا تھا۔

✡ ✡ ✡

"زر۔ زرمینے از پریگننٹ۔"

ان کا خیال تھا کہ وہ ہمیشہ کی طرح رونا دھونا شروع ہو جائے گی مگر وہ حیرت انگیز طور پر خاموش تھی اور انہیں دیکھ رہی تھی۔

دکھ، درد، تکلیف، رنج، غم یا پھر غصہ؟

وہ ان میں سے کچھ بھی محسوس نہیں کر پا رہی تھی۔ جو واحد احساس تھا۔ وہ توہین کا تھا۔

اسے بے ساختہ وہ دن یاد آیا جب مجتبیٰ کی ماں نے اسے واضح کیا تھا کہ مجتبیٰ کی خاندانی بیوی کون تھی؟

"وہ۔ زرمینے۔ اس کی خاندانی بیوی۔ اور میں؟ ہمیں کیا تھی۔ اتنا عرصہ وہ سمجھ۔"

اک جھٹکے سے وہ اٹھی۔ زور سے کرسی کو پیچھے دھکیلا اور پھر وہ اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔

مسز الشمن نے اسے جاتے دیکھا۔ ایک گہرا سانس بھرا اور ایک دفعہ پھر کھانا کھانے میں مصروف ہو گئیں۔

مرد ہر چیز کو خریدنے کی کوشش کرتا ہے۔ چاہے وہ کوئی معمولی چیز ہو یا پھر عورت۔ اگر عورت بکاؤ نہ ہو تو تب وہ ہر وہ حربہ استعمال کرتا ہے۔ جس سے عورت کو بے وقوف بنایا جا سکے۔

وہ اپنے کمرے میں بیٹھ کر رو نہیں رہی تھی۔ وہ اس اک بات کو سمجھنے کی اپنی پوری کوشش کر رہی تھی۔

"کیسے بناتا ہے ایک مرد عورت کو بے وقوف۔ دولت سے، وجاہت سے اور محبت سے۔"

اور مجتبیٰ۔ اس نے کسی ایک چیز کا نہیں ان تینوں کا استعمال کیا تھا۔

"نہیں وہ مجھے پاگل تو نہیں کھلا تا رہا۔" اچانک ایک سر کا ہوا تھا اور بے ساختہ اسے یاد آیا۔ وہ اتنی محبت سے جوس پلانا، زبردستی دودھ کے گلاس دینا، اس کے کھانے کا اتنا خیال کرنا اور سیماگل؟

"اوہ۔ میرے خدا۔" اس نے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا تھا۔ سیماگل۔ وہ تو جیسی تھی اس کی۔ پل پل کی خبر دیتی تھی اس کو۔

اس کا دل ڈوب رہا تھا اور ذلت کا سا احساس ابھر رہا تھا اور ذلت، نفرت کو جنم دے رہی تھی۔

اس کے غصے کا گراف بلند ہو رہا تھا اور پھر طیش سے آگے پیچھے ٹہلتے ہوئے یکدم وہ ساکت ہو گئی تھی۔ اس کی نظر بہت اچانک آئینے پہ پڑی تھی۔ وہ اٹھی اور اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھی۔

اس آئینے نے ہمیشہ اسے یہ ہی بتایا تھا کہ وہ سب سے خوب صورت۔ سب سے حسین ہے۔ اس کے آئینے نے اسے یہ کیوں نہیں بتایا تھا کہ وہ خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ بے وقوف بھی ہے۔

اور پھر اس نے آئینے میں خود کو وہاں پڑا گلدان اٹھاتے دیکھا اور پھر اس کے بعد۔ اس کے بعد وہ کوئی عکس دیکھ نہیں پائی تھی۔ آئینہ کرچی کرچی ہو چکا تھا اور وہ کرچیاں اس کے اندر پیوست ہو چکی تھیں۔

✡ ✡ ✡

حکومت اپنے پانچ سال مکمل کرنے والی تھی اور اس کے لیے جیسے مصروفیات کا ایک نیا دور شروع ہو چکا تھا۔ الیکشن سر پہ تھے۔ جلسے۔ جگہ جگہ ترقیاتی فلاحی منصوبوں کا افتتاح۔ مختلف شہروں کے دورے، ٹاک شوز، اس کے حلقے میں آنے والے عوامی مسائل وغیرہ وغیرہ۔ اس کی ایک، دو میٹنگز۔ کچھ بزنس کے معاملات کے بعد ذکا نے اسے آج رات ہونے والے ایک ڈنر کا بھی بتایا تھا۔

یہ ڈنر ملک سلطان کے فارم ہاؤس پر تھا۔ ملک سلطان بزنس ٹائیکون تھا۔ جس کے بہت سے سیاسی شخصیات کے ساتھ بہت گہرے مراسم تھے۔ اور ایسے مراسم جو کہ برے وقت میں بہت کام آتے تھے عموماً اسے دو مخالف سیاسی پارٹیوں کے درمیان پل بنانے کا ماہر سمجھا جاتا تھا اور عموماً وہ ڈبل کراس کا کام بھی کرتا تھا۔

"کیوں رکھا ہے اس نے یہ ڈنر؟"

"اس کا گھوڑا ڈربی ریس میں پہلے نمبر پہ آیا ہے اور سننے میں آیا ہے کہ سنگاپور کے کسی کیسینو میں جوا بھی جیتا ہے۔ اس نے۔" ذکا مسکراتے ہوئے بولا تھا۔

"ظاہر ہے اب جشن تو بنتا ہے اس بلڈی ملک کا۔" مجتبیٰ نے تبصرہ کیا۔

"ایک خبر ہے۔"

"ہوں۔ بولو۔" اس نے سگریٹ کا کش لیا۔

"زلیخا بی بی بھی اس ڈنر پہ انوائیٹڈ ہیں۔" ذکا نے بہت آہستگی سے کہا تھا۔ مجتبیٰ بری طرح سے چونکا۔

"اس کے علاوہ آج کل وہ ہر اس جگہ مسز الشمن ملک کے ساتھ ہوتی ہیں، جہاں پر انہیں نہیں ہونا چاہیے۔" مجتبیٰ نے سگریٹ کا گہرا کش لیا۔

"اور بہت اندر کی خبر یہ ہے کہ وہ چند دنوں میں آپ کی مخالف پارٹی جوائن کرنے والی ہیں۔"

وہ یکدم اتنا خاموش ہو گیا تھا کہ ذکا کو وہاں بیٹھنا ٹھیک نہیں لگا تھا۔ وہ اٹھا اور اپنی چیزیں سمیٹ کر چلا گیا تھا۔ مجھے اس عورت کو اٹھا کر کسی تہ خانے میں بند کر دینا چاہیے تھا۔ یہ اس سے بہتر تھا کہ وہ اپنی ماں کے گھر جاتی۔ پہلا خیال یہی آیا تھا اسے۔

مگر یہ بات تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ زر ایسا کر سکتی ہے۔ وہ اس حد تک بھی جا سکتی ہے۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس کا اور زر کا تعلق اتنا مضبوط تھا

کہ کوئی تیسرا ان کے درمیان نہیں آسکتا تھا۔ مگر وہ کتنا غلط تھا۔ یہ اس وقت وہاں بیٹھے بیٹھے اس کی سمجھ میں آگیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"یہ کیا تماشا ہے زر! تم اپنی ماں کی پارٹی جوائن کررہی ہو۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ تمہارے شوہر کی مخالف پارٹی ہے۔ یوں چھوٹی چھوٹی باتوں کو لے کر کوئی اس طرح سے بھی اپنا گھر برباد کرتا ہے کیا؟"

حیدر کل رات واپس آئے تھے اور آج ہمیشہ کی طرح اپنے اسٹڈی روم میں بیٹھے اس سے سوال جواب کررہے تھے۔ اسے ان کے غصے کی پروا تھی اور نہ ہی وہ ان کی باتوں کو سنجیدہ لے رہی تھی۔

"کس نے بتایا ہے آپ کو؟"

"مجتبیٰ نے۔"

"یقیناً" اس گھر میں اس کی بات سننے والے صرف آپ ہی ہیں۔" اس کے لہجے میں طنز تو تھا ہی مگر اس سے کہیں زیادہ نفرت بھی تھی۔

تم اپنے الفاظ کی درستی کرلو کہ اس گھر میں اس کی بات "سننے والا" نہیں "سمجھنے والا" یقیناً "میں ہی ہوں۔"

ان کی اس بات پر زر نے سنجیدہ نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔

"میرے خیال میں اپنی بیوی کو شاپنگ پہ لے جانا کوئی اتنی بڑی بات ہے۔" زر کو اب ان کے انداز پہ غصہ آنے لگا تھا۔

"مگر یہ اس وقت ضرور بڑی بات بن جاتی ہے جب اپنی دوسری بیوی کو اس بات سے بے خبر رکھا جائے۔" اس کا لہجہ تیز ہوا تھا۔

"وہ کم آن زر! اب اس پر فرض تو نہیں ہوگیا ناکہ اسے چھینک بھی آئے تو پہلے وہ تمہیں بتائے۔ کیا تمہیں وہ شاپنگ نہیں کرواتا؟ اور کیا تب وہ اپنی پہلی بیوی کو انفارم کرتا ہے؟"

مجتبیٰ کی طرح انہوں نے بھی اس کی بات ہوا میں اڑایا تھا۔

"اس نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ وہ آپ کی بیٹی کو مارتا بھی ہے اور جب میں اپنے گھر کال کرتی ہوں تو آگے سے اس کی پہلی بیوی جواب دیتی ہے اور اس سے بڑھ کر یہ ڈیڈی! زرمینے از پریگنینٹ اینڈ وہ بھی میں؟" حیدر صاحب بے ساختہ سیدھے ہو کر بیٹھے تھے۔

"زر! مسئلے کو یوں مت الجھاؤ۔ مجھے اس سے بات تو کرنے دو پھر۔"

"آپ کو بات کرنی ہے شوق سے کریں۔ میں تو فیصلہ کرچکی ہوں اسے مخفی آپ کے کہنے پر چھوڑنے والی نہیں۔ اسے سمجھ میں آجائے گی کہ اس نے کس کی زندگی سے کھیلنے کی کوشش کی ہے۔"

"زر! اتنی انتہا پہ مت جاؤ۔ بیٹھ کر بات تو کرو۔ اس کی سنو تو سہی یوں۔"

"نہیں ڈیڈی! اب کوئی بات نہیں ہوگی۔ میں اس شخص کی کوئی بات نہیں سننے والی۔ آپ مجھے مجبور نہیں کریں گے۔" حیدر نے حیرت سے اسے اٹھ کر جاتا دیکھا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ اس پریس کانفرنس کو دیکھ رہا تھا جس میں زر مسز الفشین ملک کی پارٹی کو جوائن کرنے کا اعلان کررہی تھی۔ لائیو کوریج چل رہی تھی۔ اس کے ساتھ مسز الفشین کے علاوہ اس سیاسی پارٹی کے اعلا عہدیداران بھی موجود تھے۔ ایسا کیا کیا تھا اس نے جو وہ اس حد تک چلی گئی تھی۔ وہ بہت مسکرا مسکرا کر پوچھے جانے والے سوالات کا جواب دے رہی تھی اور پھر اس نے ذرا سا پیچھے ہو کر ایک مرد عہدیدار سے کان میں کچھ کہا تھا۔

مجتبیٰ نے بھینچے ہوئے جبڑوں کے ساتھ پلازمہ اسکرین سے نظریں ہٹائی تھیں اور پھر چینلز پہ چینلز ... نے کے باوجود بھی وہ چہرہ نہیں بدلا تھا۔ وہ ہر طرف ... تھی۔ وہ ایک پختون کے ضبط کو آزما رہی تھی ... سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ اس نے ٹی وی بند ...

... ہر دوسرے ٹاک شو میں وہ موجود ہوتی تھی۔ اور ہر دوسرے دن ہی کسی نہ کسی اخبار میں مجتبیٰ اور سردار اجمل خان کے خلاف کوئی نہ کوئی پھلجھڑی موجود ہوتی تھی۔ بیان بازی کرنے میں اس نے اپنی ذاتی زندگی کو بھی نہیں چھوڑا تھا۔ جتنا کوئی کسی کو زچ کرسکتا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ کررہی تھی۔

وہ مجتبیٰ کو ذلیل کرنا چاہتی تھی سو وہ کررہی تھی۔ اور میڈیا۔ اسے تو جیسے بہانہ چاہیے۔ کوئی نیا موضوع ہاتھ لگنا چاہیے بس۔ اس کی شادی شدہ زندگی کے حوالے سے ہر روز ایک نئی افواہ اس کی منتظر ہوتی تھی۔

ان دونوں کے بارے میں خبریں بریکنگ نیوز کے طور پر چلا کرتی تھیں۔ مجتبیٰ کو اس نے کہیں منہ دکھانے کے لائق نہیں چھوڑا تھا مگر عجیب بات تھی۔ مجتبیٰ اس کے الزامات، اعتراضات کے جواب میں نہ تو تردید کرتا تھا اور نہ ہی تصدیق۔

زر اس کے خاندان اور پارٹی کی دھجیاں ادھیڑنے میں مشغول تھی۔ یہ مسز الفشین ملک کے اثر ورسوخ کا کمال تھا اور کچھ زر کی اپنی کارکردگی جو کہ اسے اتنی جلدی پارٹی کا ٹکٹ آلاٹ کرنے والی تھی اور آنے والے الیکشن میں وہ سردار اجمل خان کی پارٹی کے امیدوار کے خلاف الیکشن لڑنے والی تھی۔ آخر کو وہ مخالف پارٹی کی بہو تھی۔

الفشین ملک کی خوشی کا تو جیسے کوئی ٹھکانہ ہی نہیں تھا۔ آخر کو ان کا کھوٹا سکہ کھرا نکلا تھا۔

ان کا سیاسی کیریر تباہ ہونے سے بچ گیا تھا۔ باقی اس کے لیے کیا کچھ برباد ہوا تھا اور کیا کچھ برباد ہونے والا تھا اس کی پروا کسے تھی۔

☆ ☆ ☆

"تمہیں معلوم ہے کہ نیازی خاندان کی بہو نے آج کل پرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا پہ کیا تماشے لگا رکھے ہیں؟"

اس نے اپنے باپ کو آج سے پہلے کبھی اتنے غصے میں نہیں دیکھا تھا۔

"تم نے کیا چوڑیاں پہن لی ہیں مجتبیٰ خان نیازی؟" وہ ان کے اس گرج دار سوال پہ بھی خاموش تھا اور اس کا سر جھکا ہوا تھا۔

"اس طرح چپ رہنے سے تو بہتر ہے کہ اپنے چہرے پر وہ چیز بھی تھوپ لو تاکہ ان لوگوں کے ساتھ کھڑے ہو سکو جو اسلام آباد کے ہر چوک پر بھیک مانگتے نظر آتے ہیں۔"

ان کے اس طرح کہنے پر اس کا چہرہ سرخ ہونٹ بھینچ گئے تھے اور ہاتھ میں موجود بال پوائنٹ دو حصوں میں تقسیم ہوا تھا مگر سر اس نے ابھی بھی نہیں اٹھایا تھا۔

"تم کیا سمجھتے ہو میں اسے یہ سب کرنے دوں گا۔ سائن کرو ان پیپرز پہ۔" انہوں نے کچھ صفحات اس کے سامنے پھینکے۔

"میں اسے طلاق نہیں دوں گا۔" ان پیپرز کو دیکھے بغیر وہ اجمل خان کے چہرے کو براہ راست دیکھتے ہوئے بولا تھا۔ سردار صاحب کے چہرے پہ سخت برہمی کے آثار پیدا ہوئے تھے۔

"بہت اچھا۔ مت دو۔ میں جانتا ہوں اس کا منہ کیسے بند کروانا ہے۔ چاہے اس کے لیے مجھے اس کا منہ ہمیشہ کے لیے ہی کیوں نہ بند کرنا پڑے۔" وہ یقیناً دھمکی ہی تھی۔ اپنی بات کہہ کر وہ جانے کے لیے مڑے تھے۔

"اگر اسے کچھ ہوا نا بابا جان۔ تو اتنا یاد رکھیے گا کہ میں زرمینے کو بھی نیازی خاندان کی بہو نہیں رہنے دوں گا اور پھر چاہے میں چوڑیاں پہنوں یا اسلام آباد کے چوک پر چہرہ رنگین کرکے بھیک مانگوں۔ مجھے پروا نہیں ہوگی۔"

وہ جاتے جاتے رک گئے تھے اس کا لہجہ تھا ہی اتنا سنگین اور سخت۔ وہ اپنی سیٹ سے اٹھا اور ان کے سامنے آکر کھڑا ہوا۔

"آپ کیا سمجھتے ہیں مجھے پتا نہیں تھا۔ میں شروع دن سے آپ کے پلان سے واقف تھا۔ سخاوت کو منسٹری صرف اور صرف الفشین ملک کو چڑانے اور بددل کرنے کے لیے دلائی گئی اور اس کے بعد الفشین ملک نے وہی کیا جس کی آپ کو ان سے توقع تھی۔ سو آپ کے منصوبے کے حصے بڑی کامیابی سے پورے ہوتے گئے۔ میری غلطی اتنی کہ میں نے زر کو ان سب چیزوں سے دور رکھا۔ اگر میں پہلے دن ہی اسے یہ سب بتا دیتا تو وہ اپنی ماں کے ہاتھوں یوں بے وقوف نہ بنتی۔"

اجمل صاحب حیران ہوئے تھے۔ انہیں کوئی پروا نہیں تھی کہ وہ ان کی منصوبہ بندی سے آگاہ تھا یا نہیں۔

"تمہیں اتنی بے وقوف بیوی سوٹ نہیں کرتی مجتبیٰ!"

"اس سے آپ کو کیا فرق پڑتا ہے؟" ان کے طنز کے جواب میں مجتبیٰ نے سوال کیا تھا۔

"برا آپ نے افشین ملک، زریا زبیر کے ساتھ نہیں کیا بابا جان! آپ نے میرے ساتھ کیا۔" جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ ان کے سامنے کھڑا بول رہا تھا۔

"بہرحال! آپ کو جو کرنا ہے کیجیے۔ نتائج کے ذمہ دار آپ ہوں گے۔ میں نہیں۔" وہ کہہ کر دوبارہ اپنی سیٹ کی طرف چلا گیا تھا۔ سردار صاحب نے بہت غصے سے اسے دیکھا تھا۔ "تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟" وہ نسبتاً "اونچی آواز میں بولے۔

"کہہ سکتے ہیں۔" پرسکون انداز میں جواب آیا۔

"مجتبیٰ خان! وہ عورت دردِ سر بن چکی ہے تم کسی بات کی تصدیق کرتے ہو نہ تردید۔ اس طرح تو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا پارٹی کو۔۔۔" بے اختیار ان کا لہجہ دھیما ہوا۔

"بعض سر درد ایسے بھی ہوتے ہیں جو کہ لاعلاج ہیں۔ اب کیا کر سکتے ہیں بابا جان!" اس کا انداز صاف جتانے والا تھا۔ اس جواب پر سردار صاحب تیز نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ وہ بہت غصے میں ان کے آفس سے نکلے تھے۔ اب ایک ہی حل [illegible] کسی دن میڈیا پہ یہی چلتی تھی کہ نامور سیاست دان کی بیٹی زر مجتبیٰ نامعلوم افراد کی فائرنگ سے [illegible] ہو گئیں۔

☼ ☼ ☼

اتنا کچھ ہو جانے کے بعد زر نے مجتبیٰ سے طلاق لینے کا کیس فائل نہیں کیا تھا تو اس کے پیچھے مسز افشین ملک کی حکمت عملی تھی۔ مجتبیٰ اور اس کا خاندان اتنا بدنام تب نہ ہوتا جب زر مجتبیٰ سے طلاق لینے کے بعد سیاست میں آتی۔ وہ اب زیادہ بدنام ہو رہا تھا۔

اوپر سے میڈیا میں مسز افشین نے یہ مشہور کر رکھا تھا کہ مجتبیٰ زر کو حق مہر کی وجہ سے طلاق نہیں دے رہا تھا جو کہ بہت زیادہ تھا۔

اور مجتبیٰ!۔۔۔

اس نے سیکریٹری اطلاعات کو یہی ہدایات دے رکھی تھیں کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے جواب میں اس کی یا اس کی پارٹی کی طرف سے کوئی تردید یا تصدیق نہیں آئے گی۔ جو کچھ بولتی ہے۔ اسے بولنے دیا جائے۔ یہ فیصلہ کتنا صحیح یا غلط تھا۔ محبت یہ سب کہاں دیکھتی ہے۔ پارٹی ممبرز اس فیصلے پہ پریشان سے زیادہ حیران تھے اور پھر سیکریٹری اطلاعات کی ہدایات پر پارٹی ممبران میڈیا میں یہی کہتے تھے کہ زر کی باتیں اور الزامات اتنے بوگس اور فضول ہیں کہ وہ ان کا جواب دینا یا پھر تصدیق و تردید کرنا بھی پسند نہیں کرتے۔

اس طرز عمل نے زر کو اور بھڑکایا تھا۔

اس کی بیان بازی میں اور تیزی آئی تھی اور پھر یقیناً" سردار صاحب کا مجتبیٰ سے ایک اور ٹھیک ٹھاک قسم کا جھگڑا ہو جاتا۔ مگر اب کہ جو خبر سامنے آئی تھی۔ وہ

[..]ند کروانے کے لیے کافی تھے۔

مجتبیٰ سے ان کے سابقہ تنازعہ کے بارے میں ایک چینل پہ خبر چلی تھی۔ نہ صرف خبر چلی تھی بلکہ اس کی ویڈیو بھی حاصل کر لی گئی تھی اور اب ایک نیوز چینل پہ وہ ٹیپ بار بار چل رہی تھی۔ اگر کوئی اور ہوتا تو یوں اتنے اندر کے معاملات کی تشہیر دیکھ کر ضرور حواس باختہ ہوتا مگر وہ ایک سیاست دان تھے۔ البتہ وہ پریشان ضرور ہوئے تھے۔ انہوں نے مجتبیٰ سے کہا تھا کہ وہ پتا کروائے کہ اس کے پیچھے کس کا [illegible] اور بند کمرے میں ہونے والی باتیں کیسے سرعام [illegible] دی تھیں؟

ان کا بی پی شوٹ کر گیا تھا۔

مجتبیٰ نے انہیں یقین دہانی کروائی تھی کہ وہ ضرور پتا کروائے گا۔ مگر اس کی یہ بات صرف یقین دہانی تک ہی محدود تھی۔ فی الوقت اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ بھی ایسی صورت میں جبکہ اسے پتا تھا کہ یہ کس کا کام تھا۔

☼ ☼ ☼

"زرمینے زر کی غیر موجودگی میں اس کے گھر میں کیا کر رہی تھی مجتبیٰ؟" بلا تمہید انہوں نے مجتبیٰ سے پوچھا۔

"اسے کیسے معلوم ہوا؟" وہ حیران ہوا۔

"فون کیا تھا اس نے۔ آگے سے تمہاری وائف نے اٹینڈ کیا۔"

"زر کو تمہاری فرسٹ وائف کے پریگننٹ ہونے کا بھی معلوم ہے۔ اسی لیے وہ یوں ری ایکٹ کر رہی ہے۔ اس کے خیال میں تم نے اسے صرف۔۔۔" وہ یک دم بات کرتے کرتے رک گئے تھے۔ ادھوری بات۔۔۔ واضح مطلب۔۔۔ اور مجتبیٰ۔۔۔ اسے جیسے کرنٹ لگا تھا۔

"اسے یہ بات کس نے بتائی؟" "[..]ے بی! تمہاری وائف نے بتائی ہو۔" حیدر ملک نے خدشہ ظاہر کیا۔

"زرمینے؟ نہیں وہ ایسا نہیں کر سکتی۔" وہ پورے یقین سے بولا۔

"کم آن مجتبیٰ! ان عورتوں سے کچھ بھی توقع رکھی جا سکتی ہے۔ ممکن ہے جیلسی میں آ کر۔"

"میں زرمینے کو جانتا ہوں۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "گھر والوں کے علاوہ جس کو علم تھا۔ وہ ڈاکٹر صاحبہ ہیں۔"

اس نے فوراً "ڈکا" کا فون کر کے ان ڈاکٹر صاحبہ کا پتا لگوانے کو کہا تھا۔ اور چند لمحوں بعد سارا معاملہ یوں سلجھا تھا جیسے کہ ریشم کے الجھے ہوئے دھاگوں کا وہ سرا ہاتھ میں آجائے۔ جس کے کھینچنے سے سارا گچھا ہی سلجھ جاتا ہے۔ وہ زبیر بلوچ کی ہمشیرہ تھیں۔

"آپ ان عورتوں سے کچھ بھی توقع کر سکتے ہیں۔ خاص طور پر ایسی عورتیں جن کا کام ہی سیاست ہو۔"

اس نے ان ہی کی بات لوٹائی تھی۔ اس کا اشارہ افشین کی طرف تھا۔ وہ چپ ہوئے۔

"تو تم اب کیا کرو گے؟" چند لمحوں کی خاموشی کے بعد حیدر صاحب نے پوچھا۔

"اصولاً" تو مجھے اسے طلاق دے دینی چاہیے۔"

اس کے جواب پہ حیدر صاحب بے اختیار چپ ہوئے تھے۔

"تو تم اسے طلاق دے دو گے؟" تھوڑی دیر بعد ایک گہرا سانس بھر کر جیسے انہوں نے خود کلامی کی تھی۔ ان کی اس بات پہ بے ساختہ مجتبیٰ ہنسا تھا۔ انہوں نے حیرت اور ناگواری سے اسے دیکھا۔

"اگر یہ کام کرنا ہوتا تو کب کا ہو چکا ہوتا۔" مجتبیٰ نے جیسے ان کی حیرت دور کی تھی۔

"تو پھر؟"

"بظاہر ایسا لگتا ہے کہ عشق و محبت جیسے الفاظ ہم لوگوں کے لیے بے معنی ہوتے ہیں۔ ہماری کمزوری کرسی ہوتی ہے۔ ہم اپنی زندگیاں تک داؤ پہ لگا دیتے ہیں اس کے لیے مگر حقیقت یہ ہے کہ ہم انسان ہی ہوتے ہیں اور دل کے ہاتھوں مجبور بھی ہوتے ہیں۔

جس طرح سے آج مجتبیٰ خان ہوا بیٹھا ہے۔ کیا کوئی اور وجہ چاہیے؟" اس نے سوال کیا تھا اور حیدر ملک چپ رہ گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

اس وقت ملک کے ایک مشہور سیون اسٹار ہوٹل کے کمرے میں ایک انتہائی اہم میٹنگ چل رہی تھی۔ وہ دبئی کی حکومت کے ایک اعلا عہدیدار کا اہم نمائندہ تھا جو پاکستان میں کچھ سیاسی شخصیات سے اہم ملاقاتوں کا شیڈول طے کرنے آیا تھا۔

مسز افیشن کے دبئی حکومت کے اس اعلا عہدیدار سے گہرے مراسم تھے اور اس وقت اس کمرے میں اس نمائندے کے ساتھ کون میٹنگ کر رہا تھا؟

وہ زر مجتبیٰ خان تھی۔ اور دبئی میں اس اعلا حکومتی عہدیدار سے ملنے بھی وہ ہی جانے والی تھی۔ وہ انتہائی خوب صورت تھی اور خوب صورتی عرب شیوخ کی بڑی کمزوری ہوتی ہے۔۔۔ اس کارڈ کو استعمال کرکے مسز افیشن ملک اپنے بہت سے الو سیدھے کرنے والی تھیں۔ وہ جیسے ہی میٹنگ ختم کرکے کیپسول لفٹ سے نیچے آئی تھی۔ اچانک ایک طرف سے سیاہ پینٹ کوٹ میں ملبوس ایک شخص آیا تھا۔ اس نے ایک تہہ شدہ کاغذ زر کی طرف بڑھایا اور انتہائی دھیمی آواز میں اس سے کچھ کہا تھا۔ زر نے اپنے ساتھ موجود گارڈ کو جانے کا اشارہ کیا۔ پھر وہ اس شخص کے ساتھ چلنے لگی۔ ہوٹل سے باہر نکلتے ہوئے اس آدمی نے ایک بلیک شیشوں والی لینڈ کروزر کی طرف اشارہ کیا۔ چہرے پہ ایک پروفیشنل مسکراہٹ سجائے وہ اس گاڑی کی طرف بڑھی۔ پچھلی سیٹ کا دروازہ کھلا۔ اس نے بہت مسکرا کر سیٹ پہ بیٹھے شخص کی طرف دیکھا۔

مگر۔ دوسرے ہی لمحے اس کی مسکراہٹ غائب ہوئی تھی۔ اس نے مڑ کر اس سیاہ پینٹ کوٹ والے آدمی سے کہنا چاہا کہ بھلا ہوتا اسے اس نمائندے نے بلوایا تھا مگر۔ وہ مڑ نہیں سکتی تھی۔ اپنی کمر پہ پیچھے وہ ریوالور کی ٹھنڈی نالی محسوس کر سکتی تھی۔

"پلیز۔" مجتبیٰ نے مسکرا کر ہاتھ کے اشارے سے اپنی ساتھ والی سیٹ کی طرف اشارہ کیا اور یہ سیٹ پہ بیٹھنے کے علاوہ وہ کوئی اور فیصلہ نہیں کر سکتی تھی۔

"چلو۔" اس کے بیٹھتے ہی مجتبیٰ نے ڈرائیور سے کہا۔ گاڑی کے ٹائر چرچرائے اور وہ تیزی سے ٹرن کرنے لگی۔ اپنے حواسوں کو نارمل کرنے کے لیے بے اختیار زر نے ایک گہرا سانس لیا۔ اس کی حالت دیکھتے ہوئے مجتبیٰ نے منرل واٹر کی بوتل اس کی طرف بڑھائی تھی۔ جسے اس نے غصے سے ہاتھ مار کر گرا دیا۔

اس کی اس حرکت پہ وہ جبڑے بھینچ کر سامنے دیکھنے لگا تھا۔ گاڑی مسلسل چل رہی تھی۔ مجتبیٰ بالکل خاموش تھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ اور سرد تھا۔

خشک ہونٹوں پہ زبان پھیرتے ہوئے اس نے مجتبیٰ کی طرف دیکھا۔

سفید کاٹن کے سوٹ اور بلیک واسکٹ میں وہ ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھا تھا۔ جیسے وہاں کوئی اور موجود ہی نہیں تھا۔

"تم یہاں کیا مجھے اسلام آباد کی سڑکوں کی سیر کروانے لائے ہو؟" اور اس کے بولنے کی دیر تھی مجتبیٰ نے کھینچ کر پوری قوت سے اسے تھپڑ دے مارا۔ بے ساختہ اس کی چیخ نکلی تھی۔ اس نے خوف اور حیرت سے مجتبیٰ کو دیکھا۔ مجتبیٰ نے اس کا بازو کھینچ کر اسے اپنے قریب کیا۔

"تم دبئی جاؤ گی اس بلڈی شیخ سے ملنے۔ اس سے پہلے ٹانگیں نہ توڑ دوں میں تمہاری۔ جان سے مار دوں تمہیں۔"

اس کا لہجہ جتنا سرد تھا۔ اتنا ہی سخت بھی تھا۔ وہ بری طرح دہشت زدہ ہو گئی۔

"تم جا کر دکھاؤ مجھے زرا۔" ایک جھٹکے سے اس کا بازو چھوڑتے ہوئے وہ اسی سنگین لہجے میں بولا۔

زر نے سختی سے دانت پہ دانت جما کر خود کو چیخنے سے روکا۔ اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے اور اس کا چہرہ چند سیکنڈ میں سفید پڑ گیا تھا۔ بے اختیار آنسو بہہ نکلے تھے۔ وہ اپنی بات کہہ کر پھر سے اسی لاتعلق انداز میں ٹانگ پہ ٹانگ چڑھا کر بیٹھ گیا تھا۔

جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔

اس لمحے گاڑی ایک یوٹرن سے مڑی اور پہلے کی نسبت تیز رفتار سے چلنے لگی تھی۔ بے ساختہ زر نے آنکھیں بند کی تھیں۔ بند آنکھوں سے آنسو مسلسل پھسل رہے تھے۔

وہ اب یقیناً" اسے شوٹ کرنے والا تھا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا اور سانس۔۔۔ وہ تو جیسے آنا ہی بند ہو گیا تھا۔ کچھ دیر بعد گاڑی ایک جھٹکے سے رکی تھی۔

"تم دنیا کی سب سے بد صورت عورت ہو زر!" اس کے کانوں نے یہ جملہ سنا تھا مگر لہجہ میں نفرت نہیں۔ تاسف تھا

"میم پلیز!" اور اس نے "فوراً" آنکھیں کھولی تھیں۔

وہاں گاڑی کا دروازہ نہیں کھلا تھا۔ جیسے کہ زندگی کا دروازہ کھلا تھا۔ اس نے بے یقینی سے کھلے دروازے میں کھڑے ڈرائیور کو دیکھا۔ وہ اس کے نیچے اترنے کا منتظر تھا۔ وہ تیزی سے پیچھے دیکھے بغیر گاڑی سے اتری تھی۔ گاڑی سے اتر کر جو منظر اس کے سامنے تھا۔ وہ پہلے سے کئی زیادہ حیران کن تھا۔ تو وہ اسے اس کے گھر کے دروازے پہ چھوڑ کر گیا تھا۔ اس نے حیرت اور بے یقینی ہو کر جاتی ہوئی گاڑی کو دیکھا تھا۔ اس کا سانس بحال ہوا اور وہ وہیں زمین پہ بیٹھ گئی۔ پھر سیکنڈز میں اسے سارا معاملہ سمجھ آیا تھا۔

وہ صرف اسے دھمکا کر وارن کرنا چاہتا تھا تاکہ وہ دبئی نہ جائے۔

☼ ☼ ☼

ایمبیسی والوں نے اس کا ویزا آسانی سے نہیں لگایا تھا۔ بہرحال لگا دیا تھا۔ آخر کو افیشن ملک بھی اتنے عرصے سے سیاست میں جھک تھوڑا مار رہی تھیں۔ اس نے واقعی میڈیا میں مجتبیٰ کی اس حرکت کے بارے میں منہ تک نہیں کھولا تھا۔ حالانکہ افیشن کے خیال میں زر کا یہ فیصلہ ٹھیک نہیں تھا۔ اسے تو ایک اودھم مچا دینا چاہیے تھا مگر۔ اس کے خیال میں اس طرح کرنے سے مجتبیٰ چوکنا ہو جاتا۔

☼ ☼ ☼
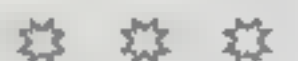
صبح چار بجے کی اس کی فلائٹ تھی۔ بظاہر وہ بہت پرسکون طریقے سے اپنی تیاری کر رہی تھی۔ مگر کچھ تھا جو اسے پرسکون نہیں رہنے دے رہا تھا۔

اپنے ہینڈ بیگ میں پاسپورٹ اور ٹکٹ رکھتے ہوئے یک دم اس کا دل چاہا کہ وہ کہیں نہ جائے۔ بے ساختہ وہ بے جان ہوتے ہوئے جسم کے ساتھ بیڈ پہ بیٹھ گئی۔

اس کا ہاتھ ابھی تک ہینڈ بیگ کے اندر تھا اور اس نے زپ بھی بند نہیں کی تھی۔ یک دم رات کے اس خاموش پہر میں گاڑیاں اسٹارٹ ہونے کی آواز نے سکوت کا پردہ چاک کیا تھا۔ ایک گہرا سانس بھر کر اس نے بیگ کی زپ بند کی۔

ملازم اس کا سامان لے کر چلا گیا۔

وہ تھکے ہوئے انداز میں اٹھی اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی گھر کے بیرونی دروازے تک آ گئی۔

دونوں گاڑیاں تیار تھیں۔ ایک گاڑی میں گارڈز تھے جو کہ اس کی حفاظت کے خیال سے ساتھ جا رہے تھے۔ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے نکلی تھیں۔

اسلام آباد کی سڑکیں خاموش اور سنسان تھیں۔ اس نے گردن موڑ کر اپنے پیچھے آنے والی گاڑی کو دیکھا۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے کوئی حفاظت کے خیال سے اپنے جیب میں موجود ریوالور کو ہاتھ لگا کر یقین دہانی کرتا ہے۔ آدھا راستہ طے ہو چکا تھا اور ابھی تک سب کچھ

نارمل تھا۔ اس کے اعصاب آہستہ آہستہ پرسکون ہورہے تھے۔

وہ شخص مجھے دھمکا رہا تھا اور کچھ بھی نہیں تھا۔

دونوں گاڑیاں ایرپورٹ پر پہنچ چکی تھیں اور اس سے تھوڑا ہی آگے پولیس چوکی تھی۔ اس بات سے جیسے زر نے خود کو محفوظ تصور کیا تھا۔

ایرپورٹ سے محض اب دس منٹ کی دوری تھی۔ سیٹ سے سر ٹکائے وہ اب غنودگی محسوس کررہی تھی۔ اس غنودگی میں اس نے محسوس کیا کہ کوئی چیز سنسناتی ہوئی سناٹے کو توڑ رہی تھی اور پھر جیسے کوئی دھماکا ہوا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تھی۔ بیک ویو مرر میں سے ڈرائیور اسے دیکھ رہا تھا اور وہ ڈرائیور کو اور پھر اس کے بدترین خدشے کی تصدیق ہوئی تھی۔

وہ دھماکا نہیں تھا۔ کوئی گولی تھی جو کہ گاڑی کے کسی نچلے حصے میں لگی تھی۔

حواس باختہ ہو کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تھا۔ گارڈز کسی پر اندھا دھند فائرنگ کررہے تھے۔

اس نے گارڈز کی بندوقوں کے رخ کی جانب دیکھا تھا اور بے ساختہ اس نے چیخ ماری تھی۔ اس کی گاڑی کے سامنے والی سڑک پر ایک ڈبل کیبن گاڑی تھی۔ جس میں موجود مسلح افراد میں سے چند اس کی گاڑی پر فائر کررہے تھے۔ جبکہ باقی ان گارڈز سے مقابلہ کرنے میں مصروف تھے۔

ابھی تک اس کی گاڑی پہ جتنے فائر ہوئے تھے وہ نچلے حصے میں ہی لگے تھے۔ ڈرائیور اسپیڈ بڑھا چکا تھا۔ وہ وہاں سے نکلنے کی کوشش میں تھا۔ وہ پولیس کی چوکی جو تھوڑی دیر پہلے تک اس کے لیے اطمینان باعث تھی۔ اب موت کا گڑھا بننے والی تھی۔ کیونکہ وہاں یقیناً گاڑی کی رفتار کم ہوتی اور اس کا مطلب تھا کہ۔۔۔

"گاڑی نکالو یہاں سے۔۔۔ خدا کے لیے نکالو۔" وہ پوری قوت سے چیخی تھی۔

"میم! آپ نیچے ہوجائیں، سیٹ سے نیچے۔" ڈرائیور بھی پوری قوت سے چلایا تھا۔ وہ سیٹ سے نیچے ہونے کے لیے اپنی جگہ سے تھوڑا سا ہی [illegible] اور وہیں ساکت ہوگئی تھی۔

ایک گولی نے سیدھا ڈرائیور کے سر کا نشانہ [illegible] خون کا فوارہ ابلا۔ ڈرائیور کے ہاتھ اسٹیئرنگ [illegible] چھوٹے۔ گاڑی بے توازن ہوگئی۔ مگر وہ دہشت [illegible] ہو کر اس بہنے والے خون کو دیکھ رہی تھی۔

گولیاں اب بھی چل رہی تھیں اور پھر جو آ[illegible] منظر اس کی آنکھوں نے دیکھا تھا۔ وہ سڑک پہ [illegible] کنکریٹ سے بنے اس بیریر سے گاڑی کے ٹکرانے [illegible] تھا۔ اور پھر۔۔۔

☼ ☼ ☼

زر پہ حملے کی خبر سنتے ہی ایک دفعہ تو مجتبیٰ کا دل [illegible] شل ہوا تھا۔

اس نے سب سے پہلے زر کے بارے میں [illegible] تھا۔ وہ محفوظ تھی اور اسے معمولی چوٹیں آئی تھیں۔ جبکہ اس حملے میں اس کا ایک گارڈ زخمی ہوا تھا اور ڈرائیور مارا گیا تھا۔

اب یہ خبر بار بار بریکنگ نیوز کے طور پر چل رہی تھی۔

ایک طرف اس کی کسی وقت لی گئی تصویروں کی کلپس چل رہے تھے۔ اور دوسری طرف حملے کے بعد کے مناظر دکھائے جارہے تھے۔ ایک رپورٹر اس بیریر کو دکھا کر رپورٹ کررہا تھا۔ جس سے زر کی گاڑی ٹکرائی تھی۔ ساتھ ہی اس کی گاڑی بھی دکھائی جارہی تھی۔ چونکہ یہ حملہ پولیس چوکی کے پاس ہوا تھا۔ تو ان کے بیان بھی لیے جارہے تھے۔

دوسری طرف ایک اور رپورٹر تھا جو کہ اسپتال سے لائیو کوریج کررہا تھا۔ جہاں پہ زر داخل تھی۔

بریکنگ نیوز چلی۔

"ناظرین! معروف سیاستدان افشین ملک صاحبہ کی بیٹی۔۔۔ زر ملک پہ قاتلانہ حملے کی رپورٹ آپ نے ملاحظہ فرمائی۔ اب آپ کو لیے چلتے ہیں پریس کلب۔

یہاں پر اس وقت محترمہ افشین ملک پریس کانفرنس کررہی ہیں۔"

مجتبیٰ اپنے آفس میں بیٹھا مسلسل نیوز چینل بدل رہا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ اس پریس کانفرنس میں کیا کہنے والی تھیں اور اس کا الزام کس پہ عائد کرنے والی تھیں۔ وہ کیا کہہ رہی تھیں، کیا نہیں۔۔۔ مجتبیٰ کو اب اس سے غرض نہیں تھی۔

اس نے فوراً سے پہلے اپنے وکیل کو کال کی تھی اور اسے اپنی اور سردار اجمل کی ضمانت قبل از گرفتاری کروانے کو کہا تھا۔

وکیل سے بات ختم کرکے اس نے ایک دفعہ پھر اسکرین کو دیکھا تھا۔

وہاں اب ایک اور بریکنگ نیوز چل رہی تھی جس میں زر کو اغوا کرنے دھمکانے اور تشدد کرنے کا سنایا جارہا تھا اس میں مجتبیٰ خان کا نام لیا جارہا تھا۔

"اف۔ یہ میڈیا والے!" اسے بے ساختہ غصہ آیا تھا اور اس نے اسکرین بند کرکے ریموٹ صوفے پر پھینک دیا۔

زر یقیناً "ایف آئی آر" میں اس کے خلاف بیان دینے والی تھی اور اب افشین کی پریس کانفرنس کے بعد کوئی بے وقوف بھی بتا سکتا تھا کہ زر پہ حملہ کس نے کروایا تھا۔ بے اختیار اس نے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھاما تھا۔

اچانک دروازہ کھلا اور ذکا بہت پرجوش انداز میں اندر داخل ہوا۔

مجتبیٰ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

اس کا چہرہ جوش سے سرخ ہو رہا تھا۔

"گڈ نیوز مجتبیٰ!" وہ دونوں ہاتھ ٹیبل پہ رکھ کر خوش ہو کر بولا۔

مجتبیٰ کو یک دم محسوس ہوا تھا کہ ذکا کا دماغ چل گیا ہے۔

"گڈ نیوز۔۔۔ اور وہ بھی ان حالات میں چہ معنی دارد؟"

☼ ☼ ☼

آنکھیں کھولنے پہ بھی پہلا احساس درد کا تھا جو لہر کی صورت میں سر کے پچھلے حصے میں جارہی تھی۔ وہ گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔

"ہنی۔۔۔ آر یو آل رائٹ۔" حیدر فوراً اسے یوں سانس لیتا دیکھ کر اس کے پاس آئے تھے۔

"ڈیڈی؟" اس نے ہاتھ لگا کر سر پہ بندھی بینڈیج کو محسوس کیا تھا۔

"شکر ہے تمہیں کچھ نہیں ہوا۔ بس معمولی سے زخم ہیں۔" وہ اسے یوں ہاتھ لگاتا دیکھ کر بولے۔

"ڈیڈی وہ ڈرائیور؟" اس نے خوف زدہ ہو کر پوچھا۔ اس کے سوال کا جواب حیدر کے چہرے کے تاثرات تھے۔

"او۔۔۔ نو۔۔۔ نو۔۔۔ گاڈ۔۔۔ میرے خدا۔۔۔ ڈیڈی!" منہ پہ ہاتھ رکھے وہ بے ربط بولتے ہوئے رونے لگی تھی۔

"ہنی۔ ہنی۔ ریلیکس۔۔۔ ٹیک اٹ ایزی۔"

وہ اس کا سر اپنے سینے کے ساتھ لگاتے ہوئے اس کی پیٹھ سہلا رہے تھے۔ لیکن وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ جس طرح ہر کوئی شاعر نہیں ہوتا۔ ادیب ہونا بھی ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ اس طرح سے ہر کوئی اٹھ کر سیاست دان بھی نہیں بن سکتا اور وہ سیاست دان نہیں تھی۔ وہ اپنی ماں کی طرح نہیں تھی۔ وہ ایک جذباتی اور کمزور لڑکی تھی۔

اس کی وجہ سے ایک جان چلی گئی تھی۔ سوا اپنے ڈیڈی کے سینے سے سر لگائے روتے ہوئے اس نے فیصلہ سنایا۔ ایک آخری قدم اٹھانے سے پہلے وہ مجتبیٰ کو ضرور پھنسوا کر جائے گی۔

وہ اگر اسے محض دبئی جانے سے روکنے کے لیے آخری حد تک جاسکتا ہے تو وہ بھی اسے جیل پہنچانے کے لیے آخری حد تک بھی جائے گی۔

اس کے ڈرائیور کی موت۔۔۔ کسی کے لیے اہم نہ

ہوتی مگر اس کے لیے تھی۔ اس نے خود اپنی آنکھوں سے اسے مرتا دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پہ موت کی تکلیف۔۔۔

"آف۔ مجتبیٰ مجھے مروانا چاہتا تھا۔" وہ اس دن بے یقین تھی جب مجتبیٰ نے اسے اغوا کروایا تھا۔
مگر اب بے یقین نہیں رہی تھی۔
پولیس کو کیا بیان دینا تھا۔ وہ فیصلہ کر چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

اس نے ضمانت کے انتظامات تو کروا لیے تھے مگر اس نے ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ بابا جان ایسا کروا سکتے تھے۔ وہ جانتا تھا ان حالات میں وہ ایسی کوئی بھی حرکت نہیں کر سکتے تھے۔ اس طرح سے تو سیدھا شک ان پہ اور مجتبیٰ پہ ہی جاتا اور ان کا ووٹ بینک متاثر ہوتا۔ البتہ وہ یہ ضرور سوچ رہا تھا کہ ایسا کون کروا سکتا تھا۔ کوئی تیسری قوت؟ جو کہ ان کی پارٹی کو نقصان پہنچانا چاہتی ہو یا پھر ایسا کوئی جسے اس واقعے سے فائدہ پہنچنے والا ہو۔ اس کا شک یقین میں ابھی وقت بدل گیا تھا جب زکا نے اسے وہ "گڈ نیوز" سنائی تھی۔
بے ساختہ وہ بھی اتنا ہی خوش ہوا تھا جتنا کہ زکا تھا۔
"ویل ڈن گریٹ۔" خوش ہوتے ہوئے اس نے ٹیبل پہ ہاتھ مار کر کہا۔ یہ ایسا بم بلاسٹ تھا جو اس کے مخالفین کے پرخچے ضرور اڑانے والا تھا۔

☼ ☼ ☼

آج زر اسپتال سے ڈسچارج ہو رہی تھی۔ اس کے ڈسچارج ہونے کی خبر سن کر میڈیا والے بھی بھاگے آئے تھے۔

وہ اسپتال سے باہر نکل کر کھلے احاطے میں آئی تھی۔ میڈیا والے یکدم اس کی طرف بھاگے تھے۔
دھڑا دھڑ فوٹوز ایک کے بعد ایک سوال۔۔۔ وہ بہت تحمل سے جواب دے رہی تھی۔
افشین ملک نے ایک ہاتھ اس کے شانے کے گرد پھیلایا ہوا تھا اور جہاں ضرورت ہوتی' وہ بھی سوالوں کے جواب دے رہی تھیں۔

"میڈم! آپ نے سردار اجمل اور مجتبیٰ خان کو ہی نامزد کیوں کیا؟ کوئی تیسری قوت بھی تو ہو سکتی ہے کہ آپ دونوں کے اختلافات کو استعمال کر رہی ہے۔"

رپورٹر کے اس سوال پہ وہ فوراً کوئی جواب نہیں دے سکی تھی۔ "اس کے ذہن میں یہ بات کیوں نہیں آئی تھی۔" بے اختیار اس نے سوچا۔
"دیکھیے! اگر کوئی شخص مجھے گن پوائنٹ پہ زبردستی اپنی گاڑی میں بٹھاتا ہے' پھر تشدد بھی کرتا ہے اور کہتا ہے کہ "تم مجھے وہیں جا کر دکھاؤ" تو اس کا کیا مطلب نکلتا ہے یہ آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی۔ ویسے بھی اس واقعے کی خبر میرے اور میرے گھر والوں کے علاوہ کسی کو نہیں تھی۔ تو پھر اسے کوئی تیسرا کیسے استعمال کر سکتا ہے۔"
وہ اپنے دلائل سے خود کو بھی مطمئن کر رہی تھی۔
"اگر اتنے ہی اختلافات تھے اور ہیں تو آپ نے ابھی تک علیحدگی کیوں نہیں اختیار کی؟" اسی رپورٹر نے دوسرا سوال کیا۔
"میں چاہتی تھی کہ یہ معاملہ اس طرح سے حل ہو جائے جس طرح سے وہ مہذب لوگوں کے درمیان ہوتا ہے' میں کورٹ کے معاملات میں الجھنا نہیں چاہتی۔ مجھے اپنی بھی عزت پیاری ہے اور میں کسی دوسرے کی عزت بھی خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔"

وہ رپورٹر کچھ زیادہ ہی باخبر تھا۔ اس کے بعد وہ فوراً مائیک کے سامنے سے ہٹ گئی تھی۔
"میڈم پلیز۔ جسٹ ون مور کوئسچن!" بہت سی آوازیں اس کو سننی پڑیں۔ مگر اب وہ کسی سوال کا جواب نہیں دینا چاہتی تھی۔
اس کے سیکورٹی گارڈز بمشکل اس کے لیے راستہ بنا رہے تھے۔
گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے مسکرا کر وکٹری کا نشان

بنایا۔ اس ایک منٹ میں کیمروں کے فلیش ایک دفعہ پھر حرکت میں آئے تھے اور پھر اس کی گاڑی آگے بڑھ گئی۔

☼ ☼ ☼

"آپ کے خیال میں کیا کرنا چاہیے بابا جان؟" اس وقت کوئٹہ میں گھر کے ایک بند کمرے میں مجتبیٰ اور اجمل خان کی گفتگو جاری تھی۔
"ہم اس کو میڈیا میں پیش کر کے مخالف پارٹی کا پورا چہرہ تباہ کر سکتے ہیں یا پھر انہیں بلیک میل بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ہم ان سے ڈیل بھی کر سکتے ہیں۔ اس طرح سے ہم اپنی مرضی کی اہم نشستوں پہ اپنے امیدواروں کو جتوا سکتے ہیں اور پھر آگے جا کر بھی یہ چیز بہت فائدہ مند ثابت ہو سکتی ہے۔"
اجمل خان بہت توجہ سے اس کی بات سن رہے تھے۔

"تم کیا کہتے ہو؟" انہوں نے مجتبیٰ سے پوچھا۔
ان کے یوں پوچھنے پہ مجتبیٰ نے مطمئن ہو کر صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی۔
"میڈیا میں ایکسپوز کر دیں۔" پھر بڑے آرام سے جواب دیا۔
"ووٹ بینک متاثر نہیں ہو گا ہمارا؟"
"ہمارا کیوں ووٹ بینک متاثر ہو گا؟ بلکہ اس سے تو ان کے ووٹ بھی ٹوٹ کر ہماری طرف آ سکتے ہیں۔ محترمہ کی گوہر افشانیوں کے باوجود ہم نے میڈیا میں بھی کوئی رسپانس نہیں دیا۔ یہ بات بھی ہمارے حق میں جائے گی۔"
"ایک پلس پوائنٹ!" سردار اجمل خان ایک دفعہ پھر سے سوچ میں پڑے تھے۔ وہ دوسرے سیاسی اکابرین سے بھی بات کرنا چاہتے تھے' مگر آخری فیصلہ تو ان کا ہی ہونا تھا۔
"ٹھیک ہے مجتبیٰ! ہم اسے میڈیا کے سامنے پیش کریں گے۔"
اور پھر فیصلہ ہو گیا تھا۔ باقی پارٹی ممبران کو بعد میں بھی اعتماد میں لیا جا سکتا تھا۔ اتنے عرصے سے وہ اور اس کے پارٹی ممبران خاموش تھے۔ اب ان کا بھی حق بنتا تھا اپنی سیاست کو چمکانے کا۔

☼ ☼ ☼

"تم نے اپنی مما کو بتا دیا اپنے فیصلے کے بارے میں؟" افشین نے پہلے چونک کر حیدر کو اور پھر زر کو دیکھا تھا۔ وہ سب اس وقت کھانا کھا رہے تھے۔ زر نے بے اختیار ملامتی نظروں سے ڈیڈی کو دیکھا تھا۔ وہ اس وقت کوئی ہنگامہ نہیں چاہتی تھی۔
"کیسا فیصلہ؟" افشین کھانے سے ہاتھ روک چکی تھیں۔
زر کے لیے بھی وہ نوالہ حلق سے اتارنا مشکل ہو گیا تھا اور حیدر صاحب۔۔۔ وہ ایک بات کہہ کر پھر سے کھانا کھانے میں مصروف ہو گئے تھے۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے کسی چنگاری کو ہوا دے دی جائے۔
"زر۔۔۔ میں پوچھ سکتی ہوں کہ اب آپ کیا کرنے والی ہیں۔" کھانے کی پلیٹ پرے کھسکا کر وہ طنزیہ لہجے میں بولی تھیں۔
"میں نے پالیٹکس چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔" ایک گہرا سانس بھر کر اس نے کہہ ہی دیا تھا۔
"واٹ؟" انہیں سخت شاک لگا تھا۔
"جی!" وہ سر اور نظریں جھکائے مضبوطی سے بولی۔

افشین چند لمحے تک تو کچھ بول ہی نہیں سکیں۔
"زر! پارٹی تمہیں ٹکٹ دینے والی ہے۔" انہوں نے جیسے اسے لالچ دیا تھا۔
"مما! میں۔۔۔ میں نہیں کر سکتی یہ۔۔۔ میرے بجائے وہ آپ کو ٹکٹ الاٹ کر دیں۔"
"بچوں کی سی بات مت کرو۔ مذاق نہیں ہے یہ۔ تمہیں الیکشن لڑنا ہے ہر حال میں۔۔۔ اتنی محنت کی۔۔۔ اتنا پیسہ لگایا اس لیے کہ آخر میں تم یوں سب کچھ برباد کر دو۔ میں تمہیں یہ سب نہیں کرنے دوں گی۔"
"آپ مجھے دھمکی دے رہی ہیں مما؟" زر حیران

ہوتے ہوئے بولی تھی۔

"ہاں! دے رہی ہوں۔ میں تمہیں وارن کر رہی ہوں زر! میں اس طرح تمہیں سب کچھ تباہ نہیں کرنے دوں گی۔"

انہوں نے اب کھڑے ہو کر انگلی کے اشارے سے تنبیہا" کہا۔

"آپ کی ان دھمکیوں سے یا سخت رویے سے میں اپنا فیصلہ نہیں بدلنے والی۔" وہ بھی جوابا" کھڑے ہو کر ٹھنڈے لہجے میں بولی۔

"میں دیکھتی ہوں' تم ایسا کیسے کرتی ہو؟" طیش میں آکر افشین نے ٹیبل پر پڑا گلاس ہاتھ مار کر گرا دیا۔

زر نے زمین پہ پڑے ٹوٹے گلاس اور پھر افشین کو دیکھا۔ افشین بھی مشتعل ہو کر اسے دیکھ رہی تھیں۔

"کھانا بہت مزے کا تھا آج!"

اچانک ان دونوں نے حیدر کی آواز سنی تھی۔ وہ اٹھے اور جانے کے لیے مڑے۔ اس سارے تماشے میں انہوں نے بہت سکون سے اور ڈٹ کر کھانا کھایا تھا۔

وہ دونوں انہیں حیرت سے جاتا دیکھ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ اسلام آباد واپس آچکا تھا۔ آتے ہی اسے عدالت کی طرف سے سمن ملا تھا۔ کورٹ میں زر اور مسز افشین کی طرف سے کیا جانے والا مقدمے کی سماعت تھی۔

اس نے ایک گہرا سانس بھر کر اس نوٹس کو ڈسٹ بن میں پھینکا۔

اور پھر بڑی طنزیہ مسکراہٹ اس لبوں پہ آگئی۔

مجتبیٰ کو پریس کانفرنس کرنے سے پہلے زر کی گاڑی جو کہ حملے میں متاثر ہوگئی تھی اس کی چند تصاویر چاہیے تھیں جس کا انتظام بہر حال ذکا نے کر دیا تھا۔ اور اس پریس کانفرنس سے پہلے وہ ایک دفعہ حیدر صاحب سے خود ملنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ لوگوں کو خبر ہونے سے پہلے انہیں خبر ہو۔

وہ اس ملاقات کو خفیہ رکھنا چاہتا تھا۔ سو وہ اس کے گھر آرہے تھے۔ مگر حیدر صاحب کو اس وقت حیرت ہوئی۔ جب اس نے انہیں گھر آنے سے منع کرتے ہوئے ایک اپارٹمنٹ میں بلایا تھا۔ وہ سمجھ نہیں سکے کہ مجتبیٰ نے انہیں گھر آنے سے کیوں منع کیا تھا۔ وہ اپنے مقررہ وقت پہ وہاں موجود تھے۔

"تمہیں نہیں لگتا مجتبیٰ! اس طرح خاموش رہ کر تم نے اس کے ساتھ زیادتی کی ہے۔"

رسمی باتوں کے بعد حیدر صاحب نے سوال کیا۔ وہ ان کے اس سوال پہ چپ ہو گیا۔ اس وقت حیدر کو وہ معمول سے زیادہ سنجیدہ محسوس ہوا تھا۔

"انسان بول کر اپنی بات سمجھا سکتا ہے۔ بیٹھ کر معاملات' مسئلے سلجھائے جا سکتے ہیں۔ تب۔ جب دوسرا فریق آپ کی بات سننے اور سمجھنے کے موڈ میں ہو۔ جب وہ پہلے ہی یقین کر کے بیٹھی ہے کہ میں غلط ہوں تو پھر کچھ بھی کہنا فضول ہے۔ انسان آنکھوں سے دیکھتا اور دماغ سے سمجھتا ہے اور فی الوقت اس نے یہ دونوں چیزیں بند کر رکھی ہیں۔" وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ سو وہ چپ رہے۔

اور راکھ کر دیتی ہے مگر وہ۔

"وہ تمہارے خلاف پولیس کو بیان دے چکی ہے۔ مقدمے کی سماعت شروع ہونے والی ہے۔ میں جانتا ہوں۔ تم نے یہ سب نہیں کروایا' مگر پھر بھی تمہیں زر کو دھمکی نہیں دینا چاہیے تھی۔" اس لمبی خاموشی کو حیدر نے توڑا تھا۔

"میں جانتا ہوں یہ غلط تھا مگر میں نہیں جانتا تھا کہ اسے یوں ڈرانا میرے اتنے حق میں جائے گا۔" سنجیدگی سے بات کرتے ہوئے وہ حیدر کو دیکھ کر ہلکا سا مسکرایا۔

حیدر کو اس کا مسکرانا سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ وہ سائیڈ ٹیبل پہ پڑا لیپ ٹاپ اٹھا کر آن کرنے لگا۔ پھر

لیپ ٹاپ کا رخ حیدر صاحب کی طرف موڑا۔

ٹیپ چلنا شروع ہو چکی تھی۔

جیسے جیسے وہ سنتے جا رہے تھے' حیدر صاحب کے پیروں کے نیچے سے زمین کھسکتی جا رہی تھی۔

وہ اس ٹیپ میں بولنے والی آواز سے بہت اچھی طرح سے واقف تھے۔ انہیں کوئی شبہ' کوئی شک نہیں تھا کہ وہ کسی اور کی آواز یا پھر کسی ٹیکنالوجی کا کمال بھی ہو سکتا تھا۔

حیدر صاحب نے عینک اتار کر سر جھکا لیا تھا۔

وہ کیا کہتے' کیا بولتے۔ انہیں تو اس قابل چھوڑا ہی نہیں گیا تھا کہ وہ کچھ کہہ سکتے۔

"کیا تم اسے اپنے تک محدود نہیں رکھ سکتے؟"

مجتبیٰ کی بات تیزی سے کاٹ کر انہوں نے کہا۔

"اب یہ ممکن نہیں ہے۔ تمام انتظامات ہو چکے ہیں۔ آدھے گھنٹے بعد تمام چینلز اس پریس کانفرنس کو نشر کر رہے ہوں گے۔ آپ کو اندازہ ہے۔ اس میڈیا وار کا جو میرے اور میرے خاندان کے خلاف شروع کی گئی تھی۔ میں نے کس طرح سے زر کو جوابی حملے سے بچایا ہے۔ یہ میں ہی جانتا ہوں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ مجھ پر پریشر نہیں ہوگا؟ اس طرح سے چپ رہنا' کیا آسان تھا؟ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ چیز آپ کی فیملی کو بری طرح سے ہٹ کرے گی مگر حیدر صاحب! میں اسے میڈیا میں آنے سے روک بھی لوں تو بابا جان ایسا نہیں ہونے دیں گے۔"

حیدر بہت خاموشی سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"تمہارے لیے یہ سب بہت آسان ہوتا اور یقینا" تم اسے کبھی بھی میڈیا میں اس طرح پیش نہ کرتے۔ اگر معاملہ زر کا ہوتا۔ زر کی ماں کا نہیں۔"

اک وقفے کے بعد حیدر تلخی سے بولے تھے۔ وہ ٹھیک کہہ رہے تھے۔ وہ جانتا تھا۔ بے ساختہ اس نے گہری سانس بھری تھی۔ پھر اس نے سائیڈ ٹیبل پہ پڑی سی ڈی اٹھائی تھی۔

"یہ میری طرف سے زر کو دے دیجئے گا تاکہ وہ جان سکے۔ اسے معلوم ہو سکے کہ سچ کیا تھا؟ کون کس کا کتنا سگا تھا؟ اور کس نے کس کو استعمال کیا۔"

حیدر صاحب نے شکستگی سے اس کے ہاتھ سے سی ڈی پکڑی۔

"معذرت خواہ ہوں کہ آپ کے لیے کچھ نہ کر سکا۔"

حیدر کے اٹھنے پہ وہ دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے باندھ کر بولا تھا۔ انہوں نے ایک نظر اسے دیکھا' پھر وہ وہاں سے چلے گئے۔

☼ ☼ ☼

کتنی دیر وہ خالی خالی نظروں سے اپنے باپ کو دیکھتی رہی تھی۔ وہ ہی اسٹڈی تھی اور اسی طرح سے وہ اپنے باپ کے سامنے کرسی پہ بیٹھی تھی۔ بات تھی ہی اتنی ناقابل یقین۔ اس کا دل چاہا کہ وہ اپنے باپ کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر روئے۔

بے ساختہ وہ کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور اس اٹھنے کی کوشش میں وہ لڑکھڑائی تھی۔

"بنی!" اس کے باپ کے ہاتھوں نے یکدم اسے تھاما۔ اسے اور رونا آیا۔ سو وہ اور پچھتاوے کا شکار ہوئی۔

"کیا چیز ہوتے ہیں ماں' باپ۔ نہیں! ماں نہیں صرف باپ۔" رک کر اس نے تصحیح کی اور اپنے باپ کو دیکھا۔

وہ مہربان چہرہ۔ حیدر نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ اس کے باپ کے جسم سے اس کے بدن میں منتقل ہونے والی حرارت۔ اس کے پورے جسم میں دوڑتی رہی اور یہ سوال کرتی رہی۔

کیا میں نے تمہیں اکیلا نہیں کیا تھا؟

اور وہ چاہنے کے باوجود اس قفس سے آزاد نہیں ہو سکی تھی۔

☼ ☼ ☼

ساری رات وہ سو نہیں پائی تھی۔ بالوں میں دونوں

ہاتھ پھنسائے وہ بیڈ کے ساتھ ٹیک لگا کر کارپٹ پہ بیٹھی رہی تھی۔ ساری رات ماؤف ہوتے ذہن کے ساتھ اس نے وہیں بیٹھے ہوئے گزاری تھی۔ صبح ہو چکی تھی۔ سورج کی روشنی نے جیسے ہر چیز کو واضح کر دیا تھا۔ ماسوائے اک اس کی ذات کے۔ وہ اٹھی اور پردے کھینچ کر روشنی کو اندر آنے دیا۔

اسے یاد تھا کہ آج مجتبیٰ پریس کانفرنس کرنے والا تھا۔ سو وہ کمرے سے باہر نکل آئی۔

اس نے افیشن کو آج خلاف معمول جاگا ہوا پایا تھا۔ یقیناً" وہ بھی مجتبیٰ کی پریس کانفرنس کے انتظار میں تھیں اور حیدر۔۔۔

وہ بھی آفس نہیں گئے تھے۔

وہ خاموشی سے عین ان کے ساتھ جا کر بیٹھ گئی۔ بیٹھتے ہوئے اس نے ایک نظر حیدر کو دیکھا تھا۔ وہ بھی اسے ہی دیکھ رہے تھے۔

اور افیشن۔۔۔ ان کی نظریں مسلسل پلازما اسکرین پہ تھیں۔

اس گھر میں تین نفوس تھے۔ دو پہ قیامت ٹوٹ چکی تھی اور تیسرے پہ ٹوٹنے والی تھی۔

سخاوت کے پریس کانفرنس شروع کرنے سے پہلے نیوز کاسٹر نے اطلاع دے دی تھی کہ چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر مجتبیٰ خان یہ پریس کانفرنس نہیں کر سکے گا۔

سخاوت خان کیمرے کی جانب متوجہ ہوا تھا اور اس نے بولنا شروع کیا۔

"بسم اللہ الرحمن الرحیم!"

جیسا کہ آپ سب لوگ اس میڈیا وار سے آگاہ ہیں' جو کہ سردار اجمل خان' ان کی پارٹی اور ان کے خاندان کے خلاف شروع کی گئی ہے اور آپ سب لوگ سردار صاحب کی خاندانی نجابت و شرافت سے بھی بہت اچھی طرح سے آگاہ ہیں۔ یہ ان کی خاندانی شرافت ہی تھی کہ اس قدر پروپیگنڈے کے باوجود ان کے یا ہماری پارٹی کے کسی ممبر کے منہ سے ایک لفظ تک نہ نکلا۔" سخاوت کا لہجہ ذرا سا پر جوش ہوا تھا۔

"اس موقع پر جب سردار صاحب اور خان صاحب پہ کیچڑ اچھالا جا رہا تھا' سردار صاحب نے ایک پختون ہونے کا ثبوت دیا اور پختون روایات کے مطابق تاریخی جملے کہے۔"

"محترمہ زر صاحبہ' نیازی خاندان کی بہو ہیں اور پختون بہو' بیٹیوں سے مقابلہ نہیں کیا کرتے۔ میرے قائد مجتبیٰ خان کو آوارہ' عیاش پسند کہا گیا۔ ان کی دوسری شادی کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ حتیٰ کہ یہاں تک کہا گیا کہ زر صاحبہ پہ قاتلانہ حملہ بھی مجتبیٰ خان کی سازش تھی۔"

اس موقع پر سخاوت کا لہجہ ذرا گلو گیر ہوا اور اس نے رک کر پانی پیا۔

"اس سے پہلے کہ میں وہ ثبوت پیش کروں' جس سے ہماری بے گناہی ثابت ہوتی ہے۔ میں آپ لوگوں کے سامنے چند سوال رکھنا چاہتا ہوں۔۔۔

سب سے پہلی بات۔۔۔ زر صاحبہ پہ قاتلانہ حملہ ہوا۔ الزام عائد کیا گیا۔ مجتبیٰ خان پہ۔ اور وجہ بتائی گئی ان دونوں کی ذاتی چپقلش۔۔۔ اس ضمن میں مخالف پارٹی کی طرف سے ثبوت بھی دیے کہ مجتبیٰ خان نے زر صاحبہ کو کڈنیپ کر کے تشدد کیا اور انہیں وہیں جلنے سے منع کیا اور جب زر صاحبہ نے ان کی بات نہیں مانی تو مجتبیٰ خان صاحب نے ان پر قاتلانہ حملہ کروا دیا۔

اگر ہم زمینی حقائق کی بات کریں تو بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ حملہ مجتبیٰ خان نے کروایا تھا' تو مجھے یہ بتایا جائے اس حملہ کروانے کا مجتبیٰ خان کو کتنا اور کہاں کہاں فائدہ ہوا؟"

کیا ان کے ووٹ بینک میں اضافہ ہوا؟

یا ان کی مقبولیت میں اضافہ ہوا یا پھر مجموعی طور پر پارٹی کو کوئی فائدہ ہوا؟ 20 مارچ کے گیلپ سروے کے مطابق اس واقعہ کے بعد مجتبیٰ خان اور ان کی پارٹی کی مقبولیت میں واضح کمی آئی تھی۔ آپ دیکھ سکتے ہیں۔" سخاوت نے پیپرز دکھائے۔ کیمروں نے اس منظر کو قریب سے دکھایا۔

افیشن صاحبہ کے چہرے پہ ابھی تک بے فکری تھی۔ مگر ان کی انگلیاں مسلسل فون پہ حرکت کرتے ہوئے ٹیکسٹ ٹائپ کرنے لگی تھیں۔ یقیناً" کہ رابطوں کا تقاضا۔

"تو اس سے یہ ثابت ہوا کہ مجتبیٰ خان کو یا ان کی پارٹی کو اس حملے کے نتیجے میں سراسر نقصان ہی ہوا ہے۔

اب ذرا تصویر کا دوسرا رخ ملاحظہ فرمایئے۔ اس واقعہ کے بعد سب سے زیادہ فائدہ کسے ہوا؟" ہمدردی کس کے حصے میں آئی اور نفرت کا حق دار کون بنا؟

20 مارچ کا یہ گیلپ سروے بھی دیکھ سکتے ہیں۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ افیشن صاحبہ کی مقبولیت میں اس واقعے کے بعد کتنا اضافہ ہوا۔"

ایک دفعہ پھر ایک پیپر قریب سے دکھایا گیا۔

سخاوت کے اشارہ کرنے پر زکا نے لیپ ٹاپ آن کیا۔ کیمروں نے ان تصاویر کو قریب سے دکھانا شروع کیا۔ پس منظر میں سخاوت خان کی آواز تھی جو کہہ رہا تھا۔

"یہ جو تصاویر آپ دیکھ رہے ہیں یہ محترمہ زر صاحبہ کی اس گاڑی کی تصاویر ہیں جو کہ حملے میں متاثر ہوئی تھی۔ آپ دیکھ سکتے ہیں۔ اس گاڑی پہ جتنے بھی فائر ہوئے وہ سب گاڑی کے نچلے حصے پہ لگے ماسوائے اس ایک فائر کے جو کہ فرنٹ سیٹ کی طرف کا شیشہ توڑتے ہوئے ڈرائیور کو لگا اور اس کی ہلاکت کا باعث بنا۔"

ساتھ ہی تصاویر کے ان حصوں کو کلوز کیا جا رہا تھا جہاں پر فائر کیے گئے تھے۔

"اور اب آپ کے سامنے اس گاڑی کی تصاویر ہیں جو کہ گارڈز کی گاڑی تھی۔ آپ دیکھ سکتے ہیں اس گاڑی پہ کیے گئے فائرز کا کوئی ایک مخصوص ہٹ پوائنٹ نہیں ہے۔

اس حملے میں جس میں ان کا ڈرائیور مارا جاتا ہے گارڈز زخمی ہوتے ہیں اور انہیں صرف چند خراشیں آتی ہیں؟ اس ملک میں جب کسی نامور شخصیت کو مارنے کا پلان کیا جاتا ہے تو پھر اسے مار کر ہی دم لیا جاتا ہے تو پھر زر صاحبہ کا اس وقت زندہ سلامت ہونا ایک سوالیہ نشان نہیں ہے؟"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے خان صاحب کہ مجتبیٰ صاحب زر صاحبہ کو مروانا نہیں بس ڈرانا یا دھمکانا چاہتے ہوں؟ اور یہ بھی تو اطلاعات ہیں کہ سردار صاحب اس شادی کو ختم کروانے چاہتے تھے سو۔۔۔؟"

ایک صحافی نے یکدم سوال داغا تھا۔

افشین ملک صحافی کے اس سوال پر بے ساختہ مسکرائی تھیں۔

افشین کا سیل فون بھی اب مسلسل بج رہا تھا اور وہ باپ بیٹی۔۔۔ وہ اپنے کنٹریکٹ کے تحت پابند تھے۔

صحافی کے اس سوال پہ سخاوت کے چہرے پہ برہمی کے تاثرات نظر آئے تھے' مگر جب وہ بولا تو اس کا لہجہ ٹھنڈا تھا۔

"بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔۔۔ مگر اس کو آپ کیا کہیں گے؟"

اتنا کہہ کر اس نے پھر زکا کو اشارہ کیا تھا۔

افشین کال چھوڑ کر بے ساختہ اسکرین کی طرف متوجہ ہوئیں۔

زکا نے چند لمحوں بعد لیپ ٹاپ کا رخ کیمروں اور صحافی خواتین و حضرات کی طرف موڑا۔

آڈیو چلنا شروع ہو چکی تھی۔ تجسس کی وجہ سے خاموشی چھا گئی تھی۔ تمام ناظرین بھی متوجہ ہوئے تھے۔ پھر ایک آواز ابھری تھی۔

"الو کے پٹھے۔۔۔ بلڈی باسٹرڈ۔۔۔ وہ گولی جو ڈرائیور کو لگی میری بیٹی کو بھی لگ سکتی تھی۔ تمہیں حملہ کرنے کو کہا تھا بندہ مارنے کو نہیں۔۔۔"

"میڈم! غلطی سے ہوا سب کچھ جان بوجھ کر نہیں کیا گیا۔"

"ایک روپے کی پے منٹ بھی نہیں کروں گی اب میں تمہیں۔ دفع ہو جاؤ کہیں۔۔۔ قتل کا کیس بن گیا ہے اب

جا کر کہیں چھپ مرو۔ اور ہاں اب مجھے کال مت کرنا ورنہ میں تمہیں شوٹ کروادوں گی۔ سمجھے؟؟"

افشین ملک کا دل حرکت کرنا بند کر چکا تھا۔ ان کے ہاتھ سے سیل فون چھوٹ کر گر گیا تھا۔

دونوں باپ بیٹی کی نظریں افشین پہ تھیں جو آنکھیں پھاڑے اسکرین کو دیکھ رہی تھیں۔

اور میڈیا والے۔ ایک لمحے کو یوں لگا کہ جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو اور پھر یک دم اتنی آوازیں ابھری تھیں کہ کسی ایک کا سوال سمجھنا یا سننا بھی مشکل ہو گیا تھا۔

سخاوت خان اب ساتھ ساتھ صحافیوں کے سوالات کے جواب بھی دے رہا تھا۔

"آپ کے کہنے کے مطابق یہ آواز مسز افشین ملک کی ہے اور یہ حملہ خود انہوں نے اپنی بیٹی پہ کروایا تھا مگر سوال یہ بھی ابھرتا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ ٹیکنالوجی کا کمال ہو آواز بدلنے والے بہت سے سافٹ ویر بہر حال موجود ہیں۔" ایک صحافی نے سوال کیا تھا۔

"آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔" سخاوت مسکرایا۔ "مگر وائس میچنگ سافٹ ویر بھی تو موجود ہیں۔ مجھے توقع تھی ایسے سوال کی سو ہم پورے ہوم ورک کے ساتھ آئے ہیں۔"

لیپ ٹاپ پر وائس میچنگ سافٹ ویر کھل چکا تھا اور وہ سافٹ ویر یہ بتا رہا تھا کہ آڈیو والی آواز سے مسز افشین ملک کی آواز جو کہ بطور نمونہ کسی پروگرام سے لی گئی تھی ننانوے فیصد تک میچ کرتی تھی۔

وہاں ایک دفعہ پھر سے سوالات کی بوچھاڑ شروع ہو چکی تھی ایک کے بعد ایک سوال۔

طوفان آچکا تھا۔ تقریباً سب ہی نیوز چینلز پہ اسی وقت یہ خبر بریکنگ نیوز کے طور پر چلنے لگی تھی۔

مجتبیٰ اس وقت بابا جان کے ساتھ اسلام آباد کے ایک لگژری فلیٹ میں بیٹھا لطف اندوز ہو رہا تھا۔

اسی کے ساتھ مجتبیٰ خان کے سیل فونز بھی بجنا شروع ہو چکے تھے مگر ابھی وہ صرف انجوائے کرنے کے موڈ میں تھا۔

☼ ☼ ☼

افشین ملک جتنی بھی تیز طرار' ماہر' ذہین اور حاضر جواب تھیں' اس وقت حقیقتاً" نظریں اٹھانے کے قابل نہیں رہی تھیں۔

ان کا دماغ فی الوقت کام کرنا چھوڑ چکا تھا۔ یہ سب اتنی رازداری اور خفیہ طریقے سے کیا گیا تھا کہ انہیں کہیں سے بھی کوئی خبر نہیں مل سکی تھی۔ چند گہرے گہرے سانس لے کر انہوں نے حیدر کو دیکھا۔

"میرے خدا۔" انہیں اپنی ریڑھ کی ہڈی میں کوئی ٹھنڈی سی اترتی ہوئی محسوس ہوئی تھی اور زر۔۔۔

وہ تو ان کے بالکل ساتھ بیٹھی تھی۔ وہ اتنی ہمت نہ کر سکی تھیں کہ گردن موڑ کر اسے دیکھ سکتیں دونوں ہاتھوں کو آپس میں ملتے ہوئے وہ گہرے سانس لے رہی تھیں۔ اور پھر جیسے ان کے دماغ نے کام کرنا شروع کیا تھا۔

"حیدر! بلیوی۔ بلیو می یہ سب بکواس ہے۔ جھوٹ ہے صرف سازش ہے۔ میں کیسے۔"

انہیں یک دم خاموش ہونا پڑا تھا کیونکہ حیدر اپنی سیٹ چھوڑ کر ان تک آئے تھے۔

"میں تمہیں "شٹ اپ" نہیں بولوں گا کیونکہ مجھے تم سے اسی ڈھٹائی اور بے غیرتی کی توقع تھی۔"

حیدر نے اتنے سنگین لہجے میں کہا تھا کہ افشین باوجود کوشش کے کچھ کہہ نہیں سکیں۔

اور زر کہنی صوفے کے بازو پہ ٹکائے' یوں بیٹھی تھی جیسے اس سارے معاملے سے اس کا تعلق ہی نہ ہو۔ ہاں البتہ وہ اپنے آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں کو ضرور روک رہی تھی۔

"زر کی شادی کروانے میں سب سے بڑا انٹرسٹ تمہارا تھا کیونکہ تمہیں کچھ سیاسی فائدے نظر آرہے تھے اور آج اس سارے تماشے میں بھی وہ ہی تمہارے بلڈ کی بینیفٹس ہیں۔"

"حیدر پلیز! میرا یقین کریں۔"

"مجھے حیرت ہوتی ہے مجتبیٰ کے ظرف پہ۔ اس کے برداشت اور حوصلے پہ۔" حیدر ملک نے سخت طیش میں ان کی بات کاٹ کر کہا اور زر اپنے آنسوؤں کو روکنے میں ناکام ہوئی تھی۔

"مگر میں مجتبیٰ جتنا اعلیٰ ظرف ہوں اور نہ ہی مجھ میں اتنی برداشت ہے۔ تم جانتی ہو نا کہ میں اپنی بیٹی سے کتنی محبت کرتا ہوں۔"

انہوں نے افشین کا کندھا پکڑ کر ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔

"مسز افشین ملک میں حیدر ملک بقائمی ہوش و حواس تمہیں طلاق دیتا ہوں۔ طلاق دیتا ہوں۔ طلاق دیتا ہوں۔"

زر یکدم صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ افشین ملک ہکا بکا رہ گئی تھیں اور حیدر۔ ان کا بس چلتا تو وہ طلاق کے الفاظ پستول کی گولی کے ساتھ ادا کرتے۔

چند لمحے وہاں اتنی خاموشی چھائی تھی کہ کیا کسی قبر میں ہوگی اور اس کے بعد۔ افشین نے شدید طیش کے عالم میں حیدر کا ہاتھ اپنے کندھے سے جھٹک کر ہٹایا۔ اور پھر حسب عادت ان کے منہ سے گالیوں کا طوفان برآمد ہوا تھا۔

زر انہیں آنکھیں پھاڑے ششدر ہو کر دیکھ رہی تھی۔

"ہاں کرایا ہے میں نے اپنی بیٹی پہ حملہ' کر لو جو کر سکتے ہو۔ تم جانتے نہیں ہو حیدر ملک کہ افشین ملک کون ہے اور کیا کر سکتی ہے۔ تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔" انگلی اٹھا کر وہ شدید اشتعال میں بول رہی تھیں۔

"تم یہاں سے دفع ہو جاؤ' ورنہ میں دھکے دے کر نکال دوں گا۔" جواباً" حیدر نے بھی اتنے ہی غصے سے اور اس سے بھی زیادہ اونچی آواز میں کہا تھا۔

اور زر ششدر۔ ہکا بکا۔ حیرت سے ساکت آنکھیں پھاڑے ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

"اور پھر۔" افشین نے ٹھیک کہا تھا۔ واقعی ان کے ہاتھ بہت اوپر تک تھے اور پھر اس سے پہلے کہ ان کے خلاف کوئی کارروائی ہوتی' وہ اسی رات لندن جانے والی فلائٹ پہ روانہ ہو گئی تھیں۔

اور جلد ہی لندن میں سیاسی پناہ لینے میں کامیاب ہو گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

کل رات اسے خبر ملی تھی کہ اس کے ہاں ایک صحت مند بچی کی ولادت ہوئی تھی۔ اسلام آباد میں اس کی مصروفیات بہت بڑھ چکی تھیں لیکن وہ پہلی فلائٹ سے کوئٹہ پہنچ گیا۔

وہ کتنی دیر تک خاموشی سے اپنی گود میں لیٹی بچی کو دیکھتا رہا تھا۔ وہ بالکل زرمینے کی کاپی تھی' سرخ و سفید۔ پھر بہت آہستگی سے اس نے بچی کا ماتھا چوما تھا۔ بچی کو گود لینے سے ایک عجیب سا احساس اس کے دل میں ابھرا تھا۔

"اس کی تربیت تم بالکل ویسی کرنا زرمینے! جیسی تمہاری ماں نے تمہاری کی ہے۔" سر جھکائے بچی کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیے بولا۔ زرمینے نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ کیا کہنا چاہ رہا تھا۔

"اور میری ماں نے۔ میری کیسی تربیت کی ہے خان؟؟" پلکیں جھپکائے بنا اس نے مجتبیٰ کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس سوال پر اس نے زرمینے کو دیکھا اور پھر بچی کو آہستگی سے اس کے پہلو میں لٹا دیا۔

"تمہاری ماں نے۔ تمہاری تربیت کیسی کی ہے؟؟" اس نے سوال دہرایا تھا اور پھر لمحوں کی خموشی۔

"ایسی تربیت زرمینے۔ جیسی ہر عورت کی ہونی چاہیے۔ جیسی ہر ماں کو اپنی اولاد کی کرنی چاہیے۔ جس معیار پہ تم اترتی ہو زرمینے! بادشاہ کی بیٹی کو بھی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے اور حکمران وقت کی بیٹی کو بھی کمپرومائز کرنے آنے چاہئیں۔ زندگی میں سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ ایسا ضرور ہوتا ہے جہاں کمپرومائز کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ تم میری بیٹی کی ایسی پرورش کرنا کہ اسے کبھی بھی' کہیں بھی ایڈجسٹ

ہونے میں پرابلم نہ ہو۔" وہ اپنی بیٹی کو دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

"ایسے سمجھوتے کا کیا فائدہ خان! جو مجھے آپ کی محبت نہ دے سکے۔" زرمینے بے ساختہ بولی تھی۔ مجتبیٰ کو کرنٹ لگا اس کی بات سن کر۔

"زرمینے!" وہ افسوس سے بولا۔ "محبت سے بڑھ کر بھی کچھ چیزیں ہوتی ہیں۔ تم جانتی ہو تم دنیا کی واحد عورت ہو جس کی میں بہت عزت کرتا ہوں۔ اتنی قدر کرتا ہوں کہ۔۔۔"

اس نے بات ادھوری چھوڑ کر بے اختیار گہرا سانس بھرا تھا۔ "اور یہ کیسے سوچ لیا تم نے کہ مجھے تم سے محبت ہی نہیں ہے۔ مجھے لگتا تھا کہ کم از کم تم وہ واحد ہستی ہو جو مجھے جانتی ہے۔ جسے مجھے کوئی وضاحت دینے کی ضرورت نہیں ہے۔"

براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا گیا تھا۔

زرمینے ہلکا سا مسکرائی تھی شرمندہ ہوئے بغیر۔

"آپ کی دوسری شادی کے بعد اگر میں کوئی انتہائی قدم اٹھا لیتی تو مجھے یہ اختیار نہ ملتا جو آج۔۔۔ ابھی۔۔۔ اس وقت ملا ہے۔ اور مجتبیٰ خان یہ میرا کمپرومائز نہیں تھا یہ میرا صبر تھا۔۔۔ اور صبر کرنے والوں کے ساتھ اللہ ہوتا ہے۔" اس نے بیٹی کو گود میں اٹھایا۔

"اور میں اپنی بیٹی کو صبر کرنا سکھاؤں گی۔ میں اسے سکھاؤں گی کہ اللہ کا ساتھ کیسے حاصل ہوتا ہے۔"

مجتبیٰ خان۔۔۔ بس اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

چاند کی روشنی میں عین لان کے وسط میں بیٹھا وہ وجود بہت نمایاں ہو رہا تھا۔ اس کے کندھوں پہ موجود شال کندھوں سے ڈھلک کر پہلو میں گری ہوئی تھی۔ ہاتھ میں موجود ماؤتھ آرگن سے ماحول کا سکوت ٹوٹ کر ارتعاش میں بدل رہا تھا اور ارتعاش دھن کی صورت سحر طاری کر رہا تھا۔

زرمینے نے مدھم سی دھن سنی تھی اور پھر کھڑکی کے پردہ ہٹا کر باہر دیکھا تھا۔ وہ لب صاف طور پر اس دھن کو سن سکتی تھی۔ ہزار بار کی سنی ہوئی غزل تھی مگر اب کہ وہ عجیب سے انداز میں دل پہ اثر کر رہی تھی۔

غزل میں اثر تھا یا بجانے والے کے انداز میں سوز زرمینے سمجھ نہیں سکی تھی۔

دشت تنہائی میں

اے جان جہاں لرزاں ہے

تیری آواز کے سائے

تیرے ہونٹوں کے سراب

زرمینے نے ہونٹ بھینچ کر اس وجود کو دیکھا۔ وہ کس قدر تکلیف میں تھا۔ وہ اندازہ کر سکتی تھی۔

زرمینے نے پردے بھینچ کر برابر کیے پھر وہاں سے ہٹ گئی۔

"خان!"

زرمینے نے پیچھے سے آ کر اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا اور ماحول کا ارتعاش پھر سے یک دم سکوت میں بدل گیا۔

"خان! زخم ناسور بن چکا ہو تو درد سہنے کا فائدہ؟ آپ جانتے ہیں کہ جو زخم ناسور بن جائے۔۔۔ اس کا علاج کیسے کیا جاتا ہے۔" ٹھہرے ہوئے انداز میں وہ بولی۔

"یہ میرے بس میں نہیں ہے۔ تمہارا صبر۔ زرمینے! تمہارا صبر میری محبت کو کھا گیا۔" ایک لمحہ توقف کے بعد وہ بڑے دکھ سے بولا۔

"خان!" زرمینے کو شدید رنج پہنچا۔ وہ گھوم کر اس کے قدموں میں بیٹھ گئی تھی۔ "آپ کو لگتا ہے کہ میں نے برا چاہا آپ کا؟ بددعا دی آپ کو۔۔۔ آپ کو لگتا ہے کہ میں ایسا کر سکتی ہوں؟" وہ اس کے گھٹنے پہ ہاتھ رکھے انتہائی غم سے بولی تھی۔

"میری بددعا تب لگتی۔ جب آپ نے مجھ سے بدسلوکی کی ہوتی' میرا حق مارا ہوتا۔"

مجتبیٰ نے ایک نظر اسے دیکھا تھا اور اسے ماننا پڑا کہ

دنیا کی وہ واحد عورت تھی جو اس کا کبھی بھی' کسی بھی حالت میں برا نہیں چاہ سکتی تھی۔ بددعا تو دور کی بات تھی۔

"ٹھیک کہا تم نے۔۔۔ مگر کبھی کبھی دوسروں کی غلطیوں کی سزا ہمیں بھگتنا پڑتی ہے۔"

وہ دور چاند کو دیکھ کر بات کر رہا تھا اور زرمینے سر اٹھا کر اسے دیکھ رہی تھی۔

"خان!" زرمینے نے اسے مدھم آواز میں پکارا۔

"جاؤ زرمینے! جا کر سو جاؤ۔" تھکی ہوئی آواز میں اس نے کہا۔

ایک گہرا سانس بھر کر زرمینے وہاں سے اٹھ گئی۔ جاتے جاتے یک دم اس کے قدموں کو کسی چیز نے جکڑا۔

وہ درد میں ڈوبی دھن

ڈھل گیا ہجر کا دن۔۔۔

آ بھی گئی

وصل کی رات۔۔۔

☼ ☼ ☼

اس کی آنکھوں کے نیچے کی جلد کا رنگ باقی جلد سے گہرا ہونے لگا تھا۔ بالوں کی ملائمت ختم ہو گئی تھی۔ آئی بروز بے ترتیب ہو چکے تھے۔ اسکن خراب ہونے لگی تھی۔

ایک ہی سوال کے دائرے میں گھومتے ہوئے۔۔۔ کیا ساری غلطی میری تھی۔

کیا میں اتنی غلط تھی؟

وہ مان نہیں رہی تھی کہ جو کچھ اس نے کیا وہ محض چند غلط فہمیوں کی بنا پہ تھا۔

وہ ہی ضدی طبیعت اور وہ ہی جذباتی پن۔۔۔ اور پھر جب یہ ہی سوال حیدر سے اس نے کیا تھا تو وہ کتنی ہی دیر تک اس کی شکل دیکھتے رہے تھے۔

"ہنی! زندگی میں بہت ساری ایسی حقیقتیں ہوتی ہیں جنہیں ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ ہاں! تم غلط تھیں اور اتنی غلط تھیں کہ کوئی اور مرد ہوتا تو اب تک تمہیں چھوڑ چکا ہوتا۔" گو کہ ان کا انداز تسلی بھرا تھا۔ مگر زر کو جیسے کرنٹ لگا تھا اور وہ بے ساختہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"نہیں ڈیڈی! کچھ غلطیاں مجھ سے ضرور سرزد ہوئیں لیکن وہ میرے ساتھ مخلص نہیں تھا۔ اس نے مجھے دھوکا دیا۔ ان فیکٹ اس نے مجھے کبھی بیوی کا درجہ ہی نہیں دیا۔"

"ہنی!" حیدر ملک نے اس کو دونوں کندھوں سے تھام کر بٹھانا چاہا۔

"نہیں ڈیڈی! میں ثابت کروں گی کہ میں غلط نہیں ہوں۔ میں اپنا بلڈ ٹیسٹ کرواؤں گی۔ پتا چل جائے گا کہ میرے بلڈ میں کسی پلز کے اثرات ہیں یا نہیں۔ آپ دیکھنا پھر۔۔۔ میں غلط نہیں ہوں۔" اس نے ان کے ہاتھوں کو کندھوں سے جھٹکا اور بھاگتی ہوئی اندر چلی گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

رپورٹ کا لفافہ اس کے ہاتھ میں تھا۔ رپورٹ دیکھنے سے پہلے صرف ایک لمحے کو اس نے سوچا تھا کہ اگر رزلٹ پوزیٹو نہ ہوا تو۔۔۔ اور اس کا دل بے اختیار ڈوبا تھا۔

اور پھر۔۔۔ ہمیشہ ویسا ہی نہیں ہوتا جیسا انسان اپنے ذہن میں سوچ کر بیٹھا ہوتا ہے۔

لفظ Negative نے رپورٹ سے باہر آ کر اس کے پچھتاووں میں اضافہ کر دیا تھا۔ اسے سچی محبت ملی لیکن اس نے خود اسے کھو دیا۔ اپنا گھر برباد کر لیا۔ اس کے دکھ کی انتہا نہیں تھی۔ اس کے پچھتاووں کی بھی حد نہیں تھی۔

وہ رپورٹ ایسا تھپڑ تھا جو اس نے خود اپنے منہ پر مارا تھا۔

وہاں بیٹھی وہ عورت۔۔۔ عورت نہیں رہی تھی۔ راکھ کا ڈھیر بن چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ روتی نہیں تھی۔ چیختی چلاتی بھی نہیں تھی۔ وہ بس خاموش ہو چکی تھی۔ پچھتاوے انسان کا وہی حال کرتے ہیں جو اس وقت زر مجتبیٰ کا ہو رہا تھا۔
پچھتاوا یہ نہیں تھا کہ اس نے کتنا غلط کیا۔ پچھتاوا یہ تھا کہ باوجود اس کے غلط کرنے کے 'مجتبیٰ نے کیا کیا تھا۔
یہ کون سا مقام تھا محبت کا۔
"زر! کل تمہارا سیشن تھا سائیکاٹرسٹ کے ساتھ۔ تم گئی کیوں نہیں بیٹا؟" حیدر ملک نے اس کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا تھا۔ ان کے سوال کرنے پر بے اختیار اس نے گہرا سانس بھرا تھا۔ سلیپنگ پلز' ٹرینکولائزرز' سائیکاٹرسٹ کے سیشنز' یہ سب چیزیں یکے بعد دیگرے اس پر اثر کرنا چھوڑتی چلی گئی تھیں۔
حیدر چند لمحے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے جواب کا انتظار کرتے رہے اور پھر مایوس ہو کر بہت دل گرفتی سے بولے تھے۔ "تم ابھی بھی اتنی ہی ضدی ہو۔"
"بات ضد کی نہیں ہے ڈیڈی' جو مرض مجھے لاحق ہے' اس کا علاج نہ ڈاکٹر کے پاس ہے اور نہ کسی دوسرے شخص کے پاس۔" اس نے بہت مدھم آواز میں کہا۔
"اور جس شخص کے پاس ہے۔ اس کا سامنا کرنے اور آنکھیں ملانے کی ہمت مجھ میں نہیں ہے۔"
یہ بات وہ کہہ نہیں سکی تھی۔ صرف سوچ سکی تھی۔
یک دم حیدر نے مجتبیٰ سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے جیب میں سے اپنے سیل فونز نکالے تھے اور پھر اپنا پرسنل سیل لے کر وہ اندر اپنے کمرے کی طرف چلے گئے تھے۔ جبکہ ان کا دوسرا سیل وہیں ٹیبل پہ پڑا تھا۔
انہیں یوں اٹھتا دیکھ کر زر حیران ہوئی مگر بولی کچھ نہیں تھی۔

وہ شاید یوں ہی کافی دیر تک ایسے ہی بیٹھے رہتی اگر حیدر کا سیل فون نہ بجتا تو۔
اس نے گردن موڑ کر کسی ملازم کو دیکھنا چاہا تاکہ وہ فون حیدر کو دے آئے۔ مگر وہاں۔ اس وقت کوئی ملازم نظر نہیں آیا تھا۔ فون مسلسل بج رہا تھا۔ ناچار اسے خود سے اٹھنا پڑا۔
سیل فون ہاتھ میں لیے وہ حیدر کے کمرے کی طرف بڑھی۔
اس سے پہلے کہ وہ دروازہ بجاتی اندر سے آتی آواز نے اسے سن کر دیا تھا۔
وہ وہیں پتھر کی ہو گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

مجتبیٰ اسلام آباد واپس آ چکا تھا۔ انتخابات ہونے والے تھے اور اس کی مصروفیات حد سے زیادہ بڑھ چکی تھیں۔
ابھی بھی وہ ذکا کے ساتھ چند اہم معاملات پر بات کر رہا تھا۔
"اب تو سب کچھ کلیئر ہو چکا مجتبیٰ! تم بھابھی کو واپس کیوں نہیں لے آتے؟"
اس سوال پہ بے اختیار اس نے سر اٹھا کر ذکا کو دیکھا تھا۔
"میں جانتا ہوں یہ پرسنل بات ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ مجھے اتنی مداخلت کی اجازت اور حق ہے۔" اس کے یوں دیکھنے پر ذکا بے اختیار بولا تھا۔
"میں نے اسے گھر آنے سے منع تھوڑی کیا ہے۔ وہ اس کا گھر ہے' جب جی چاہے آئے۔" اسے سامنے پڑے پیپرز میں اچانک ہی دلچسپی پیدا ہوئی تھی۔
"اور تمہیں لگتا ہے کہ وہ خود سے آ جائیں گی؟" ذکا کا انداز تھوڑا چبھتا ہوا تھا۔
اس سے پہلے کہ وہ اسے کوئی جواب دیتا۔ اس کا سیل فون بجنے لگا تھا۔
نمبر دیکھ کر وہ حیران ہوا۔

"السلام علیکم!" اس نے فوراً ہی فون اٹھایا۔
"وعلیکم السلام۔ کیسے ہو مجتبیٰ!" اسے حیدر کی آواز میں کچھ محسوس ہوا تھا۔ مگر وہ ٹھیک اندازہ نہیں کر پایا تھا۔
"خیریت۔ آپ نے فون کیا؟" حیدر کے سوال کے جواب کے بجائے اس نے سوال کیا۔
"نہیں! خیریت نہیں ہے مجتبیٰ!" اور مجتبیٰ بے ساختہ کرسی پہ سیدھا ہو کر بیٹھا تھا۔
"زر کی حالت بہت خراب ہے مجتبیٰ! کیا تم اس سے ملنے آ سکتے ہو پلیز۔"
ایسا سوال تھا جس نے اسے عجیب مشکل میں پھنسا دیا تھا۔
اور اس سے پہلے وہ کوئی جواب دیتا اچانک اسے فون میں سے کوئی شور سا سنائی دیا تھا اور۔

☆ ☆ ☆

تیزی سے دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوئی تھی۔
"ڈیڈی! پلیز۔ مری نہیں ہوں میں' ابھی زندہ ہوں۔ میں اس سے نظریں ملانے کے قابل نہیں اور آپ مجھ سے ملنے کو کہہ رہے ہیں۔"
مجتبیٰ نے اسپیکر سے ابھرتی وہ نم آواز سنی تھی۔ وہ جانتا تھا۔ وہ رو رہی ہو گی۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ تکلیف میں ہو گی۔
آج بھی اس کے رونے کا سوچ کر اسے ویسی ہی تکلیف ہوئی تھی۔
ہونٹ بھینچ کر اس نے سیل فون آف کر کے اسے ٹیبل پہ پھینکا تھا۔ ذکا نے حیرت اور پریشانی سے اسے دیکھا تھا۔ وہ اب ماتھے پہ تیوریاں لیے ہاتھ کی بند مٹھی ہونٹوں پہ رکھے بیٹھا تھا۔
"کیا ہوا۔ کس کا فون تھا؟"
"حیدر صاحب کا۔"
"کیا کہا؟"
"کہہ رہے تھے کہ ملنے آؤ۔ زر سے۔ حالت خراب ہے اس کی۔"
"تو پھر۔"
"پھر؟" وہ پھٹ پڑا تھا۔ "کیا اتنا آسان ہے یہ۔ کیا میں انسان نہیں ہوں۔ مجھے تکلیف نہیں ہوتی کیا؟ یا پھر میں درد کو محسوس کرنے سے عاری ہوں۔" وہ دونوں ہاتھ ٹیبل پہ مار کر بول رہا تھا۔
"ریلیکس یار! اب تک جو کچھ بھی ہوا اس سب کے جواب میں تمہارا ری ایکشن بہت کول تھا۔ اسی وجہ سے حیدر صاحب نے۔"
"ری ایکشن کول تھا۔ ہونہہ۔ وہ کول ری ایکشن نہیں تھا ذکا۔ وہ۔ وہ چیز تھی جسے "محبت کا تقاضا" کہا جاتا ہے۔"
"اور اب یہ محبت کہاں ہے؟"
"کیا محبت صرف میں نے کی تھی۔ اب جب کہ سب کچھ واضح ہو چکا ہے تو کیا اسے کچھ نہیں کرنا چاہیے۔ وہ کیا ہر چیز سے آزاد ہے؟" ذکا خاموشی سے اسے دیکھ رہا۔
"میں اسے چھوڑ نہیں سکتا۔ اس معاملے میں بے بس ہوں میں' مگر حقیقت یہ بھی ہے کہ جو تکلیف اس نے مجھے پہنچائی ہے اس کے لیے تو۔ ابھی میں اس کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتا۔" اس کے اندر کا غم اور غصہ اب اس کی شکل پر صاف نظر آ رہا تھا۔
"او کے!" ذکا اس کے سامنے سے پیپرز اٹھائے اور وہاں سے چلا گیا۔ جاتے جاتے اس نے مجتبیٰ کو سگریٹ سلگاتے دیکھا اور اس کا دل بے تاسف سے بھر گیا۔

☆ ☆ ☆

"ہیلو۔ ہیلو مجتبیٰ!۔" انہوں نے دو تین دفعہ پکارا مگر سیل فون بند ہو چکا تھا۔ انہوں نے تھک کر زر کی طرف دیکھا تھا۔ اس کی مداخلت کی وجہ سے وہ اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے اور فون کٹ گیا تھا۔
"مجھے اس سے نہیں ملنا ڈیڈی! ایسے کیسے۔"
"تو کیا ساری عمر یوں ہی گزارو گی اب؟" انہوں نے

زر کی بات کاٹی تھی۔

"ساری عمر کو چھوڑیں ڈیڈی۔ عمر کے اس فیز کی بات کریں۔ یہ اگر گزر گیا تو عمر گزارنا کون سا مشکل کام ہوگا۔"

"زر۔"

"مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے ڈیڈی۔ میں کہاں سے لاؤں وہ حوصلہ جس سے میں اس کا سامنا کر پاؤں۔"

حیدر نے بے بسی سے اسے دیکھا تھا۔ زندگی میں کبھی بھی اس نے کسی کی کوئی بات نہیں سمجھی تھی۔

وہ اب بھی ایسی تھی۔

باپ کی نظروں سے بچنے کے لیے وہ اپنے کمرے میں چلی آئی۔ کمرے تک آتے آتے اس کے آنسوؤں میں روانی آچکی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ یہاں سے دور جانا چاہتی تھی سو جا رہی تھی۔

اسلام آباد کی سڑکوں پہ سے گزرتے ہوئے کیا کچھ یاد نہیں آیا تھا اسے۔ کیا کچھ تھا جو وہ چھوڑے چلی جا رہی تھی۔ کوئی زیاں سا زیاں تھا اور پھر جیسے ہی گاڑی ایئرپورٹ کے پاس پہنچی۔

"روکو۔ گاڑی روکو۔" اسے پتا نہیں کیا ہوا تھا کہ یک دم اس نے ڈرائیور سے کہا۔

ڈرائیور نے گاڑی روک کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

اور وہ اگلی سیٹ کی پشت پکڑے، نظریں جھکائے، ہونٹ بھینچے جیسے کسی مرحلے سے گزر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

اسے گھر آتا دیکھ کر سب ملازمین اتنے حیران ہوئے تھے کہ جو جہاں پہ تھا وہیں کا ہو کر رہ گیا تھا۔

صرف سیما گل تھی جس نے اس کے ہاتھ سے بیگ لے کر پہلے اس کا ہاتھ چوما پھر آنکھوں سے لگایا تھا۔

"خوش آمدید بی بی۔ گھر آنا مبارک ہو۔"

زر نے ہونٹ بھینچ کر آنسوؤں کو گلے سے نیچے اتارا۔

یہ وہی سیما گل تھی جس کے بارے میں اسے شک نہیں یقین تھا کہ وہ اسے پلز کھلاتی رہی ہوگی۔

وہ خاموشی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھی تھی۔

بیڈ روم کا دروازہ کھولتے ہوئے کتنی ہی یادوں نے اس کا استقبال کیا تھا۔ ہینڈل پہ اس کی گرفت منجمد ہوئی تھی اور بے اختیار اس نے آنکھیں بند کی تھیں۔ آنکھوں کے بند ہونے سے آنسوؤں کا رستہ کھلا تھا۔

وہ اس کے سامنے بیٹھا جوتے اتار رہا تھا اور اس سے مسکرا کر کہہ رہا تھا۔

"کیا نظروں سے کھانے کا ارادہ ہے؟"

دروازہ بند کر کے اس نے دروازے سے ٹیک لگائی تھی۔

وہ اب دراز میں سے کچھ ڈھونڈ رہا تھا اور وہ اسے غصے سے دیکھ رہی تھی۔

اور زر دروازے کے ساتھ بیٹھتی چلی گئی تھی۔

اب کہ وہ کہیں جا رہا تھا اور بیڈ پہ اے ٹی ایم اور کریڈٹ کارڈز نکال کر رکھ رہا تھا۔ زر کے آنسو اب سسکیوں سے بہنے لگے تھے۔

پھر اس نے کسی پراپرٹی کے پیپرز زر کو پکڑائے تھے۔ اور اس کے ساتھ ہی جیسے زر کو ہوش آیا تھا۔

وہ اٹھی اور تیزی سے الماری کی طرف بڑھی تھی الماری کے دونوں پٹ کھول کر اس نے دیکھا تھا۔

اس کی جیولری۔ پراپرٹی کے پیپرز۔ اے ٹی ایم' کریڈٹ کارڈز۔ سب کچھ وہیں رکھا تھا۔

تکلیف کچھ اور بڑھی تھی۔

جیولری کے ڈبوں کے ساتھ اس نے ایک اور ڈبا بھی لاکر میں پڑا دیکھا تھا۔ وہ کوئی نیا کیس تھا۔

اس نے وہ کیس کھول کر دیکھا۔

اس میں جوڑے میں لگانے والی ڈائمنڈ پنز تھیں۔

وہ جانتی تھی کہ مجتبیٰ کو اس کے بالوں کا جوڑا کرنا اچھا لگتا تھا۔

وہ کیس ایک شاپنگ بیگ میں تھا اور اس شاپنگ

بیگ میں سے بل بھی نکلا تھا۔

بل پہ تاریخ موجود تھی اور وہ تاریخ اور شاپ کا نام پڑھ کر زر کو لگا جیسے ساتوں کے ساتوں آسمان اس کے سر پہ ٹوٹ پڑے ہو۔

وہ یہ اس کے لیے تب لایا تھا جب وہ دبئی سے واپس آیا تھا۔

مرد کی محبت خالص سونے جیسی ہوتی ہے جس میں جب تک تانبے کی ملاوٹ نہ ہو کوئی زیور کوئی خوب صورت چیز بن ہی نہیں پاتی مگر مجھے وہ مرد دیا گیا وہ محبت دی گئی جس میں کسی ضرورت کے تانبے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔

آہ کہ میرا بے صبراپن... میری ناشکری۔

وہ اب سر پہ ہاتھ رکھ کر رو رہی تھی۔

اور ہر وہ عورت سر پہ ہاتھ رکھ کر ہی روتی ہے جسے "صبر" کرنا نہ آتا ہو۔

✡ ✡ ✡

بارش یوں برس رہی تھی جیسے آج کے بعد برسنے کا ارادہ نہ ہو۔

سفید فراک اور چوڑی دار پاجامے میں وہ بے حد اداس اور غمگین نظر آرہی تھی۔

کھلے بالوں کو جوڑے کی شکل میں لپیٹے ہوئے وہ بالکونی سے ہٹ کر کرسی پہ بیٹھ گئی تھی۔ وہ لاشعوری طور پر سیما گل کی چیختی آواز سننے کی منتظر تھی۔ مگر کوئی بھی چیختی آواز نہیں سنائی دی تھی۔ کسی نے اس سے نہیں کہا تھا۔

"بی بی... خان جی...!" اور دل میں اٹھتا درد تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

اسے یاد تھا وہ دن۔ جس دن وہ گھر آئی تھی اور سیما گل نے فوراً "مجتبیٰ" کو فون کیا تھا۔

"خان جی... بی بی آئی ہیں!"

اور خان جی نے "ٹھیک ہے۔" کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔

"تم سے صبر نہیں ہوا سیما گل۔" سیما گل کے مڑنے پہ زر نے اداسی سے کہا تھا۔

اور اس دن سے وہ انتظار میں تھی۔

راتوں کو سوتے ہوئے یونہی بیٹھے ہوئے اچانک اسے لگتا کہ جیسے کوئی گاڑی گیٹ سے اندر داخل ہوئی ہے اور جب وہ دوڑ کر دیکھنے جاتی تو...

چوکیدار اسے دیکھ کر تاسف سے نفی میں سر ہلا دیتا۔

ابھی بھی اس برستی بارش میں اسے گمان گزرا کہ گاڑی گیٹ سے اندر داخل ہوئی ہے۔ مگر اب بھی وہ اس کا واہمہ تھا۔

وہ جانتی تھی اسے انتظار کرنا ہے۔

اب کے مقابلہ زر مینے کی خوب صورتی سے نہیں اس کے صبر سے تھا اور اسے ثابت کرنا تھا کہ وہ بدصورت عورت نہیں ہے۔

وہ جانتی تھی کہ مجتبیٰ ضرور اس تک آئے گا مگر زخموں کے مندمل ہونے میں کچھ وقت تو لگتا ہی ہے۔

آنکھوں کی نمی پھر سے بڑھنے لگی تھی۔ پھر وہ تھک کر وہاں سے اٹھ کر جانے لگی تھی کہ اسے گاڑی کے رکنے کی آواز سنائی دی۔

وہ مڑی اور تیزی سے بھاگ کر بالکونی سے جھک کر دیکھا تھا۔

"میرے خدا۔" سانس نے آنے سے انکار کیا تھا اور دل نے دھڑکنے سے... سیاہ لینڈ کروزر پورچ میں کھڑی ہو چکی تھی۔ وہ ان ہی قدموں سے مڑی اور بھاگی اور سیڑھیاں اترتے ہوئے لمبا سا ہال عبور کیا مگر اس سے پہلے کہ دروازہ کھلتا۔ وہ ایک جھٹکے سے رک گئی تھی۔ یوں جھٹکے سے رکنے سے بندھے بال کھل گئے تھے۔

"کیا وہ اس کا سامنا کر سکتی ہے۔ کیا وہ ایسا کر پائے گی۔"

اس کا جی چاہا کہ وہ دنیا کے کسی کونے میں جا چھپے مگر اس شخص کا سامنا نہ کرے۔

"کہاں آٹھ ماہ کا انتظار اور کہاں اب یہ حالت..."

وہ مڑنے لگی تھی مگر۔

اس سے پہلے کہ وہ کوئی قدم اٹھاتی۔ کچھ سوچتی یا سمجھتی اچانک دروازہ کھل گیا تھا۔

آف وائٹ کلف لگے سوٹ میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تھا۔

وہ آج بھی ایسا ہی تھا کہ زر بے اختیار اسے دیکھتی چلی گئی تھی اور وہ... وہ بھی ہینڈل کو پکڑے ساکت تھا۔

اور پھر۔ چند لمحوں بعد مجتبیٰ دروازہ بند کر کے اندر آیا تھا۔

زر بری طرح گھبرائی تھی۔ بے ساختہ وہ ایک قدم پیچھے ہٹی تھی اور اس نے نظریں اور سر۔ دونوں جھکائے تھے۔

وہ وہیں دروازے پہ کھڑا تھا اور وہ ذرا فاصلہ پہ سر جھکائے کھڑی تھی۔

اور یہ فاصلہ کس کو طے کرنا تھا؟ زر جانتی تھی یہ اب اسی کا کام تھا۔ وہ مرد تھا۔ اس نے مرد ہونے کا ثبوت دیا تھا۔

وہ اس سے محبت کرتا تھا سو وہاں موجود تھا اور زر اپنے پیروں کو زمین پر جمانے کی بھرپور کوششوں میں تھی۔

اور وہ کتنے سکون سے کھڑا تھا۔

دو قدم کا فاصلہ... پل صراط بن گیا تھا۔

اسے ہی آگے بڑھنا تھا' سو وہ بڑھی تھی۔

ایک قدم اٹھاتی اور اسے یوں زمین پہ مضبوطی سے رکھتی جیسے ایسا نہ کیا تو گر جائے گی۔

وہ اس تک پہنچنے میں کامیاب ہو ہی گئی تھی اور اس کے بالکل سامنے جا کر دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے وہ گھٹنوں کے بل زمین پہ بیٹھ گئی تھی۔

مجتبیٰ بھونچکا رہ گیا۔

فوراً آگے بڑھ کر اس نے اس گرے ہوئے وجود کو اٹھایا تھا۔ کندھوں سے پکڑ کر اسے کھڑا کرتے ہوئے اس نے زر کو اپنے ساتھ لگایا تھا۔

دونوں ہاتھوں کو مٹھیوں کی شکل اس کے سینے پہ رکھے وہ کسی بچے کی طرح گھٹی ہوئی سسکیاں لے رہی تھی۔

چند لمحے اسی طرح گزرے تھے اور پھر اس نے زر کو خود سے الگ کیا۔ اس کے نم گالوں کو ہاتھوں سے خشک کیا۔

"تمہیں پتا ہے تمہارے رونے سے کتنی تکلیف ہوتی ہے مجھے؟" اسے جیسے بتایا گیا تھا۔

زر کے گال پھر سے گیلے ہونے لگے تھے اور وہ نظریں جھکائے سر جھکائے کھڑی تھی۔

وہ جانتی تھی کہ یہ نظریں... یہ سر اب کبھی اس شخص کے سامنے اٹھ نہیں سکے گا۔ گو کہ وہ آگیا تھا گو کہ زندگی پھر سے شروع ہونے والی تھی مگر وہ وقار... وہ عزت گم ہو چکی تھی۔

زر جانتی تھی کہ اسے اب بہت محنت کرنا تھی اپنی زندگی کو نارمل بنانے کے لیے ان زخموں کو مندمل کرنے کے لیے اور شاید کہ وہ اب کبھی نارمل زندگی نہ گزار سکے اور شاید کہ وہ اس خلیج جتنے فاصلے کو نہ مٹا سکے۔

اور شاید کہ وہ ایسا کر بھی لے۔

کسے معلوم تھا۔

مگر ایک بات طے تھی۔

اسے صبر کرنا تھا اور صبر کرنے میں زہر کا تریاق بننے میں۔

دست شفا ہونے میں۔

"ابھی کچھ وقت باقی تھا۔"

ناولٹ

سائرہ رضا

۱۹۶۶ صدی
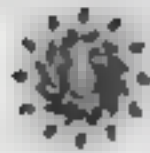
"یہ تو خیر نیا گھر ہے سو سب کچھ نیا ہو گا مگر میری تو پرانی عادت ہے' رمضان کے آغاز سے پہلے بلکہ شب رات سے پہلے ہی تمام گھر کی صفائی ستھرائی' وائٹ واش اور سیٹنگ ارینجمنٹ دیکھ لیتی ہوں۔ اب رمضان المبارک ان کاموں کے لیے تو ہے نہیں۔ مجھے تو حیرت ہوتی ہے ان لوگوں پر جو رمضان میں کام چھیڑے بیٹھے ہوتے ہیں۔"

مسز سحرش کی مصنوعی عاجزی وانکساری سے لتھڑی زبان سے گویا شیرہ ٹپک رہا تھا۔

"بالکل درست! صحیح کہہ رہی ہو۔" تینوں دیرینہ دوستوں نے ہاں میں ہاں ملائی۔ وہ اسی لیے آئی تھیں۔ لش لش کرتا' چمچماتا خوب صورت گھر نگاہوں کو تراوٹ دے رہا تھا۔ ذوق اور شوق دونوں کا مناسب امتزاج ہر شے سے خوب صورتی بن کر جھلک رہا تھا۔ کچن یوں تھا جیسے کسی غیر ملکی میگزین کا چکنا صفحہ۔ ڈرل مشین چلنے اور کیل ٹھونکے جانے کی آوازیں وقتاً "فوقتاً" سنائی دے رہی تھیں۔

سحرش کی دوست فائقہ اس گھر سے کئی گنا بڑے اور خوب صورت گھر میں رہتی تھی مگر وہ تین بھائیوں اور ساس سسر کی مشترکہ ملکیت تھا۔

سحرش جیسی راج دھانی تو نصیبوں والی کو ملتی ہے۔

عاصمہ کے میاں کسی یوریا کمپنی میں ملازم تھے۔ وہ کمپنی کمپاؤنڈ کے اے کلاس میں رہائش پذیر تھی!

تیسری دوست اور سحرش کی کولیگ تسنیم۔ طلاق یافتہ تین بچوں کی ماں تھی۔ وہ اپنے والد کے گھر میں بھائی بھابھیوں کے ہمراہ خوب گھٹ کے رہتی تھی۔ سب کے سینے میں مونگ دل کر خوش ہوتی مگر کڑھن کا لمحہ بہ لمحہ بڑھتا احساس چہرے پر نمایاں نہ ہو اس تگ ودو میں وہ مسلسل تعریفی و تنقیدی تبصرے کر کے خود کو لاپروا ظاہر کرنے میں کامیاب تھی۔

یہ دو ہزار بارہ کی ماڈرن پڑھی لکھی خواتین تھیں۔ صوفے پر نزاکت سے بیٹھی کھانے پینے کی چیزوں سے انصاف کر رہی تھیں۔ برانڈڈ پرس زمین پر پیروں کے پاس پڑے تھے۔ ہاتھوں میں بڑی اسکرین کے ٹچ موبائلز۔

وہ دانت پیس پیس کر مسکراتے ہوئے مسلسل سحرش کو سراہ رہی تھیں۔ ذوق کی مدح' شوق کے لیے واہ' واہ۔

"میں نے ڈرائنگ روم کا سامان ادھر گول کمرے میں سیٹ کروا دیا کچھ یہاں کامن میں اور ان سے صاف کہہ دیا کہ جب اتنا کچھ کیا ہے تو پلیز ڈرائنگ روم از سرنو سیٹ کردیں۔ یہ تو ٹال رہے تھے کہ صبر کرو۔ ذرا ٹھہر جاؤ مگر میں اڑ گئی کہ کیوں نہ ہوں۔ ان کی مان کر میں وہی سامان رہنے دیتی تو پھر کامن اور گول کمرے کے لیے نیا سامان لینا پڑتا۔ تو بہتر نہیں ڈرائنگ روم ہی کے لیے لیا جائے۔ پھر پہلے ڈرائنگ روم چھوٹا تھا اب کی بار ڈبل ہوگیا۔ یہ ٹھوکا ٹھاکی دو تین روز میں مکمل ہو تو لائیں گے پھر۔ تم یہ کباب ٹرائی کرو نا پلیز۔" ساتھ ہی آداب میزبانی بھی نبھائے۔

"اوہو پلیز سحرش! اتنا ہیوی ہو جائے گا۔ یہ بہت زیادہ ہے۔"

فائقہ اور تسنیم اپنی پلیٹ پیچھے کرکے انکاری ہوئیں۔ عاصمہ نے بہت نزاکت سے خود ہی فروٹ سلاد لے لی' مبادا وہ "جبرا" نہ ڈال دے۔ تینوں سارا سال بلکہ سحرش بھی ڈائٹنگ پر رہتی تھیں۔ تواضع کے لیے پیش کی گئی تمام اشیا ان کے ڈائٹنگ شیڈول سے ہٹ کر تھیں۔ آٹھ سے نو آئٹم اور انہوں نے سب کو بس اسی قدر لیا تھا جیسے نمک چیک کرنے کو تین چاول کے دانے زبان پر رکھتے ہیں۔

ویسے تمہارا یہ ڈرائنگ روم کا پچھلا سامان بھی بالکل نیا نکور ہے۔ کوئی نہیں مانے گا کہ ایک سال سے استعمال ہو رہا تھا۔" تسنیم کی عادت تھی وہ سحرش کی تعریف کرکے فائقہ کو سنا رہی تھی۔ ایک ہی محفل میں خوب ہنستے بولتے ایک کی مدح سے دوسرے کی تضحیک کا پہلو کیسے نکالتے ہیں' وہ چاروں اس فن میں طاق تھیں۔

تسنیم کے متوجہ کرنے پر وہ سب صوفے میز اور دیگر آرائشی سامان کو بغور دیکھنے لگیں۔ تب ہی فائقہ نے ہلکی سی چیخ ماری۔ اس کی نگاہ صوفے کی آڑ میں پڑے جست کے ٹرنک پر پڑ گئی تھی۔

"یہ کیا ہے تم لوگ ایسے کبھی یوز کرتے ہو؟"

سحرش نے دل کھول کر قہقہہ لگایا اور ذرا سا آگے ہو کر ٹرنک گھسیٹ لیا۔

"یہ تو اماں جی کا صندوق ہے۔ اور اسٹور میں رکھوانے کے لیے نکالا تھا۔ اس میں ان کی کتابیں اور وہ تمام خطوط حسابات اور ڈائریاں ہیں' جو شادی کے بعد سے ان کے استعمال میں رہیں۔ جب تک میرے فادر ان لا زندہ رہے بلکہ بعد کی بھی کچھ ڈائریاں ہیں۔ ایاز کو بہت انسیت ہے ان چیزوں سے... بلکہ ان کا قرآن پاک تو ہمارے ڈرائنگ روم میں ہمیشہ ہی رکھا گیا ہے اور اب بھی رکھا جائے گا۔ اس معاملے میں کوئی بات نہیں سنتے اور مجھے بھی کیا اعتراض... برکت رہتی ہے اور وہ تو ماشاء اللہ اتنی نیک پاک باز نمازی' پرہیزگار خاتون تھیں ابھی میں ان ہی کے خطوط پڑھ رہی تھی۔ دیکھو تو ذرا' کتنی خوب صورت موتیوں جیسی لکھائی ہے۔"

سحرش نے اوپر پڑی تھیلی کھول کر ایک فائل سی نکال لی۔

"واقعی!" تسنیم کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"پوری آٹھ کلاس پاس تھیں۔" سحرش کے پاس فخر کرنے کو یہ جملہ بھی تھا۔

"آٹھ کلاس!" عاصمہ کو جیسے اچھو لگا۔ انداز کسی حد تک تضحیک آمیز تھا۔

"سن 50 کا آٹھ کلاس آج کے سولہ سے زیادہ قابلیت کا حامل ہوتا تھا۔" سحرش کے چہرے پر شدید ناگواری آگئی۔

"آئی ایم سوری۔" تسنیم اور فائقہ کو ہاں میں ہاں ملاتے دیکھ کر اسے فورا" غلطی کا احساس ہوا۔ جب تین لوگ ہم خیال ہو جائیں تو غلطی تسلیم کرنا ہی بہتر ہوتا ہے۔

"ہاں بھئی اس زمانے میں تعلیم ہوتی تھی اب تو فقط ڈگری ملتی ہے اور وہ بھی جعلی۔" فائقہ اور تسنیم کے جملوں پر کمرا قہقہوں سے گونج اٹھا۔

"میں پڑھوں ان کو...؟" تسنیم کو اشتیاق ہوا۔

کوئی برا تو نہیں مانے گا؟"

"ارے واہ کیوں؟" سحرش نے ترنت کہا۔ وہ بصد شوق فائل کھول رہی تھیں۔

"یہ میری نندوں ہی میں سے کسی نے ترتیب وار رکھے ہیں۔ ایاز کہتے ہیں۔ اماں جان کے خطوط تو کتابی شکل میں شائع ہونے چاہئیں اور سچ کہوں' صحیح کہتے ہیں۔ آسان زبان شائستگی محبت مروت' سب ہے۔ جب پہلی بار ایاز نے کہا کہ ان کو پڑھو تو سچ میں تو پریشان ہوگئی مگر بہت دلچسپ ہیں۔

"آج شاید پانچ سال بعد یہ ٹرنک کھلا ہے۔ اماں کے انتقال کے وقت بڑے بھائی صاحب کے گھر رہا اور جب علیحدہ ہوئے ایاز نے بہت ضد سے اس ٹرنک کو اپنے قبضے میں کرلیا۔ جیٹھ تو مان ہی نہیں رہے تھے مگر یہ چھوٹے ہیں تو..."

"بھئی تمہاری ساس اچھی رہیں اپنی زندگی میں سب کو آزادی دی' حساب کتاب الگ کیا۔ ہماری طرح تھوڑی۔" فائقہ کے اپنے دکھڑے تھے۔

"بھئی ان کے کیا کہنے بڑی ہی بیلنس شخصیت تھیں۔ لحاظ مروت' دریا دلی' ساری زندگی بس دو جوڑے بنائے مگر سارا سال غریب بچیوں کے جہیز جوڑا کرتی تھیں۔ ایاز بتاتے ہیں۔ دال سبزی کھلا کر جوان کیا۔ پڑھائی پر آنکھ بند کرکے پیسے لگاتی تھیں یا پھر اللہ کی راہ پر' ہاں سونے کے زیورات کی بہت شوقین تھیں۔ فوت ہوئی تھیں تب بھی بالوں میں سونے کی پنی لگی تھیں کڑے اور بالے ہم نے خود دیکھ رکھا تھا نا تسنیم؟" سحرش کے پاس تفاخر کا یہ پہلو بھی تھا۔

☆ ☆ ☆

"از عیسیٰ پور... رجب المرجب
جناب من... السلام علیکم
ڈرتے ڈرتے آپ کا مکتوب کھولا' بہت سوچ سمجھ کر اپنا مسئلہ آپ کے آگے بیان کیا تھا۔ آپ کی عقل و فہم پر یقین کامل رہا ہمیشہ سے مگر اندیشہ تھا کہ آپ مجھ ناچیز سے ناراض نہ ہوگئے ہوں۔ ساری دنیا میری عقل کو سلام کرتی ہے (دنیا کی رائے ہے) مگر میں جانتی ہوں۔ میری عقل و تدبر کا اختتام آپ کا آغاز ہوتا ہے۔ اللہ جل شانہ خود کہہ چکے ہیں' مرد و عورت برابر ہیں مگر مرد کو کچھ معاملات میں برتری حاصل ہے اب اللہ کے منکر تو بن نہیں سکتے۔

الحمد للہ' ہم اللہ ہی کو تمام کرنی کا ذمہ دار مانتے ہیں بس بات ختم...

آپ سے یہی تو کہا تھا ناں کہ اب ماشاء اللہ سے سعیدہ اور فہمیدہ اردو پڑھنے کے لائق ہوگئی ہیں۔ پہلے میں خط پڑھ پڑھ کر سناتی تھی تو سارے بچے بصد اشتیاق میرے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ جاتے تھے کہ امی ابا جان کا خط پڑھ کر سنا رہی ہیں۔ جہاں جہاں جس بچے کا ذکر ہوتا' وہ اس لائن پر انگلیاں پھیر کے یہ قیاس کیے تھے گویا اپنے پیارے ابا جان کا لمس پا رہے ہوں۔

اکیلے اشتیاق کو تو میں ایک گھرکی سے سیدھا بیٹھنے پر مجبور کردیتی تھی کہ آرام سے خط سنے مگر جب آپ کی لاڈلی صاحبزادیاں بھی اس کے ساتھ مل گئی ہیں کہ آپ پڑھ کر نہ سنائیں' اب ہمیں خط پڑھنا آگیا ہے۔

سب سے پہلے آپ کا میرے لیے جان من لکھنا۔ آخر آپ مجھے اس طرح کیوں مخاطب کرتے ہیں۔ میں جانتی ہوں' میں آپ کے اور آپ میرے لیے کیا ہیں؟ پھر کہنے کی کیا ضرورت لیکن خیر اس معاملے میں آپ اپنی رائے میں واضح ہیں دو ٹوک۔ لکھتے رہیے۔ میرے روکنے سے رکنا تھوڑی ہے لیکن اب مانیں' میں نے اپنے ہاتھوں اپنے پیروں پر کلہاڑی مارلی کہ بچوں کے لیے علیحدہ علیحدہ خط... اب تو نہ کرنے والی باتیں بھی آپ کرلیں گے۔ کہنے سوچنے والی باتیں بھی لکھ ڈالیں گے۔

اور اب آپ کو کن الفاظ میں بتاؤں' بچے آپ کے بطور خاص ان کے لیے لکھے خطوط سے بے حد خوش ہوئے۔ خوشی مسرت اور استعجاب نے ان کے چہروں کے رنگ اور آنکھوں کی چمک اتنی بڑھادی تھی کہ

ستارے شرماتے ہیں۔

بچوں کی وہ خوشی اور تفاخر بیان کرنا مشکل ہے آپ بس اندازہ لگائیے۔

نئی تازہ کوئی میرے پاس فی الوقت نہیں ہے۔ چھوٹے بڑے مسئلے مسائل تو ہر صبح اٹھتے ہی ہیں۔

اباجی نماز فجر کے بعد چکر لگانا نہیں بھولتے۔

شکوہ یہ ہے کہ جب ڈاکٹر کی بیوی بغیر کسی محنت و ڈگری کے ڈاکٹرنی کہلا سکتی ہے اور ماسٹر کی ماسٹرنی تو پھر غازی کی بیوی کے لیے بھی ایسا کوئی تخاطب ہونا چاہیے۔ میں چاہتی ہوں لوگ میرا نام سنتے ہی جان لیں کہ میں ساجدہ مشکور ہوں۔ 65ء کی جنگ کے غازی چوہدری مشکوردین کی بیوی۔

آپ ہنس رہے ہیں۔ تو میں ہر نئے ملنے والے کو پہلے ہی بتا دیتی ہوں کہ میرے شوہر نے بی آر بی نہر کی حفاظت کیسے سینہ تان کر کی۔

آپ یہاں کی فکر مت کریں یہاں میں ہوں۔ سب لوگ ہیں۔ اباجی بھائی جی۔ آپا اور باجی بھی آتی ہیں۔ چھوٹی بھی ہر شام کو لازمی چکر لگاتی ہے۔ آپ بس! اپنا پورا دھیان اپنی ذمہ داری پر لگائیے۔ برا وقت گزر گیا کامیابی کے تمغے کے ساتھ۔ مگر یہ فتح کے نشے میں مست ہو کر ہوش و خرد سے بیگانہ ہونے کا وقت نہیں۔ اتنی اندوہناک شکست کو اگلے بھولیں گے نہیں۔ یہ پھر آئیں گے زیادہ تیاری کے ساتھ۔ دوتم پالا اس بار پھر بنیے سے پڑا ہے جسے پشت سے وار کرنے میں کمال حاصل ہے۔ سینہ تان کر سامنے آنا ان کی سرشت ہی نہیں۔

آپ سب کو ذہنی اور جسمانی اعتبار سے ہر پہلو کو مد نظر رکھتے ہوئے ہر وقت حالت جنگ میں رہنا پڑتا ہے۔ آپ اپنی توجہ انہی عناصر پر مرکوز رکھیں۔ یہاں میں ہوں ناں۔

بتانے والی بات نہیں مگر خط مکمل کرتے ہی میں جواب کا انتظار شروع کر دیتی ہوں۔

اجازت دیں۔ خداوند کریم آپ کو اپنے مقصد میں کامیابی عطا فرمائے (آمین)

آپ کی شریک حیات
خوشیوں اور غموں کی ساتھی
ساجدہ مشکور

✡ ✡ ✡

از عیسیٰ پور
شعبان المعظم
محترم جناب مشکور چوہدری صاحب
السلام علیکم

آپ کو میرے تخاطب ہی سے میری شدید ناراضی کا علم ہو گیا ہو گا۔ میں مانتی ہوں کہ میں بچوں کے حوالے سے کچھ تنگ نظر ہوں۔ آپ ہیں ماڈرن۔ آپ کی اپنی سوچ۔

سب سے پہلے آپ ہی نے اشتیاق کو میلے میں لے جانے کی اجازت دی۔ میں تو سخت خلاف تھی لیکن چلو چچا، بھتیجا گھوم آئیں۔ مگر اب سن لیں آپ: سپوت تختی پر گاچی رگڑے اور ساتھ ساتھ گائے۔ رم جھم رم جھم پڑے پھوار۔ تیرا میرا نت کا پیار

لاحول ولا۔

سبق سو بار ہل ہل کر پڑھنے سے بھی یاد نہ ہوا اور ایک ہی چکر میں گانا یاد ہو گیا۔ میں نے ڈنڈا اٹھایا۔ غضب خدا کا بنیں پاس بیٹھی تھیں اور نت کا پیار۔

دوتم! آپ نے وعدہ کر لیا سائیکل لے کر دینے کا۔ غضب خدا کا مجھ سے تو خط لکھتے وقت وہ ایسی فرمائشیں کرتے ہی تھے۔ اگر میں لکھنا شروع کر دیتی تو بس پھر تنخواہ ہاتھ میں آتے ہی بس یہی کام کرتے۔

جب وعدہ کر ہی لیا کہ سائیکل خریدنی اتنی ہی ضروری ہے تو پھر دو سائیکل خریدیں۔ ایک اس کی اور ایک میری۔ دو تانگوں کے سہارے صاحبزادے نہر کے ساتھ چلتے چلتے جی ٹی روڈ تک پہنچ جاتے ہیں اور آتی جاتی بسوں کو ہاتھ ہلاتے ہیں۔ دو پہیوں پر آگئے تو صبح دوپہر دو چکر لاہور تک کے لگائیں گے۔

میں سوچ چکی ہوں میٹرک پاس کر لے تو پھر لاہور آ جانا ہے۔

لاہور آنا بھی مجبوری ہے کہ کالج یونی ورسٹی یہاں ہے ورنہ لاہور کوئی رہنے کی جگہ ہے "اتنا مہنگا شہر۔ ہر چیز کو ہاتھ لگاؤ کرنٹ مارتی ہو لیکن بھی بچوں کی تعلیم اور مستقبل کے لیے آنا پڑے گا مجبوری ہے۔

آپ اپنی زبان میں سمجھا دیجیے گا۔ بھلا سائیکل کی ضرورت ہی کیا ہے۔ روزانہ تانگے میں بیٹھ کر بہنوں کے ساتھ اسکول روانہ ہوتا ہے میں بالکل بے فکر۔ اب خود سائیکل پر روانہ ہو گا تو بہنیں کیا اکیلی جائیں گی؟

اب اجازت دیں۔ بچے اسکول گئے ہیں۔ فیاض اور ابا دادا جان کے ہمراہ روانہ ہوئے۔ مائدہ جھولے میں سو رہی ہے۔ میں آج صابن بنانے لگی ہوں۔ آپ کہیں گے کہ اس جھنجھٹ میں نہ پڑوں "آپ لاہور سے اچھے خوشبو والے صابن بھیجیں گے مگر نہ جی! میں پانچ، چھ روپے فالتو نہیں خرچ کرنا چاہتی۔ جب تسلہ بھر کے صابن سے میرا اچھا مہینہ گزرتا ہے تو کیوں۔ ہاں جب لاہور آؤں گی تو آپ کر لینا اپنی من مانی۔

اپنا خیال رکھیں۔ میری دعائیں آپ کے لیے اور آپ کے تمام ساتھیوں کے لیے ہمہ وقت ہیں۔ اللہ آپ سب کی حفاظت کرے آمین۔

✡ ✡ ✡

مرے ہم صفیر بلبل! میرا تیرا ساتھ ہی کیا
میں ضمیر دشت و دریا تو اسیر آشیانہ

میں بہت دیر تک ہنستی رہی چوہدری صاحب اس شعر کا مطلب؟

اب پتا نہیں یہ تعریف ہے کہ تنقید۔ طعنہ ہے کہ طنز کیا لکھا ہے آپ نے کیوں لکھا۔ خاک پلے نہ پڑا۔ اس شعر کا پس منظر اور تشریح لکھ کر بھیجیے گا۔

اور اللہ کے لیے رمضان اور عید کا نام لے کر کچھ نہ بھیجیے گا۔ میں خود بھابیوں اور نندوں کے ساتھ جو جو ضرورت ہے لے لوں گی۔ ایک تو آپ کو معذرت کے ساتھ، کچھ خریدنے کا پتا نہیں دوسرے آپ بلاوجہ ڈھیروں پیسے جھونک دیتے ہیں۔ میں اپنے حساب سے جمع خرچ کروں گی خبردار!

بجا فرمایا! رمضان المبارک ہی تو وہ بابرکت مہینہ ہے جب دل کھول کر خرچ کرنا چاہیے۔ مگر بازاروں ہی میں کیوں؟

آپ جانتے ہیں میں اپنی سال بھر کی تمام بچت رمضان کے آغاز سے پہلے ہی ترتیب وار جما دیتی ہوں

ابھی تو آپ کے بھائی کی شادی میں دو دو جوڑے بنے تھے۔ ایک تو وہی جو آپ نے بنگال سے منگوا کر دی تھی۔ گلابی بنارسی ساڑھی اسی سے بچیوں کی فراک نکال لی۔ مجھے کہاں پہننی آتی ہے ساڑھی۔

بیٹوں کے لیے فقط صبح کی نماز کے کرتے بنانے ہیں۔ وہ میں ان شاء اللہ خود ہی بنا لوں گی۔ سعیدہ اور فہمیدہ کو جو ایڑی والی سینڈلیں آپ نے منصور کی شادی میں لاہور سے لا کر دیں، وہ اسی وقت ان کے پیروں میں کھلی تھیں۔ میں نے فوراً" سنبھال کر رکھ دی تھیں۔ امید ہے۔ عید پر پیروں میں خوب فٹ بیٹھیں گی۔ ہاں اپنے جانشین لاڈلے کے لیے کوئی جوتا ضرور بھیجیں۔ ماشاء اللہ سے خوب قد کاٹھ نکال لیا ہے حالانکہ ابھی صرف بارہ برس ہی کا ہوا ہے۔

میں جانتی ہوں میرے ارد گرد کے لوگ (میرے سسرال والے' آپ کے بہن بھائی) مجھے کنجوس کہتے ہیں۔ وہ صحیح ہیں یا غلط مجھے پروا نہیں۔ میں تو بس ایسی ہی ہوں۔

اب میری دیورانی۔ یہی آپ کی چھوٹی بھابھی دیور جی کے پاس کراچی گئی تو خوب پھولے پھولے گلابی اور سفید فراک خرید لائی۔ وہ بھی دو، دو۔ مجھے یہ حرکت پسند نہیں آئی۔

شادی میں شریک ہر دس برس تک کی بچی کی ماں کا شادی میں بیٹھنا دوبھر ہو گیا۔ ساری بچیوں نے انگلی سے اشارے کر کے فراکیں دکھائیں اور ماؤں کو ناک تک عاجز کر دیا۔

اب آپ یہ نہ کہیے گا میں نے غیبت کی میں نے

اسی وقت کونے میں لے گئی اور صاف کہا یہاں گاؤں کا ماحول سادہ ہے۔ تم ان کپڑوں کو کراچی اپنے میکے کی تقریبات کے لیے اٹھا رکھتیں۔ جو لے کر دینے کے اہل ہیں۔ وہ تو منگوالیں گے اور جو ڈھیر حسرت بھری جلبلاتی نگاہوں سے تک رہا ہے اس کی آہیں کہاں کہاں نہ پہنچیں گی؟ وہ تو اسی وقت خفا ہو گئی۔ جو لیا" (شاید احتراماً") اس وقت تو کچھ نہ بولی مگر مجھے پتا لگا تھا وہ بعد میں خوب ناراضی کہہ کر گئی ہے۔

ہماری اپنی بچیاں فرمائش کر چکی ہیں۔ میں نے کہا لاہور ماموں کی شادی کرنے جائیں گے تب بارات کے لیے لے دوں گی۔

بس آپ کچھ نہ خریدیں۔ چنانچہ کے چوڑی دار پاجامے اور دوسری گوٹے والی فراکیں تین تین گھنٹے ہی تن کو لگی ہیں۔ عید کے روز کیا کاٹیں گی؟

اسی طرح مائدہ کے لیے شادی پر لائے گئے کپڑے اس وقت بڑے تھے۔ وہ استعمال کروں گی۔ ہاں عید چونکہ شدید سردی میں آگئی ہے۔ تو ایک گرم سوٹ لاؤں گی۔ وہ بھی ارادہ ہے۔ اگر وقت ملا تو خود ہی بن لوں گی۔

پچھلے ہفتے ساجد آیا تھا تو میں نے اپنے ابو جان کی ذاتی کتب خانے سے۔

عصمت (دہلی) اور نور جہاں (امرتسر) دوبارہ منگوا کر پڑھے۔ بہت لطف محسوس ہوا۔ جو پیرائے اور جملے و تشبیہات پہلے سمجھ نہیں آئی تھیں۔ ان کا بھید اب کھلا۔ سوچتی ہوں مزید پندرہ سال بعد دوبارہ پڑھوں گی تو معنی کے کون سے نئے در وا ہوں گے۔

اشتیاق اور سعیدہ فہمیدہ کے لیے وہ رسالے جو ہم بہن بھائیوں نے اپنے بچپن میں پڑھ رکھے تھے منگوائے غنچہ پھول اور پیام وغیرہ۔

بچوں نے ابھی تفصیلی مطالعہ تو نہیں کیا مگر چھو چھو کے خوشی محسوس کرتے ہیں کہ ماں اور خالہ ماموں نے اپنے بچپن میں ان رسالوں کو پڑھا اور یہ نانا نانی خریدا کرتے تھے۔

اشتیاق پر نام کا پورا پورا اثر ہے۔ ہر چیز کی کھوج میں لگ جاتا ہے۔ کبھی مٹی تنکوں سے کرید [illegible] کبھی چونٹیوں کے گھر تک جانا چاہتا ہے۔ ورنہ [illegible] پرندوں کو بعد میں خبر ملتی ہے انڈے بچے کی [illegible] صاحبزادے کے پاس پہلے ریکارڈ پہنچ جاتا ہے۔

نت کا پیار گنگنانے پر جو چار چوٹ کی مار دی [illegible] بھول نہیں ہے۔ اپنے سدھر جانے اور تائب ہونے [illegible] اعلان کرتے ہیں۔ تختی لکھتے اسکول مدرسے کے [illegible] تیار ہوتے ہوئے۔ جیسے ہی میرے ارد گرد ہونے [illegible] گمان ہوتا ہے۔ فوراً "راہ حق کے شہید۔۔۔ یا پھر آ [illegible] سیر کرائیں تم کو پاکستان کی لے اڑاتے ہیں۔ مگر میں بدستور ان سنی کا سا تاثر دیتی ہوں۔

اس خط کو آج ہی پوسٹ کروں گی اور ہاں چنے کی دال کا حلوہ اور سوجی کی خشک مٹھائی آپ کو بھیجوں گی۔ بچے بہت سلام دعا کہہ رہے ہیں۔ ابا جی کا خط تو ساتھ ہی ڈال رہی ہوں۔ باقی سب خیریت ہے۔

آپ کے گزشتہ مکتوب میں لکھا جگر مراد آبادی کا شعر میں نے بوجھ لیا۔ میرا شعری ذوق اتنا اعلیٰ کب [illegible] مگر آپ کی کتابوں کی الماری سے جب اس غزل کو ڈھونڈا تو اکیلے ہی میں خوب خوب ہنستی رہی۔ جواب وہیں سے ملا۔

میں وہ صاف ہی نہ کہہ دوں جو ہے فرق مجھ میں تجھ میں
تیرا درد درد تنہا ' میرا غم غم زمانہ

آپ جنگ کے غازی ہیں اور یہ میرا غرور ہے۔ میں فخر کے ساتھ اشتیاق فیاض اور ایاز کو بھی رخصت کرنے کھڑی ہوں گی۔ ان شاء اللہ

دشمن بہادر ہو تو کسرت کرتے ہیں جسم بناتے ہیں داؤ پیچ سیکھتے ہیں اور ہتھیار کی دھار تیز کرتے ہیں۔
اور اگر دشمن کا سلاگن سازش ہو تو۔۔۔؟ بزدلی کی لن ترانی سے چھپا کر بغل میں چاقو لائے تو۔۔۔

ہم سب محاذ جنگ میں ہیں آپ ڈٹے رہیے جب تک ہم مائیں اگلی کمک تیار کر کے بھیجتی ہیں۔ اپنا بہت خیال رکھیں۔ ہاتھ اٹھاتے ہی پہلی دعا ہمیشہ آپ کے لیے۔

اجازت دیں۔

دعا گو ساجدہ

☼ ☼ ☼

بنام من چوہدری صاحب۔۔۔ السلام علیکم۔

آپ جانتے ہی ہیں رمضان المبارک میں میری مصروفیت بے حد بڑھ جاتی ہیں۔ مگر اب سے چند گھنٹے پہلے کی خوشی نے نیند بھگا دی ہے۔ میں نے سوچا آپ کو بھی تو اس خوشی میں شامل کرلوں۔

آپ جانتے ہیں ہمارا بیٹا اشتیاق مشکور ضدی لاڈلا ددھیال نے سر چڑھایا ہے) ہمہ وقت خود ساختہ بیماری کا شکار رہتا ہے۔ میں [illegible] نے کا نوالہ کھلا دوں یا نہ دوں شبیر کی نگاہ ضرور رکھتی ہوں اور میری پابندیوں اور سختیوں سے بیٹا ہمیشہ خائف رہا ہے۔

اب یہ نہ کہیے اس قصے کا پیچھا چھوڑ ہی دوں۔

وہی نت کا پیار۔۔۔ والا

اتنی تمہید کا مقصد یہ کہ اس بار اشتیاق پر میری شدید ترین ناراضی کا اثر رہا میں نے مارنے کوٹنے کے بجائے بات چیت ہی بند کر دی تھی مگر دل عجب پریشانی کا شکار رہا۔

دادا جان کے ہمراہ عصر کی نماز کے لیے مسجد جاتا ہے تو آواز لگا کر ساتھ لے کر جاتے ہیں اور جمعہ کو خاص طور پر۔۔۔ اس روز افطاری بھی وہیں ہوتی ہے۔ مغرب کے بعد لوٹا تو میں باورچی خانہ سمیٹ رہی تھی کہ پائی سے میری پشت پر کھڑا ہو گیا۔ میں نے جو یکدم دیکھا تو بڑی عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

جھجک شرم ہچکچاہٹ اور کسی قدر خوف۔

اس کی نظریں جھکیں تو میرا دل بھی بس آخری دھڑکن پر آ رکا۔ اس نے نظریں اپنے جوتے پر گاڑ دیں اور مٹھی کھول دی۔ اتنی سردی میں ہتھیلی پر پسینے کی نمی تھی اور نمی سے چپچپاتے۔۔۔ نوٹ روپے۔

ارے میرے اللہ رب العزت۔۔۔ اتنے بہت سے پیسے۔ میں تو آنہ دو آنہ دیتی تھی۔ دادا جان بھی بہت لاڈ میں ساتھ لے جا کر من پسند چیز دلواتے تھے تو پھر یہ اتنے بہت سے روپے۔

"میں آپ کو بہت تنگ کرتا ہوں ناں۔۔۔ شرارتوں سے اور کہنا نہ مان کر۔۔۔ اور جب سے ابا جان کے کہہ دینے پر میلے گیا اور وہ گانا گایا۔۔۔ تو آپ بہت بچی کی ناراض ہو گئیں۔ تو یہ۔۔۔ آپ کے لیے۔"

"ناراضی دور کرنے کے لیے۔۔۔ پیسے مگر یہ لیے کہاں سے۔۔۔؟ کہیں سے اٹھائے ہیں کیا۔" میں نے اپنی چیخ روکی۔ میرا بچہ کس روش پر چل رہا تھا۔

"اٹھائے نہیں ہیں ملے ہیں۔"

"ارے تو پوچھتے کس کے گم ہوئے ہیں۔ گھر لا کر مجھے کیوں دے رہے ہو۔ جاؤ مسجد میں دے کر آؤ۔ مولوی صاحب خود ہی پوچھیں گے۔"

"تو مولوی صاحب نے تو دیے ہیں۔" وہ عجلت سے بول پڑا۔

"مولوی صاحب نے؟" میں حیران ہوئی۔

"آپ ناراض تھیں ناں۔۔۔ عصر کی نماز کے بعد مغرب تک۔۔۔ مسجد میں مولوی صاحب کبھی نعتیں سنتے ہیں، کبھی حفظ کی دعائیں اور سورتیں اور کبھی قرات تو میں اتنے دن سے سورہ رحمٰن کی قرات سیکھ رہا تھا۔

حفظ تو آپ نے کروائی تھی مگر لحن اور روانی نہیں تھی۔ تو آج جب مقابلہ ہوا تو میں نے بھی حصہ لیا۔ تو مجھے پہلا انعام مل گیا۔ مولوی صاحب نے پیسے دیے پیسے اور دادا جان نے اور چچا نے بھی اور دادا جان کے دو دوستوں نے۔۔۔ تو اس طرح بن گئے وہ روپے۔"

بات کے اختتام پر وہ زارو قطار رونے لگا اور پھر جھٹکے سے مجھ سے لپٹ گیا۔

"میں آپ سے بہت پیار کرتا ہوں امی جان۔۔۔ اور ہرگز ہرگز آپ کو ناراض نہیں کرنا چاہتا۔۔۔ مجھے نہیں پتا تھا۔ گانا گانا اتنی بری بات ہوتی ہے؟" میں نے بے اختیار اسے خود سے لپٹا لیا۔

چوہدری صاحب! میں نے اپنے منہ سے تو نہ کہا کہ

لخت جگر میں تم سے کتنا پیار کرتی ہوں کہ دنیا کی تمام زبانوں کی تشبیہات و استعارے کم پڑ جائیں مگر وہ میری کل دنیا ہے۔ میری دعا میرا نتیجہ میرا خواب میری خواہش۔

اس نے مجھے خوش کر دیا اس لیے میں اسے خوش کر دوں گی۔ بھیج دیجیے پینٹ اور ٹوئیڈ چیک کی شرٹ۔۔۔ مجھے ہر وہ کام نفرت انگیز لگتا ہے جس سے نمود و نمائش کا پہلو نکلے۔۔۔ مگر عید کے روز جب وہ اپنے دوستوں کو بتائے گا کہ یہ سوٹ ماں نے قرات پر انعام پانے کے انعام کے طور دیا ہے تو اس سے بچوں میں جذبۂ مسابقت اور قرآن سے دلچسپی پیدا ہو گی۔

اب آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی ہیں۔

اجازت دیں۔۔۔ آپ کے سوالوں کے جواب اگلے خط میں۔

والسلام۔۔۔ ساجدہ مشکور دین

✡ ✡ ✡

ازعیسیٰ پور۔۔۔ دس رمضان المبارک

جناب من چوہدری صاحب۔۔۔ السلام علیکم

صد شکر اس پیدا کرنے والی پاک کامل ذات کا۔۔۔ یہاں حسب معمول سب خیریت ہے۔ گزشتہ برس آپ محاذ جنگ پر تھے۔ سعیدہ اور فہمیدہ نے پہلی بار روزے رکھے آپ کی غیر موجودگی اور ملکی پریشانی کے باعث میں نے روزہ کشائی نہیں کی مگر وعدہ ضرور کیا تھا۔ میں بھول بھال گئی مگر بچے اس طرح کے معاملے میں خوب یادداشت رکھتے ہیں۔

آپ کے عید رمضان کے حوالے سے دیے گئے پیسے اور سال بھر کی تمام بچت میرے پاس ہنوز موجود تھی۔ سالگرہ وغیرہ تو میرے نزدیک سراسر احمقانہ بات ہے مگر بسم اللہ کی رسم۔۔۔ ختم قرآن اور روزہ کشائی جیسی تقریبات جذبۂ دینی کو جلا بخشتی ہیں۔ سو پھر بہت حساب کتاب جوڑ کر خوب قطع برید کر کے سب کو دعوت دی گئی۔

چونکہ یہ روزے شدید سردی کے ہیں تو سوئیاں گرم دودھ میں چینی اور بادام میوے ڈال کر ۔۔۔ کر لیے۔ مجبوریں تو لازمی ہوتی ہی ہیں۔

دو بکرے ذبح کر کے آلو گوشت کا سالن اور تندوری روٹیاں دوپہر ہی سے لگنی شروع ہو گئی تھیں۔ سارا گاؤں مدعو تھا۔ میں نے سختی سے کسی بھی قسم کے تحفہ تحائف سے منع کیا۔ بچوں کی خوشی بھی ثواب کا نشہ یوں کہ تمام روزے داروں کی دعائیں لے گئیں۔ پھر بھی آپ کی بہن گلابی رنگ کے ریشمی جوڑے بنا کر لائی۔ میں نے تو اسے وہ چٹائی والے جوڑے نکال کر دیے کہ بال بنا کر تیار کر دو گڑیا ۔۔۔ ہوں سفید موتی ٹنکے گلابی جوڑے پہنے بچیاں پریاں لگ رہی تھیں۔ اس نے دو راتوں میں اتنی محنت کی اللہ اسے خوش رکھے۔ تینوں بیٹوں نے بھی چچی کی شادی والے تار کشی والے کام کے کرتے پہن لیے اور میں نے وہ جو آپ نے کراچی سے سلک کا سوٹ لا دیا تھا۔ مائدہ کی پیدائش پر دوبارہ ہی تو پہنا تھا بس الحمد للہ سب بخیر و خوبی نبٹ گیا۔ مگر اب میرا ہاتھ بے حد تنگ ہو چکا ہے۔ اور خرچے منہ پھاڑے کھڑے ہیں اور میری جان ناتواں۔۔۔

میری شادی کے وقت جب میرے والد صاحب نے زیور لڑکی کی ملکیت قرار دیا اور آپ نے اقرار کیا تو میں بے حد و بے حساب خوش ہوئی۔

آپ تو جانتے ہی ہیں مجھے سونے کے زیورات کا کتنا شوق ہے۔ کانوں میں دو تولے کے بڑے بڑے بالے، بالوں میں نانی جان کی دی ہوئی ہنس، ہاتھ میں چوڑا کڑا اور آپ کی دی گئی انگوٹھی تو میرے جسم کا حصہ ہیں جیسے، ساڑھے سات تولے سے زیادہ تو بنتا ہی ہو جاتا ہے۔

آپ کو یاد ہے شادی کے بعد پہلی عید آئی تو ابا جان نے باقاعدہ پیام بھجوایا ''عزیزی ساجدہ تمہارے نکاح کو سال تو ابھی پورا نہیں ہوا مگر تم زیور کی زکوۃ ابھی ہی نکال دو۔ میں نے آپ سے پیسے مانگے تو وہ کتنے بہت ۔۔۔

۔۔۔ رہے تھے حالانکہ سونا اس وقت چالیس روپے تولہ بھی نہیں تھا۔ آپ دو بہنوں کی شادی کے بعد ہاتھ ۔۔۔ کر بیٹھے تھے۔ میں نے اس بات کو ذرا اہمیت نہ دی۔ دوسرے سال پھر ابا جان کا خط آ گیا۔ ''عزیزی ۔۔۔ زیور کی زکوۃ نکالو تو کچھ پیسے اپنی مسجد کے امام صاحب کے یتیم نواسا، نواسی کے لیے ضرور بھجواؤ۔'' ۔۔۔ نے پیسے بھی نہ نکالی تھی۔ اللہ کا حکم تو بخوبی معلوم ۔۔۔ مگر جیسے سنجیدگی سے لیا نہیں۔ جواب ارسال کیا۔ ''ابا جان! میں ان سے ذکر کروں گی۔ اگر ان کی گنجائش زکوۃ دینے کی نکلی تو ان شاء اللہ بھجوا دوں گی۔''

بیٹی کے گھر کا پانی نہ پینے والے ابا جان دوسری صبح ہی دروازے پر موجود تھے۔ غیض کا شکار۔۔۔ غضب کی تصویر۔۔۔

''کتنے تولے زیور ہے تمہارا؟'' چھوٹتے ہی سوال تھا۔

''شش۔۔۔ شاید۔۔۔ اٹھائیس تولے۔۔۔ تین تین تیس۔۔۔ تیس تولے۔'' میں کچھ نا سمجھی کے عالم میں لڑکھڑاہٹ سے بولی۔

''خیر وہ تو ابھی معلوم ہو جاتا ہے۔ میں مقبول سنار کو ساتھ لایا ہوں وہ اپنی تو وزن اور شرح بتائے گا۔ زیور لاؤ۔'' وہ داڑھی کو سہلاتے ہوئے خود کو پرسکون کر رہے تھے۔ میں نے خوب خانوں تہوں میں چھپائی پوٹلی نکالی مقبول چچا نے وزن کے بعد شرح نکالی۔

''اب نکالو زکوۃ۔۔۔'' ابا جان نے ہتھیلی پھیلائی۔

''لل۔۔۔ لیکن میرے پاس تو اتنے پیسے نہیں ہیں۔'' میں حق دق تھی۔ ''اشتیاق کے ابا جان آئیں گے تو پھر۔۔۔ لیکن ان کا ہاتھ بھی ابھی تنگ ہے والدہ صاحبہ کی طویل علالت اور پھر وفات کے بعد کچھ خرچے۔''

''خاموش!'' ابا جان نے ہاتھ اٹھا کر میری تیز تیز چلتی زبان کو روکا ''اشتیاق کے ابا جان کا کیا ذکر۔۔۔؟'' وہ چبا چبا کر بولے۔

میں اچنبھے سے ان کی ناگواری اور غصے کو دیکھ رہی تھی۔ وہ تمام زندگی میں بیٹیوں سے اونچا نہیں بولے تھے کجا کہ باز پرس۔

''زیور تمہاری ملکیت ہیں یا اشتیاق کی ابا جان کی۔۔۔ داماد صاحب کا اس تمام سلسلے سے کیا تعلق۔۔۔ زکوۃ تم پر ہے ان پر نہیں۔''

''لیکن میرے پاس پیسے کہاں؟'' میں ہکلائی۔

''تو وہ تمہارا جیب خرچ کیا ہوا؟ اور ابھی اشتیاق کی پیدائش پر بھی تم کو چاندی کے روپے تمہاری نانی کی طرف سے ملے تھے وہ۔۔۔''

''ان سے تو۔۔۔ میں نے گانی بنوالی۔'' میں نے اعتراف جرم کیا۔

تو ان کو جیسے پتنگے لگ گئے۔ سنار چچا سے اسی وقت حساب ملوایا اور زکوۃ کے پیسوں برابر وزن کی انگوٹھی اپنی جیب کے اندر۔۔۔

''دیکھو ساجدہ! تم میری سب سے لاڈلی پیاری بیٹی ہو۔ بہت بچپن میں تمہاری نانی تندور دہکائے بیٹھی تھیں اور تم ان کے گھٹنے سے لگی اب اللہ جانے کیسے تم سر کے بل تندور کے اندر۔ خدا ان پر اپنا رحم کرے تمہاری نانی بہت بھلی ہمت والی خاتون تھیں۔ تمہاری بائیں پنڈلی ان کے ہاتھ آ گئی تھی اور پلک جھپکتے لمحہ میں وہ خود پیچھے گری تھیں اور تمہیں کھینچ چکی تھیں۔ یہ سیکنڈ کے سوویں حصے کا قصہ تھا۔ تمہارے تمام بال جل گئے اور چہرہ جھلس گیا۔ کئی سال تمہیں تنجار کھا گیا اور اللہ بخشے محترم خاتون نے بالوں کی نشوونما کے لیے کون کون سے ٹوٹکے نہ آزمائے۔ اور چہرہ بے داغ رہے۔ اس کے لیے نجانے کون کون سی بوٹیاں پیستی رہتیں اور آمیزے منہ پر ملتیں۔ تمہاری جسمانی تکلیف ہم نے اپنی روحوں پر کیسے جھیلی۔ اس کے بیان کے لیے الفاظ کی شدید قلت ہے۔ یہ تصور ہی جان لیوا تھا کہ اگر تم خدانخواستہ۔۔۔ کوئی پوچھے کہ میری زندگی کا ناقابل فراموش اذیت ناک تکلیف دہ واقعہ تو

کبھی ایک ۔۔۔ کہوں گا۔ میری پیاری بیٹی! میں یہ کیسے برداشت کر سکتا ہوں کہ روز حشر یہ زیور آگ بن کر تم سے لپٹ جائیں اور سانپ بچھو کا روپ دھار کر تمہارے جسم پر رینگتے پھریں۔ اس لیے یہ سب کر رہا ہوں۔"

میری آپ ندامت سے تر پیشانی کو اپنے رومال سے پونچھا گال کو تھپتھپایا اور دہلیز پار کر گئے۔

اور میرے لیے اتنا کافی تھا۔ سونا میری کمزوری تھا اور بہت مشکل تھا ہر سال ایک بڑی رقم نکالنا۔۔۔ پھر ایک روز اسی ادھیڑ بن میں تھی کہ خیال وحی کی طرح وارد ہوا۔ یہ اللہ کی تقسیم کا بے لچک نظام ہے۔ میرے اندر سونے کی پسندیدگی اس لیے ہے کہ مجھے حق داروں تک حق پہنچانا ہے۔ مجھے اس راستے سے اللہ نے دینے والا بنایا ہے۔ تمام دنیا کا رزاق وہ خود ہے مگر وہ چند کے لیے ہم جیسے حقیر کو دے کر آزماتے ہیں کہ ہم اتنا کچھ لے کر کتنا دے سکتے ہیں؟

اس احساس نے دنیا بدل دی چوہدری صاحب! مجھے ہر سال دینا ہے۔ سال گزشتہ میں ساڑھے سات تولہ میں جنگ 65ء کے لیے دے آئی۔ گمان کیا اس سال زکوٰۃ کم دینی ہو گی مگر اب خوشی کی بات کہوں یا پریشانی کی۔

ماموں میاں' نانی اماں کا دس تولے کا تاج مجھے دے گئے۔ جو ان کے پاس بطور امانت نانی جان رکھوا گئی تھیں۔ بتائیے یہ کیا ہوا۔

سو اب آپ دیکھ لیں سونا ڈیڑھ دو سو روپے تولہ ہو گیا۔ اب شرح آپ خود نکالیے۔۔۔ سارے سال کی بچتیں انڈے مرغیاں اور بکریاں سب اکٹھی کیں۔

دو بکروں کی جوڑی تھی۔ تمیں روپے میں نکلی ماشاء اللہ۔۔۔

عید تو اب چند دنوں کی دوری پر ہے۔ بچے اور۔۔۔ اور۔۔۔ میں بھی آپ کو بے حد یاد کرتی ہوں۔ مگر اب عقل کا تقاضا یہی ہے کہ عید الاضحیٰ پر آپ کی موجودگی ناگزیر ہے۔ اگر آپ نہ ہوں تو اشتیاق' فیاض اور ایاز باقاعدہ دیوانے بنے گھومیں۔۔۔ ہاں یاد آیا۔

آپ نے ایسے کیوں لکھا کہ آپ کی والدہ چونکہ نہیں ہیں' سو چھوٹی بہن کو ہمیں ماں پورے سلیقے طریقے سے رخصت کرنا ہو گا۔

آپ کی تسلی کے لیے بس اتنا کہوں گی۔ دس یا آٹھ دس برس بعد فہمیدہ اور سعیدہ کو رخصت کروں گی اس سے بڑھ کر سال بعد نسرین کو کیونکہ پہلی بیٹی ہے۔

اپنا خیال رکھیے۔۔۔ آپ ہمارا سب کچھ ہیں۔

اجازت دیجیے۔۔۔ والسلام' آپ کی زوجہ محترمہ ساجدہ شکور۔

21 رمضان المبارک 1966ء

☼ ☼ ☼

جناب عالی۔۔۔ السلام علیکم۔

اس بار آپ کا مکتوب سامنے دھرا ہے اور سوال جواب کھیلوں گی۔۔۔ (آں ہاں)

آپ نے یہ سوچ بھی کیسے لیا کہ ہم عید پر آپ کی کمی محسوس نہیں کریں گے۔ یا روزہ کشائی پر ہم آپ کی غیر موجودگی کی پروا نہ کی؟

اس جملے نے گویا ہمارے تمام صبر' جبر' برداشت' ہمت پر پیر رکھ دیا۔ چھوٹے موٹے معمولی غیر معمولی تمام مشکلوں سے میں صبح و شام نبرد آزما رہتی ہوں سب سے پہلے تو اشتیاق کا ضدی اور غصیلا ہونا آپ ہی کی غیر حاضری کے باعث ہے' میں بخوبی جانتی ہوں۔

پہلا بچہ ہونے کے باعث وہ آپ سے قریب بھی اور کچھ وہ آپ سے بے پناہ انسیت اور محبت رکھتا ہے میں اسے کیسے سنبھالے رکھتی ہوں میں ہی جانتی ہوں۔

فیاض اپنی طویل بیماری کے باعث ابتدا ہی سے مجھ سے بے حد قریب ہے' سوائے پروا کم ہے پہلی مرتبہ بار میں بھول گئی تھی۔ جس طرح ایاز نے ہم ۔۔۔ لیے خود سے نام گھڑ لیا ماں اور باپ کے ناموں کا ۔۔۔

آپ کی لاڈلی مائدہ نے غوں۔۔۔ غاں کے بعد پہلا ۔۔۔ کہا ہے بہاں۔۔۔ بابا۔۔۔ بیٹھے بیٹھے زور سے نعرہ بلند کر دیتی ہے اور اس کے منہ سے یہ لفظ اتنا ۔۔۔ ہے کہ کیا کہوں۔

روزہ کشائی پر آپ کی کمی محسوس نہ کی گئی۔ اس ۔۔۔ نانی پر ہم سب ناراض ہیں۔ ضروری ہے تمام باتیں ۔۔۔ ہی جائیں یا لکھی جائیں۔۔۔ بتائیے؟

ابا جان نے میری شکایت کی کہ میں نے اس بار نہ اپنے اور نہ بچوں کے کپڑے تیار کیے۔ ہم ابھی شادی پر بننے والے کپڑے پہن رہے ہیں۔ ان کے لیے بھی میری طرف سے یہ ہی آرڈر ہو گا۔

مجھے ان کی بچکانہ شکایت پر ہنسی آ رہی ہے بہت ۔۔۔ اور اب یاد آ رہا ہے' وہ مجھے اتنے دنوں سے بچوں کی طرح منہ پھلا کر بڑی خفا خفا روٹھی نگاہوں سے ۔۔۔ دیکھ رہے تھے۔

میں جانتی ہوں خوش لباسی ان کا شوق ہے اور وہ ماشاء اللہ نمازی پرہیزگار بندے۔

میں نے ان کے لیے ہلکا آسمانی تر بوزوں والا کرتا اور ہم رنگ تہبند یہاں تک کہ کلف لگا پگڑ رمضان سے بھی پہلے تیار کروا رکھا تھا۔ آپ کا خط پڑھا تو چیل کی طرح بڑے گھر پہنچی۔ وہ باہر گلی ہی میں چارپائی ڈال کر بیٹھے تھے۔ مسکراتے ہوئے میں گلی میں ان کے زمین پر پڑے جوتوں کے پاس بیٹھ کر ان کے قدموں کے پاس کپڑے رکھ دیے۔ "یہ تو تقریباً" ڈیڑھ ماہ سے تیار تھے ۔۔۔"

پہلے میری شکل دیکھی پھر کپڑے۔

"میں نے سوچا' اس بار بچت اسکیم میں میں بھی ۔۔۔ ہوں گا۔"

میں نے منہ چھپا کر مسکراہٹ روکی۔ ان کا بچکانہ ۔۔۔ پن سے بھرپور روٹھا انداز۔۔۔

"پہلے آپ' باقی سب بعد۔۔۔ نئی گرم شال کے پیسے تو میں کب سے حضور کو دے چکی۔ انشاء اللہ ایک دو روز میں آ جائے گی۔

اور سردی بہت زیادہ ہے۔ بچے پہننے کے لیے گرم سوئٹر ان شاء اللہ عید تک بن ہی لوں گی۔ اون تو میں لاہور سے لائی تھی۔"

ان کی ناراضی فوراً" معدوم ہو گئی۔ بچوں کی سی معصومیت سے کپڑوں پر ہاتھ پھیرنے لگے۔

"میں چلتی ہوں ابا جی! مائدہ کے پاس پڑوسن بٹھا کر آئی ہوں۔" میں وہاں سے ترنت بھاگی۔

اور اب آخری اور اہم ترین شکایت۔ میں ہر بات میں ہم کا وظیفہ کیوں استعمال کرتی ہوں۔۔۔ میں کہہ کر کوئی دلدار جملہ کوئی کھنکتا پیام کیوں نہیں دیتی۔۔۔ آپ نے لکھا بعض جگہ میں آپ کو بیوی کم اور اطلاع دینے والا نائی لگتی ہوں۔ چوہدری صاحب میں ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئی۔

آپ کی غیر حاضری میرے لیے کیا ہے؟ سوچ میں پڑ گئی ہوں کوئی مثال در خور اعتنا نہیں لگتی۔

کسی شخص کی یہ ڈیوٹی ہو کہ اپنا دل روز اپنے ہاتھوں نوچے۔ انگلیوں کی درزوں سے رستا خون دیکھے اور پھر شام ڈھلے دوبارہ اسے پسلیوں کے پیچھے لگا لے۔ نوچنے لگانے کی تکلیف سے قطع نظر۔ پورا دن بغیر دل کے میں کیسی گزارتی ہوں اس کا گمان آپ خود لگائیے۔ دل کے بغیر رہنا کیسا ہوتا ہے۔ یہ تو وہی جانے جو ایسے رہتا ہے۔

باقی میرا اندازہ ہے منہ پھاڑ کے محبت تو محبت نفرت کا اظہار کرنے والے لوگ بھی کھوکھلے ثابت ہوتے ہیں۔ وہ ثابت قدم اور بھروسے کے قابل نہیں ہوتے۔

محبت کا جذبہ تو خیر وہ جذبہ ہے جو کہنے سننے کے لیے بنا ہی نہیں۔

محبت کہنے کی نہیں محسوس کرنے کی چیز ہے۔

اور جناب مجھے طعنے دیتے ہیں کبھی خود سے بھی تو کچھ نہیں کہا۔

ایک منٹ! میرے اس جملے کا مطلب فرمائش ہرگز نہیں۔
خط پڑھنے کے بعد آپ کے چہرے پہ آئی مسکراہٹ میری آنکھوں اور میرے ہونٹوں سے چھلک رہی ہے۔ اس جذبے کو کیا کہیں گے؟

میرے غازی
آپ کی ساجدہ مشکور (ہوگئے خوش؟)

نوٹ: یاد رہے! اگلا خط اب عید گزر جانے کے بعد لکھوں گی عید کے جملہ احوال کے ساتھ۔

☼ ☼ ☼

از عیسیٰ پور۔۔۔ 14 شوال 1966ء
میرے محترم وہمراز۔۔۔ السلام علیکم

اس بار عید کا احوال لکھ بھیجنے میں زیادہ دن لگ گئے۔ دراصل عید کے تین دن گزر جانے کے بعد شادیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا اور شدید سردی بھی۔۔۔ مائدہ اور ایاز نزلے زکام اور بخار کے باعث بے حد تنگ ہوئے اور ظاہر ہے کہ خوب تنگ کیا۔۔۔

نسرین میرے پاس رہنے آگئی تھی کہ بچے تو مجھے اپنے پاس سے اٹھنے کی مہلت ہی نہیں دے رہے تھے۔ نسرین آئی تو ابا جی بھی آگئے۔ ان کی چارپائی بڑے بھائی جان کے حیدر نے اٹھا رکھی۔ پیچھے گدا کمبل رضائی اشتیاق نے، فیض نے اگال دان، حمزہ نے حقہ۔۔۔ نسرین موٹے حروف کا قرآن مجید۔۔۔ ابا جی کی سواری کی دھوم دھام پورے گاؤں نے دیکھی۔ تین دن رہے اور واپسی تک تمام دوائیاں، کتابیں، کپڑے مہمان خانے میں آچکے تھے۔

عید کیسی گزری۔۔۔ الحمد اللہ بہت اچھی۔۔۔ ہمیشہ کی طرح اللہ عزتوں کی حفاظت کرے اور حق و فرائض ادا کرنے کی توفیق دے۔

بچوں کی اور اپنی تیاری کے حوالے سے میں آپ کو پہلے ہی بتا چکی ہوں اب نیا کیا لکھوں۔

عید کی صبح دو طرح کی سویاں بنائیں، دیسی گھی میں موٹی سویاں اوپر خوب ساری شکر کا چھڑکاؤ اور۔۔۔ دودھ اور مقویات والی باریک سویاں۔۔۔

آلو گوشت کا ہرا دھنیا چھڑکا سالن صبح دس بجے اور تندور میں روٹیاں لگوانے کے لیے نائن کو بلوا لیا۔

آپ موجود ہوں تو ہم سب کے گھر جاتے۔۔۔ آپ کی غیر موجودگی میں سب ایک منٹ کے لیے بھی ہمیں اکیلا نہیں چھوڑتے۔ ماشاء اللہ خوب خوب رونق رہی۔ بڑے بھائی صاحب تمام بچوں کو میلہ دکھلانے لے کر گئے۔

اشتیاق پینٹ شرٹ پہن کر بہت خوش تھا۔ میلے سے پہلے اتار کر خود ہی تہہ لگا کر دی کہ "امی جان سنبھال کر رکھیں ماموں جان کی شادی میں پہنوں گا۔"

اس بار میری دی زکواۃ ترکھان نواز کے گھر کی بیٹیوں جمیلہ اور شکیلہ کے بیاہ پر لگ گئی۔

آپ کی والدہ مرحومہ اور اپنی نانی، نانا اور دادا، دادی کے نام کے کپڑے میں خاموشی سے مسجد رکھ آئی۔ امام مسجد اپنے یتیم بھانجوں بھانجیوں کی کفالت کرتے ہیں۔

اپنے عیش و عشرت کو حرص و طمع سے بچانے کے لیے ضروری ہے کہ ہر صاحب ثروت، اپنے مال میں موجود دوسروں کا وہ حصہ جو اللہ نے مقرر کر رکھا ہے ادا کرتا رہے۔

چوہدری صاحب! میں اندازہ لگاتی ہوں کہ ہر بار میرے پاس دینے کے لیے بہت زیادہ ہوتا ہے۔ حالانکہ وہی آمدنی ہے وہی اسباب مگر پتا نہیں کیسے۔ اس بار اشتیاق کو اپنے ہمراہ لے کر گئی تاکہ اسے پتا چلے کہ اور دینے والے ہاتھ کی پردہ پوشی کیا ہوتی ہے اور کیسے کی جاتی ہے۔

آپ خفا تو خیر قطعاً نہ ہوں گے مگر خصوصی طور پر میرے لیے دیے گئے عید کی تیاری کے پیسے بھی میں نے کسی ٹھکانے پہنچا دیے جہاں ان کی زیادہ ضرورت تھی۔ میرے بکسے میں اتنے کپڑے ہیں کہ سات دن

روز بدلوں۔۔۔ اور پھر امی جان چھوٹے بھائی کی شادی کی خوشی میں ہر روز کی تقریبات کے حساب سے کپڑے بنوا رہی ہیں۔ میں تو اس اسراف کی بھی قائل نہیں مگر امی جان اپنا چھوٹا بیٹا خوب ارمانوں سے بیاہنا چاہتی ہیں۔

بچیوں نے صبح جاپانی کے کپڑے پہنے اور شام میں کرنال کے بنے کے گلابی۔۔۔ آپ کے بھیجے ولایتی خوشبو والے صابن سے نہلا کر تیل لگا، پنی ٹھوک چوٹیاں گوندھ دیں۔ بچیاں تیار۔۔۔

یہاں ایک مزے دار بات بتاؤں تو آپ کے کیا تاثر ہوں گے۔۔۔ پہلے قصہ سن لیں۔

گھر میں عام استعمال کا صابن تو ہے مگر منصور نے منہ دھونے کے لیے شیشے جیسا چمکیلا آر پار دکھائی دینے والا براؤن رنگ کا صابن لا کر دیا تھا اور آپ نے فاسی کاروں کے منہ دھونے والا انڈے جیسا صابن لا کر دیا تھا۔ اب گھر کے عام استعمال کے لیے تو ٹھیک ہے ناں میں نے وہ دونوں صابن اوپر دو چھتی پر رکھ دیے۔

اب عید کی صبح نماز کے بعد یاد آیا بچیاں عید کا دن منصور والے صابن سے منہ دھوئیں تو خوش ہو جائیں گی۔

اسٹول پر پیر جما صابن ہاتھ میں لیا تو عجیب سا احساس ہوا۔

پیک کھلا ہوا تھا اور اتنی بار استعمال ہوا تھا کہ صابن میں کھدا اس کا نام تک گھس چکا تھا۔ یہی حال دوسرے صابن کا۔۔۔ میرا اوپر کا سانس اوپر نیچے کا نیچے یہ کون چور آیا اور کیسے آیا اور منہ دھونے والا چور۔۔۔ ذرا جو دھیان دیا تو یہ گھر کے بھیدی کا کام تھا۔

اشتیاق تو اشتیاق فیاض بھی، دونوں دوپہر کو جب میں اماں جان کے گھر جاتی ہوں، جی بھر بھر کے خوشبودار صابن سے منہ ہاتھ دھوتے بلکہ نہاتے بھی۔ بعد میں خشک کر کے اندر۔

اب فہمیدہ، سعیدہ کی بھی سنیے اور سر دھنیے۔

میں سینڈلوں کی طرف سے بے فکر تھی۔ آپ دلوا گئے تھے، اونچی ایڑی والی سنہری و سیاہ سینڈلیں۔۔۔ اس وقت کھلی تھیں تو سنبھال لیں کہ چھ ماہ بعد قابل استعمال ہو جائیں گی۔

اب صاحبزادیوں کو خوب جی لگا کر تیار کیا۔ سرمہ سرخی سب۔۔۔ بڑی بے فکری سے جوتوں کے ڈبے کھولے تو بھونچکی رہ گئی۔ ارے میرے مالک یہ کیا؟

ٹوٹے پھوٹے جوتے۔۔۔ نکلے اگلے تک اور ایک کی تو ایڑی بھی ٹوٹی ہوئی تھی۔ اللہ! میں نے تو خود بہت احتیاط سے تھیلی میں لپیٹ ڈبے میں ڈال۔۔۔ کپڑے میں باندھ کر رکھے تھے خراب نہ ہو۔

میرے چہرے کا تغیر بچیاں خود شاید اس چیز کی منتظر نہ تھیں۔

سعیدہ کی ہچکیاں شروع ہو گئیں۔ "آپ جب جب دادی جان کے گھر گئیں تو ہم نے اسٹور والے کمرے میں پہن کر "آپا اور ڈاکٹر صاحبہ" کھیلتے تھے۔

میں نے ہراساں روتی پریشان بچیوں کو خود سے لپٹا لیا اور ہنستے ہنستے بے قابو ہو گئی۔

یہی بچپن ہے یہی معصومیت اور یہی شوق۔۔۔ میں نے جوتیاں سنبھال لی ہیں آپ آکر دیکھیے گا۔

اور ہاں ہم چاروں نے ہاتھ بھر بھر مہندی لگائی تھی۔

آپ کی بھجوائی عیدی اور خطوط ہدایت کے مطابق عید کے روز ہی دیے۔

بڑی عید کی تیاری شروع کر چکی ہوں۔ دو بکرے ہیں بجن کو خوب کھلا پلا رہی ہوں اور پھر عید کے بعد چھوٹے بھائی کی شادی ہے تو وہ بھی ذہن میں ہے۔

آپ عید سے دس روز پہلے آئیں گے۔ پھر عید کے چار روز بعد ہم سب اکٹھے ہو کر لاہور کے لیے نکلیں گے۔ میں بہت فراغت کے ساتھ بھائی کی شادی کے گیت گانا چاہتی ہوں اور اتنے عرصے بعد آپ بھی تو ساتھ ہوں گے ناں۔

دھیان رہے جنگ 65ء کے بعد یہ پہلی بار ہوگا کہ آپ اتنے دنوں بعد لمبی چھٹی پر آئیں گے۔ میں شدت سے منتظر ہوں آپ کی اور آنے والے بے فکر لمحوں کی۔۔۔ ہم شالامار باغ اور راوی جائیں گے کشتی

کی سیر کرنے۔۔۔

یاد رہے اس بار ہم کے معنی میں صرف میں اور آپ شامل ہیں۔۔۔ بچے چھوٹی بہن اور امی جان کے حوالے کر کے جائیں گے۔

اب اجازت دیں۔۔۔ میری برداشت کی حد مانو ختم ہو رہی ہے۔ میں آپ سے دوری بھی تو ایک حد تک برداشت کر سکتی ہوں۔ کتنے دن ہو گئے ایک دوسرے کو دیکھے ہوئے کہیں آپ میری شکل بھول تو نہیں گئے۔ آپ کے پاس میری تو کوئی تصویر بھی نہیں۔

ہاں' ہاں۔۔۔ میرے پاس آپ کی یونی فارم والی تصویر ہے بالکل ہے۔ مگر میں اسے دیکھ نہیں پاتی۔ آپ جو اس میں پلکیں جھپکائے بنا ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے ہیں اور آپ کی تصویر کو مسلسل دیکھوں تو وہ بولنا شروع کر دیتی ہے اور آپ کی باتیں۔۔۔ سچ کہوں' شرم آپ کو چھو کر بھی نہیں گزری ہے۔

اور مجھے یہ بھی معلوم ہے آپ نے سارا خط چھوڑ کر بس ان آخری سطور کو ہی پڑھنا ہے۔ ہم ایک دوسرے کا لباس ہیں چوہدری صاحب! اور میں آپ کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ آپ کے چھت پھاڑ قہقہے کی آواز یہاں تک آ رہی ہے۔

اپنا بہت خیال رکھیں۔

آپ ہماری زندگی کی سب سے اہم ترین خوشی ہیں

بچے دعا سلام کہہ رہے ہیں۔ اجازت دیں۔

آپ کو یاد کرتی آپ کی ساجدہ

اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو

☼ ☼ ☼

"یار! سچ بات ہے ان کی باقاعدہ کتاب چھپنی ہی چاہیے۔" تسنیم کے اندر کی پروفیسری جاگ گئی۔ وہ شدید متاثر دکھائی دے رہی تھی۔

"اور یہ ان سب کو قائل کس نے کیا اور باقی سب میں کیا قصے ہیں؟" عاصمہ نے کھلے ٹرنک کے اندر ہاتھ مارا۔

"او نہوں احتیاط سے۔۔۔" سحرش نے ٹوکا۔ "ترتیب دینا منظم میری نندوں کا کمال ہے۔ انہوں نے ہی تقسیم کیا ہے۔ لاہور شفٹ ہو جانے سے ظاہر ہے خطوط کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ لیکن جب اشفاق بھائی صاحب فوج میں بھرتی ہوئے تو اماں جی نے یہ سلسلہ شروع کیا' پھر فیاض بھائی پڑھنے باہر گئے تو ان کے خطوط بھی ہیں۔ مگر وہ میں نے صرف پڑھے ہیں۔۔۔ ہیں وہ ان ہی کے پاس۔

اشتیاق بھائی والے اس لیے یہاں آ گئے کہ ان کی وفات کے بعد جب میری جٹھانی بچوں سمیت اپنے میکے کینیڈا شفٹ ہوئیں تو اماں بھائی صاحب کے سامان سے لپٹ لپٹ روتی تھیں۔ انہی کے بیگ سے یہ خطوط نکلے تو اماں جی متاع کل کی طرح سنبھال لائیں۔" سحرش کو جیٹھ کا ذکر آبدیدہ کر رہا تھا۔

"جس دن ان کے کرنل بننے کا نوٹیفکیشن جاری ہوا۔ وہ عارضہ قلب کے باعث اسی رات خالق حقیقی سے جا ملے تھے۔ تمام بچے خوب لائق فائق ہیں۔۔۔ میری دو نندیں اسلام آباد میں پروفیسر ہیں اور چھوٹی والی ڈاکٹر۔ اور آگے ان کے بچے ماشاء اللہ۔"

سحرش بی بی جیٹھ نندوں کی بڑائی تسلیم نہیں کرتی تھی۔ مگر دوستوں کے آگے اس نے سسرال کی صفات کو بڑھا چڑھا کر بتایا تھا۔

وہ ان کی قابلیت پر گھنٹوں بلا تکان بول سکتی تھی۔ تسنیم سحرش کو سالوں سے جانتی تھی۔ سحرش اب شروع ہوا ہی چاہتی تھی۔ تسنیم کو جیسے جبراً "ٹریک" کا کانٹا بدلنا تھا۔

"یار سکسٹیز کیسا سنہرا دور معلوم ہوتا ہے نا! وہ انہیں بالکل الگ راہ پر لے کر چلی۔

"کتنی سادگی تھی ناں۔ نمود و نمائش سے قطعاً دور۔۔۔ ویری سمپل اینڈ انوسینٹ۔" فائقہ بھی متاثر تھی۔

"میری ساس تو گلی میں آئے فقیر کی صدا سن کر پہلے ہی اعلان کر دیتی ہیں۔ دروازہ نہ کھولنا۔ چل بچے۔۔۔

ہی تھک ہار کر چلا جائے گا۔" وہ جل کر کہہ رہی تھی۔

"بھئی میں نے تو چند ایک گھر دیکھ رکھے ہیں۔ ہر مہینے تنخواہ آتے ہی تھوڑا بہت نکالتی ہوں۔" عاصمہ نے جان چھڑانے والے انداز میں لاپروائی سے ہاتھ جھاڑے۔

"ویسے کیا واقعی ان کے پاس بہت سونا تھا۔ چالیس پچاس تولے؟" وہ رازدارانہ انداز میں ذرا سا آگے جھک کر بولی۔

سحرش زور سے ہنس دی "چالیس پچاس تولے سن سکسٹی میں تھا۔ اپنے انتقال سے پہلے ترکے کی تقسیم شرعی لحاظ سے کر گئیں۔ اپنا سارا زیور ترکے سے نکال دیا تھا۔ اپنے بچوں کے بچوں کی شادیوں کے لیے سونے کے زیورات سب کے لیے نام کی پرچی کے ساتھ چھوڑ کر گئیں اور صاف لکھا۔ "کوئی یہ نہ سوچے اس کے چار بچے اور اس کے دو فلاں کا ایک۔۔۔ میرا سارا زیور میری نسل کے لیے تحفہ ہیں۔ جس کے چار بچے ہیں۔ اس کو چار سیٹ تو سوچو۔۔۔ اس کی چار ذمہ داریاں اتنی ہی مشکل۔ جس کی ایک ذمے داری۔۔۔ اس کی اتنی آسانی۔۔۔

اور مجھے تو بس اپنے بچوں کو پریشانی سے کسی حد تک باہر نکالنا ہے۔ ہاں اتنا کیا ہے۔ جس گھر میں ایک سیٹ دیا۔ اس کا وزن زیادہ رکھا اور ہاں اس سال کی زکوٰۃ میں اسی میں سے دے کر جا رہی ہوں۔ یاد رکھو زکوٰۃ نکالو گی تو زیور اگلے سال کسی نہ کسی انجان راستے سے بڑھ جائے گا۔ ایک بار بھی لاپروائی کر دی تو ایسی مصیبت پڑے گی کہ خالی ڈبے گنتے عمر گزر جائے گی برکت ختم' ناک کان سے اپنے ہاتھوں اتارنا پڑ جائے گا۔ یہ میری آزمائی بات ہے۔ میں نے اپنی ساری زندگی میں یہ تجربہ بارہا کیا۔ میں نکالتی تھی اور نجانے کہاں سے چل جاتا تھا۔ میرا خزانہ کبھی کم نہ ہوا۔ بڑھتا ہی گیا۔ ہاں مرتے وقت۔۔۔ یاد رکھو جو زیور بھی میرے تن پر ہو گا۔۔۔ وہ سب اللہ کے نام دے دینا۔

یہ دیکھو۔۔۔" سحرش نے بہت جوش سے کچھ کاغذ پلٹے اور اماں جی کی وصیت جو کہ فوٹو کاپی کروا کے سب آل اولاد کے پاس جمع تھی۔ نکال کر باآواز بلند پڑھنی شروع کر دی۔ سحرش تفاخر بھرے جوش سے ان تینوں کو دیکھ رہی تھی۔

"ایک بات تو بتاؤ پھر تم نے اپنی ساس کی نصیحت آئی مین وصیت پر عمل کیا یا یونہی فریم کر کے دیوار پر لگانے کے لیے وصیت سنبھال رکھی ہے۔"

فائقہ نے "دو مارا" کے انداز میں کہا عاصمہ اور تسنیم اس کی نکتہ رسی کی قائل ہوئیں۔ کمرے میں استہزائیہ ہنسی گونجنے لگی۔

سحرش نے ہنسی تھمنے کا تحمل سے انتظار کیا۔

"میری اتنی ہمت اور اوقات کہاں۔۔۔ میں تو شاید بہت تنگ دل ہوں۔" اس نے بہت بڑے دل سے اپنے چھوٹے دل کا اعتراف کیا۔

"لیکن ایاز تو اماں جی ہی کے بیٹے ہیں ناں۔۔۔ جب تک وہ حیات تھیں۔ بیٹوں کو پہلے ہی باور کرواتیں۔ یاددہانی کرواتیں۔ اور اب جب وہ نہیں رہیں تو ایاز نے یہ ذمہ خود ہی اٹھا رکھا ہے۔ شاید میرے اوپر بڑے تو میں دامن بچا لوں مگر۔۔۔ تھینکس گاڈ! ابھی تک بچی ہوئی ہوں۔ باقی اللہ مالک ہے۔ لیکن یہ میری بھی آزمائی بات ہے زکوٰۃ دینے سے مال کبھی گھٹتا نہیں اور اماں جی کی مثل۔۔۔"

"یار وہ سستا زمانہ تھا چالیس پچاس روپے بچتی ہو گی۔۔۔ تم اب مہنگائی کا عالم دیکھو۔۔۔ اب ایسا چلنا مشکل ہے اور۔"

"مشکل۔۔۔ تو یہ ناممکن کہو۔ اب تو ہزاروں روپے بنتی ہے۔" تسنیم کے ادھورے جملے کو عاصمہ نے ترنت مکمل کیا تھا۔

"اور جمع جتھا اور بچت کا سوال کیا۔ مہنگائی اور خرچے دیکھو ذرا۔"

"خرچوں مہنگائی کا ذکر تو اپنی جگہ اب آج کل کے بچے اس دور جیسے کہاں ہو سکتے ہیں اتنے سیدھے سادھے معصوم۔۔۔ میری بیٹیاں میرے ساتھ گروسری کے لیے جائیں تو اف توبہ۔۔۔ ٹرالی میں اپنی پسند کی اشیا بھرتی جاتی ہیں اور ابھی عمر کتنی ہے دس اور بارہ۔"

"صحیح کہہ رہی ہو۔ اب میں سنگل پیرنٹس ہوں۔ ٹھیک ہے کہ سیلری اچھی ہے۔ دوسرے ابو جان ہر ماہ رقم دیتے ہیں۔ ان ہی کے گھر رہتی ہوں مگر کب تک رہوں گی۔ بچے بڑے ہوں گے تو اپنے لیے گھر تو بناؤں گی ناں۔ مگر توبہ ہے جو چار آنے کی بچت ہو جائے۔ بچیاں ضد کرتی ہیں۔ اسی مال سے کپڑے بننے ہیں شاپنگ کرنی ہے جہاں سے بھتیجیاں کرتی ہیں۔ اب منع کروں تو ہرٹ ہوتی ہیں۔ اپنی کم مائیگی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اپنے کمینے باپ کو یاد کرنے لگتی ہیں۔ اب میں احساس نہ کروں تو نفسیاتی مریض نہ بن جائیں۔"

"اماں جی کے زمانے میں ایسا کمپیٹیشن تھا ہی نہیں۔ سب ایک ہی طرح رہتے تھے۔" تسنیم اماں جی کے طرز تحریر سے تو متاثر ہوئی تھی مگر طرز زندگی قابل تقلید یا قابل عمل ہرگز نہ لگا تھا۔

"تو یہ حرص و طمع ہمارا ہی تو پیدا کردہ ہے۔ ہم خود بھی نمود و نمائش کے عادی ہیں اور بچوں کو بھی اسی نہج پر چلاتے ہیں۔ وہ تو خالی سلیٹ کی طرح ہوتے ہیں۔ جو چاہے لکھ دو۔" سحرش نے ہارے ہوئے لہجے میں دھیرے سے کہا۔

"ایسا نہیں ہے کہ اس دور میں کمپیٹیشن نہیں تھا۔" سحرش نے اپنی عملی زندگی میں اپنی ساس کے اصول و فوائد کو کس حد تک پیش نظر رکھا تھا اس سے قطع نظر وہ اسے ہمیشہ ایک آفاقی شخصیت کے روپ میں نظر آتی تھیں۔ وہ آج کے زمانے کے حساب سے جیتی ضرور تھی مگر دل کا ایک کونہ حقیقت آشنائی کا دعویدار بھی تھا۔ اصل کو پہچاننے والا۔

"ان کی دیورانی یعنی ایاز کی چچی جان کراچی سے تھیں۔ ان کے ہاں پہناوا ساڑھی تھا۔ دیورانی جی نے زندگی بھر ساڑھیاں بنگال سے منگوائیں یا پھر انڈیا سے۔ نخوت کا شکار مغرور نمود و نمائش کے معاملے میں وہ اماں جی کا الٹ تھیں۔ بارہا ان کا اماں جی کے نظریات سے ٹکراؤ ہوا۔ اماں جی کے لیے ان کا طرز زندگی فکر و سوچ انتہائی ناپسندیدہ رہا تو دوسری جانب وہ برملا ان کا اور ان کے طرز زندگی اور سوچ و فکر کا مذاق اڑاتی تھیں۔

تنگ نظر کنجوس ہٹ دھرم اور ان کے خفیہ میں چندہ دکھاوا تعریف کی بھوکی کہا کرتی تھیں۔ کیوں کہ بقول نیکی لکھ چھپا کر کریں۔ وہ خوشبو کی طرح کسی نہ کسی طرح پھیل ہی جاتی ہے۔

وہ اپنے بچوں کو اچھے کپڑوں کھلونوں اور باہر سے آئی ٹافیوں چاکلیٹس کے ساتھ بھیجا کرتی تھیں تاکہ ادھر بچے ماں سے تقاضا کریں۔ مگر اماں جی کی تربیت میں دیا گیا صبر شکر حرص سے دوری تحمل کا درس اتنا زوداثر رہا کہ بچے یوں تھے کہ کوئی سونے کا نوالہ بھی کھا رہا ہے تو وہ آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتے اور دیکھ لو۔ ایاز کے ددھیال میں تمام بچے قابل نکلے مگر اماں جی کے بچوں جیسے ایک بھی نہیں۔"

سحرش آج کے دور کی عورت تھی۔ اس زمانے کے رنگ میں رنگی ہوئی رچی بسی مگر ان خطوط کا پڑھنا اس کے اندر کے انسان کو جگا دیتا تھا۔ وہ انسان جو اصل سے پیار اور یقین رکھتا تھا۔

"مجھے تو بہرحال یہ سب ناقابل عمل لگ رہا ہے۔" عاصمہ کے بھنچے ہونٹ اور نفی میں ہلتا سر کچھ بھی نہ سمجھنے کی مثال تھا۔

"نہیں، نہیں۔" تسنیم بول اٹھی "ہم کوئی نہ کوئی ایک پوائنٹ اٹھا سکتے ہیں۔ اس طرح چار پوائنٹس ہوئے یعنی چار خاندان چار نسلوں کے اندر ایک پوائنٹ سدھار آئے گا۔"

"اچھا۔" عاصمہ نے چمک کر ہاتھ ہلایا۔ "تو بھئی کون سا۔۔۔ بتاؤ ذرا۔۔۔؟"

"مطلب تم گانا سننے پر اپنے بیٹوں کو روک لو گی یا پھر اس بار عید پر وہی کپڑے پہنو گی جو تم نے ابھی لاسٹ منتھ بہن کی شادی پر بنائے ہیں۔ یا زکوٰۃ نکالو گی جو فقط اندازہ لگانے میں شاید لاکھ تک پہنچ جائے۔"

"صدقہ زکوٰۃ تو خیر اللہ اور بندے کے اندر کی بات ہے سربستہ رہا۔۔۔ جواب وہی روز حشر ہو گی ہم سب کے سامنے سچ جھوٹ کہہ سکتے ہیں۔"

"ہم سے قربانی کا حصہ نکالنا مشکل ہوتا ہے سو

پہلو دل بہلانے ڈھونڈتے ہیں۔ یا پھر نمود و نمائش کے لیے لاکھوں کے بکرے بیل ہوں نہ۔"

"یہ دونوں بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں سحرش! میری بات کا غلط مطلب مت نکالنا مگر جو آج تمہاری ساس زندہ ہوتیں تو وہ تمہیں سختی سے کہتیں۔ جتنا مجھے خط پڑھ کر ان کی شخصیت کا اندازہ ہوا ہے کہ "بیٹا سحرش اپنے صوفوں کی کیا ضرورت۔۔۔ سب کچھ تو ہے ناں نمود و نمائش اور بلا جواز خواہش سے بہتر نہیں تم ان ہی سے گزارا کرو اور اپنی رقم کسی محتاج کو دو۔"

تسنیم نے سحرش کو بھی کٹہرے میں کھڑا کر دیا۔ عام حالات میں کہا جانے والا یہ جملہ سحرش کو پتنگے لگا دیا کرتا مگر وہ اس وقت جیسے ایک ٹرانس میں تھی۔ ٹانگ پر ٹانگ رکھے سینے پر بازو لپیٹے وہ اثبات میں سر ہلانے لگی۔

کمرے میں یکدم خاموشی چھا گئی۔ گہرا سکوت۔۔۔ ڈرل مشین کی چبھتی آواز نے سناٹا کی چادر تار تار کر دی۔ چاروں اپنی سوچوں سے ابھریں تو ایک دوسرے کو دیکھ مسکرائیں اور اس مسکراہٹ کے لیے کوئی تشبیہ نہیں تھی۔

سحرش نے کھلے ٹرنک کی معمولی سی بے ترتیبی کو سمیٹا اور تسنیم نے فائل اس کی جانب بڑھائی۔ فائل ٹرنک کے اندر اور اوپر چھوٹا سا تالا۔۔۔

سحرش ہاتھ جھاڑ کے کھڑی ہو گئی۔

"تو پھر ہم نے آج کی شفٹ میں کیا سیکھا۔" ماحول پر چھائی کثافت دور کرنے کو خود کو نارمل کرنے کے خاطر اس نے کسی قدر شوخی سے سوال کیا۔

"حسب معمول، حسب عادت اور حسب روایت کچھ نہیں۔" ق لقہ کا انداز دل گرفتہ تھا۔

"ایاز بھائی کہہ رہے ہیں ناں۔ وہ ان تمام خطوط اور ڈائریوں کے متن کو کتابی شکل دیں گے۔ ضرور دیں بہت اچھا کریں گے۔ لوگ اسے خریدیں گے بھی پڑھی بھی جائے گی۔ مدح سرائی بھی ہو گی۔ لیکن قاری اسے یوں پڑھیں گے جیسے مکسٹیز کے ڈریم ورلڈ میں جھانک رہے ہوں۔ اس زمانے کے طرز زندگی کو دلچسپی سے پڑھیں گے۔ تب کیا ہوتا تھا کیوں اور کیسے؟

لوگ، زمانہ، رسم و رواج۔۔۔ قارئین کی دلچسپی بس یہیں تک۔

آج کے دور کے لیے یہ نصیحتیں ایک ایسا توشہ ہیں جن سے منہ کا ذائقہ تو بدلا جا سکتا ہے، پیٹ بھر سیری حاصل نہیں ہو سکتی۔

یہ ہدایات جنک فوڈ کی طرح جسم کو پھلا سکتی ہیں ہمارے دلوں کو کشادگی نہیں دے سکتیں توانائی فراہم نہیں کر سکتیں۔"

تسنیم کے اندر کا استاد عود کر آیا تھا۔ وہ ملول اور دل گرفتہ تھا۔ زنگ آلود آئینے میں نظر آتی بگڑی کٹی پھٹی شکل سے نگاہیں ملانا بہت مشکل تھا۔ سو شیشہ پلٹ دینا ہی بہتر تھا۔

"تو طے یہ ہوا کہ آج کی نشست سے ہم نے کیا سیکھا۔" وہ کلاس روم میں یونہی سوال کرتی تھی۔ تینوں کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"کچھ نہیں۔۔۔"

☆

"پھر کوئی آیا دل زار۔
نہیں کوئی نہیں
راہ رو ہو گا کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار۔"

وہ آواز پھر ابھری تھی۔ وہ قدموں کو مٹی پا کر اس مٹی پہ سرکتی گئی۔ پر کٹے کبوتر کی مانند وہ اس کال کوٹھڑی میں چاروں طرف دیوانہ وار گھومنے لگتی۔ پھر اس کے نہ اعصاب شل ہوتے' نہ پیروں کے آبلے روک پاتے' نہ اماوس کی رات کا گہرا اندھیرا حائل ہوتا۔ اگرچہ وہ کئی بار دیواروں سے ٹکراتی' ماتھا زخمی کرتی' مگر کچھ بھی تو راستے میں حائل نہ ہوتا' ماسوائے اس کی آواز کے۔

"ڈھل چکی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راہ تک تک کے ہر اک راہ گزر"

وہ آواز اور اس کے آنسو اس اندھیر نگری میں ردھم پیدا کرنے لگے۔ نہیں۔۔۔ ردھم نہیں' ردھم تو زندگی سے مشروط ہوتا ہے۔ وہاں تو زندگی ہی مشروط تھی۔ یہ وہ آخری لمحات ہوتے' جب اس کے آنسو فرات ہونے کو آجاتے۔

پھر ہمیشہ کی طرح اگلے مصرعے اس سے نوحے اگلواتے۔

"اجنبی خاک نے دھندلا دیے قدموں کے سراغ"

وہ پھر اندھیرے کو سوچ پا کر سیڑھیوں کی طرف لپکتی۔ اکثر و بیشتر اس کے ہاتھ قدموں کا سراغ تو لگا لیتے مگر وہ کٹے پاؤں لے کر اجنبی خاک کے ساتھ نوحے اوڑھ لیتی۔۔۔ اور چارہ بھی تو نہ تھا۔

"گل کرو شمعیں بڑھا دو مے و مینا و ایاغ"

اور وہ سسکتی تڑپتی آس کے صحرا سے آبلہ پا لوٹ پڑتی اور ان کے گھٹنوں پہ سر رکھ دیتی۔ اس کے مے و مینا و ایاغ یہ سیاہ در و دیوار ہی تو ہوتے جن میں اس آواز سے تحمل کا پیوند لگ جایا کرتا۔

"اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو۔"

اس کے ساتھ ہی سورج سے عاری وہ صبح اترتی جو فجر کے ساتھ ہی مجرم کو دار پہ چڑھا دیا کرتی۔

"اب یہاں کوئی نہیں' کوئی نہیں آئے گا۔"

☼ ☼ ☼

"یار! میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب ٹھیک نہیں اور اتنا بہت سا وقت کافی ہوتا ہے کسی کو واپس لانے کے لیے۔ مگر میں کیا کر سکتا ہوں؟" اس کے لہجے میں عجیب سی بے چارگی تھی۔

"تم کچھ نہیں کر سکتے؟" اس کے لہجے میں طنز تھا۔ نہ جانے کیوں کڑواہٹ بھی۔ حالانکہ وہ دونوں بچپن کے دوست تھے اور ایک دوسرے کے حالات اور واقعات کے متعلق بھی جانتے تھے۔ مگر یہ موضوع

اسے ہمیشہ اسد سے اجنبی بنا رہتا۔ قصور اس کا اپنا بھی نہ تھا۔

"تو میں کیا کروں؟" اب کے اس سے بھی زیادہ بے چارگی تھی۔

"کچھ نہیں۔" نبیل نے رخ موڑ لیا اور ٹیبل پر پڑی چیزوں میں مگن ہو گیا۔ اسد جانتا تھا کہ اس کا مطلب ہے اب یہاں سے دفع ہو جاؤ' اگر کچھ نہیں کر سکتے۔

اسد کو خود بھی اپنی بے بسی کا واضح احساس ہو گیا تھا۔ وہ نبیل کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا مگر۔۔۔ کر بیٹھتا۔

"چلتا ہوں۔۔۔ اگلی چھٹی پہ ملاقات ہو گی۔ اس بار میں گاؤں جاؤں گا۔" اسد نے رک رک کر کہا اور کرسی کی پشت سے جیکٹ اٹھائی اور خدا حافظ کہہ کر مڑ گیا۔

"گاؤں جاؤ گے؟" نبیل کچھ سوچ کر اس کے پیچھے آیا۔

شاید وہ ایک موہوم سی کوشش کرنا چاہتا تھا۔ اسد اسے دیکھ کر مسکرایا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ "میں بابا سے بات کروں گا۔"

نبیل کو امید نہیں تھی کہ اسد مان جائے گا۔ وہ کچھ بول نہ سکا اور نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر ہاتھ سینے پر

باندھ لیے۔

"او کے۔۔۔ آل دی بیسٹ۔" دونوں نے گلے ملتے ہوئے ایک دوسرے کو الوداع کہا۔

نبیل واپس اپنے کمرے میں آگیا مگر ذہن منتشر ہو رہا تھا۔ صبح کے چار بجنے والے تھے۔ اس کی ڈیوٹی ختم ہونے میں کچھ ہی وقت باقی تھا۔

راستے میں بھی وہ اپنے ذہن کو کسی ایک نقطے پر مرکوز نہ کر سکا تھا۔ یہ کیسی کیفیت تھی جو اس پہ طاری تھی۔ وہ خود بھی سمجھنے سے قاصر تھا۔

گھر آیا تو لان کی لائٹس کے علاوہ تمام گھر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ کپڑے تبدیل کر کے وہ کچن میں چائے بنانے آگیا۔ اس وقت تمام ملازم سو رہے تھے اور انہیں ڈسٹرب کرنے کی اسے عادت نہیں تھی۔

چائے کا ایک گھونٹ لے کر ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ اپنے منتشر ذہن کے ساتھ چائے میں چینی ملانا بھول گیا ہے۔ پھیکی چائے کا کپ اٹھائے وہ کچن کی کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"پھیکی چائے۔۔۔ اور پھیکی زندگی۔"

چائے کے پس منظر میں وہ ہادیہ علی رضا کو دیکھنے لگا۔

کیا رہ جاتا ہے زندگی میں اگر چینی نکال دو تو؟ ایسے ہی جیسے یہ چائے۔۔۔ پھیکی اور بدمزا۔

"اپنی چائے میں چینی ملانے کے لیے لوگ دوسروں کی چائے کو پھیکا کیوں کر دیتے ہیں؟" وہ مبشر علی کو سوچنے لگا۔

وہ کبھی کسی سوچ کو عملی جامہ نہ پہنا سکا تھا مگر آج اسد کی طرف سے مثبت جواب نے اسے روشنی کی ایک کرن دکھائی تھی لیکن اس کے دل میں بہت سے وسوسے بھی تھے۔ وہ اسد اور اس کے بابا کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کے بابا کے متعلق یہ دعوا شاید اتنا مضبوط نہ ہوتا، بالواسطہ تعلق سے وہ اس کے بابا کے متعلق اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ کسی بھاری چٹان کی مانند ان کے گھر کے ساحل پر کھڑے تھے اور سب کی زندگیوں کا فیصلہ اس چٹان پہ ثبت ہوتا تھا جو سرک نہیں سکتی تھی اور کوئی سرکا بھی نہیں سکتا تھا۔

"شاید وہ مان جائیں۔"

اس نے زیر لب کہا اور چائے کے آخری قطروں کو حلق میں اتارنے لگا۔ اس احساس کے ساتھ کہ چائے میں سے چینی نکال دی گئی ہو تو۔۔۔

☆ ☆ ☆

"اسد۔۔۔ اس طرح تو وہ مر جائیں گی۔" نبیل بے چارگی سے بولا۔

"بابا کہتے ہیں مر جائیں۔" اسد کے لہجے نے اسے سیخ پا کر دیا۔ اس کا جی چاہا وہ اسد کو اس کے بابا سمیت زمین بوس کر دے۔

"اور تم کیا کہتے ہو؟ تمہاری ماں کیا کہتی ہیں؟"

"ماں جی بھی وہی کہتی ہیں جو بابا۔۔۔" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور نبیل کو غور سے دیکھنے لگا۔

"یار! تم سب لوگ ذہنی مریض ہو۔ کسی اچھے سائیکاٹرسٹ سے کنسلٹ کرو۔"

"آپ کے لیے میں بھی تو یہ سب سوچ سکتا ہوں، سوچتا بھی ہوں، مگر تم اتنے ایموشنل کیوں ہو جاتے ہو؟" اسد نے نرم لہجے میں کہا تھا۔ نبیل سنبھل گیا۔

"لو یہ تم۔۔۔ تم اپنی عزیز آپا کو مرنے دو گے؟"

"نہیں۔۔۔ اللہ کی مرضی۔۔۔ قسمت۔۔۔" اسد کچھ کہنا چاہتا تھا مگر نبیل نے ٹوک دیا۔

"اللہ نے بہت سی مرضیاں بندوں کے ہاتھ میں دے رکھی ہیں اور قسمت؟ بے عمل کی قسمت نہیں ہوتی، بس انجام ہوتا ہے۔"

"میں جا رہا ہوں۔۔۔ آفس کا کچھ کام ہے۔" اسد وہاں سے اٹھ گیا۔

وہ اپنا بچپن سوچنے لگا، جب اسد بہت خوش ہو کر اپنی پیاری آپا کی باتیں اس سے شیئر کیا کرتا تھا۔ وہ دونوں ابھی طفل مکتب تھے۔ آپا بھی اسد سے بہت پیار کرتی تھیں اور اسد کی بھی ان میں جان تھی۔ نبیل کے پاس اس سے شیئر کرنے کو کچھ نہ ہوتا۔ وہ فطرتاً کم گو تھا۔ مگر اسد کے پاس روزانہ آپا کی کوئی بات بتانے کو ہوتی، پھر کچھ عرصہ کے لیے وہ دونوں ایک دوسرے سے دور ہو گئے تھے۔ اسد نے کالج میں داخلہ نہیں لیا تھا اور گاؤں چلا گیا۔ شروع میں نبیل نے اسے بہت یاد کیا۔ پھر کالج کی زندگی میں اس کا ذہن بٹ گیا۔

کچھ عرصہ بعد قسمت نے ان دونوں کو پھر سے ملا دیا تھا۔ اسد شہر آیا ہوا تھا۔ نبیل تعلیم مکمل کرنے کے بعد ایک معروف میڈیکل انسٹی ٹیوٹ سے وابستہ ہو گیا تھا اور معاش کی جدوجہد اور زندگی میں آگے بڑھنے کی تگ و دو میں ماضی ایک باب تھا، جو ختم ہو چکا تھا۔

اسد کا کسی سلسلے میں اسپتال کا چکر لگا تو وہاں نبیل کو دیکھ کر اسے ہر بات یاد آگئی اور ساتھ ہی آپا بھی۔ اسد کے بتانے پر پتا چلا کہ وہ ٹیکنیکل ایجوکیشن کے ایک ادارے سے منسلک تھا۔ اور اس نے اپنی تعلیم حال ہی میں مکمل کی تھی۔ کیونکہ کالج میں داخلہ اس نے بہت دیر سے لیا تھا۔ اس کی وجہ اس نے بابا کی مرضی بتائی تھی۔

ان کی ملاقاتوں کا ایک بار پھر سلسلہ چل نکلا۔ وہ جب بھی چھٹی پر گاؤں جاتا نبیل سے مل کر جاتا۔

باتوں باتوں میں نبیل کو یاد آیا کہ اس کی ایک آپا بھی تھیں جو اس سے بہت پیار کرتی تھیں اور اسد کے لیے یہ عجیب تھا کہ وہ اپنی بات میں ان کا تذکرہ نہ کرے۔ مگر اب اتنے دنوں سے اس کی گفتگو میں آپا کا ذکر نہیں ہوا تو اسے پوچھنا پڑا۔

"پتا نہیں۔" اس نے مختصراً جواب دیا۔

"تمہاری آپا اور تمہیں پتا نہیں کہ کیسی ہیں۔" نبیل کو حیرت ہوئی تھی۔

"ہاں۔" اسد نظریں چرا گیا۔

"شادی ہو گئی ان کی؟" نبیل اندازہ لگانے لگا۔

"نہیں۔"

"پھر؟"

"میں ان سے ملا نہیں کافی عرصے سے۔"

"کیوں؟ کہیں چلی گئی ہیں کیا؟" نبیل یہ بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ آپا تعلیم کے سلسلے میں کہیں گئی ہوں گی، کیونکہ ان کے ہاں ایسا کوئی رواج نہ تھا۔

"ہاں۔۔۔ بابا کو پتا ہے۔"

"اور تم؟"

"نہیں۔۔۔ میں نہیں جانتا۔"

"اسد! تم کچھ زیادہ ہی سسپنس ڈال رہے ہو۔۔۔ تمہاری آپا کہیں چلی گئی ہیں تمہیں نہیں پتا۔۔۔ تمہارے بابا کو پتا ہے۔ امیزنگ یار!" وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر اس کے سامنے میز کے کنارے ٹک گیا۔

"بابا بتاتے نہیں۔" اسد کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔

"کیوں؟ آخر ایسا کیا ہوا ہے؟" اب نبیل بھی سنجیدہ ہو گیا۔

"پتا نہیں۔۔۔ تب میں بہت چھوٹا تھا۔ مجھے ٹھیک سے کچھ یاد نہیں، تم جانتے ہو، جب ہم نے اسکول چھوڑا تھا اور میری پڑھائی بھی تعطل کا شکار ہو گئی تھی۔ تب۔۔۔ تب کی بات ہے، کچھ مسئلہ ہوا تھا اور پھر وہ آپا کو کہیں لے گئے تھے۔ ماں جی کو بھی نہیں پتا اور مجھے بابا سے پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی کبھی۔"

اسد نے کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر آہ خارج کی۔

نبیل نے سوچا کہ شاید وہ اسے کچھ بتانا نہیں چاہتا۔ اس کا ذاتی معاملہ سمجھ کر اس نے زیادہ کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔ یہ تذکرہ دوسری مرتبہ تب ہوا تھا جب وہ اور اسد ڈنر کر رہے تھے۔ بابا کی طبیعت کچھ خراب تھی اور اسد ایک ہفتے کی چھٹی لے کر جا رہا تھا اور جانے سے پہلے وہ ملاقات کے لیے ہوٹل آگئے تھے۔

"میرا گھر جانے کو جی نہیں چاہتا۔" اسد نے بے دلی سے پانی کا تیسرا گلاس بھی منہ کو لگایا۔ کھانا صرف نبیل کھا رہا تھا۔

"تو مت جاؤ۔۔۔ تم نے تو ایک ہفتے کی چھٹی آرڈر کی ہے۔ اب کیا ہو گیا؟" نبیل نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور اس کے تیسرے گلاس کا جائزہ لیا۔

"گھر جا کر ایسا لگتا ہے جیسے میں کسی قبرستان میں آ بیٹھا ہوں۔ وہاں تو اجنبی لوگ اپنے لگتے ہیں۔ مگر گھر میں اپنے بھی اجنبی۔ بابا بیمار نہ ہوتے تو میں کبھی ایک

ملنے کے لیے گاؤں نہ جاتا۔" اس نے پانی کا آخری گھونٹ حلق میں اتار کر گلاس رکھ دیا تھا۔

"مسئلہ کیا ہے تمہارے بابا کے ساتھ؟" نبیل نے نیپکن سے ہاتھ پونچھا۔

"ان کو ہارٹ پرابلم ہے۔"

"میری مراد ہے ان کے ساتھ ذہنی مسئلہ کیا ہے؟"

اسد کوئی جواب دیے بغیر اسے دیکھتا رہا خالی نظروں سے۔

"تمہارے پاپا کتنے اچھے ہیں اور کتنے کیئرنگ۔"

اسد کے ذہن میں اس کے باپ کا خیال آگیا تھا۔ وہ ان سے دو' چار مرتبہ ملا تھا۔ مگر بھلا نہیں پایا تھا۔ وہ تھے ہی اتنے اچھے۔

"میں آپا کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ پتا نہیں وہ کہاں اور کیسی ہیں۔ مجھے تو محبت کے لفظ بھی بھول گئے ہیں۔ ماں جی نے بھی کبھی مجھ سے کھل کر بات نہیں کی۔ نہ کسی نے کبھی حال ہی پوچھا ہے۔ نبیل! یار قبرستانوں میں بھی چڑیاں پھدکتی ہوں گی' مگر ہمارے گھر میں۔ جھینگر بھی نہیں بولتے۔"

"ریلیکس۔" نبیل نے اس کا ہاتھ تھپتھپایا۔

☼ ☼ ☼

وہ اس وقت سوئمنگ پول میں ٹانگیں گھٹنوں تک ڈبوئے کنارے پہ بیٹھا تھا۔ اس کے گالوں سے آنسو گر کر اس کی گود میں جذب ہو رہے تھے۔ کتنی جلن تھی۔ اس کے جسم میں آگ سی بھر دی ہو جیسے کسی نے۔ ٹانگیں پانی میں ڈبوئے وہ جیسے اپنی تپش کو کم کرنا چاہتا تھا۔

"تم کہاں تھے دو دن سے؟" بابا کی آواز نے اسے چونکایا۔ اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر اس نے اپنے تاثرات چھپانے کی کوشش کی۔

"نبیل!" وہ نرمی سے اسے پکارتے ہوئے اس کے قریب بیٹھ گئے۔

"نمبر بچر ہو جائے گا بیٹا! جانتے نہیں کتنی سردی ہے۔ موسم بھی خراب ہے۔ شاید بارش ہو۔" اس نے حسرت سے آسمان کی جانب دیکھا۔

"تم دو دن سے گھر سے غائب تھے۔ کہاں تھے؟ اور اب اس طرح لان میں؟۔ کیا بات ہے بیٹا!"

وہ اس کی پیشانی کے بالوں کو پیار سے چھو کر بولے اس کے ماتھے پر پسینے کے قطروں نے انہیں اور پریشان کر دیا۔ اس یخ سردی میں پسینہ؟

"میں۔ میں دیہی علاقے میں گیا ہوا تھا۔ گاؤں میں فزیکل اور ریلیس کے حوالے سے کیمپ تھی۔" اس نے جھوٹ کی آمیزش کرتے ہوئے جانے کے مقصد کو تبدیل کر کے بتایا۔

"کس ایریا میں گئے تھے؟"

"ڈیرہ مبشر شاہ کملی میں۔" اس نے لاشعوری طور پر دہرایا اور آنکھیں بھینچ لیں۔ نام لیتے ہوئے اذیت کا احساس اس کی رگ رگ میں زہر بھر گیا۔

"نبیل۔" انہیں جیسے شاک لگا ہو مگر نبیل ابھی اپنی کیفیت سے باہر نہ آیا تھا اسے ان کے چہرے کے بدلتے رنگوں کا احساس نہ ہوا۔

"نہ جانے کیوں وہاں اتنی جہالت ہے بابا۔ بابا وہ لوگ ایسٹ روک افریقیوں سے بھی زیادہ جاہل ہیں شاید۔" وہ تکلیف سے چنختا رہا۔ اسے بابا کے اٹھ کر جانے کا احساس بھی نہ ہوا تھا۔ وہ رات بہت اذیت بھری تھی۔ وہ کسی ادھ بجھے سگریٹ کی مانند ذرا ذرا جھلستا رہا۔

☼ ☼ ☼

"اسد۔ مجھے ان کے برین ٹیسٹ کرنے ہیں۔ سٹی اسکین کی ضرورت ہے۔ تمہارا دماغ تو نہیں خراب جو مجھے کہہ رہے ہو کہ یہ سب وہیں مینیج کر لوں؟ پیشنٹ اسپتال آتے ہیں' اسپتال مریضوں تک نہیں جاتا۔" وہ تپ اٹھا تھا اسد کی بے تکی ڈیمانڈ پر۔ اسد کی طرف سے خاموشی پا کر وہ دوبارہ بولا۔

"تمہیں احساس نہیں کہ زندگی کتنی قیمتی ہے؟"

"بابا اجازت نہیں دے رہے۔" وہ سر جھکا کر منمنایا۔

"بابا پاگل ہیں۔" وہ بے ساختہ چلایا۔ اسد نظریں اٹھا کر اسے دیکھنے لگا۔

"میں کچھ نہیں کر سکتا سوائے اصرار کے۔ ایک بار پھر کروں گا۔ مگر مجھے پتا ہے' وہ نہیں مانیں گے۔ انہیں بیٹی کا مر جانا ہی عزیز ہے شاید۔" تو نے لہجے میں کہہ کر وہ اس کے کیبن سے نکل آیا۔ نبیل دونوں ہاتھوں میں سر تھامے واپس کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میں تمہیں آج سے نہیں بہت پہلے سے جانتا ہوں۔ میں نے تمہیں دیکھا نہیں مگر محسوس کیا ہے۔ میں نے تمہیں سوچا ہے۔ میں تمہیں رویا ہوں۔ تم سے ناتا آج کا نہیں بہت پرانا ہے۔ اسد جب جب مجھ سے تمہارا ذکر کرتا' میرا جی چاہتا میں تمہیں کھوجوں' تمہیں ڈھونڈوں' تمہیں تراشوں' تمہیں چھو دوں۔ تم کیسی ہو گی' میں نے ہزار عکس بینائی کے کینوس پر ابھار کر مٹا دیے مگر فیصلہ نہ کر سکا کہ تم کیسی ہو گی۔ تم۔ تم ایک عرصے سے گمنام زندگی گزار رہی ہو بے نام زندگی۔ تمہارے اپنوں کو۔ حتیٰ کہ اسد کو بھی نہیں پتا کہ تم کہاں اور کیسی ہو۔ میں جانتا ہوں ایسی زندگی گزارنا آسان نہیں۔ میں تمہارا ہر دکھ سمیٹ لینا چاہتا ہوں۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں' تمہیں نارمل زندگی دوں گا۔ تمہیں اس جہنم سے نکالوں گا۔ تمہاری زندگی کی یہ رات ختم کر دوں گا۔ نہ ختم ہونے والی صبح سے نواز دوں گا۔ میرا تم سے وعدہ ہے کہ سورج تمہارے در پہ دستک دے گا۔"

وہ بولتا رہا۔ بولتا رہا تھا۔ اس کا لہجہ اس کی سچائیوں کی گواہی دے رہا تھا۔ نبیل کی آنکھیں بند تھیں۔ اس کی ہادیہ کے ہاتھوں پر گرفت ڈھیلی ہوتی جا رہی تھی۔ چند لمحوں بعد کھلنے والی اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔

"سورج میرے در پہ دستک دے گا؟"

نبیل اس کا کھلا چہرہ آج پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ وہ آج پہلی بار بول رہی تھی۔

کمرے میں اندھیرا تھا۔ اس کا پہلا جملہ نبیل کی آنکھوں کو اتنی چمک دے گیا تھا کہ اسے ہر طرف روشنی ہی روشنی لگی۔

"ہادیہ!" اس کے لب پھڑپھڑائے۔ وہ پہلی بار اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کو ایک مدت سے چاہتا تھا۔ اس نے اسے اسد سے سنا تھا۔ اسد کی زبان سے محسوس کیا تھا۔ اسد کی یادداشتوں سے چرایا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کس بات کا جشن منائے۔ اس کی لب کشائی کا' اس کے دیدار کا' اس کے امید بھرے جملے کا۔؟

وہ اسے زندگی کی طرف واپس لانا چاہتا تھا۔ جو اس سے چھین لی گئی تھی۔

"ہادیہ!" اس نے پھر اسے پکارا۔

اسے سیڑھیوں کی طرف سے کسی کی آہٹ سنائی دی۔ وہ ہادیہ کے بابا تھے۔ یقیناً۔ کیونکہ اس طرف کوئی آنے کا مجاز نہ تھا۔ نبیل فرش سے اپنا میڈیکل بیگ اٹھاتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

ہادیہ نے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔

"ان کے مزید چیک اپ اور ٹیسٹ کے لیے انہیں ایک دو روز میں اسپتال شفٹ کر دیا جائے گا۔ آپ چاہیں تو ان کے ساتھ رہائش رکھ سکتے ہیں یا اسد۔۔۔"

وہ نارمل انداز میں بولتا گیا۔ جب مبشر علی نے اسے ٹوکا۔

"بس۔ میں خود رہائش رکھ لوں گا۔"

وہ جانتا تھا۔ وہ ہادیہ کے معاملے میں کسی کو قابل اعتبار نہیں سمجھیں گے۔ انہیں دوسروں پر تو اعتبار تھا مگر شاید ہادیہ پر نہیں تھا۔

شاید ہادیہ نے ان کا اعتبار توڑ دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میں آج سے سولہ سال پہلے ادھر آئی تھی۔" وہ بول رہی تھی اور وہ اس کے قریب کھڑا اس کل کوٹھڑی کا جائزہ لے رہا تھا۔

"بابا نے مجھ پہ سورج کی روشنی حرام کر دی تھی۔" اس نے الماری پر رکھے دیے کی لو کو چھوتے ہوئے

کہا۔
"ہادیہ!" اسے لگا اس کا ہاتھ جل گیا ہو گا مگر وہ بے بسی سے لو کو چھوتی رہی۔ اس کے زخم کھلتے رہے اور وہ اس جہنم میں جھلستی رہی۔
"وہ کہتا تھا جب تک سورج طلوع ہوتا رہے گا ہم جدا نہیں ہوں گے۔"
وہ رکی۔
"بابا نے مجھ سے سورج ہی چھین لیا۔" اس نے اب کی بار ہتھیلی سے لو کو ڈھانپ دیا تھا۔ کمرے میں گھپ اندھیرا ہو گیا۔
"وہ کہتے تھے تم اب کبھی تازہ ہوا میں سانس نہیں لے سکو گی۔ میں نے سولہ سال اس اندھیرے اور حبس میں گزار دیے۔" اس کی آواز کے اندھیرے اس سماعتوں میں اترتے رہے۔
"ہادیہ! کس گناہ کی سزا ملی تھی تمہیں آخر؟"
"مجھے حق استعمال کرنے کی سزا ملی تھی۔ وہ کہتے تھے۔ تم ایک اسلامی لڑکی ہو تمہیں اس طرح کی بے ہودگی کی اجازت نہیں۔ تم نے میری دی آزادی کا غلط استعمال کیا۔"
"تم نے کیا کیا تھا؟"
"میں نے شہیر کو بابا سے ملنے کا کہا تھا۔ اس نے مجھے ان سے مانگا تھا۔ اس نے غلط کیا تھا۔ میں نے بھی غلط کیا تھا۔"
اس کے لب پہ یہ نام آج پہلی بار سنا تھا اس نے۔
"پھر؟"
"پھر۔ پھر پتا نہیں۔ پتا نہیں شہیر کو زمین نے نگلا کہ فلک نے چھپایا۔ شہیر کو دیکھے۔ سورج کو دیکھے سولہ سال ہو گئے مجھے۔" وہ خاموش ہو چکی تھی۔ کتنے ہی لمحے سکوت میں گزر گئے۔
"میں شہیر کو تلاش کروں گا ہادیہ۔"
اس نے اپنا ہاتھ دیے کی لو سے ہٹا دیا تھا۔ وہ روشنی میں اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ اس نے آج پہلی بار نگاہ اٹھائی تھیں۔
نبیل اس کی آنکھوں میں ٹھہرے ہوئے بھورے عکس کو تکنے لگا۔ چند قطرے اس کی پلکوں سے ہوتے ہوئے گالوں سے پھسلتے ہوئے ٹھوڑی پر ٹھہر گئے۔ دیے کی روشنی میں اس نے ہادیہ کا چہرہ دیکھنے گا۔

☆ ☆ ☆

"تم آخر اس گاؤں کیوں جاتے ہو؟ کون ہے وہاں تمہارا۔"
بابا آج پہلی بار اس پہ چلا رہے تھے۔
"بابا! اسد کی بڑی بہن بیمار ہیں۔ میں ان کے علاج کے سلسلے میں۔۔۔"
"اسد کی بہن اسپتال شفٹ کیوں نہیں ہو جاتی۔" انہوں نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔ وہ آج پہلی بار انہیں اتنے سخت اور تکلیف دہ موڈ میں دیکھ رہا تھا۔
"بابا! آخر آپ اتنے پریشان کیوں ہو رہے ہیں؟ میں اپنے پروفیشن کی وجہ سے وہاں جاتا ہوں۔ میں ڈاکٹر ہوں تو پیشنٹس کو دیکھنے کی وجہ۔ بابا نہیں میں اسد کی وجہ سے وہاں جاتا ہوں کیونکہ وہ اپنی بہن کو اسپتال نہیں لا سکتا۔"
"کیوں۔۔۔ وہ کیوں نہیں لا سکتا؟"
اس نے چند لمحے انہیں دیکھ کر تمام صورت حال سے آگاہ کر دیا۔
"بابا! میں شہیر کو ڈھونڈنا چاہتا ہوں۔ میں ہادیہ کو اس کا حق دلانا چاہتا ہوں۔" وہ اپنی بات ختم کرتے ہوئے بولا۔
"نبیل!" انہوں نے ٹوٹے لہجے میں اسے پکارا۔
"جی۔۔۔!" اس نے ان کا چہرہ تکتے ہوئے پوچھا۔
"شہیر تمہیں نہیں مل سکتا۔" وہ حیرانی سے انہیں تکنے لگا۔ اسے خبر نہ ہوئی کہ بابا یہ کیوں کہہ رہے ہیں۔
"کیوں بابا؟"
"وہ بھی تمہاری طرح ضدی تھا۔ وہ بھی وہاں جاتا تھا مجھ سے چھپ چھپ کر۔ وہ ڈرتا نہیں تھا۔" بابا اٹھ کر لان کی طرف کھلنے والی کھڑکی کی طرف جا کھڑے ہوئے تھے۔ باہر لگے کاسنی پھولوں کے پودوں پر نظریں مرکوز کیے وہ اپنے زخموں کے بخیے ادھیڑ رہے تھے۔
"وہ ایک بار ہنستا ہوا یہاں سے گیا تھا کہ وہ ہادیہ کے پاس جا رہا ہے مگر۔۔۔" وہ رک گئے۔
نبیل مضطرب سا ان کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔
"مگر وہ واپس نہیں آیا پھر۔ میں نے۔ میں نے کیا کیا پتہ نہیں پہلے اس کی تلاش میں مگر ہادیہ کے باپ نے اس کے قتل کے سارے ثبوت غائب کر دیے۔ ایف آئی اے والے تک اس کا سراغ نہیں لگا سکے آج تک۔"
"بابا۔۔۔ شہیر آپ کا کیا لگتا تھا؟"
"شہیر میرا بیٹا تھا۔ تمہاری ماں سے قبل میں نے آسیہ سے شادی کی تھی۔ شہیر کی پیدائش پر اس کا انتقال ہو گیا تھا۔ شہیر نے عورت کی محبت نہیں دیکھی تھی۔ اسے قدرت نے ماں کی محبت سے محروم کیا تو پھر ہادیہ بھی چھین لی۔"
"نبیل! تم ہادیہ کو بچا لو گے نا؟ شہیر ہادیہ سے بہت محبت کرتا تھا۔"
"بابا۔۔۔! میں ہادیہ کو ٹریٹمنٹ کے بعد یہیں لاؤں گا شہیر کے گھر میں۔ اس کے بابا سے چھین کر لاؤں گا۔ میں ہادیہ کو زندگی دوں گا جو ظالموں نے اس سے چھین لی تھی۔"
وہ مضبوط ارادوں سے انہیں دلاسے دیتا رہا۔

☆ ☆ ☆

ہادیہ کو اسپتال آئے آج آٹھواں روز تھا۔ اس کا علاج چل رہا تھا اور وہ بہت بہتر ہوتی جا رہی تھی۔
نبیل اس کے کمرے میں آیا اور سامنے کی کھڑکی کھول دی۔ سورج کی کرنیں اس کے چہرے پر پڑیں اس کا سانولا رنگ چمکنے لگا تھا۔ کل رات اس کی میجر سرجری کی گئی تھی۔
"ہادیہ آنکھیں کھولو۔۔۔! دیکھو! سورج طلوع ہو رہا ہے۔ شہیر اور تم کبھی جدا نہیں ہوتے ہادیہ دیکھو۔"
وہ اس کے گال سہلانے لگا۔ اس کی انگلیاں اس کے نیلے سرد ہونٹوں پر آ کر رک گئیں۔ اس نے جھکتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اس کی نبض کو چھوا۔ وہ چند لمحے اس کے نیلے ہونٹوں کو اپنی ہتھیلی کی تپش دیتا رہا۔ مگر اس کے خود کے ہاتھ سرد ہونے لگے۔
اسٹیتھوسکوپ کی مدد سے اس نے اس کی سانس کھوجنے کی کوشش کی مگر گہرا سکوت اس کی سماعتوں میں شور بھر گیا۔
اس کے وجود سے جان نکلنے لگی وہ زمین پر بیڈ کے قریب ڈھے سا گیا۔ اس کی انگلیاں اس کے ہونٹوں کو سہلاتی رہیں۔ اس کی آنکھیں سرد تھیں۔ ہادیہ مر گئی تھی اور نبیل جینے کے قابل نہیں رہا تھا۔
"شہیر کہتا تھا جب تک سورج طلوع ہوتا رہے گا ہم جدا نہیں ہوں گے۔"
آج بھی سورج طلوع نہیں ہوا تھا۔

اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

☆

رُخسانہ نگار عدنان

اکٹھی مثال

عدیل اور فوزیہ نسیم بیگم کے بچے ہیں۔ بشریٰ ان کی بہو ہے اور ذکیہ بیگم کی بیٹی۔ عمران بشریٰ کا بھائی ہے۔ مثال ذکیہ بیگم کی نواسی اور نسیم بیگم کی پوتی ہے۔ بشریٰ اور نسیم بیگم میں روایتی ساس بہو کا تعلق ہے۔ نسیم بیگم مصلحتاً "بیٹا بہو سے لگاوٹ دکھاتی ہیں۔ دوسری طرف ذکیہ بیگم کا کہنا ہے۔ ان کی بیٹی بشریٰ کو سسرال میں بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ ذکیہ بیگم اپنے بیٹے عمران کے لیے بھی لڑکیاں دیکھ رہی ہیں۔ پانچ سال کی مسلسل کوششوں کے بعد بشریٰ کی نند فوزیہ کا بالآخر ایک جگہ رشتہ طے پا جاتا ہے۔ نکاح والے روز بشریٰ دولہا ظہیر کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔

عدیل سے شادی سے قبل ظہیر کا بشریٰ کے لیے بھی رشتہ آیا تھا مگر بات نہ بن سکی تھی۔ نکاح والے دن زاہدہ اور ذکیہ بیگم بھی ایک دوسرے کو پہچان لیتی ہیں۔ بشریٰ اپنی ماں سے یہ بات چھپانے کے لیے کہتی ہے مگر عدیل کو پتا چل جاتا ہے۔ وہ ناراض ہوتا ہے مگر فوزیہ اور نسیم بیگم کو بتانے سے منع کر دیتا ہے۔ بشریٰ اور عدیل ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد جاتے ہیں۔ وہاں انہیں پتا چلتا ہے کہ بشریٰ کے ہاں سات سال بعد پھر خوش خبری ہے۔

عفان اور عاصمہ اپنے تین بچوں اور والد کے ساتھ کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔ عفان کے والد فاروق صاحب سرکاری نوکری سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ گریجویٹی اور گاؤں کی زمین فروخت کر کے وہ اپنا گھر خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ڈیڑھ کروڑ میں زمین کا سودا کر کے وہ عفان کے ساتھ خوشی خوشی شہر آ رہے ہیں۔ عاصمہ کو فون کے ذریعے کوئی اطلاع ملتی ہے جسے سن کر وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔

فون پر پتا چلتا ہے کہ شہر آتے ہوئے عفان اور فاروق صاحب ڈکیتی کی واردات میں قتل ہو گئے۔ عفان کے قریبی دوست زبیر کی مدد سے عاصمہ عفان کے آفس سے تین لاکھ روپے اور فاروق صاحب کی گریجویٹی سے سات لاکھ روپے وصول کر پائی ہے۔ زبیر گھر خریدنے میں بھی عاصمہ کی مدد کر رہا ہے۔

اسلام آباد سے واپسی پر عدیل دونوں مقتولین کو دیکھتا ہے۔ زاہدہ، نسیم بیگم سے بیس لاکھ روپے سے مشروط فوزیہ کی رخصتی کی بات کرتی ہیں۔ وہ سب پریشان ہو جاتے ہیں۔ عدیل بشریٰ سے ذکیہ بیگم سے تین لاکھ روپے لانے کو کہتا ہے۔ حمیدہ خالہ، عاصمہ کو سمجھاتی ہیں کہ عدت میں زبیر کا اکیلے اس کے گھر آنا مناسب نہیں ہے۔ لوگ باتیں بنا رہے ہیں جبکہ عاصمہ کی مجبوری ہے کہ گھر میں کوئی مرد نہیں۔ اس کا بیٹا ابھی چھوٹا ہے اور سارے کام اس کو خود کرنے ہیں۔ وہ جلد از جلد اپنا گھر خریدنا چاہتی ہے۔ عاصمہ کے کہنے پر زبیر کسی مفتی سے فتویٰ لے کر آجاتا ہے کہ وہ انتہائی ضرورت کے تحت گھر سے نکل سکتی ہے بشرطیکہ مغرب سے پہلے واپس گھر آجائے سو وہ عاصمہ کو مکان دکھانے لے جاتا ہے۔

فوزیہ کے طلاق ہو جانے پر نسیم بیگم جذباتی ہو کر سہو اور اس کے گھر والوں کو مورد الزام ٹھہرانے لگتی ہیں۔ اسی بات پر عدیل اور بشریٰ کے درمیان خوب جھگڑا ہوتا ہے۔ عدیل طیش میں بشریٰ کو دھکا دیتا ہے۔ اس کا ابارشن ہو جاتا ہے۔ عدیل شرمندہ ہو کر معافی مانگتا ہے مگر وہ ہنوز ناراض رہتی ہے اور اسپتال سے اپنی ماں کے گھر چلی جاتی ہے۔

اسی اسپتال میں عدیل عاصمہ کو دیکھتا ہے جسے بے ہوشی کی حالت میں لایا گیا ہوتا ہے۔ عاصمہ اپنے حالات سے تنگ آکر خودکشی کی کوشش کرتی ہے تاہم بچ جاتی ہے۔ نو سال بعد عاصمہ کا بھائی ہاشم پریشان ہو کر پاکستان آجاتا ہے۔

— ۷ —

ساتویں قسط

وہ رکشے سے بیگ اتار کر رکشے والے کو مٹھی میں دبے پیسے بڑی احتیاط سے گن کر دینے کے بعد رکشے کے دور جانے کے بعد یونہی کتنی دیر کھڑی رہی۔ اس کا دماغ ایک دم سے جیسے خالی ہو گیا تھا۔

"میں یہاں کس لیے آئی ہوں؟" وہ خالی الذہن کھڑی بے بسی سے دور جاتے رکشے کو دیکھتی رہی۔ "مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔" اس نے بے بسی سے سوچا۔

"تو پھر اور کہاں جاتی، میری زندگی میں چوائس کتنی کم ہے... بلکہ ہے ہی نہیں۔" دھوپ بہت تیز تھی اور جیسے اس کے سر پر جھک رہی تھی۔ مگر اسے تو نہ گرمی کا احساس تھا نہ سردی کا نہ اس بات کا کہ وہ سڑک کے بیچوں بیچ اپنا بوسیدہ بیگ لیے بے مقصد ہی کھڑی ہے۔

اس نے جھک کر بیگ اٹھایا اور اپنی پشت پہ پھیلے سرخ ٹائلوں والے خوب صورت وسیع و عریض گھر کو دیکھا۔

"اتنا بڑا گھر کہ جس کے باہر سے گزرنے والے اس کے اندر آنے کی تمنا ایک بار تو ضرور کریں۔ اس اتنے بڑے محل میں میرے لیے ذرا سی جگہ بھی نہیں ہے کہ جہاں میں مہینے کے پندرہ دن گزار سکوں۔" ڈور بیل بہت دور تک اور بہت دیر تک بجتی رہی تھی۔

وہ بے خیال سی کھڑی تھی۔

ساتویں بار کال بیل دیتے ہوئے وہ بے اختیار چونک گئی۔

"کہیں ایسا تو نہیں کہ گھر میں کوئی بھی نہ ہو۔ جیسا کہ پہلے بھی دو چار بار ہو چکا ہے۔ مائی گاڈ...!" اس کا دل بہت تیز تیز دھڑکنے لگا تھا۔

اس نے دوپٹے کے پلو سے چہرے کو رگڑ ڈالا۔

"میرے پاس تو واپسی کے لیے کرایہ بھی نہیں ہے... اگر واپس جانا ہی پڑا تو کیسے جاؤں گی۔" اس کا دل سمٹنے لگا تھا۔

اسے لگا وہ ابھی گرے گی اور... بے ہوش ہو جائے گی۔

"بے ہوش ہی کیوں، میں مر کیوں نہیں جاتی۔" اس نے جھنجلا کر خود کو ہزار بار کی دی ہوئی بددعا دہرائی۔ مگر جانتی تھی اس بار بھی یہ بددعا بے اثر رہے گی۔

"گھر میں تو کوئی بھی نہیں ہے۔ اسلام آباد گئے ہیں سب۔" اس کا خدشہ درست نکلا۔

چوکیدار سرخ آنکھوں کے ساتھ ذیلی دروازے میں کھڑا چہرے پہ زمانے بھر کی بے زاری سجائے اس سے کہہ رہا تھا۔

"کب... کب گئے؟" بالکل غیر ضروری سوال تھا جبکہ اسے کچھ اور پوچھنا تھا۔

"دو دن ہو گئے۔ آپ کو پتا نہیں تھا؟" چوکیدار نے اس کی لاعلمی پر تاسف بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

"ہاں... نہیں معلوم تو تھا مگر مجھے لگا شاید ابھی کچھ دن ہیں جانے میں... خیر آجائیں گے واپس۔ میں اندر تو آجاؤں بہت گرمی ہے باہر۔" بہت دیر بعد اسے موسم کی شدت کا احساس ہوا تھا۔ ذیلی دروازے میں آگے کی طرف بیگ کو دھکیلنے لگی۔

"مگر وہ جی... گھر تو اندر سے سارا بند ہے۔ مطلب تالا وغیرہ سب کمروں کو لگا ہے تو آپ..." چوکیدار رک رک کر بولا۔ اسے شاید یہ امید تھی کہ وہ سب گھر والوں کی غیر موجودگی کا سن کر واپس چلی جائے گی۔

اس سے کتنی دیر تک کچھ بولا ہی نہ گیا۔

"نہیں، وہ میرا کمرا... مطلب وہ اوپر کی طرف ہے تو۔"

"باہر لاؤنج سے تالا لگا ہے۔ اندر کی سیڑھیاں بھی اسی میں آتی ہیں تو آپ کیسے جائیں گی اوپر۔" چوکیدار اس کو سمجھانے والے انداز میں بولا۔ وہ ناسمجھی سے اسے دیکھے جا رہی تھی۔

"لیکن... میں تو آگئی ہوں۔ مجھے تو اب... میرا مطلب ہے میں واپس نہیں جا سکتی۔ آپ پیچھے ہٹیں۔ میں دیکھ لوں گی جہاں مجھے رہنا ہو گا۔"

اس نے اب کے کچھ بہادری دکھانے کی کوشش کی۔

"کہاں رہیں گی آپ؟"

آپ راستہ تو دیں۔ میں دیکھ لوں گی کیونکہ میں واپس نہیں جا سکتی۔" وہ درشتی سے کہہ کر بیگ اٹھا کر چوکیدار کو پیچھے کرتے ہوئے اندر چلی گئی۔

چوکیدار پریشان سا اسے اندر جاتا دیکھ رہا تھا۔

وہ اب لاؤنج کی سنگ مرمر کی سیڑھیوں پر بیگ رکھے گم صم سی کھڑی تھی۔ بند دروازہ اس کا منہ چڑا رہا تھا۔

اسے بہت دیر بعد ٹانگوں کے تھکنے کا احساس ہوا تو گرنے کے سے انداز میں وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔

چوکیدار ابھی بھی منتظر تھا کہ وہ بند دروازہ دیکھ کر واپس لوٹ جائے گی۔

وہ جان بوجھ کر چوکیدار کی طرف نہیں دیکھ رہی۔

اس کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا کہ اب اسے کہاں جانا ہے جبکہ اس کے پاس پیسے بھی نہیں۔ اس نے پرس کو یونہی ٹٹولنا شروع کر دیا۔

☼ ☼ ☼

"بشریٰ! سو رہی ہو؟" ذکیہ بیگم دیوار کی طرف کروٹ لے کر لیٹی ہوئی بشریٰ کے پاس آکر نرم لہجے میں پوچھنے لگیں۔

جواب میں بشریٰ سیدھی ہو کر ماں کو دیکھنے لگی۔

"سن لو ناں تمہارا فون ہے۔ اب کیا میں کھڑی رہوں لے کر۔" ذکیہ نے کچھ بے زاری سے کہا۔

بشریٰ نے کوفت بھرے انداز میں فون لے لیا۔ لمحہ بھر کچھ سوچتی رہی پھر سیل کان سے لگا لیا۔

دوسری طرف عدیل تھا۔

بشریٰ نے غصیلی نظروں سے ماں کی طرف دیکھا۔

ذکیہ بیگم اسے لجاجت بھرے انداز میں بات کرنے کا اشارہ کرنے لگیں۔ بشریٰ نے ہونٹ بھینچتے ہوئے لائن کاٹ کر کے تکیہ کے پاس رکھ دیا۔ ذکیہ پہلے اسے غصے سے دیکھتی رہیں پھر سر پکڑ کر اس کے پاس ہی بیڈ کے کنارے پر ٹک گئیں۔

بشریٰ لاتعلق سی ماں کو دیکھتے ہوئے سامنے دیوار پر لگی پینٹنگ کو دیکھنے لگی۔ سیل فون پھر سے بجنے لگا تھا۔

ذکیہ نے آس بھری نظروں سے بیٹی کی طرف دیکھا۔ وہ اسی طرح لاتعلق بیٹھی تھی۔

فون مسلسل بجنے کے بعد خاموش ہو گیا۔

بشریٰ دوبارہ لیٹ گئی۔

"ایسا کب تک چلے گا بشریٰ!" ذکیہ نے حتی الامکان لہجے کو نرم رکھتے ہوئے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

"تنگ آگئی ہیں مجھ سے؟" بشریٰ ماں کی طرف دیکھے بغیر سپاٹ لہجے میں بولی۔

"فضول بات نہیں کرو۔ اس میں میری تنگی یا فراخی کی بات نہیں ہے تم جانتی ہو۔" ذکیہ بیگم چڑے ہوئے لہجے میں بولیں۔

"اس بات کا تعلق تنگی اور فراخی سے تو ہے۔ آپ مانیں یا نہیں مانیں۔" وہ اسی بے تاثر لہجے میں پھر بولی۔

"آج سترہ دن ہونے لگے ہیں۔" ذکیہ طویل سے لہجے میں بولیں۔

"مجھے آکر بیٹھے ہوئے؟ بے فکر رہیں گنتی صرف آپ نہیں کر رہیں۔ میں بھی ہر روز صبح اٹھ کر دنوں کو شمار کرتی ہوں۔" بشریٰ کے لہجے میں تلخی تھی۔

"میری بچی! وہ مرد ذات ہے۔ سترہ دنوں سے وہ مسلسل چکر لگا رہا ہے۔ ہر روز دفتر سے واپسی پر گھر جانے سے پہلے وہ تم سے اور مشال سے ملنے کے لیے آتا ہے۔ بچی کے لیے فرمائش کی ڈھیروں چیزیں پھل کیک چاکلیٹ کھلونے بسکٹ کیا ہے جو وہ نہیں لے کر آتا۔ گھنٹوں تم سے ملنے کی آس لیے انتظار کرتا ہے۔ اگر اس کا دل پھر گیا تم سے تو۔"

ذکیہ حتی الامکان نرم الفاظ میں اسے رک رک کر سمجھانے کی کوشش کرنے لگیں۔

"دل ہی تو پھر گئے ہیں۔ ان کا پھرا ہے یا نہیں مگر میرا دل ان سے مکمل طور پر پھر گیا ہے۔ میں اب اس شخص کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی جو میرے بچے کا قاتل ہے۔ میری خوشیوں کا قاتل۔ آپ چاہتی ہیں میں اس کے چند چاکلیٹ چار بسکٹ اور تھوڑے سے پھلوں کے عوض اپنے بچے کا خون معاف کر دوں؟ کبھی نہیں، مر کر بھی نہیں!"

بشریٰ کے لہجے میں سختی کے ساتھ دکھ کی کرچیاں بھی تھیں، جسے صرف ایک ماں ہی محسوس کر سکتی تھی۔

"اس نے یہ سب کچھ جان بوجھ کر نہیں کیا۔ ایک بار نہیں، بہت بار وہ تم سے سب سے معافی مانگ چکا ہے۔ میں جانتی ہوں، سب جانتے ہیں اسے۔ وہ کتنی نرم، محبت کرنے والی طبیعت کا مالک ہے۔ تم تھوڑا سا دل میں وسعت۔" ذکیہ کے لہجے میں محبت تھی۔

"آپ کا مطلب ہے میں سخت دل ہوں، پتھر ہوں، جھوٹی ہوں۔ ان پر الزام لگا رہی ہوں۔ جو کچھ ہوا وہ سب میری وجہ سے تھا۔ اس میں ان کی کچھ غلطی نہیں؟" بشریٰ پھٹی ہوئی آواز میں آنسو ضبط کرتے ہوئے بولی۔

"ایسا میں نے کب کہا۔ غصے میں آگیا تھا وہ۔ طیش میں انسان بہت کچھ بھول جاتا ہے۔ نقصان اگر تمہارا ہوا ہے تو جانے والی اس کی بھی اولاد تھی۔ دوسری اولاد اس کی بھی سب سے بڑی خواہش تھی۔ دکھ اسے بھی اتنا ہی ہے جتنا تمہیں ہے۔" اب کے ذکیہ کے انداز میں ترشی تھی۔

"نہیں ہے انہیں اتنا دکھ نہ تکلیف۔ وہ اپنے گھر والوں جیسے ہیں اپنی ماں اور اپنی بہن جیسے۔ دونوں پتھر دل، بے حس عورتیں ہیں۔ انہیں دل میں جتنی میری گود اجڑنے کی خوشی ملی اور کسی بات کی نہیں۔ اور امی! آپ اس شخص کی باتوں پر پگھل رہی ہیں جبکہ اس کی ماں ہر روز اس کے کانوں میں ایک ہی صور پھونکتی ہو گی کہ بشریٰ جیسی بیوی کو چھوڑ دینا ہی اس کے لیے بہتر ہے اور آپ دیکھیے گا۔ وہ آج یا کل یا چند مہینوں بعد ماں کے کہنے پر ایمان لے آئے گا اور مجھے یہیں بیٹھے طلاق ہو گی اور آپ کو اس بھلی طبیعت کے شخص کی دوسری شادی کا کارڈ بھی موصول ہو جائے گا۔ وہ ایسے ہی ہیں سب، بے حس کمینے گھٹیا۔ میں ان لوگوں میں واپس نہیں جاؤں گی اور بے فکر رہیے۔ یہاں بھی پڑی نہیں رہوں گی۔ کسی دارالامان میں چلی جاؤں گی۔ آپ پہ مصیبت بن کر بیٹھی نہیں رہوں گی۔" وہ زور زور سے چلانے لگی تھی۔

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ تمہیں سمجھانا دیوار سے سر پھوڑنے کے برابر ہے۔ کوئی بات عقل، تمیز کی تمہاری سمجھ میں ہی نہیں آتی۔ اپنا نقصان، اپنا خسارہ لیے بیٹھی چلاتی رہتی ہو۔ خدانخواستہ اگر اس نے واقعی ماں کے کہنے پر تمہیں چھوڑ دیا تو دماغ ٹھکانے آجائے گا تمہارا، پھر کرنا یہ اونچی اونچی باتیں۔ جب بچی کو لے کر اس کی پرورش کے لالے پڑیں گے۔ بچوں کے باپ صرف اپنے ہی بچوں کے ہوتے ہیں۔ تمہیں دوسرا شوہر مل جائے گا اور اسے دوسری بیوی۔۔۔ پر اس بچی کو اپنا باپ نہیں ملے گا۔ اپنی اکڑ کی فکر ہے۔ انا کی ضد سوار ہے تم پر۔ اس معصوم کے بارے میں سوچا ہے، جو گھنٹوں باپ کے انتظار میں گیٹ کے آس پاس صبح اٹھتے ہی منڈلانا شروع کر دیتی ہے۔ سنو بشریٰ بی بی بے حس تمہارے سسرالی اور تمہارا شوہر ہے یا نہیں مگر تم ضرور ہو۔" ذکیہ بھی دوبدو بولتی چلی گئیں۔ بشریٰ ماں کو دیکھتی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

مشال دروازے کے پیچھے ماں اور نانی کی باتیں سنتے ہوئے آنکھوں میں آنسو لیے کھڑی تھی۔

"اگر مما کبھی بھی گھر نہ گئیں اور نانو کہہ رہی ہیں اگر پاپا بھی ان سے ناراض ہو گئے تو ہم کہاں جائیں گے نانو کے گھر سے۔۔۔" اس کا چھوٹا سا ذہن اتنی بڑی گتھی سلجھانے سے قاصر تھا۔

"ہاؤ!" عمران نے پیچھے سے آکر مشال کو ڈرا دیا۔

وہ ڈر کر ایک دم سے رونے لگی۔

"ارے رے میری جان، میری پیاری گڑیا لڑ پوک میں تو مذاق کر رہا تھا۔ یونہی تمہیں دیوار سے پیچھے دیکھ کر سوچا۔ تمہیں ڈراؤں، مذاق کر رہا تھا مشال جانو! اچھا یار سوری چپ تو کرو۔۔۔ کیوں اپنی مما اور نانو سے میری شامت

بلوائی ہے۔" وہ اس کے رونے پر اسے چمکارنے لگا۔
"اچھا چلو تو جلدی سے تمہیں آئس کریم کھلا کر لاتا ہوں بلکہ مثال کی پسند کی چاکلیٹ اور کھلونے بھی لے گی میری گڑیا!" وہ اس کا چہرہ نرمی سے ٹشو سے صاف کرتے ہوئے اسے گود میں ذرا سا اٹھا کر پیار سے بہلانے لگا۔

"نہیں ۔۔۔ مجھے کچھ نہیں کھانا، ماموں!" وہ چہرہ صاف ہونے کے بعد سنجیدگی سے بولی۔
"مثال!" اس کے یوں انکار پر عمران کچھ حیرانی سے بولا۔
"ماموں! میرا دل نہیں چاہ رہا۔" وہ آہستگی سے گود سے اتر گئی۔
"کیا تم ناراض ہو گئی ہو مجھ سے؟" وہ اس کے بال سلجھا کر بولا۔
"نہیں تو۔" وہ بڑے پن سے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔
"تو پھر ماموں کے ساتھ چلنے سے انکار کیوں؟"
"دل نہیں چاہ رہا ناں ماموں!" اسے واقعی آج کل کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ بس دل چاہ رہا تھا وہ جلدی سے ماما کے ساتھ اپنے گھر چلی جائے۔ نانو کے گھر اگر آئے بھی تو پہلے کی طرح بس ایک دو روز کے لیے یا چند گھنٹوں کے لیے۔۔۔
وہ بشریٰ سے اب کچھ اس لیے نہیں کہتی تھی کہ وہ فوراً "اسے باپ کی چمچی اور جانے کیا کیا کچھ کہنے لگتی تھی۔ پاپا کے سامنے بھی کھل کر اپنی خواہش نہیں کہتی تھی۔ اگر پاپا اسے ساتھ لے گئے تو وہ ماما کے بغیر نہیں رہ سکے گی۔ رہ تو وہ پاپا کے بغیر بھی نہیں پا رہی تھی مگر وہ اپنی تکلیف کسی سے بھی نہیں کہہ پا رہی تھی۔
اچھا چلو۔ جھولے لینے چلتے ہیں۔" عمران نے اسے ایک اور بہلاوا دیا۔
ماموں! مجھے نہیں جانا۔ میرا ہوم ورک بھی رہتا ہے۔ ابھی وہ بھی کرنا ہے اور ایک ٹیسٹ بھی ہے کل میرا اس کی تیاری بھی کرنی ہے مجھے۔" اسے بھی بڑوں کی طرح جان چھڑانے کے لیے بہانے بنانے آتے جا رہے تھے۔
"جان! اس کی تو آپ فکر ہی نہ کریں۔ آپ کے ماموں یوں چٹکیوں میں ہوم ورک بھی کروا دیں گے اور ٹیسٹ کی تیاری بھی۔" عمران چٹکی بجا کر مزے سے بولا۔

"چلو اب مزید ایکسکیوزز ختم کریں آپ اور جلدی سے چلیں میرے ساتھ۔ جھولے بھی لیں گے اور آئس کریم بھی چلے گی۔ سچ میرا بھی بہت دل چاہ رہا ہے آئس کریم کھانے کو اب چلو فٹافٹ۔ میں آپی سے کہہ کر آتا ہوں۔" وہ کہہ کر اندر جانے لگا۔
"ماموں! مجھے نہیں جانا ناں۔ میں نے آپ سے بولا بھی ہے، پھر آپ کیوں بار بار کہے جا رہے ہیں۔" وہ ایک دم زور سے بولی۔
عمران کے آگے بڑھتے قدم وہیں ٹھٹک سے گئے۔
اس طرح مثال نے کبھی بات نہیں کی تھی یوں چیخ کر، بدتمیزی سے۔ وہ تو بڑی تمیز والی محبت کرنے والی بچی تھی سب کا ادب کرنے والی۔
"کیا ہوا ہے اس طرح بدتمیزی کیوں کر رہی ہو۔ اگر آپ نے نہیں جانا تو مت جاؤ لیکن بات کیا ہے، ماموں کو نہیں بتاؤ گی۔" وہ جھک کر اسے پیار کر کے بولا۔
"ماموں! چھ بجنے والے ہیں ناں؟"

"ہاں کیا ہوا۔ کہیں اور جانا ہے آپ نے چھ بجے؟" وہ نرمی سے بولا۔
"پاپا آنے والے ہیں ناں مجھے ان کا انتظار ہے۔" وہ مغلوب سے لہجے میں بولی۔ عمران ہونٹ بھینچ کر اسے دیکھنے لگا۔ پھر ایک جھٹکے سے اسے چھوڑ کر اندر چلا گیا۔
مثال بے بسی سے عمران کو جاتا دیکھتی رہی۔
اسپتال میں دونوں میں جو تلخ کلامی ہوئی تھی۔ اس کے بعد عمران نے عدیل سے بات نہیں کی تھی۔ عدیل گھر بھی آتا تو وہ ماں کے مجبور کرنے پر سرسری انداز میں سلام کر کے گزر جاتا تھا۔
عدیل نے بھی اس کی خفگی کی پروا نہیں کی تھی۔ عدیل کو اس وقت سوائے بشریٰ کی خفگی اور کسی کی پروا تھی بھی نہیں۔
بشریٰ جس نے اتنے دنوں سے اسے اپنی شکل نہیں دکھائی تھی۔ کبھی کبھی تو اس کا خون اپنی اس ذلت اتنی بری طرح سے کھولتا کہ جی چاہتا وہ پستول سے بشریٰ کا، اپنا اور مثال کا خاتمہ کر دے۔
گھر جاتا تو ماں اور بہن کے طعنے ان کے طنز اس کا سینہ چھلنی کرنے لگتے۔ سسرال میں آتا تو بشریٰ کا نہ ملنا اسے اور بھی اپنی نظروں میں گرا جاتا۔ وہ سب کچھ صرف مثال کے لیے برداشت کر رہا تھا۔
باہر گاڑی کا ہارن بجا اور مثال بھاگتی ہوئی باہر چلی گئی۔ اس کے پاپا آ گئے تھے۔

☆ ☆ ☆

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ ہاشم بھائی؟" عاصمہ کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔
"کون تھا یہ کمینہ زبیر۔ کچھ نہیں چھوڑ کر گیا۔ سب کچھ لے اڑا ہے۔ تم اندھی تھیں۔ انسانوں کی تمہیں ذرا بھی پہچان نہیں۔ ایسا اندھا اعتماد تو کوئی اپنے سگوں پر نہیں کرتا تھا۔ تم نے ایک غیر شخص پر کر ڈالا۔"
وہ غصے میں دیتا چلا گیا۔ عاصمہ بے بسی سے بھائی کی شکل دیکھتی رہی پھر نظریں جھکا کر یوں بیٹھ گئی جیسے اب کبھی نہیں بولے گی۔
باہر شام ڈھل رہی تھی۔ چڑیاں اپنے گھروندوں کو لوٹ آنے کے بعد شور کر رہی تھیں۔ اس کا دل بے اختیار خواہش کرنے لگا کہ کاش وہ کوئی چڑیا ہوتی۔ درخت سے ٹوٹا کوئی بے جان پتا یا کوئی چیونٹی۔۔۔ کب کی پیروں کے نیچے آ کر مسلی جا چکی ہوتی۔

مگر وہ تو اشرف المخلوقات میں سے تھی۔

غم جھیلنے اور غم سے نپٹنے کا سلیقہ خدا نے اپنی اسی مخلوق کو دان کیا ہے۔ اس نے غم سے بوجھل پلکیں اٹھا کر ہاشم کو دیکھا۔

ہاشم کا موڈ سخت آف تھا۔

وہ بھی ٹھیک تھا بے چارہ جس دن سے آیا تھا مسلسل بھاگ دوڑ میں لگا تھا۔ بڑی مشکل سے عفان کے دفتر سے دوبارہ فائل نکلوائی۔ پھر سے حساب کتاب لگوایا۔

جمع تفریق ضرب تقسیم... ہر طرح سے الٹا سیدھا ہیر پھیر کر کے بھی حساب کر لیا۔ سارا خسارہ عاصمہ کے حصے میں آ رہا تھا۔

وہ عفان کے سارے واجبات اپنے اکاؤنٹ میں پہلے ہی ٹرانسفر کروا چکا تھا۔ اور عاصمہ نے بہت سی جگہوں پہ آنکھیں بند کر کے سائن کرتے ہوئے اس شیطان کے لیے آسانیاں پیدا کر رہی تھیں۔

"عفان کا تو ایک دھیلا نہیں چھوڑا اس نے تمہارے اور بچوں کے لیے غضب خدا کا ایسا بھی کوئی ظالم انسان ہو گا۔ یتیموں کا مال لے اڑا۔ یقیناً" زندگی میں بہت ذلیل و رسوا ہو گا لیکن... اس وقت تو وہ تمہارے لیے ہر راستہ بند کر گیا۔ میرے ہاتھ لگ جائے۔" ہاشم مٹھیاں بھینچ رہا تھا۔

واثق گم صم کبھی ماں کی طرف دیکھتا اور کبھی ماموں کے ایک ایک لفظ کو بغور سنتے ہوئے سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے بہت کچھ سمجھ میں آ رہا تھا اور بہت کچھ تھا جو وہ سمجھتے ہوئے بھی سمجھنا نہیں چاہ رہا تھا۔

"بھائی! اس کے گھر کا ایڈریس؟" عاصمہ بہت مدھم آواز میں بولی۔

"کچھ نہیں بچا... وہ کہیں کوئی اپنا پتا نشان نہیں چھوڑ کر گیا۔"

"عفان کے ساتھ وہ کتنی بار گھر آیا تھا؟" ہاشم اس کی آنکھوں میں دیکھ کر پوچھ رہا تھا۔

"دو... چار بار... شاید۔" نظروں کے ساتھ عاصمہ کی آواز اور بھی پست ہوتی جا رہی تھی۔

"اور بیوی بچوں کے ساتھ؟" وہ پھر سے بولا۔

عاصمہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"کوئی بھی نہیں جانتا۔ اس کی فیملی تھی بھی یا نہیں... عفان کے باس نے بھی اپنے ذرائع سے کافی بھاگ دوڑ کروا کے پتا چلانے کی کوشش کی ہے مگر وہ شیطان گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہے۔"

کمرے میں موت کی سی خاموشی چھا گئی۔

ایک کے بعد ایک بڑی اور بری خبر چلی آ رہی تھی۔

ہاشم تو خود یہاں آ کر پھنس چکا تھا۔ اب نہ تو وہ عاصمہ اور بچوں کو یونہی بے یار و مددگار چھوڑ کر جا سکتا تھا اور نہ اپنے پلے سے اتنی موٹی رقم دے سکتا تھا۔ ان کے سر پہ چھت بھی جاتی اور مستقل آمدنی کی کوئی صورت بھی۔

"میں نے آپ کو یہاں بلوا کر ناحق پریشان کیا ہے بھائی!"

عاصمہ کو کچھ تو کہنا ہی تھا اور یہ سب جو غلط اور الٹ پلٹ ہوا تھا اسی کی وجہ سے تو تھا۔

ہاشم نے کچھ کوفت سے اس کی طرف دیکھا مگر جواب میں کچھ نہیں کہا۔ عاصمہ دل مسوس کر رہ گئی۔

"یہاں... یہ مالک مکان کافی اچھے ہیں۔ انہوں نے گھر خالی کرنے کو نہیں کہا۔ چند ماہ میں یہاں اور گزار سکتی ہوں پھر عدت کے بعد کوئی چھوٹی موٹی سی اسکول میں نوکری کر لوں گی اور گھر بھی کوئی چھوٹا سا دیکھ لوں گی۔" اس نے رک کر ہاشم کے ماتھے پہ پڑتے بلوں کو شمار کرنے کی کوشش کی۔

"محلے والے بھی کافی اچھے ہیں۔ خیال رکھنے والے اور تعاون کرنے والے۔ بچوں کے اسکول میں بھی میں نے بات کر لی ہے۔ وہ ان کی فیس میں بھی کچھ رعایت کر دیں گے۔" وہ رک کر بولی۔

"تم جو کہنا چاہتی ہو' صاف کہو۔" ہاشم بے زاری سے بولا۔

"آپ واپس چلے جائیں۔ میری وجہ سے اتنی تکلیف نہ اٹھائیں۔" وہ اٹک کر بولی۔

"تمہارا کیا خیال ہے میں تمہارے لیے یہ سب کچھ کر رہا ہوں؟" وہ کٹیلے لہجے میں بولا۔

عاصمہ سن سی رہ گئی۔ اسے اس جواب کی توقع نہیں تھی۔

"یہ معصوم سوال کرتی آنکھیں اور اپنے مرے ہوئے بہنوئی کی بے چین روح... رات عفان میرے خواب میں آیا رات کو۔ میں نے دیکھا وہ سارے گھر میں پریشان پھرتے ہوئے کبھی کمروں کے دروازے بند کرتا ہے اور کبھی کھڑکیاں... یوں جیسے اسے تم لوگوں کی حفاظت کے خیال نے پریشان کر رکھا ہے۔ اور تم کہتی ہو تم یہاں محفوظ ہو؟" وہ بڑبڑا کر بولا۔

عاصمہ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

اس نے اتنے دنوں سے ایک بار بھی عفان کو یاد کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

وہ عفان کی یاد سے آنکھیں ملا ہی نہیں سکتی تھی۔

کوئی بھی اس کے مرے ہوئے شوہر کا نام لیتا' اس کا دھڑکتا دل لمحہ بھر کو تھم سا جاتا۔ جیسے وہی عفان کو مارنے والی ہے۔

موت کے بعد مارنے والی۔

کوئی مرنے کے بعد بھی مرتا ہے؟

اس نے عفان کو یہ دوسری موت دی تھی تو کیسے اس کا ذکر سن پاتی۔

ہاشم اٹھ کر اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

"تم فکر مند نہیں ہو۔ میں آیا ہوں تو ان شاء اللہ تمہارے اور بچوں کے لیے کچھ کر کے ہی جاؤں گا۔ نہ کچھ ہو سکا تو پھر میں خود دو چار سالوں میں واپس آنے کی کوشش کروں گا۔" وہ شفقت سے اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کر بولا۔

"تم نے خود کو سنبھالنا ہے عاصمہ! تمہاری اس حالت کی وجہ سے بچے بہت پریشان ہیں۔ دیکھو! باپ اور دادا تو اللہ نے ان سے چھین لیا' اب وہ ماں اور باپ دونوں کو تم میں تلاش کریں گے۔ تمہیں بہت حوصلہ رکھنا پڑے گا۔" وہ واثق کو اپنی بانہوں کے گھیرے میں لے کر پاس بٹھاتے ہوئے بولا۔

"مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں ہے ہاشم بھائی... میں مرجانا چاہتی ہوں۔ میرا زندہ رہنے کو دل نہیں چاہتا۔" اس کے ضبط کے بندھن پھر ٹوٹنے لگے۔

واثق کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔

"ان چاروں کو کس کے حوالے کر کے جاؤ گی؟" ہاشم اسے دیکھ کر بولا۔

"جس کے حوالے وہ دونوں کر کے گئے ہیں۔" وہ رندھی آواز میں بولی۔

ہاشم تاسف سے اسے دیکھنے لگا۔

"مجھے تم سے ایسی باتوں کی امید نہیں تھی عاصمہ!" وہ دکھ بھرے لہجے میں کہہ گیا۔

معاشی مسائل تو بہت سے تھے لیکن عاصمہ کا ٹوٹا ہوا وجود اور اس کا یوں بات بات پہ بکھر جانا' مرنے کی باتیں کرنا' زندگی میں دلچسپی لینے سے مسلسل انکاری ہونا... وہ تو بچوں سے بھی اکثر بے نیاز بیٹھی رہتی۔ ہاشم کو یہ چیز بہت پریشان کر رہی تھی۔

اس معاملے میں اسے لگتا' وہ بھی ہمت چھوڑ بیٹھے گا اور سب کچھ یونہی چھوڑ کر واپس چلا جائے گا۔ لیکن کیا

اسے واپس جاکر چین آجائے گا۔ سکون مل سکے گا؟

"عاصمہ! تمہیں کیا ہوا ہے۔ کچھ ہے جو میں نہیں جانتا۔ تم اتنی مایوس اتنی ناامید کیوں ہو۔۔۔ اللہ کی ذات پر بھروسا کیوں کمزور پڑ گیا ہے۔ تم تو بہت بہادر تھیں بہت ہمت والی پھر ایسی باتیں کیوں کرنے لگی ہو۔" وہ اس کے سر پہ دوپٹا ٹھیک کرتے ہوئے نرمی سے پوچھنے لگا۔

عاصمہ کو اسی لمحے احساس ہوا کہ اس طرح تو وہ خود کو ساری دنیا کے سامنے تماشا بنا رہی ہے۔ جس اللہ نے رات کے اندھیرے میں اس کی تار تار ہوئی عزت کا پردہ رکھا ہے وہ اسی چادر کو سارے میں پھیلا کر کے رہی ہے۔ اس کا مسلسل رونا دھونا، زندگی سے بے زار ہونا، بچوں سے لاتعلق ہونا کوئی آنکھوں کا اندھا بھی ہو تو وہ بھی کسی نہ کسی طرح معاملے کی تہہ تک پہنچ جائے گا۔

وہ خود ہی ٹھٹک کر رہ گئی۔

"بتاؤ مجھے۔ کیا ہوا ہے؟" ہاشم نرمی سے پوچھنے لگا۔

عاصمہ نے جلدی سے چادر سے اپنا چہرہ رگڑ ڈالا۔

"نہیں اسے یوں خود کو افشا نہیں کرنا، جو زیادتی اس کے ساتھ ہو چکی ہے وہ دامن اٹھا کر سب کے سامنے خود کو بے لباس نہیں کرے گی۔ اس کی زندگی تو برباد ہو ہی چکی ہے۔ اس کی اس بے صبری سے اس کے بچوں کی زندگی میں سب کچھ فنا ہو جائے گا۔ خاص طور پر اس کی تینوں بچیوں کی زندگی میں کچھ نہیں بچے گا۔ صرف ایک بے کردار ماں کی کہانی کے سوا!

اسے یہ سب نہیں کرنا۔

"واثق! دیکھو کچن میں ہنڈیا کے نیچے چولہا جل رہا ہے، جا کر بند کردو۔"

وہ جو اتنے دنوں سے نہیں سنبھل رہی تھی۔ ایک لمحے نے اسے سمیٹ لیا تھا۔ بہت کچھ ابھی بھی باقی تھا۔ بہت کچھ ابھی بھی جوڑا جا سکتا تھا۔ اس کے دل کو اتنے دنوں میں پہلی بار امید سی بندھی تھی۔

☼ ☼ ☼

"بابا!"

گاڑی میں بیٹھتا ہوا عدیل وہیں ٹھٹک کر رک گیا۔

مثال آس بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ ایک اداس سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کے پاس واپس آیا۔

جی میری جان! آپ کو میرے ساتھ چلنا ہے؟" وہ اس کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

مثال نے نفی میں سر ہلا دیا۔ عدیل اسے دیکھتا چلا گیا۔ وہ کتنی کمزور سی ہو گئی تھی۔

"آپ کو کیا کہنا ہے مثال مجھ سے؟" وہ اس کی مسلسل چپ پر پوچھنے لگا۔

"بابا! ہم یہاں نانو کے گھر کب تک اور رہیں گے۔" وہ رک رک کر بولی۔

اگرچہ وہ پہلے بھی ادل بدل کر یہی سوال عدیل سے کئی بار کر چکی تھی مگر وہ اسے کوئی بھی تسلی بخش جواب نہیں دے سکا تھا۔ اب بھی عدیل گہرا سانس لے کر رہ گیا۔

"بابا! مجھے جواب دیں نا!" وہ اس کا کندھا ہلا کر بولی۔

"جان۔۔۔ آپ ماما سے یہ بات کیوں نہیں پوچھتیں؟" وہ اس کے سنہری بال سہلا کر بولا۔

"مجھے ماما سے ڈر لگتا ہے۔ میں ان سے یہ سوال۔۔۔ کوئی بھی سوال نہیں پوچھ سکتی۔" اس نے بہت ڈرے

سہمے ہوئے لہجے میں جواب دیا تھا کہ کہیں اس کی بات سے بابا کچھ اور نہ سمجھ لیں۔ عدیل کے لب بھنچ سے گئے۔

"وہ آپ کو مارتی ہیں؟" وہ توقف سے بولا۔

مثال نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"تو پھر آپ کو ماما سے کیوں ڈر لگنے لگا ہے مثال! اور میری جان ماما سے تو کوئی بھی نہیں ڈرتا بلکہ بچے تو اپنی ہر بات صرف اپنی ماما سے شیئر کرتے ہیں۔ آپ بھی اپنی ماما سے نرمی سے پیار سے یہ بات پوچھو۔" عدیل نے اسے سمجھایا۔

مثال نے پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

"ماما بہت جلدی شاؤٹ کرنے لگتی ہیں یا پھر رونے لگتی ہیں یا پھر مجھے کہتی ہیں۔ چلی جاؤ یہاں سے یا پھر کمرہ لاک کر لیتی ہیں پھر نانو بھی انہیں بلاتی ہیں تو وہ باہر نہیں آتیں۔" مثال رک رک کر باپ کو ماں کی ذہنی حالت سے آگاہ کر رہی تھی۔

عدیل فوری طور پہ کچھ نہیں بول سکا۔ اسے معلوم تھا بشریٰ اسی طرح کر رہی ہوگی۔

لیکن اب تو اس واقعہ کو بہت دن گزر بھی چکے۔ اب تو اسے سنبھل جانا چاہیے۔ اور کچھ نہیں تو مثال کی ذہنی تکلیف کو سمجھنا چاہیے کہ بچی اس ساری صورت حال سے کس طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہی ہے۔ اسے بشریٰ سے اس بچکانہ رویے کی امید نہیں تھی۔

امیدیں تو ہمیں خود سے بھی بہت ہوتی ہیں کہ ہم بہت میچور ہو چکے ہیں مگر بعض اوقات ہم اکثر ایسا ردعمل کر جاتے ہیں کہ بعد میں ہمیں خود پہ رونا آتا ہے جیسے اس معمولی سے زبانی جھگڑے میں عدیل نے بشریٰ کے ساتھ جو سلوک کیا۔ کیا وہ بچکانہ نہیں تھا۔ وہ ٹھنڈا سانس لے کر رہ گیا۔

"ماما کہاں ہے اب تمہاری؟" وہ مثال سے بولا۔ آج بھی وہ ڈھائی گھنٹے بیٹھا رہا تھا۔ مگر بشریٰ نے ملنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

ذکیہ نے عدیل کو بہانے سے ٹالا کہ بشریٰ۔۔۔ کی طبیعت اچھی نہیں تھی۔ نیند کی گولی لے کر سو رہی ہے اور بھی بہت کچھ۔

عدیل سمجھ رہا تھا مگر خاموش تھا کہ بہر حال اس سارے معاملے کو بگاڑنے میں عدیل کی غلطی زیادہ تھی۔

مگر ایسا اور کتنے دن چلے گا۔ وہ خود بھی تھک چکا تھا۔ روز آفس سے آکر یہاں دو تین گھنٹے بے مقصد بیٹھے رہنا۔

اتنے دنوں میں بشریٰ ایک بار بھی اس کے سامنے نہیں آئی تھی نہ اس کا فون سنتی تھی۔

کئی بار اس کے خون میں غصے کے زبردست ابال اٹھے۔

اس نے بھی سوچ بھی لیا کہ اب وہ نہیں آئے گا اس ضدی عورت کو منانے کے لیے۔۔۔

مگر پھر مثال، مثال کی معصوم صورت اسے جیسے ہی آفس ٹائم ختم ہوتا کھینچ کر یہاں لے آتی۔ مگر وہ بچی ان دونوں کی اس لڑائی سے کس قدر سہم چکی تھی۔ اگر اس کے ساتھ کوئی نفسیاتی مسئلہ ہو جاتا۔۔۔ بشریٰ کو ماں ہوتے ہوئے اس بات کی نزاکت کا احساس ہونا چاہیے تھا۔

"ماما سو رہی ہیں تمہاری؟" وہ اس کے ساتھ چلتا ہوا اندر چلا آیا۔

"نہیں۔۔۔ اپنے روم میں ہیں۔" مثال ادھر ادھر دیکھ کر محتاط لہجے میں بولی کہ اگر کسی نے سن لیا کہ مثال نے عدیل کو بشریٰ کے بارے میں بتایا ہے تو کہیں اس کی پٹائی نہ ہو جائے۔

"او کے جان! ایک منٹ یہاں رکو۔ میں ابھی آپ کی ماما سے بات کر کے آتا ہوں۔ او کے۔" وہ سر ہلا کر رہ گئی اور عدیل اندر چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

عاصمہ نے سارے زیورات لا کر ہاشم کے سامنے رکھ دیے وہ کتاب پڑھتا وہیں ٹھٹک کر رہ گیا۔

"میں نے اسی ہزار کی ایک کمیٹی بھی ڈال رکھی ہے' جو مجھے اگلے مہینے مل جائے گی۔ اس کے علاوہ پندرہ بیس ہزار اور بھی ہیں۔" وہ چہرے پر گہری سنجیدگی لیے ہوئے تھی۔

"لیکن یہ سب کس لیے عاصمہ؟" ہاشم نرمی سے بولا۔

عاصمہ لحہ بھر کو کچھ بول نہیں سکی۔

دل ضدی اسی بچکانہ خواہش پر اڑا ہوا تھا کہ اس کے بچوں کے سر پر اپنی چھت ہونی چاہیے۔

"بھائی ۔۔۔ کیا یہ ممکن نہیں ۔۔۔ چھوٹا سا بھلے ایک کمرے کا گھر میرا۔ میرے بچوں کا بھی ہو ۔۔۔ بھلے یہ زیور بک جاتے اور جو کچھ بھی ہے۔ بلکہ چار لاکھ جو چچا اسلم دے گئے تھے۔ وہ بھی پڑے ہیں اس کے علاوہ۔" وہ جلدی جلدی بولی۔

"دیکھو! اپنا گھر ہونے سے زیادہ یہ اہم ہے عاصمہ! کہ تم ہمت کرو بہادر بنو۔ خود کو سنبھالو ورنہ کل کو کوئی بھی چال باز' لیٹرا پھر سے تمہارے گھر کے کاغذ لے اڑے گا اور تمہیں پتا بھی نہیں چلے گا۔" ہاشم اسے جانے کیا جتانے کو بولا۔ عاصمہ سر جھکا کر رہ گئی۔

وہ پھر سے خود کو کمزور لمحوں کے حوالے نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

"بہت سمجھوتے کیے ہیں ان کچھ دنوں میں۔ یوں جیسے میں کئی سال آگے نکل آئی ہوں۔ دعوا تو نہیں کرتی' لیکن کوشش کروں گی۔ آئندہ بہت محتاط رہوں گی۔" وہ رک رک کر یوں آہستہ سے بولی جیسے یہ خود کو باور کرا رہی ہو۔

ہاشم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے بلکہ مجھے خوشی ہے کہ تم نے بالآخر خود کو سمجھا لیا ہے۔ خود کو کمپوز کر لیا ہے۔ بجائے اس کے کہ کوئی تمہیں سنبھالتا۔ بچے بہت ڈسٹرب ہیں تمہارے اس رویے کی وجہ سے۔" وہ بولا۔

"میں سمجھ رہی ہوں بھائی!" وہ آہستگی سے بولی۔

"غفار انکل کی گریجویٹی کی رقم اللہ کا شکر ہے اس بد معاش کے ہاتھ لگنے سے بچ گئی اور کچھ رقم جو تمہارے پاس ہے۔ ہر حال میں کوشش کرتا ہوں اتنے میں کوئی نہ کوئی چھوٹا موٹا گھر تمہارے لیے دیکھ سکوں۔" وہ بولا۔

"ایکچوئیلی عاصمہ! میں پندرہ دن سے زیادہ یہاں رک نہیں سکتا۔ مجھے مزید چھٹی نہیں ملے گی۔" وہ رک کر بولا۔ عاصمہ پریشان ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

"لیکن تم پریشان نہیں ہو میں تمہیں اور بچوں کو یوں چھوڑ کر تو نہیں جاؤں گا۔ صبح دو تین ڈیلرز نے مجھے کچھ گھر دکھائے ہیں اس کے بعد ان شاء اللہ میں تمہیں دکھاؤں گا اور ہم ایک دن میں سب کچھ فائنل کر لیں گے تو ان شاء اللہ ہفتہ دس دن میں یہ کام ہو جائے گا۔"

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔" عاصمہ کے لہجے میں پھر سے آس امید تھی

"تم فی الحال یہ زیور اور رقم وغیرہ سنبھال کر رکھو۔ آج کل حالات بالکل بھی اچھے نہیں ہیں۔ کوشش کروں گا جلد سے جلد یہ معاملہ سیٹل ہو سکے۔" وہ زیور کے ڈبے اسی تھیلے میں ڈالنے لگا جس سے عاصمہ نے نکالے تھے۔

"بھائی! میں آپ کی بہت شکر گزار رہوں گی۔" عاصمہ نم آواز میں کہنے لگی۔

ہاشم نے اس کو روک دیا۔

میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں' میں یہ سب کچھ تمہارے لیے نہیں ان معصوم بچوں کے لیے کر رہا ہوں اور امی نے بھی سوچ لیا ہے' میں سال دو سال میں وہاں سے سب کچھ وائنڈ اپ کر کے پاکستان آجاؤں گا۔ تمہارے پاس کسی کو ہونا چاہیے' جب تک بچے چھوٹے ہیں۔" عاصمہ سر ہلا کر رہ گئی۔

اسے معلوم تھا یہ سب کچھ اتنی جلدی ممکن نہیں مگر وہ خاموش رہی۔

☆ ☆ ☆

"کیا سمجھتی ہو تم خود کو' ایسی کون سی قیامت ٹوٹ گئی ہے کہ جس کا ازالہ ہی ممکن نہیں۔" بشریٰ کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ عدیل یوں اچانک کمرے میں آکر اسے اس طرح جھنجوڑ ڈالے گا۔

لحہ بھر کو تو وہ شاکڈ رہ گئی۔ کچھ بول ہی نہ سکی۔

"تم اگر میرے ساتھ نہیں رہنا چاہتیں تم نے کوئی فیصلہ کر لیا ہے تو میرے سامنے آکر مجھ سے بات کرو یوں چھپ کر بیٹھ گئی ہو جیسے۔۔۔"

"منہ میں نہیں' تم چھپاؤ گے اگر میں سارے میں۔۔۔"

"بتا دو سارے میں چیخ چیخ کر ساری دنیا کو بتا دو۔ تمہارے ساتھ کچھ ایسا انوکھا نہیں ہوا ہے' وہ بچہ صرف تمہارا نہیں تھا' میرا بھی تھا۔ جتنا اس کے جانے کا تمہیں دکھ ہے' مجھے بھی اتنی ہی تکلیف ہے۔ تم یہ سب ڈراما کر کے کیا ثابت کرنا چاہتی ہو۔"

بشریٰ اس کے انداز پر ایک دم سہم کر رہ گئی۔ وہ اسے پھر سے اس دن والا عدیل لگا تھا' جب یہ منحوس واقعہ ہوا تھا وہ فوری طور پر کچھ بول ہی نہ سکی۔

"اتنی خود غرض اتنی بے حس ہو گی تم' یہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ چھوٹی سی معصوم بچی تمہاری اس ضد اور ہٹ دھرمی سے کس طرح سہم کر رہ گئی ہے۔ تمہیں کچھ احساس ہے؟" وہ اس کے سامنے یوں تن کر کھڑا تھا کہ اس کے پاس فرار ہونے کا کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔

"وہ خوش ہے یہاں میرے ساتھ۔" وہ نظریں چرا کر کمزور آواز میں بولی۔

"خوش۔ خوشی کا مفہوم جانتی ہو تم؟" وہ پھر سے اسے جھنجوڑ رہا تھا۔

"چھوڑو مجھے اور جاؤ یہاں سے' میں نے تم سے کوئی بات کرنی ہے نہ کچھ کہنا ہے۔" وہ اسے نفرت سے دیکھ کر زور سے بولی۔

عدیل سرد نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"تم جیسی عورتیں اس قابل ہوتی ہی نہیں کہ انہیں اتنی محبت دی جائے کہ وہ اپنی اوقات ہی بھول جائیں۔" وہ ایک دم اسے بیڈ پر دھکا دے کر نفرت سے بولا۔

"اور تم جیسے مرد جن میں مردانگی صرف یہ ہے کہ عورت پر ہاتھ اٹھایا جائے' اسے کمزور سمجھ کر جب چاہے دھتکار دیا جائے اور جب دل چاہے اس کے پاس چل پڑے' نفرت ہے مجھے تم جیسے مردوں سے۔" وہ بھی جواباً زور سے چلائی۔

عدیل وہیں رک کر رہ گیا۔

"نفرت ہے تمہیں مجھ سے؟" وہ ایک قدم آگے بڑھ کر بولا۔

"ہاں۔ ہاں نفرت ہے مجھے تم سے۔ چلے جاؤ تم یہاں سے۔" وہ ذرا بھی خوف زدہ نہیں ہوئی۔ اسی طرح چلا کر بولی۔

عدیل نے زور سے ہونٹ بھینچ لیے۔

اس کے منہ سے وہ کچھ نکلنے والا تھا جو سب کچھ ختم کروا دیتا پھر ان دونوں کے درمیان کچھ بھی نہیں بچتا۔

"تو پھر کیا چاہتی ہو تم۔ بولو۔" وہ اس کی طرف بڑھ کر بولا۔

"میں۔ تم سے علیحدگی چاہتی ہوں۔" وہ بیڈ سے اتر کر ایک طرف جا کھڑی ہوئی۔

عدیل اسے دکھ بھری نظروں سے دیکھ کر رہ گیا۔

اسے حیرت سی ہوئی۔ یہ وہ عورت تھی جس پر وہ آج تک اپنا سب کچھ لٹاتا چلا آیا تھا۔ اپنا دل اپنی ذات اپنی خوشی اس نے اس کی خواہش کے تابع کر رکھی تھی اور وہ کیسے چند لمحوں میں خود کو پرائی کر بیٹھی تھی۔

"علیحدگی چاہیے تمہیں؟" وہ سینے میں اٹھتے درد کو دبا کر بولا۔

"ہاں علیحدگی چاہتی ہوں میں تم سے۔ میں تم جیسے جنگلی انسان کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔ جسے یہ احساس نہیں کہ عورت کے ساتھ کیسے رہا جاتا ہے۔"

"کسی اور کو پسند کرنے لگی ہو؟" وہ تلخی سے بولا۔

"عدیل!" وہ تڑپ اٹھی تھی۔

"میں تمہیں چھوڑ دوں گا مگر مثال کی شکل دیکھنے کو بھی ترس جاؤ گی تم۔ یہ بات یاد رکھنا۔" وہ اس کی کمزوری کو جانتا تھا اس کو جتا کر بولا۔

"مثال کا تو تم نام نہیں لو گے وہ صرف میری بیٹی ہے اور میری ہی رہے گی۔ میں تم جیسے شخص کے حوالے اسے نہیں کروں گی اور تمہاری ماں بہن۔"

"خاموش! اب ایک لفظ اور نہیں بولنا میں بھی پھر ہر لحاظ اٹھا دوں گا۔" وہ دھاڑ کر بولا۔

"اوہ! تو تم نے اب تک لحاظ رکھا ہوا تھا۔ خوب!" وہ طنزیہ بولی۔

"میں مثال کو ساتھ لے کر جا رہا ہوں۔" عدیل نے مڑتے ہوئے کہا

"تم مثال کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤ گے ورنہ میں اتنا شور مچاؤں گی کہ تمہارے لیے یہاں سے نکلنا مشکل ہو جائے گا۔" وہ تیزی سے اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

عدیل اسے دیکھتا چلا گیا۔

یہ وہی صورت تھی جس پر وہ دل و جان سے فدا تھا۔ جس کے لیے وہ نسیم اور فوزیہ کا ہر طعنہ سہہ جاتا تھا اور اس کا دل چاہتا تھا کہ دنیا جہاں کے سارے خزانے اس عورت کے قدموں میں ڈھیر کر دے اس کی کوئی بھی خواہش تشنہ نہ رہے۔

"اچھا بس کرو نا اب غصہ جانے دو۔ یہ دیکھو! میں تم سے کتنی بار تو معافی مانگ چکا ہوں پھر سے مانگ رہا ہوں۔ میرا ابھی بچہ تھا مجھ سے واقعی بہت زیادتی ہو گئی میں اللہ سے بھی معافی مانگ رہا ہوں۔

پلیز بشریٰ! میری جان! میرے ساتھ چلو گھر ابھی۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اتنے دنوں سے کانٹوں کے بستر پہ ہوں مجھ پر رحم کرو۔" وہ ایک دم سے پگھل گیا تھا۔ بشریٰ کی کمزور شکل نے اس کا دل پگھلا دیا تھا۔ بشریٰ بھی پل پل بدلتے روپ کے اس مرد کو حیرانی سے دیکھتی رہ گئی۔

"میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مثال ہم دونوں کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میری جان آجاؤ واپس ہماری زندگی ایک دوسرے کے بغیر نامکمل ہے ادھوری ہے تم ہو تو سب کچھ ہے ورنہ سب کچھ بالکل ادھورا ہے۔"

وہ بے اختیار اسے اپنے ساتھ لگا کر بولا۔

"چھوڑو مجھے۔" بشریٰ نے کمزور سی مزاحمت کی۔

"تمہیں چھوڑ دوں گا تو خود کیسے زندہ رہوں گا۔" اس نے اور بھی گرفت مضبوط کی۔

"مجھے تمہارے ساتھ نہیں رہنا عدیل!" وہ اسے پرے دھکیل رہی تھی اور وہ اسے اور بھی قریب کرتا جا رہا تھا۔

"تو میں تمہارے ساتھ رہ لوں گا۔ تمہیں منا لوں گا۔ راضی کر لوں گا۔ تمہارے بغیر سب کچھ بے رنگ ہے۔ نہیں بھی زندگی ہے نہ خوشی بشریٰ! چلو واپس ہماری بچی ہم دونوں کی وجہ سے کتنی ڈسٹرب ہے۔ میرے گھر کا وہ کمرا جو صرف تمہاری ہنسی سننا چاہتا ہے تمہاری آواز کو ترس گیا ہے۔ پلیز بشریٰ! چلو میرے ساتھ۔" وہ اسے بھی بانہوں کے گھیرے میں لے کر بولتا چلا گیا۔

"مجھے وہاں نہیں جانا۔" وہ خود کو آزاد کرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"تم جہاں کہو گی میں تمہیں لے چلوں گا۔ بس مجھے چھوڑنے کی اور جانے کی بات نہیں کرو۔ تمہارے بغیر یہ دن کیسے گزرے ہیں کاش! میں تمہیں بتا سکتا۔" وہ اس کے بکھرے بال سلجھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"اتنے دنوں سے تو میرا خیال آیا نہیں۔"

شاید عورت اسی کا نام ہے وہ اتنے دنوں سے اس چیز کی منتظر تھی وہ آئے اور اسے اسی طرح جھنجھوڑ کر اپنا حق جتا کر اسے منا لے۔ اس کے ساتھ زبردستی کرے۔

عورت کو سمجھنا کتنا ناممکن ہے مگر اتنا بھی ناممکن نہیں۔

عدیل بشریٰ کو پگھلتے دیکھ کر مسکرایا۔

"کتنی کمزور ہو گئی ہو۔ کیا میرے بغیر رہ سکتی تھیں؟" وہ پھر سے اسے دیکھ کر مسکرایا۔

"مگر عدیل۔ مجھے وہاں نہیں جانا آپ کے ساتھ۔" وہ اس کی بانہیں نرمی سے ہٹا کر بولی۔

"کیا مطلب؟" عدیل پہلی بار چونکا۔

بشریٰ نے عدیل کو جانچتی نظروں سے دیکھا۔

"مجھے یہ بات کہنی چاہیے یا نہیں۔" اس نے لمحہ بھر کو سوچا اور پھر یہ بازی کھیل لینے کا سوچ لیا۔

ذکیہ بیگم نے اسے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ اس سے مناسب موقع اور کوئی نہیں ملے گا اپنی بات منوانے کا۔

"مجھے الگ گھر چاہیے۔" وہ رک کر بولی۔

عدیل لمحہ بھر کو جیسے گنگ سا رہ گیا۔ اسے بشریٰ سے اس فرمائش کی توقع نہیں تھی۔

"ورنہ میں آپ کے ساتھ کبھی نہیں جاؤں گی۔" وہ حتمی لہجے میں بولی۔

☼ ☼ ☼

چھوٹا سا صحن جس میں بمشکل ایک پلنگ اور دو کرسیاں آ سکتی تھیں۔ آگے چھوٹا سا کچن اور دو چھوٹے کمرے۔ عاصمہ کی امیدوں سے بہت بڑھ کر تھا یہ گھر۔ اس کا اپنا گھر۔

وہ آنسو بھری بے یقین نظروں سے دیکھتی چلی جا رہی تھی۔

باہر کی طرف سے اوپر جاتی سیڑھیاں تھیں اور اوپر بھی اس طرح دو کمرے کچن اور باتھ روم تھا۔

وہ تو صحن میں ہی رک کر رہ گئی تھی۔

"عاصمہ! آؤ نا کمرے تو دیکھ لو۔" ہاشم اسے وہیں سے دیکھ کر بولا۔

"ممّا! آجائیں نا جلدی سے دیکھیں تو۔ کمرے کتنے پیارے ہیں تھوڑے چھوٹے ہیں لیکن ہمارے پہلے والے کمرے سے بہت اچھے۔"

وائق اور اریبہ بہت خوش تھے۔

اس کا تو دل چاہ رہا تھا یہیں زمین پر سر ٹیک کر سجدۂ شکر بجا لائے۔
اس کے قدم زمین نے جکڑ لیے تھے۔ واثق اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گیا۔ وہ سحر زدہ سی گھر کو دیکھتی جا رہی تھی۔
"اتنا کچھ گنوا کر بالآخر اسے اپنا گھر مل ہی گیا۔" اس نے دوپٹے کے کونے سے اپنی آنکھیں صاف کیں۔
"عاصمہ! اس گھر کی سب سے اچھی بات یہ ہے کہ بہت ہوا دار ہے۔ لوگ بہت اچھے ہیں۔ خیال رکھیں گے تمہارا اور بچوں کا یہاں بہت جلد دل لگ جائے گا۔ اچھا ہے نا گھر۔" وہ مسلسل بولتے ہوئے رک کر پوچھنے لگا۔
"بہت اچھا بھائی! میرے بچوں کی چھت ہے ان کے لیے جائے اماں! کیوں اچھی نہیں ہوگی۔" وہ مسکرائی۔
دو دن بعد اس کی عدت ختم ہو رہی تھی۔ سامان سارا پیک ہو چکا تھا۔ ہاشم اسے یہ گھر ایک نظر دکھانے لایا تھا۔
"اور بھائی! یہ پچھلے گھر سے زیادہ دور بھی نہیں ہے۔"
"ہاں۔"
"بچوں کے اسکول بھی زیادہ دور نہیں اور گھر بھی بہت پر رونق جگہ پہ ہے۔" وہ بہت خوش تھی۔ اور بے تکان بولے جا رہی تھی۔ بچوں کے ساتھ ادھر ادھر کمروں میں پھر رہی تھی۔
ہاشم بہن کو دیکھ کر خوش تھا۔ اس کے سر سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا تھا۔
پورے طور پر نہ سہی اس نے کچھ حق تو ادا کر ہی دیا تھا۔
"اور میں نے اسلم سے بات کر لی ہے بہت اچھی فیملی دے گا۔ وہ اوپر کرائے پر دینے کے لیے۔ آمدنی کا ذریعہ یہ بھی ہو جائے گا۔" ہاشم اسے تفصیل بتانے لگا۔ دونوں بہن بھائی بہت خوش تھے۔

☆ ☆ ☆

عدیل کا سوچ سوچ کر دماغ تھکنے لگا تھا۔
وہ بشریٰ کی یہ ناممکن سی خواہش کیسے پوری کر سکتا تھا۔ الگ گھر بوڑھی ماں اور بہن کو اکیلا چھوڑ کر وہ کہاں جائے گا۔ اور جب نسیم بیگم کو پتا چلے گا تو وہ کتنا ہنگامہ مچائیں گی۔
وہ رات بھر ٹھیک سے سو نہیں سکا۔
اس نے بشریٰ کو بہت سمجھانے کی کوشش کی مگر اس کی ایک ہی ضد تھی۔ ورنہ وہ اس سے علیحدگی کے لیے تیار تھی۔
وہ صبح بغیر ناشتا کیے آفس چلا گیا۔
واپسی پر جاتے ہوئے بھی وہ بشریٰ سے ملنے نہیں جا سکا۔
بس یوں ہی سڑکوں پر بے مقصد گاڑی دوڑاتا رہا۔
راستے میں دو بار مشال کی کال بھی آئی مگر وہ بچی کو آفس میں کام کا بہانہ کر کے ٹال گیا۔
بشریٰ کو وہ کچھ ٹائم دینا چاہتا تھا۔
بلکہ ٹائم تو شاید اسے چاہیے تھا کہ نسیم بیگم کو آج کل پھر فوزیہ کے رشتے کی بے چینی لگ گئی تھی۔ دن میں دو دو تین تین رشتہ دیکھنے والیاں آ رہی تھیں۔
ان کی خاطر مدارات میں ساری تنخواہ اٹھنے لگی تھی۔ مگر وہ ماں کو منع بھی نہیں کر سکتا تھا۔
"اس دور کا مرد کتنا کمزور، کتنا بے بس ہے۔" وہ یوں ہی ایک پارک میں جا کر بینچ پر بیٹھ گیا۔ اس نے ایک کر فون

سے نکالا۔
نسیم بیگم کی کال تھی۔ وہ نظر انداز نہیں کر سکا۔ وہ صبح بھی ماں سے ملے بغیر گھر سے نکل آیا تھا اور اب بھی گھری ہوئی تھی۔ وہ دل کی مریضہ تھیں۔ فکر مند ہو سکتی تھیں۔ ان کی طبیعت کا یوں بھی پتا نہیں چلتا تھا۔
"امی! آفس میں کام تھا۔ اس لیے لیٹ ہو گیا۔" اس نے نرمی سے ماں سے کہا۔
"ہاں وہ تو تمہیں مہینے بھر سے ہی ہے۔ رات گئے ہی آتے ہو مگر آج تم ابھی اور اسی وقت گھر آؤ ورنہ۔" وہ غصے میں لگ رہی تھیں۔
"امی! خیر تو ہے نا۔ آپ کی طبیعت تو اچھی ہے نا۔" وہ گھبرا گیا۔
"میری طبیعت کو گولی مارو۔ بس تم فوراً گھر آجاؤ۔ مجھے بات کرنا ہے تم سے ابھی۔" وہ ہٹیلے لہجے میں بولیں۔
"جی۔ اچھا۔ میں آ رہا ہوں۔ تھوڑی دیر میں پہنچتا ہوں۔" اس نے کہہ کر فون بند کر دیا۔
"اب جانے امی کو کون سا نیا شوشا سوجھا ہو گا۔" وہ اکتا کر باہر نکل آیا۔
"یہ کیا کہہ رہی ہیں امی۔" وہ بھونچکا سا رہ گیا۔
"ہاں میری لاش پڑی ہو گی تو ہی اس گھر کے دو گھر بنیں گے۔ عدیل! میں تجھے بتا رہی ہوں۔ اگر تو بیوی بچی کو لے کر کہیں گم ہوا تو میں نال خدا کی قسم اپنی جان دے دوں گی۔ یہ بات تو میری لکھ لے۔" نسیم بیگم سخت غصے میں تھیں۔ بغیر سوچے سمجھے بولتی چلی گئیں۔
"امی! کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے اور میں کیوں کروں گا ایسے۔" وہ ماں کے تیور دیکھ کر گھبرا گیا۔
"مجھے بے وقوف نہ بنا تو۔ مجھے سب پتا چل گیا ہے۔ ماں بیٹی کیا چکر چلا رہی ہیں۔ یہ تو یوں ہی بیٹھے بیٹھے میرے دل کو بے چینی سی ہوئی کہ بہو میری بیٹی کے برابر ہے، میں جا کر بشریٰ کا حال تو پوچھ کر آؤں تو چل پڑی کہ آنچل مجھے مار۔" وہ ماتھے پر ہاتھ مار کر رو لیں۔
"اور وہ دونوں ماں، بیٹی تو جیسے تیار تھیں۔ فوراً ہی مجھے کہہ دیا کہ بشریٰ تو تب ہی واپس آئے گی جب عدیل اس کے لیے الگ گھر لے کر دے گا اور عدیل گھر لے بھی رہا ہے۔ ایک ماں ہی بے خبر ہے۔ باقی تو سب کو پتا ہے۔" وہ رونے لگیں۔
"امی! ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ یقین کریں۔" وہ روہانسا ہو کر بولا۔
"کھا میرے سر پر ہاتھ رکھ کر میری قسم کہ ایسا کچھ نہیں ہے۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سر پر رکھ کر بولیں تو عدیل بے بسی سے دیکھتا رہ گیا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

سانحۂ ارتحال

آپ کی پسندیدہ مصنفہ بہن عنیقہ محمد بیگ کی والدہ محترمہ مختصر سی علالت کے بعد اس دار فانی کو الوداع کہہ گئیں۔
اناللہ وانا الیہ راجعون
والدہ کی شفقت اور محبت سے محرومی بہت بڑا صدمہ ہے۔ ہم عنیقہ محمد بیگ کے دکھ میں برابر کے شریک ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعاگو ہیں کہ عنیقہ اور دیگر اہل خانہ کو صبر جمیل سے نوازے اور مرحومہ کو جنت الفردوس میں اعلا مقام عطا فرمائے۔ آمین۔
قارئین سے بھی دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

بگڑی ہوئی اس شہر کی حالت بھی بہت ہے
جاؤں بھی کہاں اس سے محبت بھی بہت ہے

بس ایک قدم کا ہے سفر منزلِ مقصود
رُک جائیں تو اتنی سی مسافت بھی بہت ہے

میں آنکھ سے ٹپکے ہوئے اک اشک کی مانند
بے مایہ بھی ہوں اور مری قیمت بھی بہت ہے

کافی ہے شبِ غم کے لیے ایک دیا بھی
اس دور میں چھوٹی سی صداقت بھی بہت ہے

وہ شخص جو گزرا ہے ابھی آنکھ بچا کر
شہزاد اسے میری ضرورت بھی بہت ہے

شہزاد احمد

من آنگن میں شہر بسا ہے، شہر میں اک دریا بہتا ہے
جس میں چاند، ستارے، درپن، کبھی نہ ٹوٹنے والے، در
کبھی نہ بھولنے والی یادیں، ٹوٹی پھوٹی کچھ یادیں
روشن دن اور جھلمل راتیں
لفظ ادھورے، پوری باتیں
لہروں پر اُمڈتے جذبے بہتے جائیں
کوئی کہانی کہتے جائیں
ہرے بھرے پیڑوں پہ شرمیں، سایوں کی زنجیر سنہری
پون سندیسے لیے ہوئے
نئے موسم کے خوشحال پرندے
پنکھوں پر پھیلے رنگوں سے، آنکھوں میں تصویر بنائیں
دریا میں اشناک نہائیں
اندر کے سب بھید کنارے کھلتے جائیں
من آنگن میں شہر بسا ہے
شہر میں اک دریا بہتا ہے
دریا کی لہروں میں رستے
رستوں میں ان دیکھے سپنے کھلے ہوئے ہیں
خواب دھنک، خوشبو اور چہرے ملے ہوئے ہیں
تیز ہوا میں دیپ سمے کے جلے ہوئے ہیں
لیکن شہر کے دروازے پر
بے خوابی کے دکھ سکھ اوڑھے
جانے کس کی آس میں آنکھیں
نیندوں کا پہرا دیتی ہیں

سلیم کوثر

ن کو بھی ہم سے محبت ہو، ضروری تو نہیں
شق ہی عشق کی قیمت ہو، ضروری تو نہیں

یک دن آپ کی برہم نگہی دیکھی ہے
وز ایک تازہ قیامت ہو، ضروری تو نہیں

یری شمعوں کو ہواؤں نے بجھایا ہو گا
یرے دامن کی شرارت ہو، ضروری تو نہیں

وستی آپ سے لازم ہے، مگر اس کے لیے
اری دُنیا سے عداوت ہو، ضروری تو نہیں

یک مصرعہ بھی جو زندہ رہے، کافی ہے صبا
یرے ہر شعر کی شہرت ہو، ضروری تو نہیں

صبا اکبر آبادی

اور بھی قصے ہیں جو میں داستاں کرتا نہیں
اور بھی کچھ غم ہیں جن کو میں بیاں کرتا نہیں

راز ہیں جن کا امیں ہوں میں ہی بس اس دہر میں
اس خبر کا میں کسی کو رازداں کرتا نہیں

جو ہنر جس میں نہیں ہے مدعی اس کا ہے وہ
کوئی اپنی اصل کو اپنا نشاں کرتا نہیں

صبر اک طاقت ہے میری سختیٔ ایام میں
اس صفت سے آدمی غم میں فغاں کرتا نہیں

عشق کرتا ہوں بتانِ شہر سے میں بھی منیر
میں مگر اس شوق میں جی کا زیاں کرتا نہیں

منیر نیازی

شگفتہ جاہ

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

ام حبیبہؓ اور ام سلمہؓ نے حضرت عائشہؓ سے ایک کلیسا کا ذکر کیا جسے انہوں نے حبشہ میں دیکھا تھا۔ اس میں مورتیں (تصویریں) تھیں۔ انہوں نے اس کا تذکرہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ان کا یہ قاعدہ تھا کہ اگر ان میں کوئی نیکوکار شخص مر جاتا تو وہ لوگ اس قبر پر مسجد بناتے اور اس میں یہی مورتیں (تصویریں) بنا دیتے۔ پس یہ لوگ اللہ کی بارگاہ میں قیامت کے دن تمام مخلوق میں برے ہوں گے۔

(427-بخاری، 181-مسلم، 603-نسائی)

کھانا کھلانا،

حضرت انس بن مالکؓ ایک دفعہ بیمار ہوئے۔ تو کچھ لوگ ان کی عیادت کرنے آئے۔ انہوں نے اپنی باندی سے کہا۔

"اے باندی! ہمارے ساتھیوں کے لیے کچھ لاؤ۔ چاہے روٹی کے ٹکڑے ہی ہوں۔ کیونکہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اچھے اخلاق جنت کے اعمال میں سے ہیں۔"

(حیاۃ الصحابہ)

آمنہ اُجالا۔ ڈہرکی

قرآن کی عظمت،

1935ء میں جرمنی بڑا طاقت ور ملک تھا۔ ایک دفعہ انجیل کے کوئی چالیس نسخے وہاں کے پادریوں کے ہاتھ لگے۔ انہوں نے پڑھ کر دیکھے تو سب ہی نسخے ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ یہ دیکھ کر انہیں حیرانی ہوئی پھر انہوں نے مشورہ کیا کہ مسلمانوں کا قرآن دیکھتے ہیں؟ اگر وہ بھی اسی طرح تھا تو پھر سب نسخے رہیں گے ورنہ غلط ہیں۔

انہوں نے چالیس کے بجائے دنیا کے مختلف ممالک سے ستر ہزار قرآن مجید اکٹھے کیے اور سالہا سال ان پر ریسرچ کرتے رہے لیکن ایک زیر، زبر اور پیش کی بھی غلطی نکال نہ سکے۔

اقراء اکرم۔ گاؤں سلیماں شریف

حضرت ایوبؑ کی آزمائش اور صبر کی انتہا،

حضرت ایوبؑ ایک صاحب ثروت انسان تھے آپ کے پاس ہر قسم کا مال موجود تھا۔ مثلاً غلام، بالتو (گھوڑے وغیرہ) مویشی اور حوران (شام) کے علاقے پسنیہ میں وسیع اراضی کے قطعات بھی تھے۔ اس کے علاوہ آپ کی بیویاں اور بہت سے بچے بھی تھے۔ آپؑ سے یہ سب کچھ چھن گیا۔ اور آپ کو سخت آزمائش سے دوچار کر دیا گیا۔ آپ نے اس پر بھی اللہ کی رضا کے لیے صبر کیا اور دن رات صبح و شام اللہ کا ذکر کرتے رہے۔

آزمائش کی مدت طویل ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ دوست یار ساتھ چھوڑ گئے۔ اور آپ سے دور دور رہنے لگے۔ آپ سے ملنا جلنا چھوڑ دیا۔

اس وقت آپ کی خدمت کرنے کے لیے صرف آپ کی زوجہ محترمہ باقی رہ گئیں۔ انہوں نے آپ کے گزشتہ احسانات اور شفقت کو فراموش نہ کیا۔ بلکہ وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتی تھیں اور آپ کی ضروریات پوری فرماتیں۔ حتیٰ کہ قضائے حاجت میں بھی مدد دیتیں۔ آہستہ آہستہ ان کا مال ختم ہو گیا۔ وہ آپ کی غذا اور دوا کا بندوبست کرنے کے لیے اُجرت پر دوسروں کے کام کرنے لگیں۔ انہوں نے مال اور اولاد سے محرومی پر بھی صبر کیا۔ اور خاوند پر آنے والی مصیبت کو بڑے صبر سے برداشت کیا۔ کبھی وہ طرح طرح کی نعمتوں سے مالا مال تھیں۔ اور ان کا بے حد احترام کیا جاتا تھا۔ پھر تنگ دستی آئی اور انہیں لوگوں کی خدمت کرنا پڑی۔ اس کے باوجود وہ ثابت قدم رہیں۔

سُدیؒ کہتے ہیں، آپؑ کے جسم سے گوشت جھڑ گیا صرف ہڈیاں اور پٹھے باقی رہ گئے تھے۔ آپ کی زوجہ محترمہ راکھ لا کر آپ کے نیچے ڈالتی تھیں۔ جب ایک طویل عرصہ اسی حال میں گزر گیا تو انہوں نے عرض کیا۔

"اپنے رب سے دُعا کیجیے کہ وہ آپ کی مصیبت دُور کر دے۔"

آپؑ نے فرمایا۔ "میں نے ستر سال صحت کی حالت میں گزارے ہیں۔ تو کیا مجھے اللہ کے لیے ستر سال صبر نہیں کرنا چاہیے۔"

(قصص الانبیاء)

فرحانہ مظہر۔ کراچی

عوام کا مال،

حضرت عنترہؒ کہتے ہیں میں (کوفہ کے محلہ) خورنق میں حضرت علیؓ بن ابی طالب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپؓ نے ایک پرانی چادر اوڑھ رکھی تھی اور آپ سردی کی وجہ سے کانپ رہے تھے۔ میں نے عرض کی۔

"اے امیر المومنین! اللہ تعالیٰ نے (بیت المال کے) اس مال میں آپ کا اور آپ کے اہل و عیال کا بھی حصہ رکھا ہے۔ (پھر بھی آپ کے پاس سردی سے بچنے کا کوئی انتظام نہیں ہے) اور آپ سردی سے کانپ رہے ہیں۔"

انہوں نے فرمایا۔ "اللہ کی قسم! میں تمہارے مال میں سے کچھ نہیں لینا چاہتا۔ اور یہ پرانی چادر بھی وہ ہے جو میں اپنے گھر مدینہ منورہ سے لایا تھا۔"

(حیاۃ الصحابہ)

نوزیہ ثمر بٹ۔ گجرات

خاموشی،

حضرت ابو الدرداءؓ فرماتے ہیں۔

"جیسے تم لوگ بات کرنا سیکھتے ہو، ایسے ہی خاموش رہنا بھی سیکھو۔ کیونکہ خاموش رہنا بہت بڑی بُردباری ہے اور تمہیں بولنے سے زیادہ سُننے کا شوق ہونا چاہیے۔ اور کبھی لایعنی کا بول نہ بولو۔ ہنسی کی بات کے بغیر خوامخواہ مت ہنسو اور بلا ضرورت کسی جگہ مت جاؤ۔"

(حیاۃ الصحابہ)

مسلمان کا سچا وعدہ کرنا،

حضرت ہارون بن رئاب کہتے ہیں کہ جب حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی وفات کا وقت قریب آیا تو فرمایا۔

"فلاں آدمی کو تلاش کرو کیونکہ میں نے اس سے اپنی بیٹی (کی شادی کرنے) کا ایک قسم کا وعدہ کیا تھا۔ میں نہیں چاہتا کہ اللہ سے میری ملاقات اس حال میں ہو کہ نفاق کی تین نشانیوں میں سے ایک نشانی یعنی وعدہ خلافی مجھ میں ہو۔ اس لیے میں آپ لوگوں کو اس بات پر گواہ بناتا ہوں کہ میں نے اپنی بیٹی کی اس سے شادی کر دی ہے۔"

(حیاۃ الصحابہ)

فطرت،

جب کشتی ہچکولے کھا رہی ہو تو ہیچ سمندر خدا کی رحمت کو پکارا جاتا ہے اور جب کشتی کنارے لگ جائے تو اپنی قوت بازو کے قصیدے گائے جاتے ہیں بہت کم لوگ ہیں جو اپنے حاصل کو رحمت خداوندی سمجھتے ہیں۔

(واصف علی واصف۔ دل، دریا، سمندر)

ثمینہ عطاری، سحر شازمہ اعجاز۔ ڈوگر

کام،

اشفاق احمد اپنے مضمون "چھوٹا کام" میں لکھتے ہیں۔

"میں نے بابا جی سے پوچھا کہ انبیاء کو بکریاں چرانے کا حکم کیوں دیا جاتا تھا۔ تو بابا جی نے فرمایا کہ انہیں چونکہ آگے چل کر زندگی میں نہ ماننے والے لوگوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا ان کا کفار سے واسطہ پڑتا تھا۔ اس لیے ان کو بکریوں کے ذریعے سے سکھایا جاتا تھا کیونکہ دنیا میں جانوروں میں نہ ماننے والا جانور بکری ہی ہے۔ اپنی مرضی کرتی ہے۔"

افشاں خان۔ علیہ حق نواز۔ شاہ پور چاکر

موتی مالا،

- زندگی کی کتاب پڑھ کر صرف وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جن کی توجہ اگلے باب پر ہوتی ہے۔
- زندگی کو سادہ مگر خیالات کو بلند رکھو۔
- انسان بہت کچھ تقدیر پر جبکہ تقدیر بہت کچھ انسان پر چھوڑتی ہے۔
- اسلام کو دنیا کی نظر سے نہیں بلکہ دنیا کو اسلام کی نظر سے دیکھو۔
- مور ناچتے ہوئے بھی روتا ہے اور ہنس مرتے ہوئے بھی گاتا ہے۔
- ماں سے محبت کرو کیونکہ ماں کی پریشانی دیکھ کر اللہ پاک نے "صفا مروہ" کو حج کا رکن بنا دیا۔

ساجی عاصم۔ ٹنڈو آدم

اقوال زریں،

※ زندگی میں جو چاہے حاصل کرو بس اتنا خیال کرنا کہ تمہاری منزل کا رستہ کبھی ٹوٹے ہوئے دلوں سے ہو کر نہ گزرے۔

※ جب اللہ تعالیٰ کسی سے ہدایت سلب کرنا چاہتا ہے تو سب سے پہلے اس سے اس کی غلطیوں کا شعور سلب کر لیتا ہے۔

※ اچھا غریب وہ ہوتا ہے جو دولت مندوں کی دولت دیکھ کر حسد نہ کرے اور اچھا امیر وہ ہوتا ہے جو غریبوں کو اپنی دولت سے خوفزدہ نہ کرے۔

※ شفقت سے بھاگنے کی شدت۔ مشقت اختیار کرنے سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔

※ یہ ضروری نہیں کہ جو خوبصورت ہو، وہ نیک سیرت بھی ہو مگر کام کی چیز ہمیشہ اندر ہوتی ہے۔

صومیہ نذیر، شمائلہ نذیر۔ ہری پور ہزارہ

ہر محبت دکھ دیتی ہے،

شیخ عبدالقادر جیلانی کہتے ہیں۔

اے شخص تو کہتا ہے میں جس سے محبت کرتا ہوں اس سے جدا کر دیا جاتا ہوں۔ کبھی بیماری سے کبھی عداوت سے، کبھی غلط فہمی سے کبھی موت سے ہر قیمت پر مجھے جدا کر دیا جاتا ہے۔ اے نادان! تو کیا وہ خوش قسمت ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے غیرت کھائی ہے۔ اللہ تجھے اپنے لیے چاہتا ہے اور تو غیر کا ہونا چاہتا ہے۔ ہوش کر ایسا ظرف نا برتن بن جا جس میں ماسوائے اللہ کے کچھ نہ ٹھہرے۔

جب تو غیر کے پیچھے بھاگے گا اللہ تجھے اس کے ہاتھوں توڑے گا اور جب تو اللہ کا ہو جائے گا تو ساری مخلوق کو تیرے قدموں میں لا بٹھائے گا۔ تیرے رشتے تیری محبتیں، تیری آسائشیں لوٹا دی جائیں گی۔ تیری دولت واپس لوٹا دی جائے گی اور جن سے تو محبت رکھتا تھا اور دیا کرتا تھا اب تیرے لیے رو دیں گے مگر اب تیرا دل ان سے بے نیاز ہو گا۔ جب تو ان چیزوں کو دور کر دے گا۔ یہ تجھے تکلیف دیں گی۔

ہر محبت دکھ دیتی ہے سوائے اللہ کی محبت کے۔

نبیلہ خان مومن۔ عبدالحکیم

صبا سحر

اظہار تشکر

جمیل نے اپنے دفتر کے ساتھی فاروق سے کہا "مجھے آج احساس ہوا ہے کہ میں نے تمہارے ساتھ بہت غلط رویہ اختیار کیا تھا۔ جس کی وجہ سے تم مجھ سے ناراض ہو گئے اور ہمارے درمیان ایک ماہ تک بات چیت بند رہی۔ غلطی میری تھی۔ میں تم سے معذرت چاہتا ہوں۔ امید ہے کہ تم مجھے معاف کر دو گے۔"

"معذرت کی تو خیر کوئی بات نہیں۔" فاروق نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

"مگر اس ایک مہینے میں۔ جس میں ہماری بات چیت بند رہی۔ میرے بینک اکاؤنٹ میں پورے آٹھ ہزار روپے کا اضافہ ہو گیا۔ اگر ہماری بات چیت تین چار مہینے اور بند رہے تو مجھے امید ہے کہ میں نئی موٹر سائیکل خریدنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔"

فرحانہ مظہر۔ کراچی

خوش اخلاقی

بیوی نے شکایت کرتے ہوئے اپنے شوہر سے کہا۔ "یہ کیا بات ہے کہ آپ کے دوست گھر آتے ہیں تو آپ بہت زیادہ خوش ہوتے ہیں۔ ان سے گلے ملتے ہیں ہنس ہنس کر باتیں کرتے ہیں مگر جب میری سہیلیاں آتی ہیں تو آپ ذرا خوش نہیں ہوتے۔"

"میں اس وقت اور بھی زیادہ خوشی کا مظاہرہ کر سکتا ہوں۔ مگر آپ مجھے اپنی سہیلیوں سے ملنے کا موقع تو دیں۔" شوہر نے جواب دیا۔

الماس تنویر۔ ہزارہ

پیش بندی

"تم ایک نہایت حسین لڑکی ہو۔" لڑکے نے اپنی گرل فرینڈ سے کہا۔

"مجھے معلوم ہے، تم دل میں ایسا نہیں سمجھتے۔ لیکن پھر بھی کہہ رہے ہو۔" گرل فرینڈ نے بے یقینی سے کہا۔

"میں اصل میں اس لیے ایسا کہہ رہا ہوں کہ اگر میں ایسا نہیں کہوں گا تب بھی تم دل میں ایسا سمجھتی رہو گی۔" لڑکے نے جواب دیا۔

رشیدہ بتول۔ کراچی

خمیازہ

ایک شخص نے اپنے دوست کے سر پہ پٹی اور بازو پر پلستر چڑھا دیکھ کر پوچھا "خیریت تو ہے۔ کیا آج پھر موٹر سائیکل کا حادثہ ہو گیا؟"

"نہیں۔" دوست نے مری مری آواز میں جواب دیا۔

"تو پھر یہ حالت کیسے ہو گئی۔" اس شخص نے پوچھا۔

"دراصل میں نے اپنے کزن سے پانچ سو روپے کی شرط لگائی تھی کہ وہ مجھے اپنے کندھے پہ بٹھا کر بانس کی سیڑھی پر نہیں چڑھ سکتا۔" دوست نے بتایا۔

"تو پھر۔؟" اس شخص نے حیرت سے پوچھا۔

"تو پھر کیا۔" میں شرط جیت گیا۔ دوست نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔

حنا شاہد۔ کراچی

آثار قدیمہ

شرافت علی سیرو تفریح کی غرض سے کراچی سے لاہور گئے تو اپنی ایک خالہ سے بھی ملنے کے لیے چلے گئے۔ جو خاصی عمر رسیدہ تھیں۔ خاطر مدارات کے بعد خالہ نے پوچھا۔ "اور سناؤ بیٹا! لاہور کیسے آنا ہوا؟"

"بس خالہ جان۔ میں آثار قدیمہ دیکھنے آیا تھا۔ میں نے سوچا کہ پہلے آپ سے ملتا چلوں۔" شرافت علی نے جواب دیا۔

نورین فیاض۔ میٹروول

یک نہ شد

لڑکی نے لڑکے کو اپنی ممکنہ شادی کے روشن پہلوؤں کے بارے میں سمجھاتے ہوئے کہا۔ "ہماری شادی پر کم از کم ایک خرچا تو ہرگز نہیں ہوگا۔ یعنی نکاح کی فیس بچ جائے گی' میرے ابا خود نکاح خواں ہیں۔"

"پھر تو ہمیں شادی کر ہی لینا چاہیے۔" لڑکا خوش ہوتے ہوئے بولا۔ "میرے ابا وکیل ہیں اور صرف طلاق کے کیسز لیتے ہیں۔"

بینا صدیقی۔ کورنگی

شادی سے پہلے

جھگڑے کے دوران بیوی اپنے شوہر پہ چلاتے ہوئے بولی۔ "مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اس قدر بزدل آدمی ہو۔ شادی سے پہلے تو میں تمہیں بہت بہادر سمجھتی تھی۔"

"شادی سے پہلے میرے بارے میں دوسرے لوگوں کی بھی یہی رائے تھی۔" شوہر نے ایک آہ بھرتے ہوئے جواب دیا۔

شگفتہ فیاض۔ مشی گن امریکا

گھر تو جانا ہے

فٹ پاتھ پر جھومتے ہوئے ایک شخص نے برابر میں کھڑے آدمی سے کہا۔ "ذرا میرے لیے ایک ٹیکسی تو روکنا۔"

ان صاحب نے ناگواری سے اس لڑکھڑاتے ہوئے کی طرف دیکھا اور ذرا نخوت سے اسے مطلع کیا۔ "میں کسی ہوٹل کا دربان یا کسی بلڈنگ کا چوکیدار نہیں ہوں کہ تمہارے لیے ٹیکسی روکوں' میں نیوی کا افسر ہوں۔"

جھومتا اور لڑکھڑاتا ہوا آدمی ان صاحب سے ذرا بھی متاثر ہوئے بغیر بولا۔ "اچھا۔ ٹھیک ہے۔ تو پھر ذرا کسی بحری جہاز کو روک دیں۔ بہرحال مجھے گھر تو جانا ہے۔"

ترنم اعجاز۔ گلستان جوہر

سبقت

ساجد صاحب اپنے برابر والے فلیٹ میں رہنے والی بیوہ رشیدہ سے شادی کی غرض سے تعلقات بڑھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک دن تنہائی میں کچھ دیر گفتگو کا موقع ملا تو انہوں نے جرأت کر کے رسمی باتوں سے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"میں جب صبح بیدار ہوتا ہوں تو میرے ذہن میں سب سے پہلا خیال آپ کا آتا ہے۔"

"یہ تو کوئی خاص بات نہیں ہے۔" رشیدہ ادائے بے نیازی سے بولیں۔

"اوپر فلیٹ میں رہنے والے فراز صاحب بھی یہی کہتے ہیں۔"

"لیکن آپ یہ بھی تو دیکھیں کہ میں فراز صاحب سے بہت پہلے بیدار ہوتا ہوں۔" ساجد صاحب نے متانت سے یاد دلایا۔

شگرف اعجاز۔ گلستان جوہر

*

خالدہ جیلانی

انیقہ انا ______ چکوال

ہم نے تنہائی کے صحراؤں میں دیکھا اکثر
دن نہ ہونا تو کبھی رات نہ ہونا ہے یہاں
کوئی کھیلے، کوئی توڑے، کوئی چاہے توڑ کے
مرد کے ہاتھ میں عورت ہے کھلونا سا یہاں

فوزیہ ثمر بٹ ______ گجرات

مجھ سے مخلص تھا نہ واقف مرے جذبات سے تھا
اس کا رشتہ تو فقط اپنے مفادات سے تھا
اب جو بچھڑا ہے تو کیا روئیں جدائی پہ تری
یہ اندیشہ تو ہمیں پہلی ملاقات سے تھا

عظمیٰ غلام نبی ______ کراچی

دل یوں دھڑکا پریشان ہوا ہو جیسے
کوئی بے دھیانی میں نقصان ہوا ہو جیسے

انیتا شمیم ______ فیصل آباد

گلی کوچوں میں برگِ خشک کی صورت بکھرنا تھا
ہوا سے دوستی کا کوئی تو انجام ہونا تھا
جنوں کے شہر میں لیکن ہماری ہار لازم تھی
ادھر اک شاہزادی تھی، اس طرف سارا زمانہ تھا

انشاں خان، عطیہ حق نواز ______ شاہ پور چاکر

نہ لشکروں کا وجود، نہ نشتروں کا گمان
میں اپنی بزم میں تنہا، کہ میں آزاد ہوں
نہ دشمنی کا فساد، نہ دوستی کی صلہ
میرا ہے اپنا جہاں، کہ میں آزاد ہوں

شازیہ فاروق احمد ______ بھیرہ

وہ پاس نہیں، احساس تو ہے، اک یاد تو ہے اک آس تو ہے
دریائے جدائی میں دیکھو! تنکے کا سہارا کیسا ہے
پندار سلامت ہے کہ نہیں، یہ دیکھو، یہ مت دیکھو
جاں کتنی ریزہ ریزہ ہے، دل پارہ پارہ کیسا ہے!

عرشیہ ورک ______ گجرات

یہ بھی اچھا ہوا کہ صرف سنتا ہے
دل اگر بولتا تو قیامت ہوتی

عائشہ خان ______ ٹنڈو محمد خان

یا اس اک کھیل تھا جیسے میرے گھر کا جلنا
غیر تو غیر تھے اپنوں نے تماشا دیکھا

نمرہ، اقرا ______ کراچی

زمین بیروں سے کتنی بار اک دن میں نکلتی ہے
میں ایسے حادثوں پہ دل مگر چھوٹا نہیں کرتا
تیرا اصرار سر آنکھوں پر تجھ کو بھول جانے کی
میں کوشش کر کے دیکھوں گا مگر وعدہ نہیں کرتا

مینا بخاری ______ ڈڈو

سمجھ تو جاتی ہوں داؤ پیچ اس کے لیکن دیر سے
وہ بازی جیت جاتا ہے میرے ہوشیار ہونے تک

ندا، فضہ ______ فیصل آباد

چاہا تو چاہتوں کی حد سے گزر گئے
نشہ محبتوں کا اترنے نہیں دیا
ہر بار بنا ترے ملنے کا ذائقہ
ایسا ثمر کسی بھی شجر نے نہیں دیا

عنبرین بٹ ______ جام پور

کیا جانے مہکتی ہوئی صبحوں میں کوئی دل
شاموں میں کسی درد کی رعنائی تو اب ہے
کل تک مری وحشت سے فقط تم ہی تھے آگاہ
ہر گام پہ اندیشۂ رسوائی تو اب ہے

شمع مسکان ______ جام پور

عید آئی ہے تو آنکھوں میں اتر آئے ہیں
ہجر کی اوس میں بھیگے ہوئے جگنو کتنے

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع۔ 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں۔ آپ کی سلامتی، عافیت اور خوشیوں کے لیے دعائیں۔
اللہ تعالیٰ آپ کو، ہم کو اور ہمارے پیارے وطن کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین

آتے ہیں آپ کے خطوں کی طرف پہلا خط کراچی سے ڈاکٹر نوشابہ کامران کا ہے، لکھتی ہیں میں ایک ڈاکٹر ہوں۔ زندگی میں مصروفیت بہت ہے۔ ٹی وی میں کبھی دل نہ لگا۔ پڑھائی کے دوران بس جب کبھی بور ہوتی تو شعاع پڑھ لیا۔ فریش ہو گئی۔ آج جس تحریر نے خط لکھنے پر مجبور کیا وہ فاخرہ جبیں کا ناول "برف زاروں کی تتلی" ہے۔ ماہین کی فیلنگز صرف وہ انسان سمجھ سکتا ہے جس نے محبت کی ہو، وہ بھی بہت گہری۔ ناول کے آخر میں نظم "جب میں اپنی خوابگاہ میں سو جاؤں گی" نے بہت زیادہ رلایا۔ اینڈ نے بہت زیادہ رلایا۔ ماہین کی محبت نے بہت رلایا۔ اس کی محبت کی آنچ نے اپنے محبوب کے دل کی رسائی کیوں حاصل نہ کی۔ محبت تنہا کیوں کر دیتی ہے۔ فاخرہ جبیں آپ کس طرح دلوں کے اندر اتر جاتی ہیں۔

پیاری نوشابہ! آپ نے اپنی مصروف زندگی سے وقت نکال کر خط لکھا بہت خوشی ہوئی۔ اچھا ہو تا کہ آپ دوسری تحریروں کے بارے میں بھی رائے کا اظہار کرتیں۔ آپ کے جذبات فاخرہ جبیں تک پہنچا رہے ہیں۔

انشاں خان اور عطیہ نواز شاہ پور چاکر سے تشریف لائی ہیں لکھتی ہیں

شعاع سے ہمارا رشتہ 23 سال پرانا ہے (8 سال پرانا میرا اور 15 سال پرانا بھابھی کا) ہو گئے ناں 23 سال پر اتنے سال میں خط یہ دوسرا ہی ہے پہلی جسارت کو بھی چار سال ہو گئے۔ اب آتے ہیں جولائی کے شمارے کی طرف "دیوار شب" کی آخری قسط لاجواب تھی۔ ہر کردار کے ساتھ بھرپور انصاف کیا عالیہ آپی نے گریٹ آپی آپ نے ناول کا حق ادا کیا۔ مریم عزیز کہاں ہیں پلیز کوئی مکمل ناول لکھوائیں ان سے اور سیاناور سیائی سے ملاقات ہوئے بھی عرصہ ہو گیا۔ شعاع کے سب سلسلے بہترین ہیں۔ میری فیورٹ کہانی "دیمک زدہ محبت" ہے جبکہ امی کی فیورٹ "ایک تھی شمال" اور بھابھی کی فیورٹ "دیوار شب" تھی جو کہ اب ختم ہو گئی ہے اس کا مطلب اگلے مہینے رسالہ پہلے پڑھنے کے لیے معرکہ میرے اور امی کے درمیان ہو گا

ہاہاہاہا.... مجھے ایک بات بہت حیران کرتی ہے کہ شاہ پور چاکر میں شعاع پڑھنے والوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ اکثر رسالے شارٹ ہو جاتے ہیں لیکن شعاع میں کہیں شاہ پور چاکر کا نام نظر نہیں آتا (سب ہماری طرح سست ہیں کیا بھئی؟) جاگ جاؤ شاہ پور والو۔
ہمارے شہر کا مختصر تعارف یہ ہے کہ یہ سندھ کے ضلع سانگھڑ میں واقع ایک چھوٹا سا محبتوں سے بھرا شہر ہے۔ پہلے قصبہ کہلاتا تھا لیکن اب ہر جگہ تعمیراتی کام کی وجہ سے شہر کا روپ دھار چکا ہے۔ یہاں لڑکوں اور لڑکیوں کے گورنمنٹ اسکول ہیں اور بہت سے پرائیوٹ اسکول ہیں اور اللہ کے کرم سے لڑکوں کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کی پڑھائی بھی ضروری سمجھی جاتی ہے امیر غریب ہر طبقے کی بچیاں تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ ڈگری کالج کا بھی افتتاح ہونے والا ہے جس سے بچیاں گریجویشن تک تعلیم اپنے ہی شہر میں مکمل کر سکیں گی۔

افشاں! شعاع کی بزم میں خوش آمدید۔ آپ کے شہر کے بارے میں جان کر بہت خوشی ہوئی خصوصاً "یہ بات کہ لڑکیاں بھی تعلیم حاصل کررہی ہیں۔ شعاع سے آپ کا اور آپ کی بھابھی عطیہ نواز کا اتنا پرانا رشتہ ہے پھر بھی خط لکھنے میں اتنی تاخیر کی ؟ اپنی بھابھی سے کہیں اب نبیلہ کا ناول پڑھیں اور معرکہ جاری رکھیں۔

شاہ پور چاکر میں تعلیمی سہولیات میسر ہیں اور شعاع بھی وہاں پڑھا جاتا ہے پھر وہاں کی قارئین ہمیں خط کیوں نہیں لکھتیں ؟ اس پر ہمیں بھی حیرت ہے۔

ارم کمال نے فیصل آباد سے لکھا ہے

جولائی کا شمارہ کیا غضب کا ٹائٹل تھا کہ نظریں ہٹنے سے انکاری تھیں "پیارے نبی کی پیاری باتیں" پڑھ کر دل کو روح پرور سکون ملا۔ بند ممن میں وجیہہ ثانی سے ملاقات سو سو رہی۔ شادی مبارک میں مسٹر اینڈ مسز شمس کو بہت بہت مبارک ہو۔ نیا ناول "رقص بسمل" سے امیدیں تو کافی وابستہ نظر آرہی ہیں دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔ سب سے پہلے "دیمک زدہ محبت" پڑھا بہت سلوتیپو جارہا ہے جبکہ "ایک تھی مثال" میں ہر دفعہ کوئی دلدوز سانحہ دھماکے کی صورت ہمارے دلوں پر گرتا ہے ؟ اس دفعہ یہ دھماکہ عدیل کی طرف سے ہوا۔ اب بات ہو جائے اس شاہکار اور لاجواب ناول کی جس نے ہمیں کافی عرصے تک اپنے حصار میں جکڑے رکھا "دیوار شب" عالیہ بخاری کا خوب صورت ناول جس کے اینڈ سے دل کو تسکین ملی خصوصاً" جویا اور معاذ کے مل جانے کی بہت خوشی ہوئی۔ ہر کردار کے ساتھ پورا پورا انصاف ہوا بقیہ افسانوں میں "سلائی مشین" دبی بھلے "بہت پر اثر تحریریں تھیں "ہونہ ہونہ تماشا" بہت ہی ناقابل فراموش تحریر تھی پانی کی وجہ سے اتنی افتاد میں نے تو کبھی سوچی نہ تھی صائمہ کا ناول "اجالوں کا سفر" واقعی علی اور سارہ کے لیے اجالوں کی نوید لے کر طلوع ہوا۔ "یک نہ شد دو شد" میں مزاح کے لیے بہترین مواد تھا۔

ارم! ٹائٹل اچھا لگا بہت شکریہ۔ تفصیلی تبصرہ بہت اچھا لگا۔ آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے متعلقہ مصنفین تک پہنچائی جارہی ہے۔

آنسہ شبیر ڈوگہ گجرات سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

سرورق کی ماڈل دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ سب سے پہلے عالیہ بخاری کا ناول دیوار شب دلوں پر اپنا عکس چھوڑ گیا۔ زبردست۔ "ایک تھی مثال" بھی بس ٹھیک ہی ہے۔ افسانوں میں دبی بھلے اور سلائی مشین دونوں بازی لے گئے۔ باقی افسانے بھی بہت اچھے تھے۔

آنسہ شبیر آپ نے لکھا ہے پہلی دفعہ خط لکھ رہی ہیں ساتھ ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ اس سے پہلے دو خط لکھے جو شائع نہیں ہوئے۔ بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی شعاع کی پسندیدگی کے لیے دل سے شکریہ۔

کومل جویہ ملتان سے تشریف لائی ہیں، لکھتی ہیں

پانچ طویل برسوں کی خاموشی اور مصروفیت کو "دیوار شب" کی آخری قسط نے بالائے طاق رکھنے پر مجبور کردیا۔ بہت سی الجھنوں، نشیب و فراز اور مصائب سے گزرنے کے بعد بالآخر ہر کردار اپنے اپنے انجام کو پہنچ گیا جویا اور ربیعہ کو گوہر مقصود مل گئے اور آپا گل کو اپنے کیے کی سزا، عالیہ بخاری مبارک باد کی مستحق ہیں جنہوں نے اتنا عرصہ قاری کو اپنی تحریر کی گرفت میں رکھا اور کہیں کسی جگہ پر کوئی کردار اپنے مدار سے نکلا ہوا محسوس نہیں ہوا البتہ آخری قسط میں اسلام صاحب جب شائستہ بیگم کو خوف خدا دلا رہے تھے تو عالیہ جی نے "خدا سے پناہ مانگ رہا تھا" لکھا جبکہ خدا کی پناہ لی جاتی ہے اور نعوذ باللہ یہ فقرہ درست نہیں تھا (کیونکہ شیطان مردود سے پناہ مانگی جاتی ہے)

"رقص بسمل" نے آغاز سے ہی اپنی طرف کھینچ لیا۔ کہانی بہت دلچسپ اور خوب صورت محسوس ہو رہی ہے۔ بہت جلد یہ ناول قارئین میں مقبولیت کے ریکارڈ توڑے گا "دیمک زدہ محبت" صائمہ اکرم چوہدری کی شاندار کاوش ہے۔ ماہم کسی سائیکاٹرسٹ کے بجائے خود کوئی سائیکی کیس لگ رہی ہے۔ سکینہ کی خوش فہمیوں کا گراف بڑھتا جارہا ہے۔ حقائق سے آنکھیں چرا رہی ہے۔ موحد پر قسمت مہربان ہو رہی ہے اسے ماہم جیسی خود پرست لڑکی سے جان چھوٹنے پر خوش ہونا چاہیے۔ عائشہ کا کردار بہت پسند ہے مجھے۔

"ایک تھی مثال" رخسانہ صاحبہ نے قسم کھائی ہے شاید کہ قارئین کو اذیت سے دوچار کرکے رہیں گی۔ رخسانہ ڈیئر ہم اپنے ارد گرد اتنے دکھوں میں الجھے ہیں اور

زندگی اتنی مشکلات سے دوچار ہے کہ ہر کوئی ان سے فرار چاہتا ہے۔ تو کوشش کریں کہ زندگی کو سہل پیش کریں اور کچھ وقت کے لیے ہمیں کبوتر کی طرح آنکھیں موندے رہنے دیں اور اس واحد ذریعہ تفریح کو باعث رنج نہ جانیں یقین کریں ناول بے حد شاندار ہے مگر کبھی کبھی رونے کو نہیں بھی چاہتا ناں۔

سوشی افتخار کا ناولٹ اچھا تھا مگر موضوع بہت پرانا، بازغہ نے نسوانیت داؤ پر لگائی اور نفس پرستی پر ممتا کو قربان کردیا۔ ایسی عورتیں ہی ہر عورت کی تذلیل کا سبب بنتی ہیں اور عورت ہر رشتے میں ناقابل اعتبار ہو جاتی ہے۔ حالانکہ وہ ہر رشتے میں مقدس اور معتبر ہے۔

آسیہ مقصود کا ناولٹ قدرے مزاح کا رنگ لیے ہوئے تھا۔ شگفتہ طرز تحریر اور دلچسپ اختتام پسند آیا۔

کومل! تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ۔ رخسانہ نگار ہماری بہت اچھا لکھنے والی مصنفہ ہیں یہ ان کے قلم کا اعجاز ہے کہ قارئین ان کے کرداروں کے ساتھ ہنستے اور روتے ہیں ان کے جذبات و احساسات کو محسوس کرتے ہیں آپ اطمینان رکھیں آگے چل کر یقیناً "بہت سے خوشگوار موڑ بھی کہانی میں آئیں گے۔

عیرہ مظفر اور حمنہ عزیز نے (سوبھاگہ 127 شمالی سرگودھا) سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

ہمارے گاؤں کا نام یقیناً" آپ کے لیے نیا ہی ہو گا اس میں بھی اب وہی سہولیات فراہم کی جارہی ہیں جن کا اکثر بہنیں اپنے گاؤں کا تحریر کرتے وقت لکھتی ہیں مثلاً" اسکول، اکیڈمی، ہسپتال وغیرہ رخسانہ نگار کا "ایک تھی مثال" بھی بہت اچھا جارہا ہے۔ رخسانہ جی! اسے جاری رکھیں اس کے علاوہ باقی سلسلے بھی بہت پسند آئے افسانے، ناولٹ بھی پڑھے سب میں کوئی نہ کوئی سبق تھا اور آپ کے اور ہمارے "شعاع" میں چھپنے والی تمام تحاریر میں کوئی نہ کوئی سبق ضرور حاصل ہوتا ہے۔

عمیرہ اور حمنہ! ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو شاندار نمبروں سے کامیابی دے دیجیے آپ کی تحریر کی روانی اور خوب صورتی سے تو لگتا ہے کہ آپ بہت اچھی اور ذہین اسٹوڈنٹ ہوں گی۔ شاعری بھجوانے کا طریقہ وہی ہے جس طریقہ سے آپ نے خط بھجوایا ہے۔ خط والے لفافے میں ہی شاعری کے صفحات بھی ڈالے جاسکتے ہیں۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ اب باقاعدگی سے خط لکھتی رہیے گا۔

سائرہ عبید نے ڈونگہ سے لکھا ہے

سب سے پہلے میں بات کروں گی صائمہ اکرم کی دیمک زدہ محبت کی جس کا ایک ایک لفظ جادوئی اثر رکھتا ہے اور میرا دل ان الفاظ کے زیر اثر کئی کئی گھنٹے رہتا ہے۔ بے حد سبق آموز تحریر جس میں خدا پہ بھروسے کی تلقین کی گئی ہے اور اسے پڑھ کر خدا پر بھروسہ مزید بڑھ جاتا ہے دوسری طرف ایک تھی مثال بہت دکھی کہانی۔ آج کل کے حالات کی مکمل عکاس ہے۔ نبیلہ عزیز نے بھی اچھا آغاز کیا۔ آگے آگے دیکھیں ہوتا ہے کیا؟

صائمہ بشیر کا اجالوں کا سفر بہت اچھی تحریر تھی ایک ایسی تحریر جس میں محبت، عزت، دکھ سب کچھ شامل تھا۔

باقی سب بھی بہت اچھا تھا۔ میں جمیلہ مائی کی طرح کہوں گی کہ جو لوگ ہمیں چنگے لگتے ہیں، وہ ہمیں ہر حالت میں سوہنے لگتے ہیں۔

سائرہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے شکریہ۔

مشال راجہ اور ماہین نے شاہ گھوڑا سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

قلم اٹھانے کی سب سے بڑی وجہ "جنت کے پتے" ہے اس ناول کی جتنی بھی تعریف کی جائے وہ کم ہے۔ جون، جولائی کا شمارہ اچھا لگا۔ ساری کہانیاں اچھی ہیں۔ آپی ہمارا دل کررہا ہے کہ خواتین اور شعاع میں ہر ماہ ضرور نمرہ احمد، فرحت اشتیاق، نبیلہ عزیز، نایاب جیلانی، ام مریم، مریم عزیز ان سب کا تو نہیں لیکن کسی ایک دو کا کوئی نہ کوئی ناول ضرور موجود ہو۔

یہ ڈائجسٹ تفریح کے ساتھ ساتھ ہماری تربیت میں بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اینڈ پر ایک فرمائش پلیز اسد ملک، شاہد آفریدی اور صبا قمر کا انٹرویو شائع کریں۔

مشال اور ماہین! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ آپ کی فرمائش شاہین رشید تک پہنچا رہے ہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

طلعت خان کوٹ فضلا سہارن چشمہ سے لکھتی ہیں

ماڈل بہت اچھی لگی دیکھ کے دل خوش ہو گیا۔ سب سے پہلے وجیہہ ثانی کا انٹرویو پڑھا بہت اچھا لگا اور ان کی مسز بہت کیوٹ لگی۔ سب سے پہلے دیمک زدہ محبت پڑھی' اوور آل سٹوری اچھی ہے لیکن چٹپٹی نہیں ہے۔ پڑھ کے بوریت محسوس ہوتی ہے' جمیلہ مائی اور سکینہ کی وہی باتیں ہوتی ہیں جو ہم پہلی قسط سے پڑھتے آرہے ہیں۔ کچھ نیا پن نہیں ہے۔ نائلہ اور سکندر شاہ کی اسٹوری دلچسپ ہے۔ رقص بسمل اچھا لگا' افسانے سو سو تھے۔ آپ سے فرمائش کرنی تھی کہ جیو نیوز کا سٹر "محمد جنید" کا انٹرویو شائع کریں۔

پیاری طلعت! شعاع کی محفل میں خوش آمدید' آپ کی تعریف و تنقید ان سطور کے ذریعے مصنفین تک پہنچائی جارہی ہے۔

عفیفہ محمود نے لاہور سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

ویسے تو میں آپ کی خاموش قاری ہوں اور میرا اور ڈائجسٹ کا ساتھ 15 برس سے بھی زیادہ کا ہے۔ لیکن اس مرتبہ میں نے خط لکھنے کی ہمت کر ہی لی کیونکہ میں اس مرتبہ پریشان تھی کہ روزہ کیسے چھوڑوں لیکن آپ کے ڈائجسٹ میں جو احادیث (حاملہ اور دودھ پلانے والی کا روزہ چھوڑنا) میرا مسئلہ حل کردیا۔ کیونکہ میں اپنے بیٹے کو فیڈ کراتی ہوں۔ اور مجھے یہ حدیث پڑھ کر سکون آگیا۔

میرا اور میڈم صائمہ اکرم کا تعلق ایک ہی شہر صادق آباد سے ہے اور میری شادی لاہور میں ہوئی ہے۔ مجھے بہت اچھا لگا کیا کمال لکھا ہے میڈم نے سارے کردار ہی جاندار ہیں۔ مہوش افتخار نے بھی زبردست لکھا۔ اچھی اسٹوری تھی۔ سیرا حمید کا بوند بوند تماشا نے تو کمال ہی کردیا۔ میں پڑھتے پڑھتے اتنی بار ہنسی کہ بس۔ پھر شام کو دوبارہ میں نے اپنے ہسبینڈ کو بھی یہ ناول سنایا تو میری چار سالہ بیٹی اور چھ سالہ بھانجی بھی سننے لگی اور ہنستی رہی اور میری بیٹی تو چھیڑتی رہی کہ "مما پالٹی بھر گئی" ہاہاہا اس کہانی میں نوشی کی ساس اور بوا کا کردار کچھ زیادہ ہی اچھا لگا۔

اور نبیلہ عزیز نے رقص بسمل ناولٹ کا آغاز تو اچھا کیا ہے اب آگے دیکھتے ہیں کہ خلیل جبران کا قول آفاق پر دالی پورا کرتے ہیں یا نہیں۔

عفیفہ! آپ کا خط پڑھ کر میری حیرانی نہیں جارہی خود طور پر اس لیے بھی کہ آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے ماس کمیونیکیشن میں ایم اے کیا ہے۔ سیرا کا یہ افسانہ پڑھ کر آپ کی ہنسی نہیں رک رہی تھی اور آپ کے ہسبینڈ بھی ہنسے اور آپ کی بیٹی بھی خیر وہ تو بچی ہے ۔۔۔ کیا کہیں۔

اس کہانی کو پڑھتے ہوئے کہ نوشی کی گھٹن میں نے اپنے دل میں اترتی محسوس کی تھی اس کے شوہر اور گھر والوں کی بے حسی اس معاشرے کی انتہائی تلخ سچائی ۔۔۔ کیا کسی کے دکھ' تکلیف اور اذیت پر کسی کو ہنسی آسکتی ہے بڑی عجیب بات ہے۔

یہ کہانی میں نے یہ سوچ کر شائع کی کہ شاید کسی گھر میں کسی نوشی کا دکھ کوئی محسوس کر سکے۔ کوئی ان لوگوں کو احساس دلا سکے۔ جو دوسروں کی بیٹی کو انسان ہی نہیں سمجھتے اسے پڑھ کر کسی کو ہنسی آئے گی یہ تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

انجم ملک دہاڑی سے تشریف لائی ہیں لکھا ہے

شعاع اور خواتین کی رائٹرز پوری آب و تاب سے چمکنے والے نگینے ہیں لیکن یہ بات تو ماننی پڑے گی کہ ان نگینوں کو شعاع اور خواتین نے ہی تراشا ہے رخسانہ نگار عدنان جن کا قلم کبھی نہ تھکنے والا اور کبھی نہ رکنے والا ہے رخسانہ آپی جو نام ہے اعتماد کا! عمیق مشاہدے اور علم سے بھرپور کہانیاں لکھنے والی نمرہ احمد پہلی چاہت!

زبردست فصاحت' بلاغت اور سحر زدہ کر دینے والی کہانیاں لکھنے والی عنیزہ سید آج بھی کل بھی! محبتوں کی دنیا کی باسی اور محبتوں سے اپنا مقروض بنا دینے والی فرحت اشتیاق کا انداز اتنا خالص جتنا پیار! ادب کے افق پر ابھرتا ستارہ اور ہر ناک پر مجبور رکھنے والی سائرہ رضا تم ہی تو ہو! پیارے لاہور کی پیاری رائٹرز جی ہاں فائزہ افتخار جن کا قلم یوں چلے کہ "بلے بلے!" مختصراً" تمام رائٹرز سے محبت ہے کیونکہ یہ سارے رنگ ہمارے ہیں "شعاع سے دوری سہی نہیں جاتی کیونکہ یہ دل کا معاملہ ہے!

انجم! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ بلاشبہ ہماری تمام مصنفین تراشے ہوئے ہیرے ہیں جو پوری آب و تاب سے جگمگا رہے ہیں۔ اس وقت تمام چینلز پر خواتین اور شعاع کی مصنفین چھائی ہوئی ہیں اور ان کے لکھے ہوئے ڈرامے سب سے زیادہ بے حد پسند کیے جا رہے ہیں۔

افرح گیتی نے اوکاڑہ کینٹ سے لکھا ہے

شعاع اپنے نام ہی کی طرح منفرد ہے۔ اس کے تمام ہی سلسلے بہت اچھے ہیں۔ جس طرح دن کے اجالے کے بعد سورج کی پہلی کرن افق پر ضروری ہے بالکل اسی طرح پہلی شعاع کے بغیر شعاع نامکمل ہے۔ حمد اور نعت رسول مقبول کے کیا ہی کہنے۔ دل معطر ہو جاتے ہیں اور ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔ اور پھر احادیث یعنی نبی کی باتیں نہ ہوں تو اک خلا سا رہ جاتا ہے۔

انٹرویوز میں جب نئے لوگوں کے خیالات جاننے کو ملتے ہیں تب بھی بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔ مکمل ناول ہو یا ناولٹ یا سلسلہ وار کہانی ہر سلسلہ ہی اپنے اندر بہت سا خزانہ جمع کیے ہوئے ہے۔ اس سے خود کو اور اللہ تعالیٰ کو پہچاننے کا ایک راستہ مل جاتا ہے۔

افرح! آپ جس سلسلے میں چاہیں شرکت کریں شعاع کے صفحات حاضر ہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ لیکن آپ نے شعاع کی کسی تحریر کے بارے میں اپنی رائے نہیں دی اس لیے آپ کا خط کچھ ادھورا سا لگا۔ آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجیے گا۔

فاطمہ سکندر گرین ٹاؤن لاہور سے تشریف لائی ہیں لکھتی ہیں

ایک تھی مثال اچھا جارہا ہے۔ مہوش افتخار کا ناولٹ بھی بہت اچھا تھا۔ یک نہ شد دو شد ناولٹ بھی بہت اچھا تھا۔ افسانے سارے ہی اچھے تھے لیکن سبق بہت بھلا لگا۔ مکمل ناول صائمہ بشیر کا بہت اچھا تھا۔ پورا شعاع ہی بہت اچھا ہے۔ سائرہ رضا ایک بہترین مصنفہ ہیں۔

فاطمہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

ثمینہ اکرم لیاری کراچی سے لکھتی ہیں

لیاری کے حالات گزشتہ کئی ہفتوں سے بہت خراب ہیں اس بار یہ فکر لگی تھی کہ شاید جولائی کا شعاع ڈائجسٹ بروقت مجھ تک نہ پہنچ پائے۔ رات دن ہونے والی فائرنگ' بم دھماکے اغوا اور بوری بند لاشیں۔ اس بے یقینی کی صورت حال میں بھی صد شکر ہے اخبار والے بھائی 3 جولائی کو شعاع گھر پہ ڈال گئے۔ حسب معمول قارئین کے خطوط پڑھے اور فوراً" ہی "دیوار شب" نکال لیا جبکہ غیر متوقع طور پر آخری قسط لکھا دیکھ کر حیرت بھی ہوئی اور افسوس بھی۔ ابھی دل تجھ سے بھرا نہیں والی کیفیت ہوئی۔ عالیہ بخاری کے قلم کی خاص بات کہ 5 سال سے زیادہ طوالت والے ناول سے بھی قارئین بور نہیں ہوئے۔ دیوار شب کا انجام بہت ٹھنڈا اور نرم خوشگوار رہا۔ پڑھتے پڑھتے کئی بار آنکھیں نم ہوئیں۔ مگر برے کام کا برا انجام اور اچھے لوگوں نے اپنی منزل پائی۔ جس طرح معاذ اور جویا کا ملن آخری سطور تک ناممکن لگ رہا تھا۔ اسی طرح خیام اور ربیعہ کے بارے میں یہ یقین نہ تھا کہ یہ دونوں ایک ہو سکیں گے۔ مگر رائٹر کے قلم کا جوہر سامنے آیا اور غیر محسوس طریقے سے ایک بیبی اینڈ پڑھنے کو ملا۔ مگر آخری قسط میں سالار اور گیتی سرے سے غائب تھے۔ زری اور راجو کو بھی ان خوشیوں میں شامل کر لیتے۔ جبکہ زوبیہ کا ذکر بھی سرے سے گول کر دیا تھا۔ لگ رہا تھا جیسے ابھی ایک قسط اور باقی تھی مگر جلدی میں اسے سمیٹ دیا گیا۔ میں کوئی اور تحریر نہ پڑھ سکی۔ لیاری سے نقل مکانی کرنے والوں میں میں اپنی فیملی کے ساتھ شامل رہی۔ ہم لوگ شاہ فیصل کالونی اپنی امی کے گھر چلے گئے جبکہ شعاع گھر پہ ہی رہ گیا۔ یہاں اپنی جان کے لالے پڑے تھے اس لیے باقی تبصرہ ادھار رہا۔

پیاری ثمینہ! لیاری کے حالات حقیقتاً" بہت افسوس ناک ہیں۔ میں پچھلے دو ڈھائی عشروں سے ٹارگٹ کلنگ' بھتہ' بوری بند لاشیں' پہیہ جام ہڑتال کراچی کی پہچان ہی بن گئی ہیں۔ صرف لیاری کا علاقہ تھا جہاں حالات پرسکون تھے۔ ہڑتال میں پورا شہر بند ہوتا تھا جبکہ واحد لیاری کا علاقہ تھا جہاں کاروبار زندگی اپنی معمول کے مطابق جاری رہتا تھا اور جہاں اس قسم کی وارداتیں نہیں تھیں۔ ہم لوگ ساٹھ سال سے ساتھ رہ رہے ہیں کبھی کوئی جھگڑا نہیں ہوا تو اب ایسا کیا ہو گیا ہے۔ یقیناً" یہ کوئی سازش ہے بھائی کو بھائی سے لڑایا جارہا ہے۔

اچھے برے لوگ ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ حالات کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ وہ کون لوگ ہیں جو فساد کرا رہے ہیں۔ انہیں پہچانیں اور اپنے اتحاد کو قائم رکھتے ہوئے ان کے مذموم مقاصد کو ناکام بنادیں۔

عمارہ رفیق نے فاضل پور سے لکھا ہے

اس ماہ کا ٹائٹل سادہ سا ہر طرف قوس و قزح کے رنگ بکھیر گیا سب سے پہلے دوڑ لگائی اپنے فیورٹ ناولٹ دیمک زدہ محبت جس میں مجھے جمیلہ مائی کا کردار نہایت پسند ہے۔ اس ماہ کا مکمل ناول میں اجالوں کا سفر بازی لے گیا دسترس میں بازغہ کو اپنے کیے سزا ملی افسانوں میں سب سے بازی لے گیا وہ ہے سلائی مشین۔ آج کی مہنگائی میں انسان کا ہنر ہی کام آتا ہے ویل ڈن سلویٰ علی بوند بوند تماشا کچھ اچھا نہیں لگا عجیب سا تھا۔ باقی سب سلسلے بیسٹ تھے۔

عمارہ! آپ کے خدشات غلط تھے۔ آپ کا خط شامل اشاعت ہے۔ زندگی میں کبھی بھی کوئی قدم اٹھانے سے پہلے ہی یہ سوچ لینا کہ ناکامی ہوگی، غلط ہے کوئی بھی کام کرنے سے پہلے صرف یہ سوچیں کہ آپ جو کچھ کرنے جا رہی ہیں وہ صحیح ہے یا غلط اگر آپ صحیح ہیں تو پوری مضبوطی اور اعتماد سے قدم اٹھائیں ناکامی کی پروا نہ کریں۔ کامیابی یا ناکامی اہم نہیں۔ آپ کا صحیح یا غلط ہونا اہم ہے۔
شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

ایمن تحریم نے سرگودھا سے لکھا ہے

جولائی کا شعاع چار تاریخ کو ملا۔ ٹائٹل بس نارمل سا تھا۔ سب سے پہلے "دسترس میں" پڑھی اس کا اینڈ تو پچھلے ماہ ہی میں سمجھ میں آگیا تھا۔ تو کچھ خاص نہیں لگی۔ بس نارمل سی ہی تھی۔

اس کے بعد "یک نہ شد" پڑھی پڑھ کر مزہ آیا۔ اس کے بعد "اجالوں کا سفر" پڑھی اچھی لگی۔ مگر صرف ایک مکمل ناول دیکھ کر بہت بوریت ہوئی۔ پلیز دو یا تین مکمل ناول دیا کریں۔ نایاب جیلانی بھی کافی عرصے سے نہیں لکھ رہیں۔ پلیز ان سے بھی کوئی کہانی لکھوائیں اور عائشہ یوسف کا انٹرویو شائع کریں۔ ایک تھی شال بھی اچھی کہانی لگی۔ اور فہرست میں نبیلہ جی کی کہانی دیکھ کر جو خوشی ہوئی وہ میں اپنے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی۔ بہت اچھی کہانی ہے۔

پیاری ایمن! آپ کی کامیابی کے لیے دعا گو ہیں۔ نایاب جیلانی کی تحریر جلد ہی شامل ہوگی۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

مصباح عنصر نے بوہر گجرات سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

ٹائٹل گرل کو دیکھ کر گرمی کا احساس کچھ کم ہوا۔
نبیلہ عزیز کا رقص بسمل بلاشبہ بہترین ناول ہے اور اس کے ادااس کی پختگی اچھی لگی۔ افسانے سارے کے سارے بہت اچھے لگے۔
اسلام آباد کی سیر کراتی صائمہ اکرم دیمک زدہ محبت کو اچھے طریقے سے آگے بڑھا رہی ہیں۔
مصباح! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

دعا نور یاسین خانقاہ ڈوگراں سے تشریف لائی ہیں لکھا ہے

سب سے پہلے تو عالیہ بخاری کو اتنا خوب صورت لکھنے پر مبارک باد آخر ہمارا "دیوار شب" کے ساتھ پانچ سال کا ساتھ تھا۔ لیکن اختتام پر زرتاج بیگم کے بارے کچھ بھی نہ بتایا گیا۔ صائمہ اکرم جی سے تو ایک ہی درخواست ہے کہ پلیز کسی بھی کردار کے ساتھ ناانصافی نہ ہو اور ثناکلہ کے بارے میں زیادہ لکھا کریں۔ افسانوں میں "ٹپ ٹپ بہا" نمبر ون تھا۔ یہ نایاب جیلانی کہاں ہیں آج کل آپ؟ پلیز نبیلہ ابر راجہ اور سائرہ عارف کو ڈھونڈ لائیں۔
دعا نور! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ سائرہ عارف ٹی وی پر مصروف ہیں۔ نبیلہ ابر راجہ اور نایاب جیلانی کی تحریریں جلد شامل ہوں گی۔

مسز ساجدہ زمان نے اوکاڑہ سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

میرا گاؤں شہر اوکاڑہ کے قریب واقع ہے۔ خوب صورت ترین نئی نویلی سڑک نے اسے شہر سے قریب ترین کر دیا ہے۔ گاؤں میں لہلہاتے ہرے بھرے کھیتوں ٹھنڈے میٹھے ٹیوب ویلوں کے ساتھ ساتھ جدید ترین اسکول گھروں میں پانی کے پمپ اور گاؤں میں ایک جدید ہوٹل نے گاؤں کو خوب صورتی اور دلکشی سے بھرپور کر دیا

ہے' یہاں کی بہت سی عورتیں نہ صرف گھروں اور کھیتوں میں جانفشانی سے کام کرتی ہیں بلکہ کراچی' کوئٹہ جیسے بڑے شہروں سے بہترین کپڑا لا کر ہمیں گھر بیٹھے مہیا کرتی ہیں۔ ہر طرح کی سہولتوں سے مزین میرے گاؤں میں بس ایک مسئلہ' یہاں سے شعاع نہیں ملتا۔

شعاع میرا ہمدرد' غمگسار' میری تنہائی کا ساتھی ہر لمحہ کسی معلم کی طرح رہنمائی کرتا ہوا شعاعیں بکھیرتا کہ جس میں کبھی تو لمبے لمبے ناول چھوٹی سی بات سمجھا جاتے ہیں تو کبھی ایک صفحے کا افسانہ بہت بڑا سبق دے جاتا ہے۔

پیاری ساجدہ! آپ کے گاؤں کے بارے میں جان کر بہت خوشی ہوئی۔ شعاع تاخیر سے سہی پھر بھی آپ کو مل جاتا ہے اور آپ کے میاں صاحب خود لا کر دیتے ہیں۔ یہ بڑی بات ہے۔

ہمارے دیہی علاقوں کی خواتین مردوں سے زیادہ جفاکش' غیور اور محنتی ہیں۔ عموماً" شہروں میں بھی گھروں میں دیہی علاقوں سے آئی خواتین کام کرکے چلاتی ہیں بچے پالتی ہیں' جبکہ ان کے مرد عموماً" کوئی کام نہیں کرتے۔

حمنہ حبیب اور عبدالحکیم سے شرکت کی ہے۔ لکھتی ہیں

ٹائٹل اچھا تھا۔ "افسانہ نگار" کا "ایک تھی مثال" بہت اچھا جارہا ہے۔ افسانہ نگار سے درخواست کرتی ہوں کہ عدیل اور بشریٰ کی صلاح کروادیں اور عاصمہ کے ساتھ مزید کچھ برا نہ ہو۔ نبیلہ عزیز کا سلسلہ وار ناول دیکھ کر بہت خوشی ہوئی "دیمک زدہ محبت" بھی بہت اچھا جارہا ہے۔

مہوش افتخار کا دسترس میں ناول بھی اچھا تھا باقی ناولٹ اور افسانے بھی بہت اچھے تھے۔

پیاری حمنہ! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

اقصیٰ بتول نے نیالاہور سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

میری ڈرائنگ کافی سے زیادہ اچھی ہے اور میں اپنے اسکیچ بناتی ہوں کیا میں اپنے بنائے ہوئے اسکیچ بھیج سکتی ہوں اور اگر بھیج دوں تو کیا رو لز ہیں؟ سب سے پہلے تو اداریہ پڑھ کر ہم بھاگے عالیہ جی کی طرف سب کچھ بہت اچھا اور حسب توقع تھا۔ مجھے کنفرم تھا کہ ربیعہ کا معاملہ یوں ہی طے پانا ہے۔ آپا گل کے ساتھ بہت اچھا ہوا بیسٹ اینڈ کرنے پر عالیہ جی کا بہت بہت شکریہ۔ "ایک تھی مثال" بلاشبہ رخسانہ جی نے کمال کردیا عاصمہ سے یہی توقع تھی

جس بے بسی کی انتہا پر وہ تھی کچھ بعید نہ تھا اور بشریٰ اور عدیل کی لڑائی۔ اف وہ سین پڑھتے ہوئے میرے دل میں بھی اسٹار پلس کے ڈراموں والی دھن دھن ہو رہی تھی۔ رقص بسمل' نبیلہ عزیز ہمیشہ کچھ اچھا ہی لکھتی ہیں آغاز تو زبردست لگ رہا ہے (تیری دسترس میں درماں) نام جتنا خوب صورت کہانی نے اتنا اثر نہیں ڈالا۔ مہوش بہت بہت معذرت لیکن تنقید کرنا تو ہم قارئین کا حق ہے ناں لیکن خیر اور "یک نہ شد" آسیہ مقصود کیا نیا نام ہے؟ مزے کی کہانی تھی۔ چھوٹے چھوٹے بے ساختہ جملے ہونٹوں پہ مسکراہٹ لانے کا سبب بنے۔ افسانوں میں میرا حمیدبازی لے گئیں۔ اف بیچاری نوشی۔

حسب معمول سارے ہی سلسلے زبردست تھے۔ آپ سے کچھ شکوہ کرنا تھا کہ کیا ہماری کہانیوں کا موضوع ایک ہی چیز نہیں بنتی جارہی "محبت محبت" کچھ نیا' کچھ مختلف کیوں نہیں ہوتا۔

پیاری اقصیٰ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ آپ کا شکوہ سن کر حیرت ہوئی۔ شعاع کا کوئی بھی شمارہ اٹھائیں اور دیکھیں کتنی کہانیاں محبت کے موضوع پر ہیں۔ جو چند ایک محبت کے موضوع پر کہانیاں ہوتی ہیں' ان میں بھی ساتھ ساتھ بہت سے معاشرتی مسائل کی نشان دہی بھی کی جاتی ہے۔

تبصیر نشاط

چاند سی بھابھی

"آج نہیں تو کل اس گھر میں چاند سی بھابھی آئے گی۔"

اکثر بہنیں اپنے بھائیوں کو یہ مدھر گیت گا گا کر چھیڑتی ہیں۔ بہنوں کو بہت ارمان ہوتا ہے ناں بھائیوں کی شادی کا۔ مگر جب وہ چاند سی بھابھی گھر آنگن میں اترتی ہے۔ تب۔ خیر! جانے دیجیے کہ ابھی تو اچھی اچھی باتیں سننے کا وقت ہے۔ معروف کرکٹر وسیم اکرم نے اسکینڈلز کے کئی باؤنسرز پھینکنے کے بعد بالآخر ایک آسٹریلوی حسینہ کا دل کیچ کر ہی لیا۔ وسیم اکرم اپنی اہلیہ کے انتقال سے اب تک تنہا تھے۔ مگر انہوں نے اپنی اس تنہائی کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور اس دوران کئی حسیناؤں کے ساتھ اننگز کھیلیں۔ سب سے پہلے ان کا نام بھارتی حسینہ سشمیتا سین کے ساتھ جوڑا گیا۔ تاہم یہ سین زیادہ عرصے چل نہیں سکا۔ اور پھر وسیم اکرم کا نام معروف اداکار شمعون عباسی کے ایل بی ڈبلیو ہونے کے بعد ان کی سابقہ اہلیہ عمیمہ ملک کے ساتھ جڑ گیا۔ مگر یہ اننگز بھی جلد ہی ختم ہو گئی۔ عمیمہ ملک فلمی دنیا کی طرف پرواز کر گئیں۔ اس کے بعد سشمیتا سین ایک مرتبہ پھر وسیم اکرم کی زندگی میں ان ہو گئیں۔ وسیم اکرم نے بھی اپنی لگاوٹ کا پورا پورا ثبوت دیا۔ یوں وہ کئی مرتبہ ٹی وی اسکرین پر سشمیتا کے سنگ جھومتے اور تھرکتے نظر آئے۔ مگر اچانک وسیم اکرم نے ایک آسٹریلوی حسینہ کو بیچ پر لانے کا اعلان کردیا۔ سب سے خوش کن بات یہ ہے کہ آسٹریلوی حسینہ وسیم اکرم کی خاطر اسلام قبول کرنے کو بھی تیار ہیں۔

(وسیم جی! ذرا دھیان سے۔ آپ سے قبل آپ کے پیش رو عمران خان نے بھی ایک غیر ملکی حسینہ کو مسلمان کرنے کا دعوا کیا تھا اور جیون ساتھی بنایا تھا۔ مگر

ڑوسی ملک کی ہی ایک معروف فلم کا مکالمہ ہے کہ نیم کے پتے کو شہد میں جتنا بھی ڈبو دو۔ وہ کڑوا ہی رہتا ہے۔)

پرائی

عمیمہ ملک کی "بول" بھارت میں کامیاب کیا ہوئی' انہوں نے اس بول کو دھاڑ میں تبدیل کیا اور "شیرنی" کا روپ دھار لیا۔ ایک عرصے تک ان کی بھارتی فلم "شیرنی" کے چرچے رہے۔ مگر ایک دن اچانک اس فلم پر بھارتی سرکار نے شب خون مارا اور فلم کے ہیرو سنجے دت کو جیل میں ڈال دیا۔

بولی ووڈ میں عمیمہ کے مستقبل پر سوالیہ نشان لگا تو عمیمہ نے جھٹ وضاحت دی کہ فلم جلد ہی ریلیز ہو جائے گی۔ کیونکہ سنجے دت اپنا کام مکمل کرا کے گئے ہیں۔ مگر جناب! لگتا ہے کہ عمیمہ کی یہ وضاحت محض وضاحت ہی ہے۔ کیونکہ فلم تو ابھی تک ریلیز نہیں ہوئی اور اب سننے میں آیا ہے کہ عمیمہ ملک نے اگلی بھارتی فلم بدنام زمانہ ہیرو عمران ہاشمی کے مقابل سائن کی ہے۔ گویا عمیمہ ملک بھارتی فلموں میں رہنے کے لیے اب کسی بھی حد تک جانے کے لیے تیار ہو گئی ہیں۔ عمران ہاشمی کے ساتھ آج کل کوئی بھارتی ہیروئن بھی کام کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اب یہ نہیں پتا کہ عمران ہاشمی کے ساتھ ہیروئن کا رول قبول کر کے عمیمہ ملک نے عمران ہاشمی کے کیریر کو سہارا دیا ہے یا اپنے کیریر کو۔

(کوئی بھارتی ہیروئن ہی کیا۔ عمران ہاشمی کے ساتھ تو شاید خود ان کی بیگم بھی ہیروئن کا رول قبول نہ کریں۔ کیونکہ ان کی بیگم کے لیے شوہر لاکھ اپنا سہی ہیروئن دیگر عملہ اور فلم دیکھنے والی ہزاروں لاکھوں آنکھیں تو پرائی ہی ہیں نا۔)

تاخیر

آپ سب نے یہ واقعہ تو یقیناً" سن رکھا ہو گا کہ محکمہ ڈاک کا ایک ملازم ریٹائر ہوا۔ جب اس سے کہا گیا کہ اس کی پنشن کے کاغذات اور واجبات اس کے گھر ڈاک سے بھیج دیے جائیں گے تو وہ تڑپ اٹھا اور فوراً" کہا کہ "نہیں! مجھے بذریعہ ڈاک کچھ نہ بھیجا جائے۔ میں خود آ کے لے لوں گا۔" اسے یہ کہنا ہی تھا۔ کیونکہ وہ محکمہ ڈاک میں کام کرنے کے باعث وہاں کی "تیز رفتار خدمات" سے آگاہ جو تھا۔

اکثر لوگ "دیر آید درست آید" کے مقولے پر بڑی تن دہی سے عمل کرتے نظر آتے ہیں۔ خاص طور پر ہمارے سرکاری محکمے اور ان میں کام کرنے والے افراد۔ اس ضمن میں اکثر محکمہ ریلوے اور محکمہ ڈاک میں ٹائی کانٹے کا مقابلہ رہتا ہے۔ مگر جناب! اب اس مقابلے میں ایک اور محکمہ بھی دم خم ٹھونک کر کود پڑا ہے۔ اور وہ محکمہ ہے فلم سنسر بورڈ کا۔ اس محکمے نے فلم "صنم" کو خیر سے پورے پندرہ سال بعد سنسر سرٹیفکیٹ عطا کر دیا ہے۔ (تین سال اور ٹھہر جاتے تو قانونی بلوغت کا سرٹیفکیٹ بھی مل جاتا۔) اس فلم کے ہدایت کار سید نور ہیں۔ اور سید نور کا نام سنتے ہی آپ یقیناً" سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ فلم کی ہیروئن کون ہوں گی۔ جی ہاں! آپ بالکل ٹھیک سمجھے۔ ہاں ہاں! وہی اپنی صائمہ جی۔ ان کے علاوہ اس فلم میں ریما اور بابر علی بھی ہیں۔ (گویا اس فلم کے ذریعے تاریخ اپنے آپ کو پھر دہرائے گی۔) پندرہ سال قبل بننے والی اس فلم کو آج کے ناظرین کتنا قبول کرتے ہیں۔ یہ تو فلم کی ریلیز کے بعد ہی پتا چلے گا۔ سو انتظار کیجیے۔

(ہاں! سارے محکمے ہی لیٹ لطیف ہیں۔ بس ایک نہیں ہے تو وہ۔ جو بجلی کے محکمے میں کام کرتا ہے اور لوڈشیڈنگ کے اوقات میں بجلی بند کرتا ہے۔ کاش وہ بھی کبھی بجلی بند کرنا بھول جایا کرے۔)

کچھ اِدھر اُدھر سے

طالبان کسی صورت امریکیوں پر اعتماد نہیں کرتے تھے۔ وہ انہیں مکار' دھوکے باز' جھوٹے اور دغا باز سمجھتے تھے امریکا کی مذاکرات کی درخواست پر انکار کر کے وہ یہ الزام اپنے سر نہ لینا چاہتے تھے کہ افغانستان میں امن نہیں چاہتے سو بظاہر ان سادہ لوح طالبان نے ایسا فیصلہ لیا کہ امریکا بدک کر پیچھے ہٹ گیا۔ انہوں نے طے کیا ان کی جانب سے مذاکرات کا اختیار لیفٹیننٹ جنرل حمید گل کو دیا جائے گا۔ حمید گل سے امریکی ایسے بھاگتے تھے جیسے کتے اینٹ سے کیونکہ وہ امریکیوں کی رگ رگ سے واقف تھے۔

(ڈاکٹر ضیاء الدین خان)

امریکی اور برطانوی میڈیا نے کہا ہے کراچی اغوا کاروں اور بھتہ مافیا کے لیے سونے کی کان ہے۔ دنیا میں دہشت گردی کی وجہ کراچی کے جرائم پیشہ گروہ ہیں' جنہیں وہاں کی سیاسی جماعتوں کی سرپرستی حاصل ہے۔ بزنس مین سرمایہ کاری سے کترا رہے ہیں۔ 50 علاقے نوگو ایریاز ہیں۔

(واشنگٹن' لندن' "آئی این پی)

فیس بک پر 6 سالہ شاکرہ کا جھلسا ہوا چہرہ دیکھیں۔ اسے میڈیکل ریلیف ٹیم نے ڈرون حملے کا نشانہ بننے والے گھر کے ملبے سے نکالا ہے۔ وہ اپنا چہرہ کھو چکی ہے اور اس کے جھلسے ہوئے چہرے پر کوئی شرمین عبید چنائے ڈاکو منٹری بنانے بھی نہیں آئے گی اس کے

چہرے پر کسی جنونی نے تیزاب تھوڑی پھینکا ہے وہ تو ڈرون حملے میں جھلسی ہے۔

فرض کیا ملالہ کو طالبان نے ہی گولی ماری ہے اور رائے عامہ کے برعکس یہ ٹوپی ڈراما نہیں' ایک دل خراش واقعہ تھا تو کیا ملالہ پہلی بچی تھی جو شدت پسندوں کی اس جارحیت کا نشانہ بنی ہے؟ اعزازات کی برسات ہونے لگی تو ملالہ کو عالمی مفکرین کی فہرست میں شامل کرنے کی انہونی بھی ہو گئی۔

(محمد بلال غوری۔ جنگ)

مشرف سے تفتیش کرنے والوں کو سختی سے تاکید کی گئی ہے کہ وہ انہیں تفتیش کے دوران ہاتھ تک نہیں لگائیں گے۔ ان سے دور ہو کر ان کے سامنے کرسی پر بیٹھیں گے۔ پرویز مشرف ان کے سامنے جس طرح چاہیں بیٹھ سکتے ہیں۔ اور ان سے صرف سوال ہو گا اور ان کی جانب سے کسی بھی سوال کا جواب نہ ملنے پر ان سے جرح اور تکرار نہ کی جائے اس حد درجہ نرم سلوک کے باوجود گل بن اور مظلومیت کی تصویر نظر آتے ہیں۔

(میاں منیر احمد۔ جسارت)

امت الصبور

مسلمانوں میں آتش بازی کی ابتدا

تاریخ کے حوالے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ۱۳۲ھ میں جب بنو عباس نے بنو امیہ سے اقتدار چھیننے کی کوشش کی تو انہوں نے دیکھا کہ بنو امیہ کو شکست دینا آسان کام نہیں۔ کیونکہ عرب کے جنگجو لوگ اموی حکومت کے ساتھ ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ایرانیوں اور عجمیوں سے تعاون لینے کے لیے سوچا۔ ایرانی آتش پرست تھے۔ مگر فاروقی اور عثمانی حکومت کی فتوحات نے مجوسی آتش کدوں کو سرد کردیا تھا۔ مگر آتش پرست ایرانی مسلمانیت کا لبادہ اوڑھ کر اسلام میں داخل ہوگئے۔ ایرانیوں کا ایک مشہور خاندان "خاندان برامکہ" تھا۔ "برمک" کہتے ہیں آتش کدے کی آگ روشن کرنے اور اس کی نگرانی کرنے والے کو۔ یہ مجوسیوں کے ہاں سب سے بڑا مذہبی عہدہ سمجھا جاتا تھا۔ جب مسلمانوں کی آمد سے برمک عہدے بھی ختم ہوگئے تو برمکی خاندان کے لوگوں نے اسلام کا لبادہ اوڑھ لیا۔ مگر اندرون خانہ آگ سے محبت برقرار رکھی۔ جب بنو عباس نے بنو امیہ سے اقتدار چھینا تو ایسے نو مسلم عجمیوں سے تعاون لیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایرانی امور سلطنت میں شامل ہوگئے۔ بلکہ برمکی خاندان نے تو حکومت اسلامیہ میں بڑے بڑے عہدے حاصل کرلیے اور خالد برمکی تو وزیر اعظم کے عہدے تک جا پہنچا۔ 163ھ میں خالد کا انتقال ہوا تو خلیفہ ہارون الرشید نے اس کے بیٹے یحیٰ برمکی کو وزارت کا قلمدان سونپ دیا۔ برمکی چوں کہ سابقہ آگ پرست تھے اس لیے یحیٰ برمکی نے خلیفہ ہارون الرشید کے دور میں مقدس آگ کو روشن کرنے کا ایک عجیب طریقہ ایجاد کیا۔ اور خصوصاً "شعبان کی پندرھویں رات کو نیک اعمال سے منسوب کرکے اس رات کثرت سے چراغاں کیا۔ آگ روشن کرنے کا مقصد لوگوں کے دلوں میں آگ کا تقدس اور وقار پیدا کرنا تھا۔ مساجد میں چراغاں کی بدعت کو اسی نے پیدا کیا۔ تاکہ وہ اس طرح آگ کی پوجا کرسکیں۔ یہ آتش بازی اور چراغاں کی رسم اسلام میں ڈیڑھ سو سال بعد جاری ہوئی۔ پھر زمانہ کے ساتھ ساتھ اس میں تبدیلیاں آتی رہیں اور آتش بازی کی جدید صورت آج ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔

فرعون کی لعنت

فرعون توتن خامن کا مقبرہ نومبر 1922ء میں دریافت کیا گیا، لیکن جس کمرے میں فرعون کی لاش دفن تھی، وہ 16 فروری 1943ء میں کھولا گیا۔ اس واقعے کے بعد کچھ ایسی باتیں پیش آئیں کہ یورپ اور امریکا میں وہم پھیل گیا کہ فرعون توتن خامن کی اور تمام پرانے مصریوں کی جن کی قبریں کھولی گئی ہیں، لعنت پڑتی ہے اور وہ لوگ مرجاتے ہیں یا سخت نقصان اٹھاتے ہیں جو اس جرم کے مرتکب ہوتے ہیں۔

اس سلسلے میں پہلا واقعہ پیش آیا کہ ایک بلبل کی بہت عجیب طریقے سے موت ہوئی۔ فرعون کے مقبرے میں جو لوگ گھسے تھے ان میں ایک مسٹر ہوارڈ کارٹر بھی تھے اور انہوں نے اپنے گھر میں ایک بلبل پال رکھی تھی، جو خوب چہچہاتی تھی جس دن مسٹر کارٹر مقبرے میں گئے اسی دن ایک کوبرا سانپ بھی ان کے گھر میں پہنچ گیا اور بلبل کو مار کھا گیا۔ کوبرا سانپ فرعون کا خاص نشان تھا۔ وہ اس کی مورتی یا شکل اپنی پیشانی پر رکھتا تھا۔ اور یہ تاج سے ملی رہتی تھی۔ مصری دستاویزوں میں لکھا ہے جو کوئی فرعون کا برا چاہے گا کوبرا اسے اپنی آگ اگل کر جلا ڈالے گا۔ مسٹر کارٹر کی بلبل کو جب سانپ نے مار ڈالا تو بہتوں نے یقین کرلیا کہ ہو نہ ہو یہ فرعون کا ایک قہر ہے اور فرعون کے محافظ سانپ نے بلبل مار کر اس شخص سے بدلہ لیا ہے، جس نے شاہی مقبرے میں جاکر فرعون کی نیند خراب کی اور اسے غصہ دلایا تھا۔

اس کے بعد ایک اور بہت بڑا واقعہ پیش آیا۔ لارڈ کارنارون نے فرعون توتن خامن کا مقبرہ کھولنے کا ٹھیکہ لیا تھا اور انہی کے ہاتھ میں کھدائی وغیرہ کا انتظام تھا یعنی فرعون کا مقبرہ کھولنے کا اصل ذمے دار تھا۔ 16 فروری 1923ء کو جب مقبرہ کے کمرے میں داخل ہونے کا وقت آیا تو لارڈ نے لوگوں سے ہنستے ہوئے کہا۔ "یہ تو لازمی ہے کہ فرعون کے کمرے میں جاکر رات کو جشن منائیں گے۔" اور اس مذاق کو چھ ہفتے بھی نہیں گزرے تھے کہ لارڈ کی لاش بچھونے پر پڑی ہوئی ملی۔ عجیب تر بات یہ ہوئی کہ انہیں بھی کوبرا سانپ ہی ڈس گیا تھا۔ اس واقعے نے لوگوں کو فرعون کی لعنت کا اور بھی معتقد بنادیا۔

اس کے بعد ایک اور موت ہوئی۔ یہ پروفیسر سٹیڈ کی تھی اور امریکا میں پیش آئی۔ موصوف تاریخ مصر کے بڑے عالم تھے اور فرعون توتن خامن کے مقبرے میں داخل ہوئے تو مرنے سے پہلے بالکل اچھے تھے دفعتاً فوت ہوگئے۔ ڈاکٹروں نے ہرچند کوشش کی مگر موت کا سبب نہ بتاسکے۔ اس پر لوگوں کو فرعون کی لعنت کا اور زیادہ یقین ہوگیا۔

اس کے بعد یہ ہوا کہ مصری عجائب خانہ کو دنیا کے مختلف ملکوں سے خط آنے شروع ہوگئے جن کا حال عجائب گھر کے نائب مہتمم نے اس طرح بیان کیا ہے۔

"اپریل 1926ء میں ہمیں انگلستان سے چلا ہوا ایک خط ملا جس پر کسی کے دستخط نہ تھے۔ خط کے ساتھ ایک ممی کے کپڑوں کا ایک ٹکڑا بھی تھا اور لکھا تھا کہ اس کپڑے کی وجہ سے انگلینڈ کے ایک بہت ہی معزز اور امیر خاندان پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹتے چلے جارہے ہیں لہٰذا درخواست ہے کہ اس کپڑے کو مصر کی ہی زمین میں دفن کردیا جائے۔ عجائب گھر نے یہ درخواست منظور کرلی اور کپڑا ایک فرعونی مقبرے میں دفن کردیا۔"

فروری 1927ء میں انگلستان سے ایک اور خط آیا۔ جس کے ساتھ ایک مصری مورتی بھی تھی۔ خط لکھنے والے نے ظاہر کیا تھا کہ ہندوستان سے واپس ہوتے ہوئے پورٹ سعید میں اس نے یہ مورتی مول لی تھی مگر اس کی بیوی کو یقین ہوچکا ہے کہ مورتی منحوس ہے کیونکہ جب سے آئی ہے ہم پریشانیوں میں پڑگئے ہیں۔ میری بیوی کی تندرستی خراب ہوگئی ہے اور خود میں فالج کا شکار ہوگیا ہوں لہٰذا بہتر یہی ہے کہ مورتی مصر کو لوٹا دی جائے۔

اکتوبر 1923ء میں ایک شخص نے عجائب گھر میں کچھ کوڑیاں بھیجیں اور لکھا کہ پرانے وقتوں کے مصری کوڑیاں ہیں۔ ایک دوست کے پاس تھیں وہ ان کوڑیوں کی نحوست سے برباد ہوگیا۔ دوست نے مجھے دے دیں تو میں بھی تباہیوں کا شکار ہونے لگا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ خط لکھنے والے نے اپنے نام کے بجائے لکھا ہے "ایک شخص جو سمجھتا ہے کہ خرافات پر یقین نہیں کرنا چاہیے۔"

27 نومبر 1939ء کو انگلستان سے ایک مصری مورتی آئی۔ اس کے ساتھ خط بھی تھا جس میں لکھا تھا کہ یہ مورتی جب سے میرے قبضہ میں آئی ہے نحوست میں پڑگیا ہوں۔ میں نحوست کا قائل نہ تھا، لیکن بار بار ایسے واقعات پیش آئے کہ قائل ہوجانا پڑا! میں دستبردار ہوتا ہوں اور مصری عجائب گھر کو ہبہ کرتا ہوں۔

30 دسمبر 1935ء کو انگلستان سے ایک خط آیا۔ خط کے ساتھ ایک پتھر بھی تھا۔ خط میں لکھا تھا کہ یہ پتھر مجھے تحفتاً ملا تھا مگر ہے بڑا منحوس۔ جن جن لوگوں کے پاس رہا ہے پریشان ہوئے اور برباد ہوگئے۔ جب سے میرے پاس آیا ہے میں بھی تباہی کے بھنور میں پڑگیا ہوں، پتھر مصر سے آیا تھا اسی لیے مصر کو واپس کیے دیتا ہوں۔

بقیہ: سروے

شعاع کی تحریروں نے دل و دماغ کو کچھ اس طرح سے جکڑا ہوا ہے کہ ہم اس کو چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کرسکتے' شعاع ایک باغ ہے اور اس کے تمام رائٹرز اس باغ کے پھول ہیں جو ہمیشہ خوشبو دیتے ہیں۔

مسکان قریشی۔ بلال کالونی' ملتان

1۔ رمضان میں دو یا ڈھائی بجے تک جاگ جاتی ہوں۔ تہجد کے بعد سحری کی تیاری اس کے بعد سب کو سحری کے لیے اٹھانا جو کہ سب سے مشقت طلب کام ہے۔ کیونکہ جن افراد نے روزہ رکھنا ہے ان کے لیے سحری اور جن لوگوں نے نہیں رکھنا ان کے لیے ناشتا ریڈی ہے۔

پھر چھوٹی آپی کو فون کرکے جگاتی ہوں۔ سحری کے بعد نماز و تلاوت سے فارغ ہو کر گھر کا کام کرتی ہوں۔

صفائی سے فارغ ہو کر دوپہر کے لیے روٹیاں بناتی ہوں (جو روزہ نہیں رکھتے ان کے لیے) پھر آہستہ آہستہ سب اٹھنا شروع ہوتے ہیں اور میں سو جاتی ہوں۔ پھر سارا دن عبادت میں گزرتا ہے کیونکہ میری کوشش ہوتی ہے۔ گرمی ہو چاہے سردی' میں باوضو رہوں۔ افطاری چھوٹی بہن بناتی ہے۔ اس کے ساتھ ہلکی پھلکی مدد کروادی اور بس تبدیلی؟

تبدیلی یہ آتی ہے کہ برداشت کا مادہ پید ہو جاتا ہے۔ ایک مہینے تراویح پڑھنے سے پورے سال عشاء کی نماز چھوٹی لگنے لگتی ہے۔ دنیاوی رغبت میں کمی آجاتی ہے۔ جیسے ٹی وی' موبائل' گپ شپ' ان چیزوں کے بغیر آسانی سے رہا جاسکتا ہے۔ اور خصوصاً "طاق راتوں میں' خدا کا قرب حاصل کرنے کی لگن' روحانی سکون مہیا کرتی ہے۔

2۔ رمضان کے آخری عشرے میں ہماری عید کی

تیاری شروع ہوتی ہے۔ پردے' بیڈ شیٹ' کشن کور' نئے سینا اور پرانے تبدیل کرنا' گھر کی تفصیلی صفائی خصوصی طور پر میرے ذمہ ہوتا ہے۔ اس لیے عید کے آخری عشرے میں پھرتیاں دیکھنے لائق ہوتی ہیں۔ عید

کے کپڑے سینا چھوٹی بہن کے ذمہ ہوتے ہیں اور چھوٹی آپی بازار کے چکر لگاتی ہیں۔ امی اللہ کو پیاری ہوگئی ہیں اس لیے ہر ہر موقعے پر ان کی یاد دامن تھام لیتی ہے تو دل اداسی کی لپیٹ میں آجاتا ہے۔ بڑی آپی دوسرے شہر میں رہتی ہیں۔ اس لیے عید پہ عیدی کا جادلہ یا پھر ٹیلی فونک گفتگو ہو جاتی ہے۔ پہلے دن مہمانوں کا رش ہمیں نکلنے نہیں دیتا۔ عید میں عید کے دن اسپیشل ٹائم وہ ہوتا ہے جب بڑے بھائی اور چھوٹے بھائی کی فیملیز ملنے آتی ہیں۔ اس کے علاوہ سب سے چھوٹے بھائی کے ساتھ دوستوں کے گھر جانا' خالہ اور ماموں کی طرف جانا' مزا آجاتا ہے اور ہاں ہمارے اسٹوڈنٹس کا عید پہ ملنے آنا۔ سب بہت اچھا لگتا ہے اور سجدۂ شکر بجالانے کو دل کرتا ہے۔

3۔ مصنفین سے ملاقات؟ شکوہ' شکایت' فرمائش یا تعریف و ستائش؟

ایک وقت تھا جب ہم شعاع پڑھنے کے بعد کہا کرتے تھے کہ ان کہانیوں پر ڈرامے بننے چاہئیں اور اب یہ حال ہے کہ ٹی وی پر دھڑا دھڑ رائٹرز کے ناول چل رہے ہیں لیکن دیکھنے کا وقت نہیں اور ہماری رائٹرز کے پاس ڈائجسٹ میں لکھنے کی فرصت نہیں۔ خدارا! ہمارے لیے بھی تھوڑا سا وقت بچا کر رکھ لیں۔ یہ ہوگیا شکوہ!

عمیرہ احمد' فائزہ افتخار' نایاب ملک' میمونہ مناف' راحت جبیں' تنزیلہ ریاض' ثروت نذیر' رفعت سراج' سائرہ عارف' اور بہت سے بڑے نام' جو ذہن کے دریچے پر دستک دینے سے قاصر ہیں' انہیں واپس لے آئیں۔ بہت سی منتظر آنکھیں آپ لوگوں کی تحریریں پڑھنے کے لیے محو انتظار ہیں۔ یہ ہوگئی فرمائش!

اس سال شعاع نے شاہکار ناول تخلیق کیے۔

صائمہ اکرم کا ناول "دیمک زدہ محبت" "محبت کی کرنیں بکھیرتا" کامیابی کی طرف رواں دواں ہے۔ بیسٹ وشز آپ کے لیے۔ عالیہ بخاری کا حساس رشتوں کے تقدس پر مبنی خوبصورت ناول "دیوارِ شب"۔ خدا کرے آپ ہمیشہ اسی طرح لکھتی رہیں۔

عنیزہ سید کا انسانیت کی تعظیم کروانے والا' اعلا سوچ کی عکاسی کرتا منفرد ناول "تان بائی کی بیٹی" نجانے کیوں رفعت ناہید سجاد کی یاد دلا گیا۔

سائرہ رضا کا شدت پسندی میں ڈوبا' میانہ روی کا درس دیتا' محبت کا انوکھا روپ لیے "فرماں بردار" آپ کا رائٹنگ کی دنیا میں' بہت آگے جانے کی پیش گوئی کرتا ہے۔ تسی گریٹ او جناب!

فاخرہ جبیں کی دھماکا خیز انٹری "برف زاروں کی تتلی" ان سچے ناولز ایسے شاہکار ہوتے ہیں جو دماغ سے چپک جاتے ہیں اور پھر ان کے کردار مجسم روپ دھار کر ہمارے سامنے چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح

رابعہ افتخار کا افسانہ "مجبوری" "شاید ہی کبھی بھلا سکوں" ویل ڈن جی!

رخسانہ نگار کی چشم کشا تحریر "ایک تھی مثال" ایک ایسی تلخ حقیقت جس کو پڑھتے ہی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ ایسی تکلیف' اذیت' دکھ ناقابل برداشت درد۔

اور ان سب کے علاوہ اس آدھے سال میں آسیہ رزاقی' نعیمہ ناز' ثوبیہ جبیں' سمیرا حمید' رمشہ خالد' سمیرا گل' مصباح علی' تسنیم شریف' ام مریم' عائشہ نصیر احمد' ام طیفور (بہت اچھا اضافہ) سعدیہ عزیز' صباحت یاسمین' مصباح خادم' الیا یقین' مصباح نوشین' شیریں ملک' سحرش بانو' فرحانہ ناز' عنبرین اعجاز' صدف آصف' عظمٰی افتخار' راشدہ رفعت' عاصمہ رانی' میمونہ انکبری' سلویٰ علی بٹ' سعدیہ رئیس' بنت حوا' فرزانہ حسین' آمنہ محسن' ماہ وش ملک سب نے بہت خوب لکھا اور شعاع کی رونق میں اضافہ کیا اور چار چاند لگادیے۔ ☆

مہندی کے ڈیزائن

ادارہ

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

گلاب جامن

اجزا :

خشک دودھ	دو کپ
میدہ	ایک کھانے کا چمچہ
انڈا	ایک عدد
بیکنگ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
سوڈا	ایک چٹکی
الائچی پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
چینی	دو کپ
گھی	ایک کھانے کا چمچہ

ترکیب :

خشک دودھ میں الائچی پاؤڈر اور چینی کے علاوہ تمام اجزا ڈال کر انڈے سے گوندھ لیں اور پانچ منٹ رکھ کر چھوٹی چھوٹی بالز بنا کر ہلکے گرم تیل میں ہلکی آنچ پر تل لیں۔ چینی میں دو کپ پانی ملا کر گاڑھا سا شیرہ تیار کر لیں۔ گلاب جامن سنہری رنگ کے ہو جائیں تو شیرے میں ڈال کر ہلکی آنچ پر پکائیں۔ گلاب جامن پھول جائیں تو الائچی پاؤڈر ڈال دیں۔ ڈش میں نکال کر بادام کی ہوائیاں چھڑک دیں۔

ناریل کی برفی

اجزا :

پسا کھوپرا	آدھا کلو
کھویا	ایک پاؤ
چینی	ایک کلو
گھی	دو کھانے کے چمچے

ترکیب :

کھوپرے کو فرائنگ پان میں ڈال کر بھونیں۔ بادامی رنگ کا ہو جائے تو کھویا ڈال کر بھونیں۔ دونوں یکجان ہو جائیں اور رنگ ہلکا ہلکا تبدیل ہو جائے تو چینی اور تقریباً" ڈیڑھ گلاس پانی ڈال کر بھونیں۔ مسلسل چمچہ چلاتے رہیں۔ پانی خشک ہو جائے اور تینوں چیزیں خوب کس جائیں تو چولہا بند کر دیں۔ ایک بڑی پرات میں گھی لگا کر یہ آمیزہ پھیلا دیں اور چمچے سے دبا کر جما لیں۔ ٹھنڈا ہو جائے تو برفی شیپ میں کاٹ لیں۔ چاہیں تو پستے کی ہوائیاں چھڑک دیں یا چاندی کے ورق لگا لیں۔

رس ملائی

اجزا :

دودھ	ایک کلو
سوکھا دودھ	ایک کپ
بیکنگ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
انڈا	ایک عدد
الائچی	پانچ دانے
بادام، پستے	حسب مرضی
چینی	ایک کپ
گھی	ایک کھانے کا چمچہ

ترکیب :

دودھ میں چینی' الائچی اور بادام' پستے (کتر کے) ڈال کر چولہے پر رکھ دیں۔ سوکھے دودھ کو بیکنگ پاؤڈر' انڈا اور گھی (گھی اگر دانے دار اور سخت جما ہوا ہو تو زیادہ اچھا ہے) کے ساتھ گوندھ لیں۔ دس منٹ رکھ کر ہاتھ چکنا کر کے چھوٹی چھوٹی گولیاں بنا لیں۔ دودھ میں جوش آنے پر ساری گولیاں ڈال کر آنچ کم کر دیں۔ وقفے وقفے سے چمچہ ہلاتے رہیں۔ دودھ گاڑھا ہو جائے اور گولیاں پھول جائیں تو اتار لیں اور ٹھنڈا کر کے بادام پستے کی ہوائیاں چھڑک دیں۔

سویوں کی کھیر

اجزا :

چاول	آدھا پاؤ
سویاں	آدھا پاؤ
چینی	ایک پاؤ
دودھ	تین کلو
سبز الائچی	چند دانے
زعفران	آدھی چٹکی
بادام	چار کھانے کے چمچے
گھی	ڈیڑھ پاؤ

ترکیب :

گھی گرم کر کے الائچی کڑکڑائیں۔ پھر سویاں ڈال کر بھونیں۔ دوسری پتیلی میں چاول اور دودھ ملا کر ہلکی آنچ پر پکائیں۔ پھر بھنی ہوئی سویوں کے ساتھ زعفران ڈال دیں۔ ہلکی آنچ پر سویاں پکنے دیں۔ پھر چینی ڈال دیں۔ دودھ گاڑھا ہو جائے تو اتار لیں۔ ڈش میں نکال کر اوپر سے بادام کی ہوائیاں چھڑک دیں۔

روپالی بریانی

اجزا :

چکن قیمہ	ایک کلو
چاول	ایک کلو
ادرک لہسن پیسٹ	تین کھانے کے چمچے
ہری مرچ	چھ عدد
ڈبل روٹی	ایک سلائس
پیاز	چار عدد
پسا گرم مسالا	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
ثابت گرم مسالا	حسب ضرورت
انڈا	ایک عدد
دہی	ڈیڑھ کپ
زردے کا رنگ	ایک چٹکی
سرخ مرچ	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

قیمے میں آدھا چمچہ پسا گرم مسالا' ایک چمچہ لہسن ادرک پیسٹ' ہری مرچ' پودینہ' نمک' سرخ مرچ'

ایک پیاز، انڈا اور سلائس ملا کر باریک پیس لیں اور کوفتے بنا کر گرم تیل میں تل لیں۔ الگ پتیلی میں باقی پیاز براؤن کر کے نکال لیں۔ اسی تیل میں باقی لہسن ادرک پیسٹ، مرچ، نمک، بقیہ پسا گرم مسالا اور دہی ڈال کر بھونیں۔ پھر کوفتے ڈال دیں۔ آدھا کپ پانی ڈال کر پکائیں اور گاڑھا شوربا ہو جانے پر چولہا بند کر دیں۔ چاولوں میں ثابت گرم مسالا ڈال کر ابال لیں۔ الگ پتیلی میں چاول اور کوفتوں کی تہ لگائیں۔ کیوڑے میں زردے کا رنگ ملا کر چھڑک دیں اور دم پر رکھ دیں۔

رس گلے

اجزا:

خالص دودھ	ایک کلو
کھویا	ایک چھٹانک
میدہ	آدھا پاؤ
چینی	آدھا کلو
بیکنگ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
سبز الائچی	بارہ دانے
پھٹکری	ایک چٹکی

ترکیب:

دودھ کو پکنے کے لیے رکھ دیں۔ ابال آجائے تو پھٹکری ڈال دیں۔ دودھ پھٹ جائے تو اتار لیں اور نتھار کر پنیر بنا لیں۔ بیکنگ پاؤڈر، کھویا اور میدہ ملا کر ایک گھنٹے تک خوب مکس کریں۔ جتنا زیادہ اچھا مکس کریں گی رس گلے اتنے ہی نرم ہوں گے۔ رس گلوں کا شیپ دیں۔ درمیان میں سبز الائچی کے دانے ڈالتے جائیں۔ چینی میں پانی ملا کر گاڑھا سا شیرہ بنا لیں۔ پھر رس گلے ڈال کر چولہے پر چڑھا دیں۔ پھول جائیں تو اتار لیں۔ ٹھنڈا کر کے پیش کریں۔

دہی مسالا چکن

اجزا:

چکن	ایک عدد
دہی	ڈیڑھ کپ
پیاز	ایک عدد
سرخ مرچ	ایک چائے کا چمچہ
لونگ	دس عدد
کالی مرچ	دس عدد
دار چینی	دو ٹکڑے
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

گرم تیل میں چوپ کی ہوئی پیاز سنہری کریں۔ چکن (پورے چکن کے چار یا پانچ ٹکڑے کروائیں) کے ساتھ لونگ، کالی مرچ اور دار چینی ڈال کر چمچہ چلائیں۔ دہی میں نمک اور سرخ مرچ ڈال کر پھینٹ لیں۔ چکن کے ٹکڑے سرخ ہو جائیں تو دہی ڈال کر ہلکی آنچ پر چکن گلنے تک مسلسل ہلکے ہاتھ سے بھونیں۔ دہی کا پانی خشک ہونے تک چکن گل چکا ہوگا۔ سلائس میں کٹے لیموں اور پیاز کے ساتھ سجاوٹ کر کے پیش کریں۔

ڈبل روٹی اور قیمے کے کباب

اجزا:

باریک قیمہ	ایک کلو
ڈبل روٹی	چار سلائس
کارن فلور	ایک کھانے کا چمچہ
سرکہ	ایک کھانے کا چمچہ
سویا ساس	چار کھانے کے چمچے
پسی کالی مرچ	ایک چائے کا چمچہ
انڈا	ایک عدد
ہری مرچ	چار عدد
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

قیمے میں تمام اجزا ملا کر اچھی طرح گوندھ کر رکھ دیں۔ پندرہ منٹ بعد ہاتھ گیلا کر کے چھوٹے چھوٹے کباب بنا لیں اور ہلکی آنچ پر تل لیں۔

ادارہ

خوبصورت بنیے

بے رونق چہرہ بھی میک اپ کی صناعی سے دلکش اور دل آویز ہو جاتا ہے۔ عید کا دن جو چمکتے دمکتے چہروں کا دن ہے بھلا وہ میک اپ کے بغیر کیسے مکمل ہو سکتا ہے۔ اپنے چہرے کے حسن کو نکھارنے اور اس میں دلکشی پیدا کرنے کے لیے ہلکا پھلکا میک اپ ضرور کریں۔

میک اپ سے پہلے یہ بات یاد رکھیے کہ فیشل اور بلیچ ہمیشہ عید یا تقریب سے دو روز پہلے کریں۔

1 ۔ میک اپ کا پہلا مرحلہ ہوتا ہے چہرے پر بیس لگانے کا۔ اپنی اسکن کے مطابق فاؤنڈیشن کا کلر منتخب کریں۔ چہرے پر براہ راست کبھی فاؤنڈیشن نہ لگائیں کیونکہ چہرے کی جلد حساس ہوتی ہے۔ اسے اسفنج میں لگا کر چہرے پر لگائیں اس کے بعد اسفنج کی مدد سے فیس پاؤڈر لگائیں۔ بعد میں اسے برش کی مدد سے صاف کر دیں۔ بیس لگاتے وقت یہ بات ذہن میں رکھیں کہ اگر آپ کا چہرہ خشک ہے تو آئلی بیس استعمال کریں اور اگر چہرہ آئلی ہے تو واٹر بیس استعمال کریں۔

2 ۔ اب آنکھوں کے میک اپ کی باری ہے۔ آنکھوں میں آئی شیڈو کا انتخاب اپنے لباس کی مناسبت سے کریں۔

3 ۔ آئی لیشس لگانا چاہیں تو لگا سکتی ہیں۔ اس کے بعد لائنر کے بعد مسکارا لگائیں۔

4 ۔ اب بلش آن کی باری ہے۔ برش کی مدد سے گالوں پر ہلکا سا ٹچ دے دیا جاتا ہے۔ لباس کی مناسبت سے براؤن یا میرون کلر استعمال کریں۔ ویسے براؤن ہر لباس پر چل جاتا ہے۔

5 ۔ لپ اسٹک لگائیں۔ آپ کوئی ایک کلر منتخب کریں اور اسی کلر سے ایک نمبر ڈارک لپ پنسل استعمال کریں۔ پنسل سے لائن بنا کر ہونٹوں پر لپ اسٹک سے فلنگ کر دیں۔ فلنگ تھوڑی لائٹ رکھیں اور اگر پنسل لائٹ ہے تو لپ اسٹک ڈارک رکھیں۔

اب آپ کا میک اپ مکمل ہوا۔

چہرے کا میک اپ بالوں کے اسٹائل کے بغیر نامکمل رہتا ہے۔ بالوں کی آرائش کا انداز وقت کے ساتھ کافی بدل گیا ہے۔ کچھ دنوں پہلے تک بیک کومنگ کا رجحان تھا مگر اب بالوں کو سیدھے سادے انداز میں بنانے کا فیشن ہے۔ اگر بال لمبے ہیں تو مختلف انداز میں چوٹی گوندھ کر اسے گجروں کی مدد سے سجائیں یا پیچھے سے بالوں کو سمیٹ کر جوڑا باندھ لیں اور جوڑے میں پھول یا گجرے سجا لیں۔ بالوں کو کھلا رکھنے کا فیشن بھی ان ہے۔ اگر آپ کے بال گھنے اور سلکی ہیں تو کھلے بال آپ کی شخصیت کے حسن کو بڑھائیں گے اگر چھوٹے ہیں تو آپ انہیں بلو ڈرائیر کر سکتی ہیں۔ عید کا دن آپ کو گھر پر مہمانوں کی خاطر مدارات میں گزارنا پڑتا ہے تو بالوں کا ہلکا اسٹائل مناسب ہے۔ بالوں کو ایسا اسٹائل دیں جو آپ کو ڈسٹرب نہ کرے سارا دن گھر کے کام کاج کے دوران آپ کو خوب صورت لک بھی دے اور سمٹا بھی رہے۔ سادہ سی چوٹی بنا کر آپ اسے گجروں سے بھی سجا سکتی ہیں۔ ✿